مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف ـــ مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے، یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے.
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے.
جسمیں ۷۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے.
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے.
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۴۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴/-
مکتبہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ۰۰/۴
پاکستان سے ۰۰/۴

فی کاپی ....۷۰ پیسے

جلد ۳۷ | بابت ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۸۹ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۶۹ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: ۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: ۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: ۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے! اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

۲۶ جنوری کے اسٹیٹسمین میں شائع ہونے والے پروفیسر ٹائن بی کے مضمون اور اس پر مسلمانانِ کلکتہ کے احتجاج و اشتعال کا واقعہ ایک معنی میں پرانا ہو گیا ہے۔ لیکن تبصروں کا سلسلہ بہرحال اب بھی جاری ہے اس لیے اس میں ایک تبصرہ کا اور اضافہ بعد از وقت نہیں ہو گا۔

سب سے پہلے مسلمانانِ کلکتہ کے ردِ عمل پر ہمارا تاثر یہ ہے کہ یہ ایک خاص رُخ سے قابلِ تحسین و آفرین ہے، لیکن اصل محرک اور مقصد کے اعتبار سے اس کی مناسب شکل احتجاج و اشتعال کے بجائے کچھ اور تھی۔ قابلِ آفریں پہلو یہ ہے کہ مسٹر ٹائن بی نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ گاندھی جی سے کیا تھا اور آپ کی شان ان کے مقابلہ میں گھٹائی تھی۔ گاندھی جی ہندوستان کے "دیش پتا" کہلاتے ہیں اور ان کی تعظیم کو اس درجہ سرکاری حیثیت حاصل ہے کہ سرکاری دفتروں ہی نہیں عدالتوں تک میں ان کی تصویر کا نہایت احترام سے آویزاں ہونا بلکہ ہر اہم میز پر اُن کی ایک شبیہ کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ کلکتہ کے مسلمان لائقِ صد تحسین و آفریں ہیں کہ انھوں نے اگر یہ سمجھا کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا حق یہی ہے کہ ٹائن بی کا مضمون شائع کرنے والے اخبار کے خلاف ایک پرجوش مظاہرہ کر کے اس سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا جائے تو پھر اس حق کو ادا کر دکھانے میں انھوں نے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ صاحبِ مضمون نے اگر آنحضور کو گھٹایا ہے تو بڑھایا ایک ایسی شخصیت کو ہے جو انکے

ملک میں یہ مقام رکھتی ہے۔ اور اس لیے اس موقع پر کسی احتجاج میں بڑی نزاکت ہے۔
ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایسی نزاکتیں کتنے ہی لوگوں کو فرائض کی ادائیگی سے روک سکتی ہیں۔ اور دین و ایمان کے وہ تقاضے بھی خوف و دہشت کی نذر ہو سکتے ہیں جنہیں ہر حال میں پورا کیا جانا چاہیے۔ اس لیے مسلمانان کلکتہ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر جو کچھ اپنے ایمان و اسلام کا حق سمجھا اُسے ایک سخت نزاکت کے علی الرغم بے خوف و خطر ادا کیا۔ اور ایک نقشِ پا چھوڑ دیا کہ رہروان محبت ایسی پُر خار وادیوں سے بھی گزر جاتے ہیں۔

اس اولین تاثر کے ساتھ دوسرا تاثر یہ ہے کہ احتجاجی مظاہرہ کر کے اسٹیٹسمین سے معذرت کرانے سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوا جو اس موقع پر ایک دوسرے طریقے سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مضمون کا متعلقہ حصہ اس قدر لچر اور ساتھ ساتھ اتنے صاف طور سے قابل اعتراض تھا کہ اُس پر اخبار کے ایڈیٹر کو بڑی آسانی سے قائل کیا جا سکتا تھا۔ اور اس طرح قائل معقول ہونے کے بعد جو معذرت سامنے آتی وہ یقیناً اُس رسمی معذرت سے بہت مختلف ہوتی جو کسی دباؤ کے تحت کی جاتی ہے۔ پھر اس دوسری شکل میں یہ حق بھی حاصل کیا جا سکتا تھا کہ اسٹیٹسمین ہی میں مسٹر ٹائن بی کے مضمون پر ایک تنقیدی مضمون کسی مسلمان صاحب علم و قلم کا شائع ہو اور جن لوگوں تک مسٹر ٹائن بی کا مضمون پہونچا ہے اُن کی نظر سے اُس پر نقد بھی گزرے۔

یہ فریضہ دراصل ایک اسلامی حکومت پر عائد ہوتا ہے کہ اس کی قلمرو میں ناموسِ رسالت پر کوئی دست درازی کی جائے تو حکومت کا سخت گیر ہاتھ حرکت میں آئے۔ کیونکہ وہاں یہ ایک اساسِ مملکت کی حرمت کا مسئلہ ہے اور اس کے تحفظ میں سختی برتے بغیر کوئی حکومت "حکومت" کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ لیکن ایک غیر اسلامی مملکت میں رہنے والے مسلمان ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری سے بری ہیں۔ وہ ذمہ داریاں جو حکمران مسلمانوں پر بتقاضائے حکومت و اقتدار عائد ہوتی ہوں۔ دوسرے مسلمانوں پر اُن کے عائد ہونے کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ بات الگ ہے کہ واجب نہ ہونے کے باوجود بعض صورتوں میں سختی مستحسن ہو گی اور اُس کے لیے خطرہ مول لینا عزیمت کہلائے گا ـــــــ لیکن عمومی طور پر غیر حکمراں مسلمانوں کی ذمہ داری

یہ ہو کہ وہ اپنی زندگی سے اپنے دین اور اپنے پیغمبر کی عظمت لوگوں کے دلوں پر قائم کریں۔ اپنے بہترین وسائل جمع کر کے اسلام اور پیغمبر اسلام کو صحیح طور پر اپنے غیر مسلم ماحول میں متعارف کرائیں۔ علم واستدلال کے لہجہ میں تنقیص کرنے والوں کو علمی اور استدلالی سطح پر جواب دیں۔ غلط فہمی و ناآشنائی پر مبنی اعتراضات کے مقابلہ میں "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" کا عمل اکسیر آزمائیں۔ اور کوئی سمجھانے اور جواب دینے کے قابل بھی نہ ہو تو "وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا" کے طرز عمل سے خود اسی کے ماحول میں اس کے خلاف نفرت کا سامان کر دیں۔

غیر اسلامی ماحول کے مسلمان تو دراصل اپنی ذمہ داری کی رو سے اسلام کے بس مبلغ ہیں۔ اور ایک مبلغ کا لائحہ عمل یہی ہے۔ لیکن مبلغ کا کام بڑی پتہ ماری کا کام ہے۔ اس کے لیے آہن کا جگر چاہیے۔ چنانچہ ہم لوگ (الا ماشاء اللہ) اسلام کی عزت وحرمت کے بارے میں اسلامی حکومت کے فرائض کو اپنا لینا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک لذت نفس بھی ہے خواہ ہمیں وہ لذت سراسر معصوم اور مقدس جذبہ ہی کی لذت نظر آئے لیکن مبلغ کا کردار نفس کشی کا مجاہدہ چاہتا ہے! ایک طویل مجاہدہ جو "انا" کا سر کٹا دینے کی عزیمت سے بھی زیادہ سخت ہے! دین کا صحیح اور صحتمند جذبہ وہ ہے جو انسان کو اس کی اپنی ذمہ داریاں اٹھانے پر اکسائے۔ اپنی ذمہ داریاں چھوڑ کر اور اپنے کردار سے غافل ہو کر کوئی دوسرا من پسند کردار ادا کرنے کی اکساہٹ آدمی میں پیدا ہوتی ہے تو یہاں سمجھ لینا چاہیے کہ کسی مقدس لبادہ میں کوئی چور اندر داخل ہو گیا ہے ــــــ اور تلاش کرنے سے وہ ضرور ہاتھ آئے گا۔

مسٹر ٹائن بی کے مضمون کی اشاعت پر اسٹیٹسمین سے معذرت نامہ چھپوا کر ہم نے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان تو ضرور کر لیا لیکن کیا اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر کو اندرونی طور پر معترف بھی کر دیا کہ اس سے غلطی ہوئی تھی؟ کیا ہم نے اس میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ہمارے جذبات و اعتقادات سے قطع نظر مضمون کا متعلقہ حصہ علم و تحقیق کے پیمانہ سے بھی نہایت پست وکم عیار تھا؟ کیا ہم نے اپنی اس ذمہ داری کو پورا کیا کہ جن لوگوں تک مسٹر ٹائن بی

کی تحریر پہونچی ہو اُن تک نہایت مؤثر اور مدلل انداز میں ہماری یہ بات بھی پہونچ جائے کہ مسٹر ٹائن بی نے اپنے علم و فضل کی ساری شہرت کے باوجود علم و فضل کے چہرے پر محض خاک اڑائی ہے؟ ہم نے اپنے مجروح دل کی ٹیس تو دور کر لی مگر تقدیسِ رسالت کے سینہ میں جو تیر پیوست کیا گیا تھا اُسے نکال پھینکنے بلکہ تیر انداز پر لوٹا دینے کا کوئی سوال ہی ہمارے ذہن میں نہیں آیا، آنکھوں میں چبھی ہوئی سوئیاں جوں کی توں چھوڑ کر ہم خوش خوش چلے آئے کہ باقی سب سوئیاں نکل گئی ہیں، حالانکہ پھر کچھ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ یہ سب بھی از سرِ نو چبھی ہوئی ملیں گی؟
ہم نے اسٹیٹسمین سے معذرت کرا لی اور اپنے نزدیک سارا فرض ادا کر دیا، حالانکہ وہ معذرت جب ہمارے احتجاجی مظاہرہ کی خبروں کے ساتھ لوگوں کے سامنے پہونچی ہوگی تو زیادہ سے زیادہ صرف یہ اثر اُس سے لیا گیا ہوگا کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچی تھی! لیکن یہ کہ یہ ٹھیس پہونچنا مسلمانوں کے خاص عقیدتمندانہ نقطۂ نظر پر مبنی نہ تھا بلکہ اس سے قطع نظر بھی مضمون کے متعلقہ حصہ کا معیار پست اور علم و تحقیق کی ذمہ داریوں سے عاری تھا، اس تاثر کی ہوا تک کسی کو نہ لگی ہوگی۔ کیونکہ مسلمان اپنی دینی حس میں بدنام ہے اور ٹائن بی وقت کے مانے ہوئے صاحب علم و نظر اور اسلامی تاریخ کے بھی اسکالر!

افسوس، جو اصل کام تھا وہ پسِ پشت رہا، اور جو ہم پر کچھ ایسا فرض نہیں تھا اُس میں چار جانیں تک چلی گئیں۔ مشہور بنگالی صاحب قلم و اہل نظر مسٹر نراد چودھری کے بقول:
پروفیسر ٹائن بی نے اپنی شہرت کو بالائے طاق رکھ کر یہ ایسا مضمون لکھا ہے جو کوئی تاریخ وال بلا تعصب نہیں لکھ سکتا (ملاحظہ ہو ہندوستان اسٹینڈرڈ ۹ فروری ۶۹ء)۔ اس لیے قدرتی طور پر یہ بہترین موقع دیتا تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے معاملہ میں مغربی مصنفین کی اندھیر گردی کا اچھی طرح پردہ چاک کر دیا جائے۔ اسٹیٹسمین اگر اس کی اشاعت پر معذرت خواہ ہو سکتا تھا تو اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ اس پر راضی ہو سکتا تھا کہ اس کا جواب اس میں شائع ہو۔ اور اس طرح یہ ایک خداداد موقع ملتا تھا کہ اسٹیٹسمین جیسے موقر انگریزی اخبار میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی اشاعت ہو، ورنہ کہاں اس کا موقع ہاتھ آتا ہے!

مضمون کے بودے پن کا اندازہ کرنے کے لیے تو اب کیا، البتہ عبرت حاصل کرنے کے لیے اسے ذرا دیکھیے کہ خدا فراموشی کی سزا میں خود فراموشی (نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ) کا کیسا نمونہ ہے۔ ایک عالمگیر شہرتِ علم وفضل کا مالک کس درجہ کی بچکانہ اور بنجرانہ باتیں کر رہا ہے، ایک ہستی جس نے چار دانگ عالم میں روحانیت کا نور پھیلایا، جس نے دن رات میں پانچ پانچ دفعہ خدا کے لیے دنیا سے کٹ جانے کو ایک وسیع وعریض انسانیت کا دین بنا دیا، جس نے سال کے ہر گرم وسرد موسم میں ایک مہینہ کی روزہ داری کا ذوق رہتی دنیا تک کے لیے اپنی اُمت میں ودیعت کر دیا، اس پر گاندھی جی کی فوقیت بتائی جا رہی ہے، جن کی اصل دعوت کوئی روحانی دعوت ہی نہ تھی۔ اور جنھوں نے اپنے پیچھے کسی روحانی انقلاب کے کوئی آثار نہیں چھوڑے۔

حد ہو گئی، آنحضرت کے بارے میں ارشاد ہے کہ انھوں نے (معاذ اللہ) اپنے روحانی خسارہ کی قیمت پر سیاسی کامیابی حاصل کی، جبکہ گاندھی جی نے سیاست میں رہ کر روحانی پاکیزگی کی بھی اعلیٰ مثال قائم رکھی ـــــ اتنے بڑے دعوے کی دلیل کیا ہے؟ کچھ نہیں! البتہ اسے ایک امرِ واقعہ فرض کر کے اس کی وجہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ تکلیف دہ ہونے کے باوجود عبرت کے لیے سننے کی چیز ہے فرماتے ہیں: حضرت محمد کے برخلاف، کہ وہ ناکامی کی پریشانی سے دوچار اور قدرتی طور سے کسی دوسرے میدانِ عمل کے جویا تھے، گاندھی جی سیاست میں آنے سے قبل ہر طرح ایک آسودہ انسان تھے، ایک قانون داں کی حیثیت سے وہ ایک کامیاب پریکٹس کے مالک تھے ـــــ گویا جو شخص آسودہ حال اور فارغ البال ہو، وہ اگر سیاست میں آئے تو مسٹر ٹائن بی کے نقطۂ نظر سے کسی حرص وآز اور کسی طالع آزمائی کا سایہ اس پر نہیں پڑ سکتا۔ برخلاف اس کے، جو شخص پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کر رہا ہے، وہ اگر اس وادی کا رُخ کرتا ہے تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہ دوسروں کو کچھ دینے کے لیے نہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس طرف آیا ہے!

کہیے عبرت کی جا ہے کہ نہیں کہ ایک پختہ کار انسان کیسی طفلانہ اصول سازی کر رہا ہے حالانکہ دنیا نے اخلاقی اور روحانی بہار کی جتنی فصلیں بھی دیکھی ہیں اور آج بھی اس کے جو کچھ بچے کھچے پھول نظر آتے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ وہ سب فاقہ مستوں ہی کا طفیل ہے اور

اس شرف میں اُن کا شریک کوئی آسودہ حال ہو ابھی تو اُسے بھی یہی طرز داد اپنانا پڑی ؎

نازپروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

اپنے وقت میں تاریخ کا امام سمجھا جانے والا آدمی تاریخ کی اتنی موٹی حقیقت سے روکش!
بس ایسی جگہ یقین آتا ہے کہ ہدایت محض عطیہ خداوندی ہے جس کے لیے قلب سلیم چاہیئے
اور کچھ نہیں۔

پاکستان کے حالات پڑھ پڑھ کر دل لرز رہا تھا کہ خدایا کیا ہونا ہے' قدرتی طور سے اس پر کچھ لکھنے کا بھی خیال تھا۔ مگر قبل اس کے کہ قلم کو اس کی فرصت ملے' حالات کی اس نامبارک رو پر مارشل لا کا بند لگ گیا ہے! ـــــ یہ بند اور علاج بذات خود اچھا ہے یا بُرا' اس کا فیصلہ اہل پاکستان کو کرنا ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ممکن نہیں کہ جو ہو رہا تھا اس سے یقیناً یہ اچھا ہے۔

ان نئے حالات میں سیاسی سرگرمیاں تو یقیناً ممنوع ہو جائیں گی لیکن غیر سیاسی اور غیر اختلافی دینی سرگرمیوں کے لیے امید ہے' اسی طرح اجازت رہے گی جس طرح ۵۸ئہ کے مارشل لا میں رہی تھی۔ کیا اچھا ہو کہ دین کے نام درد مند اس گنجائش سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر پاکستانی عوام کو اُن اولیں دینی تقاضوں سے آشنا کرنے پر کمربستہ ہو جائیں جن سے ناآشنائی یا غفلت ہی ان سارے فسادات کی بھی جڑ ہے جن کا بھیانک اور ناقابل گمان تماشہ وہاں ان دنوں دیکھنے میں آیا۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات ہی میں تو اس کے تمام اولیں و آخریں اور عمومی و خصوصی تقاضے مضمر ہیں' پوری زندگی میں نفی و اثبات کی شاخیں اسی بیج سے نکل کر پھیلتی ہیں۔ اُس کے موٹے موٹے عام زندگی سے متعلق تقاضے قوم کے ذہن و عمل میں رچ بس جائیں تو مختلف شعبوں اور مختلف حالات کے تقاضوں کا مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا' پھر ایک خاص حس پیدا ہو جاتی ہے جو قوم کی حفاظت بھی کرتی ہے اور ایک حد تک رہنمائی بھی۔ اس اندرونی روشنی کے ساتھ باہر سے جس جس موڑ پر صحیح رہنمائی ملتی جائے گی قوم اُسے قبول

کرتی جائے گی۔ غلط ترغیبات اور اغوائی کوششیں ایسی قوم پر آسانی سے کارگر نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر علانیہ ہوں تو چیلنج کیے جانے پر ٹک نہیں سکتیں۔ لیکن اس مضبوط بنیاد کے لیے محنت کیے بغیر محض قوم کے دعوئے اسلام پر تکیہ کر کے ہر اُس غیر اسلامی دعوت اور جاہلی نعرے کو شکست دیدینے کی اُمید رکھنا جس کی فتح و شکست کا فیصلہ اکثریت کی حمایت و عدم حمایت سے ہوتا ہو کوئی صحیح امید نہیں ہے۔

اسلام کے لیے لڑنے والا کیمپ ہر طرح کے حربے استعمال نہیں کر سکتا جبکہ غیر اسلامی محاذ کو کوئی بھی وہ طریقہ اختیار کرنے میں عار نہیں جس سے لڑائی جیتنے میں مدد ملتی ہو، خواہ کوئی سی بھی انسانی اور اخلاقی قدر پامال ہوتی ہو۔ اس لیے جب تک قوم کی غالب اکثریت مضبوط اسلامی مزاج، اسلامی کیریکٹر اور سچے دینی جذبات نہ رکھتی ہو اس طرح کا کوئی انتخابی معرکہ اہلِ دین کو جیتنے کی امید نہ رکھنی چاہیئے ـــــ ہمارا ذہن تو کچھ اس طرح بھی سوچتا ہو کہ آیا یہ بات مناسب ہو کہ ایک ایسی مسلم قوم میں اسلام کے اجتماعی نظام کو برسر اقتدار لانے کی براہ راست جدوجہد کی جائے، جس میں کچھ لوگ (تھوڑے یا بہت) اس جدوجہد سے صاف صاف نظریاتی کشمکش کرنے اور اسے چیلنج کرنے کی جرأت بھی کر سکتے ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات قابلِ غور ہے۔ یہاں اسکی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر یہ اشارہ کافی ثابت ہوا تو انشاء اللہ اس کی مزید وضاحت کی جائے گی!۔

ہمدردان الفرقان سے!

۱۔ الفرقان کی توسیع اشاعت کی کوششوں کی ضرورت ہو جن میں ہمیشہ ہمدردان الفرقان کا خاص حصہ رہا ہے ــــ ہماری خواہش ہے کہ اپریل کے مہینے میں جو الفرقان کے نئے سال (سینتیسویں سال) کا بھی پہلا مہینہ ہو ہمدردان الفرقان اس طرف توجہ فرمائیں۔

۲۔ اگر آپ کا اپنا یا اہل تعلق میں سے کسی کا کوئی اشتہار اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا ہو تو الفرقان میں بھی اس کی اشاعت انشاء اللہ مشتہر کے لیے بھی مفید ہوگی اور الفرقان کو بھی اس سے مدد ملے گی۔

ان دو پہلوؤں پر اگر ہمدردان الفرقان اس مہینہ میں خاص طور پر توجہ فرما سکیں تو ہم ان کے بیحد مشکور ہوں گے۔

ــــــــ ادارہ

کتاب الأذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

درود شریف کے خاص کلمات:-

[اس عنوان کے تحت چند حدیثیں گزشتہ اشاعت میں پیش کی جا چکی ہیں، اُن کے آگے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔]

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَارِجَةَ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ الصَّلٰوةُ عَلَيْكَ؟ فَقَالَ صَلُّوْا عَلَيَّ وَاجْتَهِدُوْا فِي الدُّعَاءِ وَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

——— رواہ احمد والنسائی

حضرت زید بن خارجہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ پر درود کس طرح بھیجی جائے؟ تو آپ نے فرمایا مجھ پر درود بھیجا کرو، اور خوب اہتمام اور دل لگا کے دعا کیا کرو، اور یوں عرض کیا کرو۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ

حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ" (مسند احمد، سنن نسائی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن خارجہ کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ پر درود کس طرح بھیجی جائے؟ درود کے کلمات بھی تلقین فرمائے اور اس سے پہلے ارشاد فرمایا "صَلُّوْا عَلَیَّ وَاجْتَهِدُوْا فِی الدُّعَاءِ" اس عاجز نے "وَاجْتَهِدُوْا فِی الدُّعَاءِ" کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ درود شریف جو دراصل اللہ تعالیٰ کے حضور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک دُعا ہے، صرف زبان سے سرسری طور پر نہیں، بلکہ اہتمام اور دل کی پوری توجہ کے ساتھ مانگی جائے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَفَعَهٗ مَنْ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ وَتَرَحَّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا تَرَحَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ، شَهِدْتُّ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَشَفَعْتُ لَهٗ ——— رواہ الطبری فی تہذیب الآثار (فتح الباری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مجھ پر اس طرح درود بھیجا "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ وَتَرَحَّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا تَرَحَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ" تو میں قیامت کے دن اس کے لیے شہادت دوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا۔

(تہذیب الآثار للطبری)

(تشریح) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی ہوئی اس درود میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لیے صلوٰۃ اور برکت کے علاوہ ترحّم کی بھی دُعا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے علماء اور فقہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رحمت کی دُعا سے منع فرمایا ہے، کیونکہ یہ دُعا تو عام مومنین کے لیے کی جاتی ہے، لیکن اگر صلوٰۃ وسلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے رحمت اور ترحّم کی استدعا آپ کے لیے کی جائے تو مضائقہ نہیں ہے، تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس میں آپ کے لیے سلام کے ساتھ رحمت کی دُعا بھی ہے، اسی طرح حضرت ابوہریرہ کے روایت کیے ہوئے اس درود میں صلوٰۃ اور برکت کی استدعا کے بعد ترحّم کی استدعا بھی کی گئی ہے۔ اس طرح ترحّم کی استدعا صلوٰۃ وسلام کا تکملہ بن جاتی ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّكْتَالَ بِالْمِكْيَالِ الْاَوْفٰى اِذَا صَلّٰى عَلَيْنَا اَهْلَ الْبَيْتِ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اس سے خوشی ہو اور وہ چاہے کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر درود بھیج کے اللہ کی رحمتیں اور برکتیں زیادہ سے زیادہ اور بھرپور حاصل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں عرض کیا کرے

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ

اے اللہ اپنی خاص نوازش اور عنایت و رحمت فرما نبیِ اُمّی حضرت محمد پر اور ان کی ازواج مطہرات اُمہات المومنین پر اور ان کی اولاد پر اور ان کے سب گھر والوں پر، تو ہر حمد و ستائش کا مستحق و

مجید"۔ سزاوار ہے اور عظمت و کبریائی تیری ہی صفت ہے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر بعض حضرات کا خیال ہے کہ درودوں میں یہ درود سب سے افضل ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ اور بھرپور رحمت و برکت اور اجر و ثواب حاصل کرنا چاہے وہ یہ درود پڑھے ۔۔۔ اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ نماز میں تو وہ درود پڑھنا افضل ہے جو ابتدائی حدیثوں میں گزر چکا اور نماز سے باہر یہ درود افضل ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث میں روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَدَّهُنَّ فِیْ یَدِیْ جِبْرَئِیْلُ وَقَالَ جِبْرَئِیْلُ هٰکَذَا اُنْزِلَتْ مِنْ عِنْدِ رَبِّ الْعِزَّةِ۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰهُمَّ وَتَرَحَّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا تَرَحَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰهُمَّ تَحَنَّنْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا تَحَنَّنْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰهُمَّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا سَلَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

—— رواه البیهقی فی شعب الایمان والدیلمی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جبرئیل امین نے میرے ہاتھ کی انگلیوں پر گن کر درود شریف کے یہ کلمات تعلیم فرمائے اور بتایا کہ ربّ العزّت جل جلالہ کی طرف سے یہ اسی طرح اترے ہیں .... وہ کلمات یہ ہیں

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ .... الخ

(مسند فردوس دیلمی، شعب الایمان للبیہقی)

تشریح) اس درود میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے صلوٰۃ اور برکت اور ترحّم کی استدعا کے علاوہ سلام اور تحنّن کی استدعا بھی کی گئی ہے ـــ تحنّن کے مفہوم کو اردو زبان میں شفقت اور پیار دلار سے ادا کیا جا سکتا ہے اور سلام کے معنی ہیں ہر برائی اور ناپسندیدہ چیز سے سلامتی اور حفاظت۔

اس حدیث کے بارہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کنز العمال جلد اول میں جہاں یہ حدیث ذکر کی گئی ہے وہیں سند کے لحاظ سے اس کے ضعیف ہونے کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، پھر اسی کی دوسری جلد میں اسی مضمون کی ایک حدیث اور درود شریف کے یہی کلمات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی صاحب مستدرک ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری کی "معرفۃ علوم الحدیث" کے حوالے سے ان کی مسلسل سند کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں اور اس سند کے بھی بعض راویوں پر سخت جرح کی گئی ہے، ساتھ ہی سیوطی سے نقل کیا گیا ہے کہ انھیں اس حدیث کے بعض اور "طریقے" بھی ملے، نیز حضرت انس سے بھی قریباً اسی مضمون کی ایک حدیث روایت کی گئی ہے جو ابن عساکر کے حوالہ سے کنز العمال میں بھی درج ہے۔ اور اصحاب فن کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ ضعیف حدیث تعدّدِ طُرُق کی وجہ سے قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ خاص کر فضائلِ اعمال میں ایسی حدیث سب کے نزدیک قابلِ عمل ہے۔ مُلّا علی قاریؒ نے شرح شفاء میں حاکم کی روایت کردہ حضرت علی والی حدیث کے راویوں پر سخت جرح کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "غایۃ الامر یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث کو بھی قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے"۔ (شرح شفاء صفحہ ۴۳ج ۳) انہی سب باتوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ حدیث ضعیف ہونے کے

باوجود یہاں درج کر دی گئی ہے۔

یہاں تک جو احادیث درج ہوئیں جن میں درود و سلام کے کلمات تلقین فرمائے گئے ہیں، یہ سب مرفوع حدیثیں تھیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تھے ــــ اور ان میں درود و سلام کے جو کلمات تعلیم فرمائے گئے ہیں ــــ ان سب کی بنیاد وحی ربانی پر ہے، حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی حدیث کے ذیل میں اوپر گزر چکا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بشیر بن سعد نے دریافت کیا کہ ہم آپ پر درود کس طرح بھیجا کریں؟ تو آپ کچھ دیر خاموش رہے، یہاں تک کہ وحی آئی اس کے بعد آپ نے درودِ ابراہیمی تلقین فرمایا ــــ اس سے معلوم ہوا کہ درود شریف کے بارہ میں آپ کو بنیادی رہنمائی وحی سے ملی تھی، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ درود و سلام کے جو کلمات بھی کسی وقت آپ نے تلقین فرمائے ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ اور یہ فضیلت درود و سلام کے انھیں کلمات کو حاصل ہے جو کسی وقت آپ نے تعلیم فرمائے۔ ان کے علاوہ بعض صحابۂ کرام اور دوسرے سلف صالحین سے درود و سلام کے جو کلمات منقول ہیں ان کو یہ خصوصیت اور فضیلت حاصل نہیں ہے، اگرچہ ان میں سے بعض لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت ہی بلند ہیں اور ان کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں ہو ــــ ان میں سے ایک درود جو کتب حدیث میں فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا گیا ہے، اور دوسرا جو حضرت علی مرتضیٰ سے مروی ہے یہاں درج کیے جا رہے ہیں اور انہی پر روایات کا یہ سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَحْسِنُوا الصَّلٰوةَ عَلَيْهِ فَاِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ لَعَلَّ ذَالِكَ يُعْرَضُ عَلَيْهِ فَقَالُوْا لَهٗ فَعَلِّمْنَا، فَقَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ وَبَرَكَاتِكَ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ اِمَامِ الْخَيْرِ وَقَائِدِ الْخَيْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَةِ اَللّٰهُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدًا يَّغْبِطُ بِهِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

———— رواہ ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو تو بہتر سے بہتر طریقہ پر درود بھیجنے کی کوشش کرو، تم جانتے نہیں ہو انشاء اللہ تمہارا وہ درود آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا —— لوگوں نے عرض کیا تو آپ ہمیں بتا دیجئے اور سکھا دیجئے کہ ہم کس طرح درود بھیجا کریں —— آپ نے فرمایا یوں عرض کیا کرو "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِکَ وَرَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ .... الی قولہ ...... اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ"

(اے اللہ اپنی خاص عنایات اور رحمتیں اور برکتیں نازل فرما سید المرسلین، امام المتقین، خاتم النبیین حضرت محمد پر جو تیرے خاص بندے اور رسول ہیں نیکی اور بھلائی کے راستہ کے امام اور راہنما ہیں، رحمت والے پیغمبر ہیں (یعنی جن کا وجود ساری دنیا کے لیے باعث رحمت ہے) —— اے اللہ ان کو اس "مقام محمود" پر فائز فرما جو اولین وآخرین کے لیے قابلِ رشک ہو —— اے اللہ حضرت محمد اور آلِ محمد پر اپنی خاص نوازشیں اور عنایتیں فرما جس طرح کہ تو نے حضرت ابراہیم و آل ابراہیم پر نوازشیں اور عنایتیں فرمائیں، اور حضرت محمد و آلِ محمد پر اپنی خاص برکتیں نازل فرما جس طرح تو نے حضرت ابراہیم و آلِ ابراہیم پر برکتیں نازل فرمائیں، تیری ذات ہر حمد و ستائش کی سزاوار ہے اور عظمت و کبریائی تیری ذاتی صفت ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) درود شریف کے یہ کلمات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے

لوگوں کو تعلیم فرمائے تھے، بلاشبہ بڑے مبارک اور مقبول کلمات ہیں اور اس میں وہ درود ابراہیمی بھی لفظ بہ لفظ شامل ہے جو کعب بن عجرہ کی اس روایت میں گزر چکا ہے جو صحیحین کے حوالہ سے سب سے پہلے درج کی جاچکی ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ فِي الصَّلٰوةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـــــ "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ـــــ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ رَبِّيْ وَسَعْدَيْكَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ الْبَرِّ الرَّحِيْمِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَمَا سَبَّحَ لَكَ مِنْ شَيْءٍ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ عَلٰى مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَسَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ وَرَسُوْلِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الشَّاهِدِ الْبَشِيْرِ الدَّاعِيْ اِلَيْكَ بِاِذْنِكَ السِّرَاجِ الْمُنِيْرِ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ۔

ـــــ اورده القاضی عیاض فی کتاب الشفا

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح درود بھیجتے تھے ـــــ (پہلے سورۂ احزاب کی یہ آیت تلاوت فرماتے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے) ـــــ "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ـــــ اس کے بعد کہتے لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ رَبِّيْ وَسَعْدَيْكَ۔ اے میرے اللہ میں تیرے اس فرمان کی بسر وچشم تعمیل کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں

"صَلَوَاتُ اللّٰهِ الْبَرِّ الرَّحِيْمِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ... الخ"

اُس خداوند تعالیٰ کی طرف سے جو بڑا احسان فرمانے والا اور نہایت مہربان ہے

خاص نوازشیں اور عنایتیں ہوں، اور اس کے ملائکۂ مقربین اور انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کی اور اس ساری مخلوقات کی جو اللہ کی تسبیح و حمد کرتی ہے بہترین دُعائیں اور نیک تمنائیں ہوں حضرت محمد بن عبداللہ کے لیے جو خاتم النبیین، سید المرسلین، امام المتقین اور رسولِ رب العالمین ہیں، جو اللہ کی طرف سے شہادت ادا کرنے والے ہیں، اللہ کے فرمانبردار بندوں کو رحمت و جنت کی بشارت سنانے والے اور مجرموں نافرمانوں کو برے انجام سے اور اللہ کے عذاب سے آگاہی دینے والے ہیں، جو تیرے بندوں کو تیرے حکم سے تیری طرف دعوت دیتے ہیں اور تیرے ہی روشن کیے ہوئے چراغ ہیں، اور ان پر سلام ہو۔ (شفاء قاضی عیاض)

تشریح) یہ درود پاک جیسا کہ ظاہر ہے الفاظ و مطالب کے لحاظ سے نہایت بلند اور ایمان افروز ہے۔ لیکن حدیث کی کسی کتاب میں اس کی روایت نظر سے نہیں گزری۔ البتہ پانچویں اور چھٹی صدی کے عالم اور محدث قاضی عیاض نے اپنی کتاب "الشفا بحقوق المصطفیٰ" میں اس کو حضرت علی مرتضیٰ سے نقل کیا ہے[۱]۔ اور علامہ قسطلانی نے "مواہب لدنیہ" میں شیخ زین الدین بن الحسین مراغی کی کتاب "تحقیق النصرۃ فی دار الہجرۃ" کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آپ پر یہی درود پاک پڑھا تھا اور لوگوں کے دریافت کرنے پر ان کو بھی تعلیم فرمایا تھا[۲]۔ بہرحال الفاظ و مطالب کے لحاظ سے بڑا پیارا اور روح پرور یہ درود ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے درود و سلام کے جو کلمات یہاں نقل کیے گئے اُن سے یہ معلوم ہوگیا کہ اُمت کے لیے یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف آپ کے تلقین فرمائے کلمات ہی کے ذریعہ درود و سلام بھیجے بلکہ ارباب

---

[۱] شرح شفاء صفحہ ۴۶۴ [۲] زرقانی شرح مواہب لدنیہ صفحہ ۳۹۱ ج ۸

ذوق و محبت کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے وہ حدودِ شریعت کے پابند رہتے ہوئے اپنے ذوق و شوق کے تقاضے کے مطابق دوسرے کلمات کے ذریعہ بھی آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیج سکتے ہیں ـــــ چنانچہ بہت سے اکابر امت، تابعین اور بعد کے علما ر عارفین سے اور بھی کلمات منقول ہیں لیکن وہ سلسلہ معارف الحدیث سے باہر ہیں اس لیے ان کو یہاں درج کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا، اگر اللہ نے توفیق دی تو ان میں سے بھی چند منتخب کلمات کو ایک مستقل مضمون میں جمع کرنے اور ان پر کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہٖ واصحابہ اجمعین۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ

اپنی وصایا اور نصائح کے آئینے میں

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

وصیت ـــــ نصیر الدین بغدادیؒ کو جبکہ انھیں خرقہ پہنایا ـــــ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ـــــ (آپ نہ ہٹائیں اپنے پاس سے اُن لوگوں کو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ بس اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں)۔

لفظ ارادت جو خاص اصطلاح کے طور پر مشائخ صوفیہ کے یہاں مستعمل ہے اس کی اصل و بنیاد یہی آیت ہے (یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ) ـــــ مُرید، مشائخ صوفیہ کے نزدیک وہ ہے جس کی ہمت، اللہ تعالیٰ سے طلبِ مزید کرتی رہے ـــ جو مزید کو برابر طلب کرتا رہے گا وہ مُرید ہے ـ جب وہ طلبِ مزید سے سُست پڑ جائے گا تو اس کو (سمتِ ترقی میں آگے بڑھنے کے بجائے) رجعت (واپسی) سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور ارادت کے باب میں اس کی ہمت زائل ہو جائے گی ـــ اکابرِ صوفیاء کے نزدیک ایسے شخص کی موت اس کی حیات سے بہتر ہوتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جب کوئی مُرید، مزید حاصل نہیں کر رہا ہے تو وہ نقصان میں ہے اور نقصان عینِ خسران

ہے ـــــ جب خسارہ دائمی طور پر کسی بندے کے شاملِ حال ہو جائے تو پھر اس کی موت اس کی حیات سے بہتر ہوتی ہے ـــــ مرید کو اپنی ارادت میں ایک شیخ کی ضرورت ہے جو صاحبِ بصیرت ہو، جو راہِ سلوک طے کرائے اور اس کو طُرقِ مواجید اور اسباب مزید بتائے، نیز صفاتِ نفس، اخلاقِ نفس اور مخفی شہواتِ نفس سے آگاہ کرے ـــــ اس لیے کہ معرفتِ نفس طریقۂ صوفیا کی جڑ اور بنیاد ہے ـــــ معرفتِ نفس کا معرفتِ رب سے گہرا تعلق ہے ـــــ جیسا کہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا" ـــــ معارف کے مراتب و منازل ہیں۔ اہلِ معرفت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ابرار دوسرے مقربین۔ ابرار کو نفس کی بعض حرکات اور شہوات کی معرفت ہوتی ہے۔ مگر مقربین کی معرفت نفس اس سے اعلیٰ ہوتی ہے ـــــ بہت سے عمل، ابرار کی نظر میں اُن کے مبلغ علم کی رُو سے عین طاعت ہوتے ہیں اور وہ مقربین کے نزدیک معصیت ہوتے ہیں کیونکہ مقربین کی نظر نفس کی حالت معلوم کرنے میں دقیق ہوتی ہے اور ان کو علم النفس میں کمال حاصل ہوتا ہے ـــــ اسی وجہ سے بزرگوں نے کہا ہے حسناتُ الابرار سیئاتُ المقربین ـــــ یعنی ابرار کے نزدیک جو (بعض) حسنات ہیں وہ مقربین کے نزدیک سیئات کا درجہ رکھتے ہیں ـــــ

درحقیقت مشائخ صوفیا میں جو اربابِ بصیرت ہیں ان کے علاوہ کسی کو مقامات و احوال کی تفصیل اور اُن آفات کی معرفت حاصل نہیں ہوتی جو فسادِ اعمال کا باعث ہیں ـــــ یہاں تک کہ وہ علما جو احکامِ شرع اور علم مسائل و فتویٰ سے تو واقف ہیں لیکن زہد فی الدنیا، تقویٰ اور علم القلوب سے بہرہ مند نہیں ہیں، وہ بھی مشائخ صوفیا کے اس بلند مقام تک نہیں پہونچ سکتے ـــــ اس لیے کہ صوفیا کا علم "میراث التقویٰ" ہے ـــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ـــــ اس آیت میں علم کو تقویٰ سے متصل کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ سے

ڈرنے والے علم والے ہی ہیں) اس آیت میں غیر متقی سے علم کی نفی ہے۔
جب کوئی شخص زہد فی الدنیا اور تقویٰ کے بغیر علم کو جمع کرے گا تو وہ فقط علم کا ایک برتن ہو گا۔ حقیقی عالم وہی ہو گا جو تقویٰ اختیار کرے گا۔ پس جب یہ بات واضح ہو گئی کہ مرید صادق، اللہ کے راستے میں چلنے کے لیے ایک ذی بصیرت شیخ کی صحبت کا محتاج ہے جو اس کو مقاماتِ قرب اور حقیقتِ عبودیت تک پہونچا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت دیتے ہیں) تو اب، شیخ کامل کا متابعتِ رسول کی بنا پر باذن اللہ، داعی الی اللہ ہونا بھی ثابت ہو گیا۔۔۔۔
اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تعلیم کے لیے اور اپنے خاص بندوں کی تدریجی ترقی کو ظاہر کرنے کے لیے فرماتا ہے "وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا"۔۔۔ (وہ جو کہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور ہماری ذریات واولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے اور ہم کو تقویٰ شعار لوگوں کا امام بنا دے) اس آیت سے پتہ چلا کہ ایک گروہ ایسا ہوتا ہے جو قدوۃ المتقین کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ہر وقت اور ہر زمانے میں ہر علاقے میں ایسے افراد ہوتے ہیں اگرچہ وہ عدد میں قلیل ہوں۔ چونکہ یہ حضرات ایک بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں لہٰذا ان کی اقتدا بھی وہی مریدین صادقین کرتے ہیں جو طریقِ حق کے سالک ہوتے ہیں اور وہی ان سے علم الوراثت اس طرح حاصل کرتے ہیں جس طرح علمارلسان، علم دراست حاصل کرتے ہیں۔
۔۔۔۔۔ مرید (مجازی طور پر) ولد ہوتا ہے اور شیخ بمنزلہ والد ہوتا ہے۔ اسلئے کہ ولادت دو قسم کی ہے ایک ولادتِ طبیعیہ اور دوسری ولادتِ حقیقیہ۔۔۔۔ پس ولادتِ طبیعیہ۔ رسوم ملک اور رسوم عالم شہادت وحکمت کی اقامت کے لیے واقع ہوتی ہے اور ولادتِ معنویہ اجزاء ملکوت اور عالم الغیب والقدرۃ کے مطالعے

کے لیے ہوتی ہے۔ سرکار رسالت مآب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُمت کے معنوی والد ہیں اور شیخ حُسنِ متابعتِ رسول کی وجہ سے مریدین کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ جس طرح ولادتِ طبیعیہ میں بچے کے دودھ پینے کا ایک زمانہ اور دودھ چھوٹنے کا ایک وقت ہوتا ہے اسی طرح ولادتِ معنویہ میں ہے۔ پس مرید ملازمت شیخ اور اس کی دوام صحبت کا اس وقت تک محتاج رہتا ہے جب تک استفادہ کرنے کی قوت پیدا ہو اور اس کے لفظ اور اشارہ چشم سے نفع حاصل کرنے لگے۔ اور شیخ کے اشارۂ چشم سے نفع حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ شیخ کو اور اس کے اعمال کو دیکھے کہ وہ کس طرح خلوت اور جلوت میں مع الحق اور مع الخلق رہتا ہے۔ شیخ کے اخلاق و آداب کو دیکھ کر یہ سب باتیں سیکھے اور اس طور طریقے کا پابند رہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کمالِ صدق و محبت کی بنا پر جب یہ شیخ کی طرف نظرِ محبت سے دیکھے اور شیخ بھی اس کی طرف نظرِ محبت سے دیکھے تو شیخ کی نگاہ سے اس کے باطن میں نور اور برکت پیدا ہونے لگے۔ اس طرح اس کے باطن میں خیر جاگزیں ہو جائے جس طرح سیپی کے اندر موتی متمکن ہوتا ہے...... بعض سانپوں میں یہ تاثیر ہے کہ وہ جب کسی انسان پر نظر ڈالیں یا کوئی انسان ان کی طرف دیکھ لے، تو انسان ہلاک ہو جائے۔ پھر کیا بعید ہے کہ بعض بندوں میں (منجانب اللہ) دلوں کے زندہ کرنے کی قوت پیدا ہو جائے۔

جب مُریدِ صادق، شیخ کی خدمت میں رہے تو اس کا ادب یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے نکل جائے اور حتی الامکان) ماکولات و ملبوسات اور تمام معاملات میں شیخ کا تابع ہو۔ بالکل اس طرح جس طرح بچہ اپنے والد کا تابع ہوتا ہے...... مرید کے لیے حق تک پہنچنے کا راستہ سوائے شیخ کے ذریعہ کے اور کوئی نہیں۔ پس شیخ ابوابِ حق میں سے ایک کھلا ہوا دروازہ ہے۔ اس کی طرف رجوع کر کے اپنے اختیار و ارادہ سے دست بردار ہو جائے...... مُرید، شیخ سے ناقص حالت میں جُدا ہو گا تو اس صورت میں ایسی آفات کا اندیشہ ہے جو امراضِ قلبیہ تک پہونچانے

والی ہوں اور مزاج توبہ و استقامت کو ختم کرنے والی ہوں، بوجہ انحراف کے ــــــ ایسے شخص کا زہد کے بعد دنیا کی طرف اور عبادت سے عادت کی طرف رجوع ہونا بہت جلد ہوتا ہے اور یہ مرض اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شیخ سے قبل از وقت جدا ہو گیا، جس طرح دودھ پینے والے بچے کا جب اپنے وقت سے پہلے دودھ چھوٹ جاتا ہے تو اسے (بعض اوقات) کوئی نہ کوئی مرض لاحق ہو جاتا ہے ــــــ یہ دوام ملازمت وصحبت اُن مریدین کے لیے ضروری ہے جو صادقین ہیں نہ کہ ان کے لیے جو شیخ کے صورتِ محب ہیں اور اس سے تھوڑی سی برکت حاصل کرنے والے اور اس کی صحبت سے ادنیٰ درجہ پر قناعت کرنے والے ہیں ــــ اُن کا مرید نام پڑ جانا محض رسمی ہے حقیقی نہیں ــــ .... پس مریدِ حقیقی کو شیخ، خرقۂ ارادت اس وقت پہناتا ہے جب پہلے اس کے باطن کو ارادے اور اختیار سے انخلاع کا خرقہ پہنا دیتا ہے اور وہ مرید جو محبین میں سے ہے اس کو شیخ، فقط خرقۂ تبرک پہناتا ہے اور خرقۂ تبرک میں دوام صحبت اور ملازمت شرط نہیں ہے، اس کے پہننے سے مریدین بس شیخ سے (تھوڑی) مشابہت حاصل کر لیتے ہیں اور شیخ کے ساتھ رابطۂ صحبت (ڈال کر کچھ) محفوظ ہو جاتا ہے، اور بقدر صحبت، برکت و خیر حاصل کر لیتے ہیں، پس خرقۂ تبرک، تو ہر اس محب کو دیا جا سکتا ہے جو اچھا گمان رکھتا ہو اور اس خرقے کو طلب کرے ــــ مگر خرقۂ ارادت اس شخص کو ہی پہنایا جاتا ہے جو مستقل جد و جہد کرے اور طریقے میں اس طرح داخل ہو کہ اپنی خواہشات ترک کر دے، عبادت تقویٰ اختیار کر کے اپنے ارادے سے نکل جائے ... امرِ حق کی رعایت مدِ نظر رکھے، اپنی نظر کو مخلوق سے ہٹا لے .... مخلوق کی اقتدا نہ کرے، نہ اُن کے استحسان اور پسندیدگی کی نہ ان کے استقباح اور ناپسندیدگی کی ــ اس کے نزدیک قبیح و ناپسندیدہ وہ ہو جس کو شریعت نے قبیح قرار دیا ہے اور حَسن و پسندیدہ وہ ہو جس کو شریعت نے حَسن بنایا ہے ــــــ وہ ہر تکلف سے بری ہو ــــــ

(باقی)

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ

تیرھویں (۱۳) مجلس

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

۴ر ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۳ر جنوری ۱۹۶۹ء پنجشنبہ ۹½ بجے صبح

خاص حاضرین مجلس: مولوی حسن خاں میواتی، سید ظہیر الحسن صاحب (نبیرۂ نواب سید نور الحسن خاں خلف الرشید نواب سید صدیق حسن خاں بہادر)، مولوی فراہیم صاحب تحصیلدار، مولوی نثار الحق ندوی۔

ہم لوگ جب پہونچے تو مکتوبات امام ربانی کا مکتوب ۵۴ جو حدوث و فنائے عالم کے بارے میں مولانا حمید احمدی کے نام تحریر کیا گیا ہے، پڑھا جا رہا تھا، پہلے حضرت نے اس کا فارسی متن پڑھ کر سنایا، پھر حافظ منظور صاحب نے اس کا اردو ترجمہ پڑھا۔

حضرت نے سامنے سے ایک مجلد کتاب اٹھائی، اور سید ظہیر الحسن صاحب کی طرف اس کو بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "نماز پڑھنے کا مزہ تو اس کو پڑھنے کے بعد آئے گا، ہم کو معلوم ہی نہیں کہ نماز کیا ہے"۔ ظہیر الحسن صاحب نے کتاب کھول کر دیکھی تو وہ "الارکان الاربعۃ" تھی۔ راقم سطور ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، اس کی بھی نظر پڑی، فرمایا کہ "قرآن شریف کا

عطر ہے اس کو روز گھوٹتا رہے، کپڑا بننا، گلو بند بننا وغیرہ ایک مدت میں آتا ہے، دین کو یہ سمجھ رکھا ہے کہ ادھر گھی کھایا، ادھر آئینہ میں منہ دیکھنے لگے، دین کا کام بھی ایک مدت میں آتا ہے، جس طرح دنیا کے کاموں کو ہم مدتوں میں سیکھتے ہیں، راقم سطور نے عرض کیا کہ حضرت دُعا فرمائیں کہ اس کے لکھنے والے کو بھی نماز پڑھنی آجائے۔ حضرت نے اس پر پُراز شفقت کلمات فرمائے اور دُعا دی۔

فرمایا عبادتوں میں چورن ملا ہوا ہے، کھاتے جاؤ بھوک لگتی جاتی ہے، اسی کا نام عبادت ہے۔ جس سے طبیعت سیر ہوئی اس کا نام عادت ہے۔ دُنیا کی ہر چیز کے کھانے کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی ہے مگر عبادت سے طبیعت سیر نہیں ہوتی، عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے، میری بچی[۱] کی شادی ہوئی سب بھائیوں نے اس کو تحفے دیئے، میں نے اس کو ایک نصیحت نامہ لکھ کر دیا، یہی میرا تحفہ تھا، اس کا خاص مضمون یہی تھا کہ عادات کو عبادات بنانے کی کوشش کرو، عبادات کو عادت نہ بنالو۔ اس وقت ہماری اکثر عبادات عادت بن گئی ہیں۔ جو عادۃً اور بغیر کسی شعور و استحضار کے ادا ہوتی ہیں۔ کسی کو کلب جانے کی عادت ہے، کسی کو مسجد جانے کی، عبادت کی عظمت اور اس کی فضیلت کا استحضار نہیں ہوتا، اجر و ثواب کے خیال اور آخرت کے منافع پر نظر کر کے کسی کام کو انجام دینے کا نام عبادت ہے، یہی ترغیب و منافع ہیں جن کی وجہ سے آدمی سردی کی رات میں جب وہ میٹھی نیند سو رہا ہوتا ہے، لحاف سے نکل کر نماز پڑھنے کے لیے اُٹھتا ہے، ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا ہے، مسجد جاتا ہے، اور یہی دُنیاوی منافع کی خاطر کرتا ہے، ڈاکیہ کی آواز پر، کوئی عزیز سفر حج سے واپس آئے ہیں اُن کے استقبال و ملاقات کے لیے آرام چھوڑ کر، اور تکلیف اٹھا کر جاتا ہے۔ مجھے تہجد کے لیے اُن چیزوں سے کام لینے سے ہمیشہ اختلاف رہا، جو بیداری کے لیے معاون اور نیند دور کرنے والی ہیں، اس کے لیے تو "هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِيَه

---

[۱] اہلیہ ڈاکٹر سید رفیع الدین صاحب قادری صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، ناگپور یونیورسٹی۔

هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهٗ" کی وہ صدا ہی کافی ہے جو رات کے آخری حصہ (ثلث اللیل الآخیر) میں لگتی ہے[۱]۔ اس صدا کے بعد پھر کسی اور تدبیر یا انتظام کی ضرورت نہیں۔

فرمایا کہ بمبئی کے ایک تاجر ایک مرتبہ کہیں جاتے ہوئے بھوپال اُتر گئے، اس دن میرے سر میں درد تھا، میں دوپہر کو یہ کہہ کر سو گیا کہ مجھے جگانا نہیں، وہ سیٹھ صاحب آئے مجھے دریافت کیا اور کہا کہ مجھے جلد جانا ہے، لوگوں نے مجھے جگا دیا، سرگرانی تو بہت ہوئی لیکن اس خیال سے کہ اللہ کی مخلوق سے فائدہ ہوتا ہے، کوئی آتا ہے تو میں پڑا دل بھر لیتا ہوں، اُنھوں نے حضرت تاج الدین بابا[۲] کا ذکر شروع کیا[۳] کہ ایسے بزرگ تھے ایسے سیف زبان تھے، جس سے جو کہہ دیا، ہو گیا، جس کو سخت سست کہا یا پتھر اُٹھا کر مارا اس کا کام بن گیا، میں خاموش سنتا رہا، جب وہ اچھی طرح بیان کر چکے تو میں نے کہا کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ تاج الدین بابا روزانہ رات کے آخری پہر میں میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے ہیں، لیکن بدقسمت بھی پرلے درجہ کا ہوں کہ وہی وقت میرے گہری نیند سونے کا ہوتا ہے، وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، مجھے خبر نہیں ہوتی، سیٹھ صاحب میری یہ بات سن کر بہت چونکے، اور کہنے لگے کہ اُن کا تو مدت ہوئی وصال ہو گیا، وہ اب کہاں تشریف لاتے ہیں؟ اور اتنا کامل بزرگ کسی کے یہاں آئے تو وہ کیسے سو سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ میرا تو یہی قصہ ہے کہ تاج الدین بابا تشریف لاتے ہیں اور میں سوتا رہتا ہوں، جب اُن کی حیرت کی انتہا ہو گئی تو میں نے کہا کہ آپ تاج الدین بابا کے جو

---

[۱] صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے یہ حدیث مروی ہے کہ جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوتی ہے کون ہے جو مجھ سے دعا کرے میں قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اس کو دوں، کون ہے جو مغفرت طلب کرے، میں اس کی مغفرت کا فیصلہ کروں۔

[۲] ناگپور کے ایک مجذوب بزرگ تھے، پہلے انگریزی فوج میں تھے، پھر ترک و تجرید اختیار کر لی، صاحب جذب و حال تھے۔ وفات کو غالباً پچاس برس ہوئے ہوں گے۔

[۳] اُمراء اور اغنیاء کا عام حال یہی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس جاتے ہیں تو بجائے اس سے استفادہ کرنے اور اس کی بات بغور سننے کے، دوسرے بزرگوں کی بزرگی کا حال اور ان کے کرامات و خوارق بیان کرنے لگتے ہیں۔

صفات بیان کررہے ہیں کہ زبان سے کچھ نکلا اور ادھر ہوگیا، جس کی طرف اشارہ کردیا اس کا کام بن گیا، یہ تو دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے،

"اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ"

اُس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو کہہ دیتا ہے کہ ہوجا، تو وہ صرف اس کے حکم سے موجود ہوجاتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے، اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کے جانا ہے۔

اور جس کی یہ شان ہے وہ میرے گھر روز مخبر صادق (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطلاع کے مطابق نزولِ اجلال فرماتا ہے، لیکن وہی وقت میرے خواب نوشیں کا ہوتا ہے، اس لیے مجھ سے بڑھ کر خوش قسمت اور بدقسمت کون ہوسکتا ہے کہ اس کی طرف سے بذل و عطا کا اعلان ہوتا ہے اور رحمت کا صلائے عام دیا جاتا ہے اور میں گہری نیند سوتا ہوں[1] اگر ایسی بڑی ہستی کسی کے یہاں آنے والی ہو تو آدمی سو برس تک اس کے انتظار میں کھڑا رہ سکتا ہے، عرفیؔ نے کچھ غلط نہیں کہا ہے، ع

عرفی اگر بگریہ میسّر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

لیکن اس غیبی آواز کو سننے کے لیے خاص حاسّہ اور خاص کان درکار ہیں، جس طرح ایک ملک کی آواز دوسرے ملک میں سننے کے لیے ایک مخصوص صندوقچہ (ریڈیو سٹ)

---

[1] یہ واقعہ حضرت نے اس تفصیل کے ساتھ سالہا سال پہلے میری ابتدائی حاضری کے موقعہ پر سنایا تھا، میری خواہش تھی کہ حضرت اس کا اعادہ فرمادیں، تاکہ اس مجلس کے ملفوظات میں میں اس کو قلم بند کرلوں، آج یہ تمنا پوری ہوئی۔ حضرت نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تاج الدین بابا کا وہ قصہ جو میں نے آپ کو سنایا تھا، پھر اس کو اختصار کے ساتھ بیان کیا میں نے اپنے حافظہ پر زور ڈال کر یہاں وہ قصہ اسی تفصیل کے ساتھ نقل کردیا، جو میں تقریباً بیس ۲۰ پچیس ۲۵ سال پہلے حضرت کی زبان سے سن چکا ہوں اور کئی موقعوں پر اس کو نقل کرچکا ہوں۔

کی ضرورت ہے، جس کے پاس وہ صندوقچہ ہے اور وہ اس کے استعمال کا طریقہ جانتا ہے، وہ بھوپال میں بیٹھا ہوا کراچی کی آواز سنتا ہے، اور جو اس سے محروم ہے وہ اس سے بے بہرہ رہتا ہے، ایسے ہی یہ آواز ہر شخص نہیں سنتا۔ قبر والے بھی پکار رہے ہیں" يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِيْنَ" (ہائے ہماری بدقسمتی، ہم اس سے غافل رہے، ہم ہی قصوروار ہیں)

سورۂ یٰسٓ میں خدا کے تین پیغام پہونچانے والوں کا جو ذکر ہے اس کو پڑھیئے۔

" وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ" الخ اس قصہ میں بھی آتا ہے، کہ جب اس تیسرے خدا کے بندے کو بھی شہید کردیا، اور اللہ نے اس کو اپنے انعامات سے سرفراز فرمایا، تو اس کا قول بھی منقول ہے " قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ" مگر یہ آواز وہی سنتے ہیں جن کا حاسہ بیدار ہوتا ہے اور کان کھلے ہوتے ہیں۔

ان آیات کے مطالب کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض اوقات مصیبت فرحت کا مقدمہ بن کر آتی ہے، اسی واقعہ میں ہے کہ نبی آئے تو قوم پر قحط ہوگیا۔ " قَالُوْا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ" تمھارا آنا ہمارے لیے بدشگونی کا باعث ہوا، انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے اعمال سب سے بڑھ کر بدشگونی کا باعث ہیں،" قَالُوْا طَائِرُكُمْ مَعَكُمْ" میں نے حیدرآباد کے طاعون، انفلوئنزا اور موسیٰ ندی کے سیلاب کے متعلق یہی کہا تھا کہ یہ حالات، اور مصائب چونکانے اور آنکھ کھولنے کے لیے آئے ہیں، میں نے اسی وقت کہا تھا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے، لوگ کہتے تھے کہ یہ رحمت کیسے ہوسکتی ہے، میں نے کہا تھا کہ جب غضب آتا ہے تو رحمت لے کر آتا ہے، لیکن اگر ان سے سبق نہ لیا گیا تو پھر خیر نہیں، چنانچہ یہی ہوا، کہ میں تو چلا آیا، لیکن مدت کے بعد پھر وہاں وہ انقلاب آیا کہ دنیا ہی بدل گئی۔

عرضیاں جارہی ہیں کہ غضب بھیجئے اور وہ فرماتے ہیں نامنظور! لوگوں کے حالات ایسے ہوچکے ہیں کہ غضب آئے لیکن اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں جن کی وجہ سے غضب نہیں آرہا ہے، انفلوئنزا آیا، ندی آئی، اس کے بعد اللہ نے ڈھکیل کر پہونچا دیا،

ے کاش میری قوم والوں کو کسی طرح معلوم ہوجاتا کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور میرا اکرام و اعزاز فرمایا گیا۔

اللہ کے بندے غور و فکر نہیں کرتے۔

فرمایا کہ روح کا اپنے تعلق والوں سے بڑا تعلق رہتا ہے، یہ بات بہت دلیلوں سے ثابت ہے، "قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ" سے بھی ظاہر ہوتا ہے، اب وہ قرآن مجید کے صندوقچہ سے ظاہر ہو رہا ہے، یہ سب آوازیں قبرستانوں سے آتی ہیں، آنکھیں بند کر لینے کی حالت میں (مراقبہ میں) تخیلی آواز آتی ہے لیکن قرآن مجید کے ذریعہ مستند اور ناقابلِ انکار طریقہ پر آوازیں آتی ہیں اور حقائق کا علم ہوتا ہے کیسے کیسے سند یافتہ، ترقی یافتہ، اور معزز لوگ ان قبروں میں پڑے ہوئے ہیں، مولانا جامیؒ نے خوب فرمایا ہے، ؎

بر سر قبر یکے رفتم و گفتم چونی
گفت احوال چہ پرسی چو تو آئی دانی
مگر از ذائقۃ الموت خبر نیست ترا
تو کہ بے ہوش دریں عالم سرگردانی

اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو

قرآن کی نوید فتح

(الفرقان کے پچھلے شمارہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیر طبع کتاب "ما قبل النکبۃ وما بعدھا" کے جس آخری مضمون "الفتح للعرب المسلمین" کا ذکر آیا تھا اس کا اردو ترجمہ پیش ہے یہ مضمون ایسے دینی و تاریخی حقائق پر مشتمل ہے، جو غالباً اس وضاحت و قوت کے ساتھ اس سے پہلے جدید طبقہ کے سامنے نہیں آئے۔ ترجمہ حسب سابق سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کا ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بین الاقوامی یہودیت کو اپنے بہت سے مقاصد میں توقع سے بھی زائد کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ اور اس کے بہت سے وہ منصوبے بروئے کار آگئے ہیں جن کا خواب وہ ہزاروں سال سے دیکھ رہی تھی۔ بہت سی وہ باتیں جو پہلے خواب خیال اور جنون و پریشان دماغی کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں اس آسانی کے ساتھ واقعہ بن چکی ہیں کہ نہ صرف عرب بلکہ یہودی بھی کچھ عرصہ پیشتر اس کا تصور کرنے سے قاصر تھے۔

پہلے اسرائیل کی ریاست عالم عربی کے قالب و جگر اور اس کے بہترین و مقدس مقامات کے عین وسط میں قائم ہوئی اور عربوں اور مسلمانوں کے سینہ پر کابوس بن کر مسلط ہو گئی، اس کے بعد یہودیوں کے بین الاقوامی اثر و رسوخ کی بدولت اس نے اپنے وجود کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ دن بدن طاقت پکڑتی گئی اور بالآخر عالم عربی کی سب سے بڑی فوجی طاقت[۱] پر غالب آئی اور اس کی

۱۔ مصر

ہوائی قوت کو ختم کر دینے میں کامیاب ہوگئی۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوئی کہ اس نے ۵ رجون کی جنگ میں چند گھنٹوں کے اندر عربوں کی قوت ارادی اور قوت مدافعت کو سخت نقصان پہونچایا، بیت المقدس، نہر اردن کے مغربی کنارے اور جزیرہ نمائے سینا پر مکمل قبضہ کر لیا، سوئز اور مصر کے ساحلی شہر ہر وقت اسرائیلی حملہ کی زد میں رہنے لگے، شام میں اس نے اندر تک پیش رفت کی اور بہت سے فوجی اہمیت کے مقامات اور پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا، اس نے بعض عرب ممالک کے ہوائی اڈوں کو بڑی جسارت کے ساتھ نشانہ بنایا اور اب وہ پورے عالم عربی پر قبضہ جمانے اور حجاز کے مقدس مقامات تک پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

اسرائیل کے بعض لیڈروں نے کھل کر یہ بات کہی ہے کہ اسلام کے دور اول میں جن یہودی نوآبادیوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا وہ اس پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر بہت سے یہودی یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ان کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننا ہے جس کا حکم دنیا کے تمام ممالک، سرمایہ، حکومت اور دولت پر چلے گا۔ اور اس طرح وہ خواب پورا ہو جائے گا جس کا ذکر یہودیوں کی مقدس کتاب تلمود میں اور حکماء صیہون کے مشہور پروٹوکولز میں ملتا ہے۔[1]

اب ہمیں اس پر غور و فکر کرنا ہے کہ کیا یہ صورت حال واقعی مستقل اور پائدار صورت اختیار کرے گی اور صیہونیت کے باقی ماندہ منصوبے بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں گے، کیا عرب اور مسلمان ان حوصلہ مند یہودیوں کے رحم و کرم پر رہنے کے لیے مجبور ہوں گے، کیا ان کی رسی اتنی دراز کر دی جائے گی اور ان کو اس طرح پے در پے کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں گی کہ بالآخر ساری دنیا پر ان کا تسلط قائم ہو جائے گا، ان کے تمام منصوبے اور مقاصد پورے ہو جائیں گے، اور ان کا فلسفہ حیات اور ان کا نظریات ساری دنیا میں پھیل جائیں گے، کیا انسانیت کی زمام قیادت ان کے حوالہ کر دی جائے گی، اور وہ اس طرح اس کی رہنمائی د

---

[1] ملاحظہ ہو بروتوکولات حکمائے صیہون ؛

قیادت کرنے لگیں گے جس طرح تاریخ کے بہت سے دوسرے مذاہب، تہذیبوں اور دعوتوں نے اپنے اپنے وقت پر کی تھی۔

ہم اس وقت تک اس سوال کا فیصلہ کن اور قطعی جواب نہیں دے سکتے جب تک کہ ہم اس عجیب و غریب اور بیکراں کائنات پر ایک نظر نہ ڈال لیں، اس کے خالق و پروردگار کے اسماء وصفات، افعال و ارادوں اور اس کے قوانین فطرت و اصول قدرت کا مطالعہ نہ کرلیں، اور انسانی تاریخ کے تجربوں اور اہم واقعات کو اپنی نظر کے سامنے نہ رکھیں۔

ہم اس سوال کا اطمینان بخش جواب اسی وقت دے سکتے ہیں جب نسل انسانی کی صلاحیت، انسانی خمیر میں خیر و شر کی آمیزش، بنی نوع انسان کا مستقبل اور اس کائنات کی تقدیر اور قوانین فطرت ہماری نظر کے سامنے ہوں اور ہمارے ذہن میں ان کا واضح اور معین تصور موجود ہو۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خالق کائنات نے اس کائنات اور اس سیارہ کو جس پر ہم رہتے ہیں صرف فساد و تخریب، خوں ریزی اور دہشت پسندی، ظلم و سنگدلی، حیوانیت و بربریت سازشوں اور مکر و فریب کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس نے اس دنیا کے لیے یہ سارا اہتمام و انتظام (جو اس کے ہر شعبہ کے حسن و جمال، ترتیب و توازن اور اعجاز سے ظاہر ہے اور جس میں انبیاء کی بعثت، کتب سماویہ کا نزول، وحی والہام، صالحین و صادقین کی نصرت، خیر پر شر اور فساد پر صلاح و فلاح کا غلبہ سب چیزیں شامل ہیں) صرف اس لئے کیا ہے کہ اس پر ایک ایسے عنصر کا تسلط ہو جائے جو کسی زمانہ میں انبیاء کی طرف منسوب سمجھا جاتا تھا اور جس کی رگوں میں ان کے خون کے چند ایسے ذرے شامل ہیں جن کو آج خوردبین سے دیکھنا بھی مشکل ہے اور جنکی حقیقت تک رسائی ریاضی کی مدد سے بھی ناممکن ہے، اس نے اس کائنات کا پورا انتظام اس لئے قائم کیا ہے کہ ایک نسل جو اپنے کو (خدا کی لپندیدہ و برگزیدہ قوم) کہتی ہے اور اپنے کو مقدس الٰہی خاندان کے افراد سمجھتی ہے ساری طاقتوں سارے ذخائر اور دولتوں پر قابض ہو جائے۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ یہ خاندان وہ واحد انسانی نسل ہے

جس کو اللہ نے ہر قسم کی صلاحیتوں اور طاقتوں سے نالا مال کر دیا ہے اور ہر قسم کی ذہانت، اعلیٰ دماغی اور ہر قسم کا کمال صرف اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ باقی تمام نسلیں جن سے دنیا آباد اور بزم عالم قائم ہے وہ آٹے کے چوکر کی طرح حقیر و بے قیمت ہیں اور ہر طرح کی اہلیت و صلاحیت، ایجاد و اختراع کی قوت اور مختصر یہ کہ تمام عطیات خداوندی سے یکسر محروم ہیں تو ہمیں یہ بات یقیناً تسلیم کر لینا چاہیئے کہ صرف اسی نسل کو بنی نوع انسان پر حکمرانی کا حق حاصل ہے اور دوسری تمام نسلیں و اقوام صرف اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ان کو جانوروں کے ریوڑ اور بھیڑوں کے گلہ کی طرح ہانکا جاتا رہے۔ اس ناز پروردہ اور محبوب اولاد اور ان "وہبی و پیدائشی خوش نصیبوں" کے سوا جتنے لوگ بھی ہیں وہ شطرنج کے ان مہروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جن کو یہ معزز اور ذہین یہودی بڑی قدرت و مہارت کے ساتھ ایک دوسرے سے لڑاتے اور ان سے کھیلتے رہتے ہیں، خود ان کو اپنے مستقبل کی تعمیر اور زندگی کی تشکیل میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ انسانی فطرت اصلاً بد ہے، اور تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کو اور اصلاح کے مقابلہ میں فساد کو پسند کرتی ہے، ہر چیز کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ساری دنیا سے بیزار اور برسرپیکار ہے، ماضی و حال دونوں سے برگشتہ ہے۔ وہ ہر وقت بغاوت اور انتقام، نفرت اور کینہ کی آگ میں جلتی رہتی ہے، اور اپنے سینہ میں ہر قسم کی قدیم و جدید عداوتوں کا ذخیرہ رکھتی ہے اور ہر صنعت و تعمیر اور ہر تہذیبی ورثہ اور تمدنی دولت کے صرف کمزور پہلو دیکھنے کی عادی ہے۔ اپنے سوا سب کو حقیر سمجھتی ہے، وہ احساس کمتری کا شکار ہے اور اس کی نگاہ میں انسان کی عزت و شرافت

لہ اسی بات کو قرآن مجید نے ان کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے۔ نحن ابناء اللہ واحباؤہ (سورہ مائدہ ۱۸) بائبل عہد عتیق اور تلمود کے صفحات ان دعووں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں جگہ جگہ یہودیوں کے امتیاز و نسلی برتری کا ذکر ہے۔ یہ مختصر مضمون اس کی تفصیلات کا متحمل نہیں۔

کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مادہ پرستی کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہیں اور سفلی جذبات کی تسکین و تکمیل کے سوا اس کا کوئی مشرب و مسلک نہیں وہ فتح کے وقت ظلم و بربریت کی آخری حد پر ہوتی ہے، اور ہزیمت کے بعد بزدلی کے آخری کنارے پر، وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز وسائل کو استعمال کرنا ضروری سمجھتی ہے، اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے اس کو ذلیل سے ذلیل عمل، بڑے سے بڑے ظلم، پست سے پست اخلاق اور آخری درجہ کے نفاق سے بھی کوئی عار نہیں ہوتا۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کرلیں کہ تاریخ سازی، تہذیب و تمدن کی تشکیل، انسانیت کی فلاح اور اقوام عالم کی سیاست و تدبر کا واحد تعمیری اور حقیقی محرک اور طاقتور و مؤثر عنصر صرف مکر و فریب، جرائم پسندی، تخریبی ذہانت ہے اور تہذیب و تمدن کا یہ درخت صرف فساد فی الارض، ضمیر اور خاندانی نظام کے خاتمہ، بے حیائی و بے قید زندگی کی تبلیغ و اشاعت اور بغاوتوں اور سازشوں کے ذریعہ برگ و بار لاسکتا ہے ——— اور وہ واحد ذریعہ اور وسیلہ جو اقوام کی تقدیر کو ڈھالتا ہے اور دنیا کے تمام انقلابات میں کارفرما نظر آتا ہے، اور تاریخ کا رُخ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دراصل وہ خفیہ ہاتھ ہے جو سازش کا جال پھیلاتا ہے، اور وہ سب سے بڑی طاقت جس پر اعتماد ممکن ہے بدعہدی، دھوکہ بازی، محسن کشی اور اعلیٰ درجہ کی رذالت اور کردار کی پستی و گندگی ہے۔ اور خدا کو سب سے زیادہ پسندیدہ شئی جو فتح و کامرانی کی شرط اور انسانیت کی فلاح و خوشحالی کی بنیاد ہے وہ تکبر اور خود غرضی ہے[1]۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ انسانیت کا چہرہ ہمیشہ سے سیاہ اور داغدار ہے اور امن و سکون، انسانی اخوت، ہمدردی و انسانیت اس کی تقدیر میں نہیں بلکہ اس کی قسمت میں

---

[1] قرآن مجید نے ان یہودیوں کے لیے "مغضوب علیہم" کا لفظ دراصل اسی لئے استعمال کیا ہے یہ وصف سورۂ فاتحہ میں ہے جو بار بار پڑھی جاتی ہے اس بلیغ جملے کا صحیح ذوق وہی لے سکتا ہے اور یہودیوں پر اس کے ٹھیک ٹھیک انطباق کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جو یہودیوں کے قومی خصائص اور اس کردار سے واقف ہے جو انھوں نے انسانیت کی تاریخ میں ادا کیا ہے۔

صرف یہ لکھا ہے کہ ایک جنگ سے دوسری جنگ، ایک المیہ سے دوسرا المیہ، ایک بدنصیبی سے دوسری بدنصیبی اور ایک بغاوت سے دوسری بغاوت کے درمیان ہچکولے کھاتی رہے یہاں تک کہ اس جہنم میں جا پڑے جو غیظ و غضب، کینہ و حسد اغراض و ہوس اور نفرت و عداوت کی ایندھن سے بھڑک رہا ہے۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ اس دنیا میں رسالت و ہدایت کا کوئی قصہ ہی سرے سے موجود نہیں" یہاں نہ عقائد و مبادی کا کوئی سوال ہے، نہ قلب و ضمیر کا کوئی مسئلہ، نہ اخلاق و فضائل کی کوئی ضرورت، نہ خدا کی پسندیدہ شریعت اور نظام زندگی کی کوئی حاجت، یہاں صرف ایک ہی حقیقت کار فرما ہے اور صرف اسی کو زندہ اور باقی رہنے کا حق ہے، اور وہ ہے نسل و خاندان کی برتری، آباؤ اجداد کا خون، پرانی روایات، نفرت و انتقام، کینہ و حسد، عظمت رفتہ کے حصول کی کوشش اور اپنے پرانے علاقوں کو واپس لینے کی ہوس، مہم پسندی، اور ہوس ملک گیری کی تسکین اور اپنے جذبہ حرص و طمع کی تشفی و تسلی۔

اگر ہم ان تمام مفروضات کو تسلیم کرلیں اور یہ ساری باتیں مان لیں تو پھر اس میں یقیناً شبہ نہیں کہ یہودی انسانی قیادت اور غلبہ و کامرانی اور اقتدار و تسلّط کے جائز اور موزوں امیدوار ہیں۔ اور ان کو ابتدا سے اسی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حالات اسی طرح برقرار رہیں گے۔ اور یہودیوں کی ہوس ملک گیری اور اپنی سرحدوں کو بڑھاتے رہنے کی پالیسی کامیاب ہوگی اور اُن کے لیے کوئی چیز سنگ راہ نہ بن سکے گی اور ان کے تمام شیطانی منصوبے ایک ایک کرکے پورے ہو جائیں گے۔ یہی وہ حقیقی تصویر ہے جو ہمیں یہودیوں کے عہد قدیم بائبل میں تلمود میں حکماء صیہون کے پروٹوکولز میں اس کے لیڈروں کی تقریروں میں ان کے جلسوں کی کارروائیوں میں بلکہ خود ان کے عملی اقدامات میں ملتی ہے۔ خاص طور پر اس جنگ کے بعد یہ تصویر اور زیادہ ابھر کر سامنے آرہی ہے

لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ پوری تصویر کینہ پروری اور حقارت کی تصویر ہے یہ جن رنگوں سے تیار ہوئی ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ انسانیت سے قدیم بغض و عداوت یہودی نسل کے تقدس پر ایمان کامل، اسرائیلی خون کی عبادت و پرستش کی حد تک عظمت

اور تاریخ انسانی کے ہر دور اور روئے زمین کے ہر گوشہ میں بقیہ انسانی نسلوں اور قوموں کو ہر اہلیت و صلاحیت سے محروم سمجھنا، پوری دنیا پر تسلط حاصل کرنے کا منصوبہ، شر و فساد کا طبیعت ثانیہ اور افتاد طبع بن جانا، تشدد اور دہشت انگیزی کا قومی خصائص اور موروثی عادتوں کا درجہ اختیار کر لینا۔

یہ تصویر یہودیوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جس طرح مزاج انسان کے ساتھ، یہ سائے کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ ان کے ساتھ ہے، اس لیے کہ سازش ان کی تاریخ کی سب سے بڑی بنیاد اور ان کے نظام زندگی کا سب سے بڑا ستون ہے۔ یہ وہ محور ہے جس کے گرد ان کی ساری ذہانت اور کاوش گھومتی ہے۔ یہی وہ داغ یا خفیہ ہاتھ ہے جو ہر بغاوت، انقلاب، سازش، تخریبی نظریات، تباہ کن فلسفوں اور ہر قسم کی بے چینی اضطراب، انارکی اور ہر طرح کے اقتصادی، سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی بحران کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ ایک ممتاز یہودی مفکر ڈاکٹر آسکر لیوی نے اپنے اس جملے میں اس قوم کی ساری تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہودیوں کے کردار پر فخر کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہم ہی دنیا کے حاکم اور مفسد ہیں، ہم ہی تمام فتنوں کو ہوا دیتے ہیں ہم ہی جلاد ہیں۔"

یہودیوں کے پاس اُن کی زندگی کے کسی دور میں کوئی عالمی پیغام نہیں رہا۔ اس کی

لہ برطانیہ کے سابق یہودی وزیر اعظم بنجامین ڈزرائیلی لارڈ بیکنز فیلڈ نے اپنے یہودی ہیرو "سیڈونیا" کی زبان سے "بین الاقوامی یہودی" کی حقیقی تصویر کھینچ دی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"یورپ میں ایسی کوئی عظیم فکری تحریک مشکل ہی سے ملے گی جس میں یہودیوں کا بہت بڑا اور نمایاں حصہ نہ ہو۔ قدیم زمانہ کے عیسائی بھی یہودی تھے۔ یہ روسی ڈپلومیسی جو یورپ کے ملکوں کے لیے باعث پریشانی ہے اس کی تنظیم اور نفاذ بھی یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ عظیم بغاوت جس کا مواد جرمنی میں تیار ہو رہا ہے اور جو ایک قسم کی تحریک اصلاح دینی سے ملتی جلتی چیز ہے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ اور جس سے خود انگلستان کے لوگ بھی بہت کم واقف ہیں، وہ بالکلیہ یہودیوں ہی کی نگرانی میں پروان چڑھ رہی ہے۔" (ہنری فورڈ کی کتاب کے عربی ترجمہ "الیہودی العالمی" صـ۶۶ سے ماخوذ ہے)

وجہ یہ ہے کہ خون اور نسل کی تقدیس اور ہر قسم کی فوقیت و برتری، پاکیزگی اور روحانی ترقی کی صلاحیت اور قرب خداوندی کو صرف ایک نسل و برادری کے ساتھ مخصوص سمجھنے کا عقیدہ عالمی پیغام کی روح اور اسپرٹ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا اس طرح مساوات، انسانی اخوت و برادری اور ترقی کے مواقع میں یکسانیت اور وحدتِ انسانیت کا انکار عالمی پیغام اور آفاقی دعوت کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتا۔ خون و نسل کی تقدیس اور ہر قسم کی ذہانت و اعلیٰ دماغی اور عظمت و برتری کو صرف ایک طبقہ کے ساتھ مخصوص سمجھنے کا مزاج نسل انسانی پر شفقت کے بالکل منافی ہے۔ روئے زمین کی دوسری اقوام اور پوری انسانیت کو اپنے دعوت و پیغام میں شریک کرنا، اور اپنے علم صحیح، عمل صالح اور اخلاق فاضلہ میں ان کو حصہ دار بنانا اس مزاج کے ساتھ کبھی جمع ہی نہیں ہو سکتا، یہ مزاج ہدایت و دعوت کا دائرہ قدرتی طور پر تنگ کر دیتا اور اس کو ایک نسل اور عنصر میں محدود کر کے سر بمہر کر دیتا ہے اس لئے اس کی ترویج و اشاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ یہودی مذہب کسی دور میں انسانیت عامہ کا مذہب نہ بن سکا اور نہ یہودی (اپنے مذہبی صحیفوں کی روشنی میں) تبلیغ رسالت کے کبھی مکلف ہی کئے گئے[1] بلکہ ان کی مذہبی کتب میں ایسے نصوص موجود ہیں جو ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ سے باز رکھتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے تھا کہ وہ بنی اسرائیل اور دوسری اقوام کے درمیان برابر امتیازی سلوک کرتے رہیں اور خیر و شر اور گناہ و ثواب کے صرف اس معیار اور پیمانے پر ایمان رکھیں جو نسل اور قوم کے ساتھ بدلتا رہتا ہو اور

---

[1] نومسلم امریکن فاضلہ مریم جمیلہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"یہی نہیں کہ یہودی اپنے مذہب کی تبلیغ عملی طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ وہ یہ کبھی پسند نہ کرتے تھے کہ دوسرے لوگ ان کا مذہب اختیار کریں۔ مجھے ان کی طویل تاریخ میں صرف دو مثالیں ایسی ملتی ہیں جب ایک قابل ذکر تعداد نے یہودی مذہب اختیار کیا۔ ایک بار یمن میں بعثت محمدی (صلعم) سے کئی صدی پہلے دوسری بار تاتاری الاصل مملکت خزار کے باشندوں کا یہودی مذہب قبول کرنا یہ ریاست ایک زمانہ میں روس کے حدود میں تھی۔

(Islam versus Ahle-Kitab Past & Present 22-23)

ان کو دوسری قوم کے ساتھ بُری سے بُری ناانصافی جرم اور ظلم سے عار نہ ہو۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ [۱] — اُن کا یہ طرز عمل اس بنا پر ہے کہ انھوں نے کہا نہیں ہے ہم پر اُمیوں کے بارے میں کوئی گرفت

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات بالکل قدرتی اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ وہ تمام قومیں اور نسلیں جو یہودیوں کے اقتدار و تسلط میں ہیں ان کی کھلی ہوئی ناانصافی و حق تلفی اور سخت ترین مظالم کا شکار ہوں۔ اس لیے کہ وہ ان اقوام کو اپنے برابر کی قوم اور ایک شریف اور باعزت انسانی نسل اور انسانی مجموعہ کی حیثیت سے نہیں دیکھتے وہ ان کی نظر میں بے جان جمادات یا بے زبان حیوانات سے زیادہ قیمت نہیں رکھتیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ نعوذ باللہ اس کی "لاڈلی اولاد" کی خدمت گذاری کرتے رہیں [۲]

لیکن وہ فطرت سلیم جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا کی ہے، وہ پیغام جو مذاہب اور آسمانی صحیفوں میں ملتا ہے اور جس میں سب سے زیادہ خدا کے عدل و انصاف، رحم، حکمت اور قدرت کا بیان ہے اور جس میں اس عجیب و غریب، متوازن اور منظم کائنات کی تخلیق کا مقصد اور نسل انسانی کی پیدائش اور اس کو خلافت الٰہی سے سرفراز کرنے کا راز بیان کیا گیا ہے، اس مفروضہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں جو خواص رکھے ہیں اور اقوام کے عروج و زوال حکومتوں کے قیام اور سقوط، تہذیبوں کی ترقی اور پسپائی اور فتح و ناکامی کے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں اور تمام مذاہب، فطرت سلیم رکھنے والے انسانوں، نیز عقل انسانی نے جس طرح متفقہ طور پر اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ صرف ایک نسل، ایک قوم ایک خاندان اور ایک ملک یا شہر کا رب نہیں بلکہ سب کا معبود اور

---

[۱] سورہ آل عمران ۷۵۔ [۲] یہ نظریہ اور عقیدہ ہندوستان کے برہمنوں اور آریہ نسل کے قدیم فاتحین کے نظریہ سے بہت ملتا جلتا ہے جس پر ہندو مذہب کے طبقاتی نظام اور عدم مساوات کی بنیاد ہے۔ اور جو متعدد اصلاحی کوششوں کے باوجود اب تک ہندوستانی سماج میں اسی طرح رائج ہے اور اس پر بدستور عمل ہو رہا ہے۔

رب ہے اور مشرق و مغرب سب کا مالک و پروردگار ہے، اس کی روشنی میں یہودیت کا فلسفہ خود بخود غلط ٹھیرتا ہے اس کے علاوہ تاریخ انسانی کی یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اقوام اس پیغام ونصب العین اور ان فضائل وصفات کے ساتھ زندہ رہتی ہیں جن میں وہ دوسروں سے فائق ہوں۔ ان کی بقا و ترقی کا راز اسی افادیت اور بقاء انفع کے قانون میں مضمر ہے جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے اور جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فأما الزبد فيذهب جفاءً وأما ما ينفع الناس فيمكث في الأرض كذلك يضرب الله الأمثال

پس جو اوپر بیکار جھاگ ہوتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں اور جو لوگوں کے لئے نفع مند اور کارآمد ہوتا ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتا ہے، اللہ اس طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔

یہ باتیں حتمی طور پر یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہودی جو ان تمام حقائق کو چیلنج کر رہے ہیں اور خدا کی سنت، فطرت، قوانین قدرت اور ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ برسر جنگ ہیں جن کے لیے اس نے یہ پوری کائنات پیدا کی، نسل انسانی کو وجود بخشا اور اس کے اندر خیر وصلاح ترقی اور بقا کی خواہش اور جذبہ پیدا کیا۔ زیادہ دن تک اس اقتدار و تسلط اور فتح و کامرانی کے مزے نہ لے سکیں گے۔ ان کو اپنی ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا موقع کبھی حاصل نہ ہوگا۔ اور ان کے تخریبی منفی اور تباہ کن منصوبے کبھی پورے نہ ہو سکیں گے۔ خواہ ان کی حمایت کے لیے ہزاروں حکومتیں اٹھ کھڑی ہوں اور ان کی پشت پر دنیا کی تمام بڑی طاقتیں جمع ہو جائیں اور ان کے پاس وہ تمام شیطانی حربے اور جہنمی وسائل اکٹھا ہو جائیں جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور جن میں خود ان یہودیوں کا بنیادی حصہ ہے اور جو ان کا خاص فن اور موضوع ہے[۱]۔

---

[۱] احادیث نبوی کے مطالعہ سے (جو حدّ تواتر کو پہونچ چکی ہیں) یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہودی فلسطین میں اقتدار و تسلط کے پورے طور پر مالک ہو جائیں گے۔ پھر ان میں دجّال پیدا ہوگا جو اس قوت واقتدار اور اختیار و تصرف کا آخری رمز اور نمونہ ہوگا۔ اور وہ اپنے اس اختیار واقتدار کا مظاہرہ بھی کرے گا۔ سارے یہودی ایک جگہ جمع ہو جائیں گے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

غلبہ اور فتح انشاء اللہ اہل حق کی اور انسانیت کے لیے عمومی اور ابدی پیغام رکھنے والی ملت ہی کی ہوگی جس کی شفقت میں پوری انسانیت کا حصّہ ہے اور جس کی نظر میں ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے جو حق کے لیے ہر جگہ سینہ سپر ہو جاتی ہے۔ اور ظلم کا مقابلہ ہر موقع پر ہر شکل میں ہر جگہ کرتی ہے۔ جو انسانیت کی خدمت کے لئے زندہ ہے اور انسانیت ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس کا دامن فتنہ و فساد سے پاک ہے اور اور جو دنیا میں علو و فساد کی نہیں حق و انصاف کی علمبردار ہے۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر مسلمان ان پر غالب آئیں گے اُن سے قتال کریں گے ہر چیز یہودیوں کی دشمن ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ پتھر بھی ان کی مخبری کریں گے۔ علماء اہل سنت تیرہ سو (۱۳۰۰) برس سے آثار قیامت کے باب میں ان احادیث پر غور و خوض کرتے رہے ہیں۔ اس وقت یہ باتیں عالم اسباب اور واقعات کے لحاظ سے بہت بعید بلکہ محال اور ناقابل فہم تھیں۔ اس لیے کہ اس پورے عرصہ میں یہودی ساری دنیا میں پراگندہ اور منتشر رہے یہاں تک کہ اس صدی کے نصف میں یہ نبوی پیشین گوئی ظاہر ہونا شروع ہوئی فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی وطن کے قیام کی تجویز سامنے آ گئی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ پیش آیا جو اَب کسی سے مخفی نہیں اب پیشین گوئی کے آخری حصّہ کو بھی پورا ہونا ہے جس طرح اس کا پہلا حصّہ پورا ہو چکا ہے۔ یہ نبوت کے ان معجزات میں سے ہے جس کا کچھ حصّہ صبح کی طرح روشن ہو چکا ہے اور باقی بھی اسی طرح ظاہر اور روشن ہونے والا ہے۔ ولِلّٰہِ الامر من قبل و من بعد۔

اکبر کا دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر

از پروفیسر محمد اسلم

(۴)

اکبری بدعات

اکبر نے دینِ اسلام سے برگشتہ ہوتے ہی اپنے عمال کے نام ایک حکم جاری کیا جس کی رُو سے انھیں مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا۔[140] جزیہ اس سے پہلے ہی منسوخ ہو چکا تھا۔[141] علمائے دین اور ائمہ اہلِ سنت (جنھیں ابوالفضل سبزی فروش اور کفش دوز کہہ کر پکارا کرتا تھا) کے ساتھ تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا، اس لیے ان ایام میں اگر وہ کسی کو گالی دینا چاہتا تھا یا کسی کی تحقیر مقصود ہوتی تھی تو وہ اسے "فقیہہ" کہہ کر پکارتا تھا۔[142] اس کی صحبت میں ملک الشعرا فیضی، صاحبِ تفسیر سواطع الالہام "ایں پیالہ را بکوریٔ فقہا می خوریم" کہہ کر جام چڑھایا کرتے تھے۔[143]

پارسی موبد دستور جی مہر جی رانا کے زیرِ اثر وہ آگ کی تعظیم کرنے لگا تھا اور اس نے ابوالفضل

---

[140] مکتوباتِ علامی، ورق ۲۰، ۲۱ الف　　[141] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۰

[142] ایضاً ۲۶۱　　[143] ایضاً ۳۰۹

کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ شاہی محل میں ہر وقت آگ روشن رہے[144] بادشاہ
کے حکم سے کرمان سے آتش پرستوں کی ایک جماعت فتحپور سیکری بلائی گئی۔ وہاں کے ایک نامی گرامی
آتش پرست اردشیر کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔[145] محسن فانی کی روایت ہے کہ آذر کیوان نامی ایک
آتش پرست کا دل و جان سے احترام کیا کرتا تھا۔[146]

اکبر کی رعایا کی اکثریت اور اس کی ہندو بیویاں گائے کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے اس نے گاؤکشی
قانوناً بند کردی۔[147] اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کیا کہ گائے کے گوبر کو پوتر قرار دے کر اس کی تعظیم
کرنے کا حکم جاری کیا۔ وہ خود بھی گوبر کا دل و جان سے احترام کیا کرتا تھا۔[148] اسی دور
میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص کسی قصائی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پکڑا
گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔[149] دن میں دو بار اکبر سورج کی پرستش کیا کرتا تھا۔[150]
اس موقع پر وہ سورج کی طرف منھ کرکے کھڑا ہو جاتا اور سنسکرت زبان میں سورج کے ۱۰۰۱
نام جپتا۔[151] ایک سرکاری درباری عالم ملا شیری نے جب ان "اسماء الحسنیٰ" کو منظوم کرکے
بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔[152]

بادشاہ نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ ماہ رمضان میں اسکے
سامنے کھایا پیا کریں، اور اس غرض سے اگر وہ پان کا بیڑا منھ میں رکھ کر دربار میں آیا
کریں تو یہ زیادہ موزوں ہوگا۔ بصورت دگر وہ روزہ دار ہونے کے الزام میں دھر لیے
جائیں گے۔[153] اورنگ زیب کے سوانح نگار فاروقی صاحب اپنی کتاب میں اکبر کا ذکر
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے بیٹے دانیال کے نام یہ فرمان جاری کیا تھا کہ وہ اسیرگڈھ
کی مسجد گرا کر اس کی جگہ مندر بنوا دے۔[154] لیکن شاہزادے نے اس کی تعمیل پر کوئی توجہ

---

[144] بدایونی ص ۲۶۱ [145] دبستان مذاہب ص ۲۶۶۔ [146] ایضاً [147] بدایونی جلد ۲، صفحہ ۲۶۱
[148] ایضاً [149] دبستان مذاہب ص ۲۶۰ [150] تذکرۃ الملوک، ورق ۲۳۲ ب
[151] بدایونی، جلد ۲ ص ۳۲۲ [152] بدایونی جلد ۲ ص ۳۲۶
[153] تذکرۃ الملوک، ورق ۲۲۱ ب [154] اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز ص ۵۶۳

نہ دی اور اس طرح یہ مسجد بچ گئی۔[155] دربار سے ملحقہ مسجد اور شاہی محل میں اذان اور نماز با جماعت پر پابندی لگادی گئی اور بادشاہ نے احمد، محمد، محمود اور مصطفیٰ جیسے نام رکھنے پر ناخوشنودی ظاہر کی[156] اس نے خود اپنے پوتوں کے نام ساسانی بادشاہوں کے ناموں پر ہوشنگ، طہمورث اور بایسنغر رکھے[157] اس کے علاوہ اگر بادشاہ کے کسی ملازم کے نام کا جزو محمد ہوتا تو وہ اس ملازم کو آواز دیتے وقت کسی دوسرے نام سے پکارتا تھا[158] حضور کا اسم گرامی کلمہ طیبہ میں سے حذف کر دیا گیا (اور خاص خاص حلقوں میں یا شاہی محلات کے اندر) یہ کلمہ پڑھا جاتا تھا[159]

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَکْبَرُ خَلِیْفَةُ اللّٰهِ

مہابھارت کے دیباچہ میں ابوالفضل اکبر کو خلیفۃ اللہ ہی لکھتا ہے۔[160] اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ اکبر کا اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ براہ راست تعلق تھا اور اس کے اور خدا کے درمیان نبی اکرمؐ کا واسطہ ضروری نہیں تھا۔ اکبر معجزات پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے وہ حضورؐ کے معجزات مثلاً شق القمر اور معراج کا منکر تھا۔[161] اس کے علاوہ بہت سی احادیث کا بھی منکر تھا۔ جو شخص قرآن کو ہی حضورؐ کی تصنیف سمجھتا ہو، اس سے یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ وہ حدیث پر ایمان رکھتا ہو۔

ان ہی ایام میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ سولہ سال سے کم عمر کے لڑکے اور چودہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہ کی جائے[162] اور اگر دولہا اور دولہن کی عمروں میں کوئی شبہ ہو تو یہ ضروری تھا کہ ان کا قریبی کوتوالی میں توئے بیگی سے معائنہ کروایا جائے[163] اسی طرح اکبر نے "خدا یکے و زن یکے" کا نعرہ لگاتے ہوئے دوسری شادی پر پابندی لگادی[164]

---

[155] تاریخ فرشتہ، جلد ۲، ص ۲۹۱ [156] بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۹، ۳۱۴

[157] تکملہ اکبرنامہ، ورق ۳۵ الف، ۴۰ الف، ۴۲ الف [158] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۶۹، ۳۱۴

[159] ایضاً ۲۷۳ [160] مہابھارت ورق ۵ الف

[161] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۱۶۔ ۲۱۷ [162] ایضاً [163] ایضاً

[164] ایضاً، ص ۳۶۱ [165] ایضاً، ص ۳۵۶

بادشاہ کے حکم سے کئی قبرستان اور مسجدیں مسمار کر دی گئیں اور اکثر مقابر پر ہندو قابض ہو گئے[166] بادشاہ نے یہ فرمان جاری کیا کہ عوام کو چاہیے کہ وہ آئندہ عربی اور علوم اسلامیہ کی بجائے ریاضی، ہیئت، فلسفہ اور طب جیسے مضامین کا مطالعہ کریں[167] غالباً ان ہی ایام میں اس نے بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے ختنہ پر پابندی لگا دی اور اس کے بعد یہ معاملہ ان کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا[168] ہندو عورتوں کو ستی ہونے کی اجازت بھی دیدی گئی[169]

جب اکبر کی والدہ کا انتقال ہوا تو اس نے ہندوؤں کے رواج کے مطابق بھدرا کروایا[170] اس واقعہ کے کچھ سال بعد جب اس کی رضاعی ماں فوت ہوئی تو اس موقع پر بھی اس نے اور اس کے خوشامدی امرا نے بھدرا کروایا[171] جب ۱۰۰۱ ہجری میں شیخ مبارک راہی ملک بقا ہوا، تو ابوالفضل علامی اور صاحبِ تفسیر سواطع الالہام ابوالفیض فیضی نے بھی بھدرہ کروایا[172]

خواجہ کلاں خواجہ عبید اللہ بن خواجہ باقی باللہ نے ابوالفضل کی ایسی ہی حرکات دیکھ کر اس کا شمار ملحدوں اور زندیقوں میں کیا ہے[173] بدایونی رقمطراز ہے کہ جب سلیم کی شادی راجہ بھگوان داس کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو شادی کی رسومات ہندوانہ طریقے پر ادا کی گئیں[174]

اکبر ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا بڑا معتقد تھا اور اس کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ چیتنیہ کی مدح میں بھجن گایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایسے سکے بھی ڈھلوائے تھے جن پر رام چندر اور سیتا کی مورتیں موجود تھیں[175] مشہور مؤرخ اسٹینلے لین پول نے برٹش

---

[166] بدایونی ص ۳۲۲ [167] ایضاً، ص ۳۶۳

[168] i۔ اکبر اینڈ دی جیوائٹس، ص ۴۵، ii بدایونی جلد ۲، ص ۳۷۶ [169] بدایونی جلد ۲، ص ۳۷۶

[170] (i) مرآۃ عالم، ورق ۱۳۵ الف (ii) سوانح اکبری، ص ۱۲۴، (iii) اکبر نامہ جلد ۳، ص ۸۲۱

[171] مآثر الامرا، جلد ۱، ص ۶۸۵ [172] جلد ۲، ص ۳۸۸

[173] مبلغ الرجال، ورق ۳۴۳ب، ۳۴۳ الف

[174] i۔ بدایونی، جلد ۲، ص ۳۴۱، ii۔ تذکرۃ الامرا، ورق ۱۳۱ ب

[175] اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، ص ۵۶۳

میوزیم لندن کے مغل مسکوکات کی فہرست تیار کی تھی۔ اس فہرست میں پانچویں پلیٹ پر ۲، ۱ نمبر سکے پر رام اور سیتا کی مورتیں موجود ہیں[۱۷۶]

اکبر کے حکم سے شاہی دربار کے قریب ایک میخانہ کھولا گیا اور شراب نوشی پر مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی[۱۷۷] شیطان پورہ کے نام سے بادشاہ نے طوائفوں کی ایک الگ بستی قائم کر دی تھی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ بادشاہ ان کے حالات سے باخبر رہتا تھا اور ان کے ذاتی معاملات میں بڑی دلچسپی لیتا تھا[۱۷۸]

بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کوئی مسلمان اپنی خالہ، پھوپھی، ماموں یا چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح نہ کرے کیونکہ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ ہمیشہ کمزور ہوتی ہے[۱۷۹]۔ اکبر جوا بازی میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک جوا خانہ بھی کھلوایا۔ یہاں جواریوں کو سرکاری خزانے سے جوا کھیلنے کے لیے قرض بھی ملتا تھا۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اسلام کا جانی دشمن ہو رہا تھا، اور وہ ایک ایک کر کے تمام اسلامی شعائر مٹانے پر تلا ہوا تھا۔

اکبر کا ایک مرید سلطان خواجہ فوت ہوا تو شاہی حکم کے مطابق اس کی قبر میں اس کے چہرہ کے مقابل مشرق کی جانب ایک سوراخ رکھا گیا تاکہ ہر صبح جب سورج طلوع ہو تو اس کی پہلی کرنیں سلطان خواجہ کے چہرہ پر پڑیں۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر اور اس کے پیرو سمجھتے تھے کہ سورج کی مقدس روشنی انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے[۱۸۰]

اکبر لوگوں کو مرید کیا کرتا تھا۔ اور جو شخص اس کا مرید ہوتا تھا اسے "چیلہ" کہتے تھے[۱۸۱]

---

۱۷۶ دی کوئنز آف دی مغل ایمپررز آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم، ص ۴۴۔

۱۷۷ i۔ اخبار محبت، ورق ۹۰ الف و ب، ii بدایونی، جلد ۲، ص ۳۰۲

۱۷۸ i۔ اخبار محبت، ورق ۹۰ الف و ب، ii۔ بدایونی، جلد ۲، ص ۳۰۲

۱۷۹ i۔ اخبار محبت، ورق ۸۹، الف و ب، ii۔ بدایونی، جلد ۲، ص ۳۰۶

۱۸۰ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۴۴، ۳۴۱ ۱۸۱ ایضاً، ص ۳۲۵

جس طرح صوفیائے کرام اپنے مریدوں کو اپنے مشائخ کا شجرہ فراہم کرتے ہیں۔ بعینہ اکبر اپنے چیلوں کو اپنی تصاویر دیا کرتا تھا جسے وہ اپنی دستار میں اُڑس لیتے تھے[182] جب یہ چیلے آپس میں ملتے تو سلام مسنون کی بجائے ایک چیلہ اللہ اکبر کہتا تو دوسرا اس کے جواب میں جلالہ کہتا[183] بادشاہ کا چیلہ بننے سے پہلے امیدوار کو اس مضمون کی ایک تحریر بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا ہوتی تھی[184]

"منکہ فلاں بن فلاں باشم بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابراء و تبرا نمودم و در دین الٰہی اکبر شاہی در آمدم و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد، قبول کردم۔"

بیربل، دیوی اور پرکھوتم جیسے ہندوؤں نے اکبر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ سوّر (نعوذ باللہ) خدا کا مظہر ہے اور ایک بار خدا نے (نعوذ باللہ) اس کی صورت میں اوتار لیا تھا۔ اس لیے ہر صبح سوّر کے درشن کرنا باعثِ سعادت ہے[185] چنانچہ بادشاہ علی الصبح اس کے درشن کیا کرتا تھا اور اس مقصد کی خاطر شاہی محل میں سوّر خانہ قائم کیا گیا تھا[186]

اسلام میں چونکہ مردوں کے لیے ریشمی لباس کا استعمال اور مرد و عورت کے لیے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا حرام ہے اس لیے بادشاہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا اور درباریوں کو ریشمی لباس زیب تن کر کے دربار میں آنے کی ترغیب دیا کرتا تھا[187] اپنی اسلام دشمنی کی بنا پر ہی اس نے سن ہجری کا استعمال متروک کر کے اس کی جگہ ایرانی سن رائج کیا[188]

قصۂ مختصر، اکبر نے جملہ شعارِ اسلامی مٹا دیے۔ بقول ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب اگر اس صورت حال کا اسلامی ذہن سے مطالعہ کیا جائے تو وہ دین اسلام سے منحرف ہو چکا تھا[189] مسلمانوں

---

[182] بدایونی ص ۳۳۸ [183] ایضاً۔ ص ۲۵۶ [184] ایضاً۔ ص ۳۰۴
[185] ایضاً۔ ص ۳۰۵ [186] ایضاً [187] بدایونی جلد ۲، ص ۳۰۶
[188] ایضاً [189] اے سوشل ہسٹری آف اسلامک انڈیا، ص ۱۴۲

کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ حضرت امام ربانیؒ رقمطراز ہیں: "مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند، اگر میکردند بقتل میرسیدند۔"[190] ایک دوسرے مکتوب میں آپ یوں تحریر فرماتے ہیں: "اگر مسلمانے از شعائر اسلام اظہار نماید بقتل میرسد۔"[191] حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ خود حضرت مجدد الف ثانی اس دور میں ظہور مہدی کے منتظر تھے۔ ان حالات میں شیخ سلیم چشتیؒ کے صاحبزادے شیخ بدرالدینؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ میں جا بسے۔[192] بعض مؤرخوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اکبر نے خود ان کو جلا وطن کر دیا تھا۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ حجاز تشریف لے گئے تو واپس آنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ یہ تو بھلا ہو شیخ عبدالوہاب متقی کا کہ انھوں نے آپ کو ہندوستان واپس جا کر اپنا مشن چلانے کی ترغیب دی۔[193] ورنہ ہندوستان اس بزرگ کی دینی خدمات سے محروم رہ جاتا۔ جون پور کے قاضی ملا محمد یزدیؒ نے، جو ایک مانے ہوئے عالم تھے، یہ فتویٰ دیا کہ اکبر مرتد ہو چکا ہے اس لیے اس کے خلاف صف آرا ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔[194] (امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی اکبر جیسے "کافر، زندیق اور مرتد" حاکم کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیتے ہیں)[195]

علماء کی ایک جماعت نے ملا محمد یزدی کی جرأت کی داد دیتے ہوئے اکبر کے خلاف تلوار اٹھانے کا فتویٰ جاری کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد معصوم کابلی، میر معز الملک، محمد معصوم خاں فرنخودی، نیابت خاں اور عرب بہادر جیسے جانباز بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔[196] بعض دوسرے امراء نے بھی اکبر کے بھائی حکیم میرزا کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔[197] میرزا نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور وہ لاہور تک بڑھ آیا۔ بنگال اور بہار کے تورانی

---

[190] مکتوبات امام ربانی، جلد ۱، مکتوب نمبر ۴۶۔ [191] ایضاً، مکتوب نمبر ۸۱۔ (پادشاہ نامہ محمد امین قزوینی ورق ۱۱ الف پر بھی قریب قریب اسی مضمون کی عبارت ملتی ہے) [192] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۱۲
[193] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۱۱۹۔ [194] دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴، ص ۱۲۶
[195] منصب امامت، ص ۹۷ [196] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۷۶ [197] مغل نوبلٹی، ورق ۱۸۳۔

اُمراء نے جمعہ کے خطبہ سے اکبر کا نام حذف کر کے اس کی جگہ حکیم میرزا کا نام شامل کر دیا۔[۱۹۸]

باغی اُمراء کی قیادت بابا خاں جباری اور وزیر جنبل نے کی اور کچھ مدت کے لیے وہ اکبر کی اطاعت سے آزاد ہو گئے۔ اکبر نے ان کے خلاف فوج کشی کی۔ فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی لیکن بدقسمتی سے بابا خاں عین معرکۂ کارزار میں کام آیا۔[۱۹۹] امیر میرکی نام ایک سردار جو اپنی فوج لے کر باغیوں کی مدد کو آرہا تھا شاہی فوج کے ہاتھ لگا۔ بادشاہ نے اس کا سر قلم کرا دیا۔[۲۰۰] حسین بیگ جبرادقلی بھی اکبر کے خلاف لڑتا ہوا میدانِ جنگ میں کام آیا۔[۲۰۱] باغی اُمراء کا زور ٹوٹتے ہی علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ میر یعقوب قاضی بنگال کے دست و پا باندھ کر انھیں دریا میں پھینک دیا گیا۔[۲۰۲] ملا محمد یزدی اور میر معز الملک بھی میر یعقوب کی طرح دریائے جمنا میں پھینکے گئے۔[۲۰۳] قاضی لان برنی کو اکبر کے حکم سے ذبح کیا گیا۔[۲۰۴] لاہور کے اکثر علماء کو اکبر نے مروا ڈالا، اور بقیۃ السیف کو دور دراز علاقوں میں جلا وطن کر دیا۔[۲۰۵] حضرت مجدد الف ثانی کے خسر شیخ سلطان تھانیسری بھی بادشاہ کے حکم سے تختۂ دار پر لٹکائے گئے۔

ڈاکٹر محمد یٰسین رقمطراز ہیں کہ وقتی طور پر اکبر باغیوں کو دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن بالآخر اس کے مرنے کے بعد راسخ العقیدہ مسلمان اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔[۲۰۶] اکبر کے الحاد اور بے دینی کے خلاف اس کی زندگی کے آخری ایام ہی میں کام شروع ہو گیا تھا۔ خواجہ باقی باللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ لیکن ان کا طریقِ کار نورانی اُمراء کے طریقے سے مختلف تھا۔

(بشکریہ المعارف لاہور)

۱۹۸ھ مغل نولیس، ورق ۱۴۳ ۱۹۹ھ تاریخ محمدی، ورق ۱۰۲ب۔ ۲۰۰ھ ایضاً ورق ۱۰۲ الف

۲۰۱ھ ایضاً ورق ۱۰۳ ۲۰۲ھ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۷۷

۲۰۳ھ ا۔ ایضاً۔ از تاریخ محمدی، ورق ۱۰۳ الف

۲۰۴ھ تاریخ محمدی، ورق ۸۲ الف ۲۰۵ھ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۷۷

۲۰۶ھ اے سوشل ہسٹری آف اسلامک انڈیا۔ ص ۱۴۴۔

دو محسنوں کی وفات

——— از عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے دو محسنوں سے محرومی ہوئی، یعنی شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب لکھنوی اور مولوی فہیم الدین صاحب (میرٹھی) نے علی الترتیب ۵ر ذی الحجہ اور ۱۸ر ذی الحجہ کو ملک آخرت کی راہ لی۔ مالک الملک سے دعا ہے کہ انھیں رحمت و مغفرت سے نوازے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان اطباء جھوائی ٹولہ کی بزرگ ترین یادگار تھے۔ کوئی ۶۵ سال مطب فرمایا اور قریب پچاسی برس کی عمر پائی۔ الفرقان کے خریداروں میں ان کا نام نامی ایک مدت سے تھا۔ مگر اب سے چند سال پہلے تک میرے لیے وہ تقریباً ایک اجنبی شخصیت تھے۔ ۱۹۶۴ء میں سخت اعصابی ضعف کا حملہ ہوا اور رہ رہ کر اس کا اعادہ ہوتا رہا۔ ۶۶ء کی گرمیوں میں یہ حالت ہوگئی کہ دوا علاج بیکار محسوس ہونے لگا۔ والد ماجد بار بار معالجہ کی طرف متوجہ فرماتے اور میں ایک یاس کی کیفیت کے ساتھ ٹالتا جاتا۔ حتیٰ کہ بستر سے اٹھنا مشکل ہوگیا۔ حکیم صاحب قبلہ سے رجوع کی نوبت اب تک نہ آئی تھی، والد ماجد نے اصرار سے فرمایا کہ ابھی ان سے رجوع کرکے دیکھا جائے۔ اور پھر ایک دن (غالباً ۱۴ر جون ۱۹۶۶ء کو) حکیم صاحب کے مطب میں حاضری عمل میں آہی گئی۔ والد ماجد نے تعارف کرایا کہ الفرقان کی تمام ذمہ داری ایک عرصہ سے اسی نے اٹھا رکھی تھی مگر اب ڈھائی سال سے ضعف اعصاب کی یہ کیفیت چل رہی ہے کہ کسی علاج یا تبدیل آب ہوا سے کیسا ہی فائدہ ہو جائے لیکن ادھر کچھ کام کیا اور

ادھر عوارض ٹوٹنا شروع ہوئے۔ حکیم صاحب نے بڑی شفقت سے نسخہ تجویز فرمایا اور علاج شروع ہوگیا۔

علاج کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال نہایت پابندی سے جاری رہا۔ ہر ہفتے یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہفتے کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ مطب کا وقت میری کمزوری کے اعتبار سے خصوصاً موسم گرما میں نہایت ہی سخت تھا، یعنی گیارہ سے ایک تک۔ اور عموماً حکیم صاحب کی تشریف آوری گیارہ کے بعد ہی ہوتی تھی، پھر مطب کا فاصلہ بھی کوئی ڈیڑھ میل۔ غرض یہ آمد ورفت سخت دھوپ اور لُو کے دنوں میں بہت ہی ہوشربا ہوتی تھی۔ مگر حکیم صاحب کی طرف سے جس عنایت وکرم اور شفقت والتفات کا معاملہ تھا اس کی خنکی نے کبھی اس کلفت کے آگے ہمت کو پست نہ ہونے دیا کہ حسب ہدایت حاضری میں فرق پڑتا۔ میں حاجتمند تھا اور وہ کرم فرما، دوسرے فیس پیش کرتے تھے اور مجھ سے فیس بھی نہیں لی جاتی تھی لیکن التفات وکرم کا یہ عالم تھا کہ ادھر نظر پڑی اور ان کی یہ خواہش ہوئی کہ سب کو چھوڑ کر پہلے مجھے دیکھ لیں۔ کچھ دیر لگتی تو بیچ میں ایک دو بار معذرت آمیز جملے زبان پر آجاتے۔ عمر اور عزت کے اعتبار سے میرے بزرگوں کے بزرگ تھے مگر ایسی تواضع سے پیش آتے کہ شرم آئے۔ حال کہنے کی قریب والی کرسی پر پہنچا تو عموماً مصافحہ کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ پھر اسقدر شفقت بھرے لہجے میں حال پوچھتے جیسے کسی حد درجہ عزیز سے مخاطب ہیں۔ حال اچھا ہوتا تو زبان پر "الحمد للہ" اور چہرہ پر مسرت نمایاں ہوجاتی وہ مسرت نہیں جو ایک معالج کو اپنی کامیابی سے ہوتی ہے بلکہ وہ مسرت جو ایک شفیق بزرگ کو اپنے کسی عزیز کی راحت سے ہوتی ہے ــــ کچھ تکلیف بتاتا تو اسی طرح اس کا تاثر چہرہ پر آجاتا۔ اور پھر نسخہ میں ترمیم فرما کر بڑے دلنواز انداز میں فرماتے کہ ان شاء اللہ اس سے طبیعت ٹھیک ہوجائے گی، اب یہ تکلیف نہیں رہے گی۔ اور پھر اسی کریمانہ انداز سے رخصت کرتے جس سے شروع میں پیش آئے تھے۔

حکیم صاحب کے علاج کا یہ سلسلہ پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ تقریباً سال بھر چلا۔ اور اس میں موصوف نے اپنے ایک خاص تدریجی نقشہ پر معالجہ کی تکمیل فرمائی لیکن اس کے بعد والے سال میں بھی میں وقتاً فوقتاً ضرورت پڑنے پر حاضر خدمت ہوتا رہا اس

ہو۔ خود الفرقان بھی ان کی اس شرافت وللّٰہیت کے ممنون کشوں میں ہے کہ جب کبھی ضرورت ہوئی تو بس سادہ سے دو جملے ٹیلیفون پر کہدئے اور عموماً مولوی صاحب کا آدمی ہی روپے پہونچا گیا۔

عام حاجتمندوں کی امداد و اعانت میں ان کے ہاتھ کی وسعت کا علم اللہ ہی کو ہوگا مگر مجمل طور پر اتنا اندازہ ہے کہ وہ مال کے بارے میں وَاٰتُوھُم مِّن مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیٓ اٰتٰکُم[1] کا ذہن رکھتے تھے۔ کسی حاجتمند کی حاجت براہ راست اپنے سامنے آئے یا کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعہ اس کا علم ہو وہ اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے کہ اسکی مدد کریں، اور وَفِیٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[2] کے زمرہ میں داخل ہوں۔ صرف وقتی مدد نہیں بلکہ بیواؤں یتیموں اور معذوروں کے بعض مستقل ماہانہ وظیفے بھی ہمارے علم میں ہیں۔ اگرچہ ان کے اخفاء کا تو یہ عالم تھا کہ شاید وظیفہ پانے والے آجتک نہ جانتے ہوں کہ کہاں سے آرہا ہے۔

حافظ قرآن تھے اور اچھا یاد تھا خصوصاً پڑھنے تو بہت ہی اچھا تھے سادہ اور نہایت صحیح، مخارج کی ادائیگی میں بڑی پختگی۔ دس سال سے میرا قیام بھی انکے پڑوس ہی میں تھا۔ محلہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو چند آدمیوں کے دم سے آباد ہے وہ پابندی کے ساتھ تراویح میں قرآن سناتے تھے۔ آٹھ بجے دوکان بند کرا کے آتے اور پھر چند منٹ رک کر مکان سے سیدھے مسجد چلے جاتے، کھانا یا ناشتہ بعد میں کرتے ـــــ ان دنوں بلکہ رمضان کے پورے مہینے میں فجر کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھتے۔ روزانہ کچھ دیر ساتھ کا موقع پورے سال میں اسی مبارک مہینے میں ملتا تھا۔ اور اس کے لیے وقت نماز فجر کے بعد کا تھا کہ مسجد سے نکلے اور میرے ساتھ میرے مکان سے کچھ آگے بڑھ کر امین الدولہ پارک تک چہل قدمی کی ـــ طبیعتا

---

[1] اور دو حاجتمندوں کو اللہ کے اس مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ (قرآن)

[2] اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کے مالوں میں حق ہوتا ہے (یعنی وہ حق سمجھتے ہیں) مانگنے اور نہ مانگنے والے سب حاجتمندوں کا۔ (قرآن)

میں سادگی کا جو ذکر اوپر کیا ہے اس کا یہ عالم تھا کہ مجھے اگر کچھ آگے بڑھ کر کسی دن دودھ لینا ہوتا تو ساتھ چھوڑتے نہیں تھے بلکہ اصرار کرکے وہاں تک ساتھ جاتے تھے۔

اللہ غریق رحمت کرے اپنے تجربہ میں تو وہ فرشتہ صفت انسان تھے صرف چون برس کی عمر پائی صحت اچھی اور جسم بھرا ہوا تھا۔ عید الضحیٰ سے دو دن پہلے فلو ہوا عید کو اچھے رہے دوسرے دن اور اچھے تھے۔ کہ نو بجے صبح دل کا حملہ (ہارٹ اٹیک) ہوا۔ جو اتنا سخت تھا کہ ڈاکٹروں نے شروع ہی سے مایوسی ظاہر کردی۔ اللہ نے انھیں سب کچھ دیا تھا دوسرے دن صبح تک قیمتی سے قیمتی علاج ہوا۔ دو دو ڈاکٹر رات میں ان کی تیمارداری کو رہے مگر وقت پورا ہوگیا تھا۔ حکم الٰہی کے آگے کسی کی نہ چلی۔ اور صبح ۸ بجے کے قریب روح جسم سے جدا ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا! کیسے دیکھتے دیکھتے مولوی صاحب آخرت تک کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اللہ ان سے جنت میں ملاقات نصیب کرے۔ وہ یقیناً ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

مولوی صاحب کی یادگار تین بچے ہیں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پسماندگان میں عزیز و اقارب کے وسیع حلقے کے ساتھ اہلیہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے صدمے کو، جو بعض وجوہ سے ان کے لئے بہت ہی سخت ہے، ہلکا کرے۔ انھیں دنیا میں راحت سے رکھے اور جنت النعیم میں پھر ملنا مقدر فرمائے۔ اور اصل ملنا تو وہیں کا ہے جس کے بعد پھر جدائی کا خطرہ ہی نہیں وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ [1]

جی چاہتا تھا کہ گزشتہ الفرقان ہی میں اپنے ان دو محسنوں کی تعزیت کی جائے۔ مگر سال بھر کے قریب ہوگیا ہے کہ لکھنے سے طبیعت کو سخت اِبا ہے۔ لکھنے کی محنت سے اچھی خاصی طبیعت اتنی بار بگڑ چکی ہے کہ اب اس کا تصور بھی طبیعت کو گراں ہوتا ہے کوئی چیز کسی سخت ضرورت یا اندرونی خواہش سے لکھنا ہی پڑے تو کئی دن کی کوشش سے طبیعت ہموار ہوتی ہے اور اتنی گنجائش گزشتہ اشاعت کے وقت میں نہیں تھی۔ مجبوراً موخر کرنا پڑا اگرچہ دل کو یہ تاخیر بہت ہی شاق تھی۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ دونوں حضرات کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں کہ الفرقان میں تذکرہ کا مقصد یہی ہے۔

[1] آخرت کی زندگی ہی، اگر تم جانتے ہو تو اصل زندگی ہے۔ (قرآن)

حدیث نبوی اور اس کے متعلقات

بخاری شریف کامل (اردو)

بخاری شریف کو اُمت نے قرآن مجید کے بعد صحیح ترین اور سب سے زیادہ مستند کتاب مانا ہے۔ یہ اُس کا قابل اعتماد ترجمہ ہے، تین ضخیم جلدیں، اعلیٰ کاغذ قیمت مجلد -/۴۵

زبدۃ البخاری (اردو)

یہ بخاری شریف کی جامع اور مکمل تلخیص ہے۔

قیمت مجلد .. .. .. -/۱۳

الادب المفرد (اردو)

یہ امام بخاری کی ایک مستقل تصنیف ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات و ہدایات اور سنن و معمولات کو جمع کیا ہے جن کا تعلق باب معاشرت و اخلاق سے ہے۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا شوق رکھنے والوں کے لیے قابل قدر تحفہ ہے۔

قیمت مجلد .. .. .. -/۱۲

حصن حصین (ترجمہ مع متن عربی)

ذخیرۂ حدیث میں جس قدر دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و ماثور ہیں وہ سب اس میں جمع کر دی گئی ہیں، حلّ مشکلات اور دفع بلیات کے لیے اس کا ختم مجربات میں سے ہے۔

قیمت مجلد .. .. .. -/۱۲

کتاب الآثار (مترجم اردو)

تقریباً نو سو آثار کا عظیم ذخیرہ جس کو امام اعظمؒ نے چالیس ہزار احادیث و آثار سے منتخب فرمایا۔

قیمت مجلد .. .. .. -/۱۰

بلوغ المرام (مترجم)

حدیث کی مشہور درسی کتاب ہے۔ قیمت مجلد -/۱۲

ترجمان السنہ (۴ جلد)

از حضرت مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ

یہ کتاب اپنی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے تعارف سے بے نیاز ہے۔ قیمت جلد اول -/۱۲ جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲ مجلد کیلیے ہر جلد پر دو روپے زیادہ

علوم الحدیث (ترجمہ اردو)

اس کتاب کے مصنف لبنان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر صبحی صالح ہیں، ترجمہ غلام احمد صاحب حریری نے کیا ہے، اپنے موضوع پر جامع فاضلانہ کتاب ہے ــــ اس کے خاص موضوعات یہ ہیں: حجیت حدیث ــــ تاریخ تدوین حدیث ــــ حدیث اسلامی قانون کی بنیاد ــــ اصول حدیث ــــ حدیث کی کتابوں اور ان کے مولفین کا تعارف ــــ کتاب کی نوعیت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ پانچسو سے زیادہ صفحے نفیس کاغذ۔ نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت۔

قیمت مجلد .. .. .. -/۱۶

عجالۂ نافعہ مع شرح فوائد جامعہ

فن حدیث پر حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی بے نظیر اور مفید ترین تصنیف ہے۔ شرح نے اس کی افادیت میں بیحد اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت مجلد -/۱۵

ابن ماجہ اور علم حدیث

از فاضل گرامی مولانا عبد الرشید نعمانی

عہد رسالت سے امام ابن ماجہ کے زمانہ تک کی تاریخ تدوین حدیث اور سنن ابن ماجہ پر تفصیلی محققانہ تبصرہ۔ قیمت ــ /۸

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ کا تذکرہ اور تدوین حدیث کی مختصر تاریخ، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مقدمہ

قیمت مجلد

چار روپے پچاس پیسے

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

اسلام کیا ہے
تالیف: مولینا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ
مصنف نے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ضرورت اور نیا حصل وقتی تقاضوں کو
سامنے رکھ کر توجہ اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسلامی تعلیمات پر ایسی مفید اور جامع کتاب اردو
زبان میں کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہو، اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی
نہیں، بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی
ہو، اسلام کی ضروری تعلیمات کو بیس سبقوں کی شکل میں مرتب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہو
ہر سبق اپنے موضوع پر ایک مستقل مضمون اور موثر خطبہ ہے زبان کو آسان بنانے کی خاص
کوشش کی گئی ہو کہ بے پڑھے لوگ اور کم عمر بچے بھی آسانی سے سمجھ سکیں، خود پڑھ کر ایمان تازہ
کیجیے، بیوی بچوں کو پڑھا کر انھیں پکا اور کامل مسلمان بنایئے، مسجدوں اور مجمعوں میں سنا کر
تبلیغ کا حق ادا کیجیے، اور مسلمانوں میں ایمانی روح اور دینی زندگی پیدا کرنے کا بے انتہا ثواب
حاصل کیجیے، اور اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست اسلام کو جاننا اور سمجھنا چاہے تو اس کے ہاتھ
میں بھی بے تکلف یہی کتاب دے دیجیے......کاغذ و طباعت اعلیٰ۔۔۔
ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 37 NO. 1 APRIAL 1969

الفرقان
لکھنؤ

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف ـــ مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے نا آشنا ہے۔ یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۴۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

فی کاپی ..... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۷	بابت ماہ صفر ۱۳۸۹ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۶۹ء	شمارہ ۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجائے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے جن اذیت ناک حالات کا خاتمہ ۲۵ مارچ (سنہ رواں) کو ایک نئے مارشل لا پر ہوا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر "صدق جدید" نے ان حالات سے متاثر ہو کر ۱۲ مارچ کے صدق جدید میں "بنیاد پاکستان ـ ایک محاسبہ" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے۔ مضمون داد طلب بھی ہے کہ نہ صرف اپنے بارے میں کم نظری اور فریب خوردگی کا برملا اعتراف کر کے اخلاقی جرأت کی ایک اعلیٰ مثال مولانا نے قائم کی، بلکہ اس اعتراف کی زد اگر مولانا کے بے شمار ہم خیالوں پر بھی پڑ رہی تھی تو اُن کی ناگواری کے برحق اندیشہ کو بھی اپنے احساسِ فرمہ داری پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ لیکن یہ داد و تحسین مولانا کے ہمسروں کا منصب ہے۔ ہمارا حصہ اس میں نصیحت و عبرت ہے جو مولانا کا اصل مقصد ہے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اصلاً دُنیوی تھی، یعنی مسلمانوں کو ملکی حقوق کے بارے میں ہندوؤں سے شکایات، اندیشے اور تلخیاں پیدا ہوئیں جن کا حل بعض لوگوں نے یہ ڈھونڈھا کہ کچھ حصہ ملک کا مخصوص اپنا کرالیا جائے وہاں آزادی اور امن وچین سے رہنے کا موقع ملے گا اور ان حق تلفیوں سے نجات ہو جائے گی ــــــ مسئلہ دینی شکایات کا بالکل نہیں تھا، علاوہ ازیں مطالبہ کے ترجمانِ اعظم جناح صاحب تھے، یہ خود اس بات کی بہت کھلی علامت تھی کہ معاملہ دینی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نہ دینی حیثیت رکھتے تھے اور نہ کوئی خاص دینی واقفیت۔

یہ مولانا دریابادی کے ابتدائی حصۂ مضمون کا خلاصہ تھا، آگے کچھ حصہ بعینہ ان کے الفاظ

میں پڑھ لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

"جب تحریک پھیلی اور اس کے قدم جم لیے تو عام مسلمانوں میں اپنی سادہ دلی سے قدرۃً یہ خیال پیدا ہوا کہ جب حکومت اپنی ہوگی تو لازمی طور سے قانون اسلام رائج ہوگا۔ اور اس فریب نفس میں مبتلا ہونے والے بے شمار عامی مسلمانوں میں ان سطور کا راقم اور صدق کا مدیر بھی تھا۔ علماء میں مخلصین اور تہجد گزاروں کی ایک بڑی تعداد بے شبہ تھی لیکن وہ بیچارے موجودہ سیاسیات کی باریکیوں اور پیچیدہ گتھیوں کو کیا سمجھتے، ان کے ذہن میں حکومت کا تمامتر وہی سادہ نقشہ تھا جو کروسیڈز (حروب صلیبیہ) کے زمانہ میں آج سے سیکڑوں سال قبل تھا۔ جب مسلموں اور غیر مسلموں میں جنگ جہاں کہیں بھی ہو بڑی آسانی سے جہاد دینی کی شکل اختیار کر لیتی۔ موجودہ نسلی ولسانی، جغرافی وسیاسی، معاشی وعمرانی قسم کی بے شمار پیچیدگیوں کا کسی دماغ کو اندازہ ہی نہ تھا۔"

تقریباً آخر میں جاکر مولانا پھر لکھتے ہیں:-

"پاکستان کا اصل مقصود دنیوی حکومت حاصل کرنا تھا، مسلمان قوم وملت کو آزادی دلانا تھا۔ داعیان پاکستان اسی مطالبہ کو لے کر اُٹھے تھے۔ تحت الشعور میں البتہ یہ بات تھی کہ جب قوم کو آزادی حاصل ہوگی تو قدرۃً وہ اپنے ہی نظام حکومت کا انتخاب کرے گی۔ اس راہ کی پیچیدگیاں، گتھیاں اور لاینحل دشواریاں ہرگز شعور میں تھیں نہ لاشعور میں۔ بس ایک مجمل، مبہم اور نہایت پرجوش نعرہ تھا جو زبان اور حلقوں سے نکل رہا تھا (....) اس کے مضمرات، مقتضیات کا واضح کیا معنی دھندلا خیال نہ مسلمانوں کے چھوٹوں کے دل میں آیا نہ بڑوں کے ـــ بھولی قوم کی طرح لیڈر بھی کچھ ایسے ہی بھولے بھالے تھے! بدنصیبی دونوں میں مشترک۔"

مولانا کا لہجہ جس قدر ہمدردانہ ہے اور محاسبہ میں جتنی رعایت سے انھوں نے کام لیا ہے وہ بالکل ظاہر ہے، مگر عبرت ونصیحت کے لیے اتنا بھی بہت کافی ہے۔ قوم کے ایک خاص مریضانہ مزاج کی تشخیص اس میں پردہ داری ہی کے ساتھ سہی، مگر آگئی ہے۔ اور وہ ہے نعروں سے مست ہو جانا اور ان کے تجزیہ کو گناہ ٹھیرانا، خوابوں کی دُنیا میں مزے لینا اور حقائق کی طرف آنکھ

اُٹھا کے نہ دیکھنا، جذبات کی تحریک پر دوڑنا اور دعوتِ فکر و نظر کو خاطر میں نہ لانا ـــــ یہ ہماری ملت کا وہ مزاج بن گیا ہے کہ سوچ سمجھ کے بات کرنے والے یا گوشے میں پڑے رہتے ہیں یا طعن و تشنیع کا ہدف بنتے ہیں۔ اور جذبات کو اپیل کرنے والے خواہ وہ اربابِ اخلاص ہوں یا طالب جاہ اور طالع آزما! ان کی پرستش کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہو۔ بس ان کی زبان پر من پسند نعرے ہوں، شعلہ نوائی کی اچھی صلاحیت رکھتے ہوں اور قوم اُن کے الفاظ میں اپنے دل کی بات سنے، حد یہ ہے کہ کسی شخص سے یکایک اور بالکل غیر متوقع طور پر ان کے مسائل میں کچھ اس طرح کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو سو فیصدی ان کی پسند کی ہیں، اس سے زیادہ یہ اس شخص کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر کچھ جانتے تھے تو وہ کچھ کشش یا حسنِ ظن کی بات نہیں تھی۔ لیکن اب اس سے جو خوش ہوئے ہیں تو پھر بالکل ضرورت نہیں کہ اسے تمام پہلوؤں سے جانچیں پرکھیں، کچھ قیافہ شناسی سے کام لیں کہ فلاں فلاں جو اور مسئلے اس کے دائرۂ کار کے ہیں ان میں بھی اس سے اسی رویہ کی امید کی جانی چاہیے یا کچھ اور اندیشہ ہے؟ ـــــ بالکل کسی بات کی ضرورت نہیں، بس خوش ہوئے اور مکمل اعتماد کا اعلان کر دیا کہ اس سے بہتر آدمی ہماری نظر میں نہیں۔ ہمارے سامنے اس کی ایک بالکل قریبی مثال ہے اور اسی کا ذکر ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے خود مولانا دریابادی سے سُن لیجئے کہ اس مرض کا ظہور تحریک پاکستان کے ایام میں کس حد تک ہو چکا ہے ـــــ مولانا کا یہ ٹکڑا ۱۸ اپریل ۱۹۶۹ء کے صدقِ جدید سے ماخوذ ہے جس میں "چند مزید صراحتیں" کے عنوان سے ۲۱ مارچ کے مضمون پر ایک تکملہ ہے ـــــ فرماتے ہیں:۔

"خوش عقیدگی اور اعجوبہ پرستی کی جو روح آج سے نہیں صدیوں سے مسلمانوں پر مسلط ہو۔ وہ ہر دور میں انھیں عجیب عجیب خوش فہمیوں میں مبتلا کرتی رہی ہے اور اسی نے "قائدِ اعظم" کی مذہبیت سے متعلق طرح طرح کی اختراعی روایتیں پھیلا رکھی تھیں لوگ بے تکلف انھیں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کسی کو ان پر جرح و تنقید کا خیال تک نہ آتا تھا۔"

اس کے بعد ایک بڑے مستند حوالے سے چلی ہوئی روایت جناح صاحب کی تہجد گزاری کی نقل کر کے مولانا فرماتے ہیں:۔

"جی ہاں نماز پنجگانہ ہی نہیں نماز تہجد! ــــ سادہ لوح و معصوم صفت قوم اس خوش خیالی میں مبتلا اور اس کی منتظر کہ امام مہدی کا ظہور بس اب ہوا چاہتا...."

خوش عقیدگی کی اس مثال کے بعد حال کی وہ مثال جو ہمیں دینا ہے، بڑی پھیکی نظر آئے گی. مگر اسے لانا اس لیے ہو کہ ایسی ایسی چوٹیں کھانے کے بعد بھی کیا ظرف ہماری ملت کا ہو اور کیا وضعداری اس نے پائی ہے کہ کوئی خود ہی اس کے حسنِ عقیدت پہ ستم ڈھا جائے تو دوسری بات ہے ورنہ اسے آج بھی بس ایک ادا پہ مکمل سپردگی میں کوئی انکار نہیں! قیامِ پاکستان کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب فائز ہوئے، وہ بھلا مسلمانوں کو کیا پسند آتے، ان کے بعد یہ جگہ کرنل بشیر حسین زیدی کو مل گئی. ان کے طور طریق بھی پسند آنے والے نہیں تھے، خصوصاً دینی خیال کے مسلمانوں کو جو علی گڑھ سے کوئی رابطہ رکھتے تھے ان کی بعض "ترقی پسندیاں" بہت ناگوار تھیں اور معاملات مسلم پریس میں آنے لگے. وہ گئے تو مرکزی حکومت کے ایک سکریٹری اور ایک پرانے قوم پرور خاندان کے فرزند بدرالدین طیب جی نے ان کی جگہ لی. ہمیں یاد ہے کہ ان کی ان دونوں حیثیتوں کی بنا پر وہ لوگ اس تقرر سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے جو علی گڑھ کے معاملات میں قوم کے ترجمان بنے ہوئے تھے، بلکہ آتے ہی طیب جی نے سرسید ڈے پر جو تقریر کی وہ کچھ تشویش انگیز تھی ــــ مگر آدمی صاحبِ ضمیر اور صاحب رائے تھے، اس وقت کے وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا یونیورسٹی کا جو حلیہ بنانا چاہتے تھے، اس سے انھیں اختلاف ہوا اور بعض مواقع پر یونیورسٹی کی حیثیت اور نوعیت کے بارے میں انھوں نے پبلک طور پر ایسی باتیں کہیں جو وزیر تعلیم سے اظہار اختلاف کی حیثیت رکھتی تھیں ــــ یونیورسٹی کے بارے میں بعض اکثریتی حلقوں سے ہونے والے مکروہ پروپیگنڈے کی تردید بھی انھوں نے ایک شان خودداری اور عزتمندانہ ناگواری کے ساتھ کی. ان کی اس طرح کی باتوں سے یونیورسٹی کے مسلم طلباء اور حقیدۃً مسلمان اساتذہ میں ایک خود اعتمادی پیدا ہوئی، دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں احساسِ کمتری اور لاچاری زائل ہونے لگی ــــ اس کے علاوہ بھی کچھ اقدامات طیب جی نے اپنے مختصر دور میں اپنے طلبہ کی امنگیں پوری کرنے اور قومی زندگی میں انھیں

برابر کا درجہ دلانے کے لیے کیے۔ اور اپنی ان سرگرمیوں میں وہ برابر اضافہ ہی کرتے ہوئے یونیورسٹی سے رخصت ہو گئے۔

کیا شبہ ہے کہ طیب جی کی یہ باتیں قابل تحسین تھیں۔ اور کسی قدر غیر متوقع ہونے کی بنا پر ان کا اور بھی زیادہ اعتراف کیا جانا چاہیئے تھا۔ مگر کیا ان چند باتوں سے طیب جی کا پورا ذہن سامنے آجاتا تھا۔ اور ان لوگوں کو غیر مشروط اعتماد کا اظہار کر دینا چاہیے تھا جو ایک دینی روح بھی مسلم یونیورسٹی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے تھے؟ حالانکہ اس پہلو سے طیب جی ابھی تک بند تھے۔ مگر جب قائد اعظم جناح صاحب ہندوؤں سے کشمکش کے معاملہ میں مسلمانوں کا دل خوش کر دینے کے بعد "تہجد گزاری" کا حسن ظن پا سکتے ہیں تو کیا طیب جی اتنے اعتماد کے بھی حقدار نہ تھے کہ اگر وہ اس روح کے علمبردار نہ بنے تو کسی غیر دینی روح کے بھی علمبردار یا طرفدار نہ بنیں گے چنانچہ جب وہ واپس بلا لیے گئے تو ان لوگوں نے ان کا اسی طرح سوگ منایا جیسے ان کا ایک آئیڈیل وائس چانسلر ان سے چھین لیا گیا اور پھر جب ان کے بعد نواب علی یاور جنگ آئے اور کچھ ہی زمانے ہی ستم ڈھا کر چلے گئے تو ان کی خالی جگہ کے لیے ایگزیکیٹو کونسل کی طرف سے رکھے گئے ناموں کو اس پہلو سے بھی رد کرتے ہوئے کہ یہ صحیح اسلامی ذہن نہیں رکھتے ہیں اور اس لیے مسلم یونیورسٹی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتے، پھر ایک بار بدرالدین طیب جی کو یاد کیا گیا کہ بس وہ ہیں جو اس یونیورسٹی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں[1]! ـــــ اب کیسے سب نقشہ کھینچا جائے کہ لوگوں کے اظہار اعتماد کا کیا عالم تھا! کیسی گرویدگی اور للک ان کے لیے گفتگوؤں اور اخباری مضامین و مراسلات میں ٹپک رہی تھی۔ مبادا کوئی سمجھے کہ وہ اب علی گڑھ لوٹنا پسند نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایسوں کے اطمینان کے لیے ان کی طرف سے از خود ہی اس کا اطمینان اس طرح کے اشعار لکھ کر دلا دیا جاتا تھا کہ

مہرباں ہو کے مجھے چاہو بلا لو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ نہ سکوں

---

[1] ہمیں اس سے بالکل اختلاف نہیں ہے۔ طیب جی واقعی بہت موزوں ہیں۔ لیکن یہاں بات دوسری ہو رہی ہے۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر اس کا اب بھی سوال نہیں تھا کہ طیب جی کے دینی خیالات تو معلوم کر لیے جائیں۔ اور ہاتھ پاؤں کٹانے سے پہلے یہ تو جان لیا جائے کہ وہ اس بے پناہ اعتماد کے ہر پہلو سے اہل بھی ہیں یا نہیں؟۔

ابھی ماتم مکمل نہیں ہوتا۔ طیب جی کو علی گڑھ کا چانس تو ملا نہیں اور ادھر وہ کچھ دن بعد سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ رگوں میں ایک سیاسی خاندان کا خون تھا جسے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے دور میں مسلمانوں کے حالات کے قریبی مطالعے اور ان کے اظہار اعتماد و عقیدت نے جگا دیا۔ چنانچہ ریٹائر ہونے کے بعد یہ خبریں ملنے لگیں کہ طیب جی ملک کی سیاست میں آ سمجھیے آ ہی لیں پھر کیا تھا، علی گڑھ کے سلسلہ میں ان کے خصوصی حامی اور سفارشی جو مسلمانوں کے لیے ایک آل انڈیا لیڈر کی تلاش میں بھی تھے، دوڑ پڑے کہ دیدہ و دل فرشِ راہ! آپ تشریف لائیے! اور تاج قیادت سنبھالیں، مسلمان گوش بر آواز ہیں، طیب جی سمجھدار آدمی تھے، پہلے انھوں نے ملک کا ایک دورہ طے کیا، کہ اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔

دورہ کے پروگرام میں پہلا نام لکھنؤ ہی کا پڑا، جو بہت دن سے مسلم سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور شاید مسلم سیاست میں طیب جی کے آنے کا داعی اول بھی یہی تھا۔ پانچ دن طیب جی رہے۔ کیا بتایا جائے کہ کیا جذبات خوش آمدید کہنے والوں کے تھے! کیا کیا محل ان کی امید پر بنائے گئے تھے! مگر وہ آدمی چونکہ ایمان دار تھے، اس لیے بس دو تین دن ہی میں ظاہر ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے ذرا کام کے نہیں جو مسلمانوں کی بالکل الگ سیاسی تنظیم چاہتے ہیں۔ یہ بھی کھل گیا کہ وہ دین کے معاملے میں پورے "ترقی پسند" ہیں۔ علماء تک کو تجدد کی دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں جس پہلو سے وہ سو فی صدی قابل اطمینان نظر آتے تھے اس میں بھی رخنہ نکل آیا کہ وہ بھری پریس کانفرنس میں کہہ گئے کہ مسلم یونیورسٹی کو اسلامی کلچر کی نمائندگی کرنے والا ادارہ تو ضرور رہنا چاہیے، جیسے بنارس ہندو یونیورسٹی ہندو کلچر کی نمائندگی کرے، مگر یہ میں نہیں مانتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی یونیورسٹی ہے ـــــ بس اس کے بعد ہمارے خوش فہموں کا وہی حال تھا

جو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر دوڑنے والوں کا ہوتا ہے۔ سارے جذبات خاک اور سارے احساسات بار ہو کر رہ گئے۔

یہ مثال اتنی طویل ہو گئی کہ کہیں اصل موضوع بحث فراموش نہ ہو گیا ہو، یا کسی کو یہ گمان نہ ہو جائے کہ اصل مقصد اسی کا تذکرہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مضمون شروع کرتے وقت یہ قصہ بطور مثال بھی ذہن میں نہ تھا۔ اس کا خیال یکایک اس جگہ پہونچ کر آیا جس جگہ سے اس کی تقریب شروع ہوتی ہے۔ اور پھر جب تقریب پیدا ہو رہی تھی تو اس کا چھوڑنا ظلم تھا۔ یہ بالکل تازہ بتازہ عبرت پارہ ہے۔ اس میں ہمارے مزاجِ خوش اندیشی، جھٹ پٹ عقیدتمندی اور خود گرفتاری کو درسِ عبرت بننے میں کوئی لمبا سفر طے نہیں کرنا پڑا۔ معاملہ متنازعہ بھی نہیں ہے کہ عبرت انگیزی میں کوئی شک ہو۔ اور ایک خاص پہلو یہ ہے جس کی طرف اس مثال کے تقریبی جملوں میں اشارہ ہو گیا تھا۔ کہ طیب جی بیچارے نے ذرا بھی کوئی ایسی بات نہیں کی یا کہی تھی جس سے اس طرح کی خوش فہمیوں کی اُن پر کوئی ذمہ داری آتی ہو اور مبتلا ہونے والوں کے لیے کوئی عذر بنتا ہو! صرف وہ کام کیا تھا جو ایک خود شناس اور خود دار وائس چانسلر کو کرنا چاہیے۔ کسی یونیورسٹی کے طلبہ کا احساسِ کمتری، وہاں کے فضلا کی ملک میں ناقدری، ان پر اور یونیورسٹی کے اسٹاف پر بیہودہ الزامات ایک باشعور وائس چانسلر کی نظر میں خود اسکی توہین ہے اور یونیورسٹی کے وقار ہی سے اسکا وقار ہے۔ ہمارے ذہن اگر مفلوج نہ ہو گئے ہوتے اور کسی نجات دہندہ کی تلاش مالیخولیا تک نہ پہونچ گئی ہوتی، تو یہ کوئی مشکل سے سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔ بالخصوص جبکہ طیب جی کا ماحول، اُن کی تعلیم و تربیت اور عام زندگی بھی اُن کے اس طرزِ عمل کو وہ خاص معنی پہنانے میں کوئی مدد نہیں کرتی تھی جو بڑے جزم و اعتماد کے ساتھ پہنا دیے گئے ـــــ تو اس مثال سے اندازہ کیجیے کہ ہم میں دھوکہ کھانے کی صلاحیت کس حد کو پہونچی ہوئی ہے! ایک آدمی نہ دھوکہ دے رہا ہے نہ کوئی بات ہی اس کی ایسی ہے جس سے خواہ مخواہ غلط فہمی ہو سکے مگر ہمیں بس بہانہ چاہیے کہ کسی کو مرکزِ اُمید بنا لیں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر اس قصے کا المناک پہلو یہ ہے کہ یہ دھوکہ کھانے والے عوام نہیں تھے، وہ تھے جنھیں قوم کی کریم کہا جاتا ہے۔ پڑھے لکھے، عالم و فاضل، وکیل اور بیرسٹر، جہاندیدہ و سنجیدہ

جنھیں مسلمانان ہند کے اس پُر آشوب دور نے یکجا کر دیا ہے — بتائیے جب کریم کا یہ حال ہو کہ بے سبب دھوکہ کھائے تو قوم کس درجہ پر ہوگی! اور ایسی قوم کے لیے خطرات کا کیا ٹھکانہ ہے۔

مولانا عبد الماجد صاحب نے ایک بند کھولدیا ہے، پتہ نہیں کب سے اس صورت حال پر دل خون ہو رہا تھا۔ مرض کے اتنے پہلو ہیں اور قوم بقول مولانا دریابادی اتنی "بھولی" ہے کہ ہندی کی چندی کیے بغیر چارہ نہیں، اس لیے اب گفتگو کو آئندہ پر رکھنا ناگزیر ہے۔ ؎

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

توفیق سازگار رہی تو اپنی بساط بھر سب ہی پہلو کھولنے ہیں تاکہ جڑ کی تلاش ہو سکے اور کوئی علاج اس "پریشان نظری" کا سوچنا آسان ہو!

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

ذی الحجہ ۶۸ھ کے الفرقان میں والد ماجد کے ایک نوٹ کی بنا پر اہل کرم صحت کا حال پوچھتے ہیں۔ الحمد للہ وسط مارچ سے حال بہت غنیمت ہے۔ علاج ڈاکٹری چل رہا ہے جو بظاہر سازگار ہو لیکن اسے ایک آفت کا سامنا ہے! وہ یہ کہ اس گرمی کے موسم میں آئے دن عدالت کچہری کی سخت تکلیف دہ حاضری جس سے کوئی مناسبت بھی نہیں۔ "ندائے ملت" جس سے اب تقریباً ۶ مہینے پہلے قطع تعلق بھی کیا جا چکا ہے، اس سے پچھلے تعلق کی نشانی کے طور پر دفعہ ۱۵۳۔ الف (اخبارات کی گوشمالی) کے تحت اکٹھے پانچ مقدمے اس جان ناتواں پر ہیں — میں اس سلسلۂ ابتلاء کے خیر و عافیت اور استقامت کے ساتھ گزر جانے کے لیے نہایت ہمدردانہ دعاؤں کا طالب ہوں۔

میں شاید اپنی عدم مناسبت اور کمزور صحت کی بنا پر ابتداء ہی میں ان مقدمات سے حیران ہو جاتا اور الفرقان کے لیے کچھ لکھنے لکھانے کا تو سوال ہی نہ رہتا، مگر خدا بہترین عنایتوں سے نوازے میرے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمٰن نعمانی کو کہ وہ مجھ سے مثالی محبت رکھتے ہیں اور ان مقدمات کی پیروی کا سارا بار انھوں نے اس طرح اپنے اوپر لے لیا ہے کہ مجھے

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

درسِ قرآن

مسجد مرکز والی۔ ۱۱ر محرم الحرام ۱۳۸۹ھ

دین سے غدّاری کرنے والے نام نہاد مسلمانوں کو سخت ترین انتباہ

[حمد و صلوٰۃ اور اعوذ اور بسم اللہ کے بعد]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝

المائدۃ ۵۴-۵۵-۵۶

مسلمانو! تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پھر جائیں تو اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں (ان کی جگہ) وہ دوسرے لوگ پیدا کرے گا جن سے اس کو محبت ہوگی اور وہ اس کے چاہنے والے ہوں گے۔ وہ نرم دل اور فروتن ہوں گے اہل ایمان کے لیے اور سخت مزاج اور زور آور ہوں گے کافروں کے مقابلہ میں، پوری جدوجہد اور جانبازی

کریں گے راہ خدا میں اور بالکل پرواہ نہ کریں گے (اس کے راستہ میں) کسی ملامت گر کی ملامت کی، یہ اللہ کا فضل و انعام ہے وہ اُس سے نوازتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

(مسلمانو!) تمہارا ولی (یعنی تمہاری مخلصانہ دوستی اور وفاداری کا مستحق) بس اللہ ہے اور اس کا رسول، اور وہ مؤمنین صادقین جو اچھی طرح نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور (اللہ کے سارے ہی احکام کے سامنے) سرِتسلیم خم کرتے ہیں —— اور جو لوگ اپنی ولایت (یعنی مخلصانہ دوستی اور وفاداری) کا تعلق قائم کرلیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور سچے اہل ایمان سے تو (وہ حزب اللہ یعنی اللہ کی جماعت میں شامل ہیں اور) یہ خداوندی جماعت ہی انجام کار غالب ہونے والی ہے۔

تفسیر و تشریح :-

یہ سورۂ مائدہ کے آٹھویں رکوع کی آخری تین آیتیں ہیں، پچھلے ہفتہ جب یہ رکوع شروع ہوا تھا تو میں نے اس صورتِ حال اور پس منظر کا ذکر کیا تھا جس میں سورۂ مائدہ کا یہ حصّہ نازل ہوا ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ جس زمانہ میں اس سورت کا یہ حصّہ نازل ہوا ہے، مدینہ طیبہ کے لوگ عام طور سے اسلام قبول کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوش ہوچکے تھے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بارے میں پورے مخلص نہیں تھے قرآن پاک میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کم سے کم دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ جو اندر سے اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے اور انھوں نے صرف فریب کے طور پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے ہی کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، اس قسم کے منافقوں میں عبداللہ بن اُبَیّ ابن سلول کا نام بہت مشہور ہے۔

دوسری طرح کے منافق وہ تھے جنھوں نے اسلام کو وقت کی ایک مقبول دعوت اور کامیاب تحریک دیکھ کر اور اُس سے وابستگی کو اپنے لئے نفع بخش سودا سمجھ کر قبول کرلیا تھا اور مسلمانوں میں شامل ہوگئے تھے، لیکن انھیں اسلام کے بارے میں وہ اذعان و یقین اور شرح صدر بالکل نہیں تھا جو مؤمنین صادقین کو ہوتا ہے، اس لئے ان کا اسلام

ان کی مفاد پرستی کا تابع تھا اور انھیں اسلام سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے لیکن انھیں اسلام اور مسلمانوں سے وہ عناد بھی نہیں تھا جو عبداللہ بن اُبَیّ جیسے نمبر اکے منافقین کو تھا۔ بلکہ یہ دراصل غرض پرست اور مفاد پرست قسم کے لوگ تھے۔

سچے مخلص مسلمانوں اور دو قسم کے ان منافقوں کے علاوہ ایک جو تھا مستقل عنصر وہاں یہودیوں کا تھا مدینہ کے آس پاس میں ان کی مستقل بستیاں تھیں، یہ لوگ عام طور سے خوشحال اور دولت مند تھے، پڑھے لکھے بھی تھے، "اہل کتاب" تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو مذہبی بزرگ اور پیشوا مانے جاتے تھے ان کا پورے علاقہ میں بڑا وقار تھا اور اپنے دائرہ میں ان کو ایک طرح کی مذہبی و روحانی حکومت و سیادت حاصل تھی۔

جب مدینہ طیبہ میں اسلام کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی اور وہاں کے قریب قریب سب ہی لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تو ان یہودیوں میں اور خاص کر اُن کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں میں حسد کے جذبات بھڑک اُٹھے اور وہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے لگے اور مسلمانوں میں سے وہ مفاد پرست اور غدار قسم کے لوگ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، ان کے آلہ کار بن گئے وہ ان یہودیوں سے خاص خلا ملا رکھتے تھے اور وہ ان کو خوب استعمال کرتے تھے ———

مسلمانوں میں ایسے مفاد پرست غدار ہمیشہ رہے ہیں اور آج بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

اس رکوع میں "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے اگرچہ خطاب بظاہر عام مسلمانوں سے کیا گیا ہے لیکن دراصل اسی غدار طبقہ کو تنبیہ کرنا اور آگاہی دینا مقصود ہے جو اللہ اور رسول اور دین کے مقابلہ میں اپنے مفادات کا زیادہ وفادار تھا اور جو دشمنانِ اسلام یہودیوں کا آلہ کار بن جاتا تھا ——— یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ سیدھے مسلمان بھی اپنی سادہ لوحی سے یہودیوں کے ساتھ ایسے مخلصانہ روابط رکھتے ہوں اور یہ نہ سمجھتے ہوں کہ یہ یہودی اس لائق نہیں ہیں کہ اُن سے ایسے تعلقات رکھے جائیں اور نادانستہ طور پر وہ یہودیوں کے آلہ کار بھی بن جاتے ہوں۔

بہرحال مسلمانوں میں سے جو لوگ اپنی منافقانہ ذہنیت یا سادہ لوحی کی وجہ سے

یہودیوں کے ساتھ ایسے تعلقات اور روابط رکھتے تھے جن کی وجہ سے وہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے، دراصل انہی کو تنبیہ کرتے ہوئے اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ

(اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی نہ بناؤ) یعنی اُن سے ایسے روابط نہ رکھو جو ہم مقصد اور معتمد دوستوں کے درمیان ہی ہوتے ہیں ــــ اس حکم کی تشریح اور تفصیل میں پچھلے ہفتہ کے درس میں کر چکا ہوں اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ غیر مسلموں سے تعلقات اور روابط کا مسئلہ زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ ممتحنہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

آج اس وقت میں نے اس رکوع کی جو آخری تین آیتیں آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان میں بھی اسی طبقہ کو اور اس طرح کے تمام لوگوں کو خواہ وہ کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصہ کے ہوں بڑے جلال کے انداز میں سخت آگاہی دی گئی ہے اور یہ آخری درجہ کی تنبیہ اور آگاہی ہے اور اُس کے ایک ایک لفظ سے جلال ٹپک رہا ہے ــــ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

(اے مسلمانو) تم میں سے جو لوگ مرتد ہو جائیں یعنی اسلام سے باغی ہو جائیں اور اس کو چھوڑ کر دوسرا کوئی دین و مذہب اختیار کر لیں تو خدا کا اور اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ وہ خود ہی محروم اور مردود ہو جائیں گے اور اللہ اُن کی جگہ دوسرے بندوں کو دین کی نصرت اور خدمت کے لئے کھڑا کر دے گا۔ جن میں یہ اوصاف ہوں گے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ــ ان کو خدا کی محبت اور اس کا پیار حاصل ہوگا اور وہ دل و جان سے خدا سے محبت کریں گے، اس لیے ان کی دوستی اور دشمنی اور نرمی اور گرمی صرف اللہ کے لئے ہوگی۔

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ اہل ایمان کے لئے یعنی خدا،
اس کے رسول اور ان کے دین کے ماننے والوں کے سامنے وہ بالکل عاجز و بیچارے نرم دل
اور اُن کے خدمت گزار ہوں گے "أَذِلَّة" ذلیل کی جمع ہے، اس کے معنی یہاں نرم اور
متواضع کے ہیں۔ ذلت اگر خدا کی طرف سے یا دشمنوں کے دباؤ سے ہو تو مصیبت و نقمت ہے۔
اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں اس سے
پناہ مانگی گئی ہے۔ اور اگر بندہ اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنے کو دوسروں کے سامنے اللہ کے
لیے پست اور نرم کردے اور اپنے کو ان سے نیچا اور کمتر سمجھے تو یہ بڑا کمال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی دعاؤں میں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے تھے "وَفِي نَفْسِي لَكَ فَذَلِّلْنِي"[1]
اس آیت میں اللہ کے جن محبوب و مقبول بندوں کا ذکر ہے، ان کے کردار کا ایک رخ تو یہ
بیان کیا گیا ہے کہ وہ مومنوں اور اللہ کے وفادار بندوں کے سامنے "أذلة" یعنی پست اور
نرم ہوں گے۔ اور دوسرا رخ یہ بتایا گیا ہے کہ "أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ" یعنی خدا کے باغیوں
منکروں اور دین کے دشمنوں کے مقابلہ میں وہ زور آور سخت اور گویا فولادی انسان ہوں گے
اسی کو قرآن پاک میں دوسری جگہ ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا ہے "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ
رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" (سورہ الفتح)

آگے ان کی تیسری اور چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ وہ اللہ کے راستہ میں
اپنے امکان بھر جد و جہد اور جانبازی کریں گے اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ سچے
عشق کی وجہ سے اس راہ میں کسی ملامت گر کی مطلق پرواہ نہیں کریں گے۔

یہ ان بندوں کے اوصاف بیان ہوئے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں میں
سے کچھ بدنصیب اور شقاوت پرست مرتد ہو جائیں تو اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں، وہ خود محروم و
مردود ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت و خدمت کے لیے اور لوگوں کو اٹھائے گا
جن میں یہ اوصاف ہوں گے، وہ خدا کے محبوب اور دل و جان سے اس کے محب ہوں گے۔
ایمان والوں کے لئے یعنی اللہ کے وفادار بندوں کے لئے نہایت نرم و متواضع اور اس کے باغیوں

۱؎ اے اللہ مجھے ایسا کردے کہ میں اپنی نگاہ میں تیرے واسطے ذلیل اور پست ہو جاؤں ۱۲

کافروں کے مقابلہ میں مردِ آہن اور بے لچک ہوں گے۔ اللہ کے دین کی راہ میں بے دریغ جدو جہد کریں گے اور ہر قسم کی قربانی دیں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت انکے قدموں میں لغزش نہیں پیدا کر سکے گی۔

آگے فرمایا گیا ہے: "ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ" — یعنی ان ایمانی اوصاف کا کسی بندہ کو عطا ہونا اور دین کی نصرت و خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو منتخب کیا جانا اور اس کی توفیق ملنا، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و انعام ہے۔ اس عظیم نعمت اور دولت سے وہی بندے نوازے جاتے ہیں جن کو خدائے علیم و حکیم نوازنا چاہتا ہے۔

آخر میں فرمایا گیا — "وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" — یعنی اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا وسیع اور لامحدود ہیں جو بندے اپنے کو اس فضل و انعام کا مستحق بنا لیں وہ اُن سب کو بھر لور عطا فرمائے گا۔ لیکن وہ علیمِ کل اور ہمہ داں ہے اس لیے وہ کسی کو عطا فرمانے یا محروم کرنے کا فیصلہ اندھا دھند نہیں کرتا بلکہ اُس کے سارے فیصلے علمِ محیط کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

یہ میں نے آیت کے اجزا کی مختصر تشریح کی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اس آیت میں "یا ایھا الذین آمنوا" کے الفاظ سے بظاہر عام مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت اُن منافقانہ ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کو آگاہی دی گئی ہے جو اللہ و رسول اور اسلام کی وفاداری میں پورے مخلص اور یکسو نہیں تھے بلکہ اپنی مفاد پرستی کی وجہ سے دشمنانِ اسلام سے بھی یارانہ گانٹھے ہوئے تھے اور ان سے ایسے روابط اور تعلقات رکھتے تھے جو صرف ہم مقصد اور ہم مشرب رفیقوں کے درمیان ہی ہونے چاہئیں — اس آیت میں اُن کو سُنایا گیا ہے کہ خدا کو اور اُس کے دین کو تمہاری بالکل ضرورت نہیں۔ اگر تم بالفرض مرتد ہو کر کھلے دشمنوں کی صفوں میں شامل ہو جاؤ جب بھی تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اور اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دین کے مخلص جانباز سپاہی پیدا کرے گا اور تم مردود ہو جاؤ گے۔

لہٰذا اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو اور خدا کی رحمت اور عنایت سے محروم ہونا نہیں چاہتے تو اللہ و رسول اور دین کے پورے وفادار ہو جاؤ۔ اپنے اندر حنیفیت کی شان پیدا کرو اور خدا کے دشمنوں سے ایسے تعلقات نہ رکھو اور اُن کے آلۂ کار اور ایجنٹ نہ بنو

بلکہ اپنی وفاداری کو اللہ و رسول اور مومنین صادقین کے لئے خالص کرو — چنانچہ آگے فرمایا گیا ہے۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ ولی کے معنی یار وفادار، معتمد رفیق اور قریبی تعلق والے کے بھی ہیں، سرپرست اور مددگار کے بھی ہیں اور آقا اور صاحبِ امر کے بھی ہیں، اسی لئے قرآن پاک میں کہیں اللہ کو اہل ایمان کا ولی کہا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے "اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا" اور خود اس زیر درس آیت میں فرمایا گیا ہے۔ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ" اور کہیں مومن بندوں کو اللہ کا ولی کہا گیا ہے، مثلاً فرمایا گیا ہے "أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝" اور کہیں مسلمانوں کو مسلمانوں کا اور کافروں کو کافروں کا ولی کہا گیا ہے مثلاً فرمایا گیا ہے" الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے " وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" — یہاں مائدہ کی اس آیت میں یہ لفظ "یار وفادار" کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ سچا دوست جس کا حق ہو کہ دل و جان سے اس کی وفاداری کی جائے اور اس کے معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھا جائے۔

آیت کے آخری جز " وَهُمْ رَاكِعُونَ "کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کہی ہیں، میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہی ہے جس کو ہماری زبان میں سر تسلیم یا سر نیاز خم کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب کمل فرمانبرداری ہے — اس بنا پر آیت کا مطالبہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اُن کی "یاری وفاداری" بس اللہ کے لئے اُس کے رسول کے لیے اور اُن اہل ایمان کے لیے ہو جو اللہ اور اس شریعت کے ہر حکم کے لیے سر تسلیم ختم کرتے ہوں پورے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہوں خاصکر اہتمام سے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں کیونکہ یہ دونوں ایمان کی نشانی اور اسلام کے اولین ارکان ہیں۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے

وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝

یعنی جو لوگ اللہ، اُسکے رسول اور مومنین کو اپنا ولی بنالیں اور اپنی "ولایت" یعنی "یاری وفاداری" کا تعلق اُن کے لئے خالص کرلیں وہ اللہ کے لشکر کے سپاہی اور خدائی پارٹی "حزب اللہ" کے ارکان واعضاء ہیں اور یہ خدائی پارٹی اور یہ اللہ کا لشکر انجام کار دشمنوں پر غالب آنے والا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ اور اُس کی اٹل تقدیر ہے۔

یہاں تک میں نے ان آیتوں کا سادہ مطلب بیان کردیا ہے ـــــ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا تھا ان آیتوں کے نزول کے وقت ان کا خاص رُخ اُس مخصوص طبقہ کی طرف سے تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا لیکن فی الحقیقت ان آیات میں ہر دور کے اُن مسلمانوں کے لئے بڑا سخت انتباہ ہے جو اپنے دنیوی مفادات اور نفس کی خواہشات کے مقابلہ میں اللہ و رسول کے احکام اور دین کے تقاضوں کو نظر انداز کردیتے ہیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ آج کی مسلمان قوم میں (جس کو لوگ ناواقفی سے "خیر امت" کہدیتے ہیں) ۹۰ فیصدی سے زیادہ کا حال یہی ہے ـــــ بہرحال یہ آیتیں ان سب مسلمانوں کو سنا رہی ہیں کہ خدا کو اور اُس کے دین کو تمہاری کوئی ضرورت اور حاجت نہیں، اگر تم اپنی بدبختی سے اس نافرمانی اور جزوی ارتداد کی حالت سے آگے بڑھ کے بالکل مرتد بھی ہو جاؤ تو اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا اور اُن سے دین کی خدمت کا کام لے گا اور پھر اُن پر اُس کا فضل و انعام ہوگا۔

اس آخری آیت نے یہ بھی صاف بتادیا کہ ہر مسلمان کہلانے والا اللہ کے لشکر کا سپاہی اور اللہ کی پارٹی "حزب اللہ" کا رکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمان کہلانے والی کسی قوم کے لیے نصرت اور غلبہ و کامیابی کا وعدہ نہیں ہے بلکہ یہ وعدہ صرف اُن اہل ایمان کے لیے ہے جنھوں نے اپنی وفاداری کو اللہ و رسول اور مومنین صادقین کے لیے خالص کرلیا ہو اور اُن کی عملی زندگی اس کی شہادت دے رہی ہو۔ بس یہی اللہ کے لشکری اور "حزب اللہ" کے رکن ہیں، انہی کے لئے فرمایا گیا ہے "فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔"

آج کل دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ملکوں میں مسلمانوں اور غیر مسلم طاقتوں کے درمیان جو ٹکراؤ ہو رہے ہیں اُن کی نوعیت ہرگز یہ نہیں کہ ایک طرف اللہ کے دوست

اور وفادار بندے ہوں اور دوسری طرف اُس کے دشمن، ایک طرف "حزب اللہ" ہو اور دوسری طرف "حزب الشیطان" بلکہ اس لحاظ سے جو صورت حال ہے وہ بالکل کھلی ہوئی ہے اور اس میں کسی کو غلط فہمی کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی اُس غیبی مدد اور نُصرت کا کوئی استحقاق نہیں ہے جس کا وعدہ اس آیت میں اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں میں کیا گیا ہے —— سچی بات یہ ہے کہ دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی اجتماعی عملی زندگی قریب قریب اتنی ہی گندی ہو گئی ہے جتنی کہ نزول قرآن کے وقت بنی اسرائیل کی تھی جس پر قرآن پاک میں جا بجا سخت تنقید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس زندگی کی وجہ سے اُن پر خدا کی لعنت ہوئی اور وہ نعمتوں سے محروم کیے گئے —— میں نے اس درس میں بار بار آپ سے کہا ہے کہ قرآن پاک میں "بنی اسرائیل" کا ذکر اتنی کثرت اور اتنی تفصیل سے جو کیا گیا ہے اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ہم مسلمان اُس کے آئینے میں اپنے چہرے دیکھتے رہیں اور اس سے سبق حاصل کرتے رہیں۔

—— نگاہ اوّلیں —— (بسلسلہ صفحہ ۹) ——

تاریخ پہ حاضری کے سوا کچھ اور نہیں کرنا پڑتا۔ ندائے ملت سے قطع تعلق کے بعد سے مقدمات کے مصارف تک کی فکر بھی وہی والد ماجد سے ہل کر کرتے ہیں —— خود ان پر بھی اس سلسلہ کا ایک مقدمہ رہا ہے[1] مگر علاً جیسے سب اُن ہی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں سلامت رکھے اور بہتر اجزائی فرمائے —— ہمارے مشیرانِ قانونی جناب عبد المنان صاحب ایڈوکیٹ اور جناب سید صغیر احمد صاحب ایڈوکیٹ کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی عنایات سے نوازے۔ ان کا خلوص بھی بالکل مثالی ہے۔

---

[1] بعض اخبارات میں ان ہی دنوں ہندوستان بھر کے ماخوذ اخبارات اور افراد کی فہرست نکلی ہے اُس میں غلطی سے چھوٹے مقدمات میں میرا نام درج ہے۔ حتیٰ کہ ندائے ملت میں یہ غلطی اسی طرح نقل ہو گئی ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ

وصایا اور نصائح کے آئینے میں

(مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

(۳)

(وصیت: بنام نصیر الدین بغدادی کا بقیہ حصہ) [تسلسل کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان محرم ۸۹ھ]

مریدین کو اپنے مشائخ کے ساتھ کیا طریقہ برتنا چاہیے؟ اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ کے صحابہؓ کا طرز عمل بہترین نمونہ ہے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا ہے کہ ہم نے بیعت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع وطاعت پر خوشحالی میں اور تنگدستی و پریشانی کے عالم میں جی چاہے یا نہ چاہے ہر حال میں"۔ ۔۔۔۔۔

اللہ تعالےٰ نے بھی اپنے کلامِ پاک میں غایت ادب رسولؐ کی تنبیہ فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ۔۔۔۔۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔

(خدا کی قسم لوگ ایماندار نہیں ہوں گے جب تک وہ اپنے آپسی جھگڑوں میں آپ کو اپنا حکم نہ بنائیں پھر آپ جو فیصلہ صادر فرمائیں اس سے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کو تسلیم کریں) ۔۔۔۔ اللہ تعالےٰ اُمت کو تحکیم رسولؐ کا حکم فرماتا ہے۔ اُن تمام معاملات میں جو اس کو پیش آئیں ۔۔۔۔۔ اگرچہ اس آیت کا سبب نزول حضرت زبیر ابن عوامؓ وغیرہ کا مقدمہ ہے، زمین کے بارے میں ۔۔۔۔ لیکن اعتبار عمومِ لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ واقعہ کا ۔۔۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے تحکیم (ثالث بنانے کا) کا حکم فرمایا۔ اُس کے بعد تنگیٔ قلب نہ ائی کرنے کا ــــــ اس لیے کہ تحکیم "وظیفۂ ظاہر" اور ادب ظاہر ہے اور زوالِ تنگیٔ قلب وظیفۂ باطن اور ادب باطن ہے ــــــ بعض لوگ حکم بنانے پر تو قادر ہوتے ہیں مگر (خلاف مزاج) فیصلے کی صورت میں تنگیٔ قلب کے ازالے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ وہ مرید رسمی جس نے خرقۂ تبرک پہنا ہے فقط صاحبِ تحکیم کی حیثیت میں ہو جائے اور جس نے خرقۂ ارادت پہنا ہے وہ ازالۂ حرج والا ہو ــــــ ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے مُرید کے اپنے شیخ کے مقابلے میں اپنے اختیار سے باہر آجانے کے متعلق ــــــ وہ اس آیت کریمہ کے مفہوم میں داخل ہے ــــــ جب مُرید شیخ کے ساتھ ادب کا راستہ اختیار کرنے کا ارادہ کرے تو وہ قرآن مجید کے ذریعے ادب سیکھے اور متنبہ ہو۔ اُس ہدایت سے جو اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ کو صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمائی ہے چنانچہ سورہ حجرات میں ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ (الیٰ قولہ)
وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتّٰى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ــ

پس مُرید غور کرے اور سیکھے اُس ادب کو جو کلام اللہ میں ہے ــــــ سورہ نور میں ہے ــــــ

عہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلٰى أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوهُ ــــــ اس آیت سے دلالت ہو رہی ہے اُس بات پر جس کو ہم نے ذکر کیا ہے یعنی شیخ کی صحبت اور اُس سے مفارقت بصیرت کے ساتھ ہو۔ بہت سی آیات میں یہ معنی موجود ہیں جو تلاش کرے گا وہ کلام اللہ میں پائے گا ــــــ آگے مُریدین کو کن باتوں کا حکم دیا جائے اُس میں بڑی تفصیل ہے۔ لیکن جس بات کی تاکید پہلے کی جائیگی وہ یہ ہے کہ تجدید توبہ کرے اس لیے کہ توبہ ہی کام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ مُرید، مُرید نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے بائیں طرف کا فرشتہ بیس سال تک کچھ نہ لکھ پائے ــــــ حفاظت توبہ پر مُرید قادر نہیں ہو سکتا سوائے دوام محاسبہ کی مدد کے ــــــ

عہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان والے بندے بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر اور جن کا عمل یہ ہے کہ جب وہ کسی اجتماعی مہم میں رسول کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر کہیں نہ جائیں۔

جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے محاسبہ کرو (دنیا میں) اپنے نفسوں کا اس سے پہلے کہ محاسبہ کیے جاؤ (یعنی قیامت میں) ـــــ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کا محاسبہ ہر فرض نماز کے بعد کرے .... جب سچائی کے ساتھ محاسبے پر مداومت کرے گا تو اس کی لغزشیں کم ہوتی جائیں گی یہاں تک کہ معدوم ہو جائیں گی ـــــ جب محاسبے کا حق ادا ہوگا تو قول و فعل میں جو لا یعنی باتیں ہوتی ہیں اُن سے باز رہے گا۔

اگرچہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہوں ـــ اس وقت اس کی فضولیات کم ہوں گی اور اس کا ظاہر "سیاستِ علم" کے قبضے میں ہوگا ـــ پھر اس بات کی توقع ہوگی کہ وہ مقامِ مراقبہ تک ترقی کرے اور اُس کا باطن بھی ظاہر کی طرح سیاستِ علم کے ماتحت ہو جائے ـــ مراقبہ اصطلاحِ صوفیا میں یہ ہے کہ اپنے قلب کو اس بات کی طرف متوجہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسکو دیکھ رہے ہیں، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے پوری طرح شرمائے گا اور ضمیر کے خطرات سے بھی اس طرح پرہیز کرنے لگے گا جس طرح حرکاتِ جوارح سے پرہیز کرتا ہے پھر اس مقام سے ترقی کر کے مقامِ مشاہدہ تک پہونچے گا اور اُس کا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے قلب نے رب کو دیکھا۔ یہی مقامِ احسان ہے جس کی طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مبارک میں اشارہ فرمایا ہے۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ (یعنی احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالےٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ اُسے دیکھ رہا ہے۔)

اربابِ مشاہدہ کے مواجید مختلف ہوتے ہیں مگر اُصول میں سب متفق ہیں فقط فروع میں اختلاف ہوتا ہے۔ .... وہ اسباب جو موثر ہیں اور مُریدین کے لیے خیرِ کثیر کو کھینچنے والے ہیں چار ہیں تمام مشائخ صوفیا اِن چار چیزوں اور اُن کے حسنِ تاثیر پر متفق ہیں ـــــ اور وہ یہ ہیں۔ قلتِ کلام۔ قلتِ طعام۔ قلتِ منام۔ قلتِ اختلاط مع الانام (یعنی لوگوں سے بلا ضرورت ملنے جلنے سے بچنا) .... مُرید کو چاہیے کہ ان چار باتوں کا خیال رکھے۔ اس کے بعد وہ ثمرات و برکات مشاہدہ کرے گا ـــــ اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ احوالِ مشائخ ہیں اور اُن کے بدایات اور نہایات ہیں اور یہ سب باتیں میراثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ـــ مشائخ کو یہ میراث حسنِ متابعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے شیوخ کے ساتھ صدقِ صحبت کی برکت سے

ملی ہے.........

وصیت :۔ ـــــــ امام نجم الدین کو

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و ایاکم ان اتقوا اللہ ـــ (ہم نے نصیحت کی اُن کو جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے اور تم کو بھی اس بات کی کہ تم اللہ سے ڈرو)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ایک شخص حاضر ہوا اور آپ سے نصیحت طلب کی آپ نے منجملہ اور نصائح کے زبان کو قابو میں رکھنے کی تاکید فرمائی ـــ اللہ اور اسکے رسول کی نصائح ہر ذی بصیرت عاقل کے لیے کافی ہیں ـــ بندہ ان نصائح پر عمل اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی درازیٔ اُمید و آرزو کو کوتاہ نہ کر دے اور موت کو برابر یاد نہ کرے منجملہ دیگر اُمورِ نافعہ کے مجالستِ اہلِ صلاح و تقویٰ اور اہلِ باطل سے علیحدہ رہنا نیز نیک ہمنشین میسر نہ آنے کی صورت میں خلوت کو لازم رکھنا بھی ہے ـــ پھر خلوت میں بھی بیکاری سے بچے کیونکہ اس سے قلب مُردہ ہو جاتا ہے بلکہ اپنے اوقات اُن اعمال سے معمور رکھے جن سے تقربِ باری تعالیٰ حاصل ہوتا ہے، اس بات کا یقین کرے کہ اُس کی جو ساعت ذکرِ حق یا اللہ سے قرب پیدا کرنے والی کسی عبادت سے خالی گزرتی ہے، وہ ساعت قیامت کے دن اُس کے لیے مستقل ایک حسرت ہوگی ـــ وہ اعمال جن سے تقرب الی اللہ حاصل ہوتا ہے، نماز، تلاوتِ قرآن، ذکر بالقلب اور مراقبہ ہیں۔

مراقبہ یہ ہے کہ بندے کے قلب میں یہ علم راسخ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دیکھ رہا ہے اور وہ اُس کے ضمیر کی پوشیدہ باتوں پر بھی مطلع ہے۔ جب ان اُمور سے فارغ ہو تو سو جائے پس نیند میں بھی سلامتی ہے۔ یہ بات بھی مناسب ہے کہ ہمیشہ طہارت پر رہے اور جب وضو ٹوٹے دوبارہ وضو کرے اور اس بات کی حتی الامکان کوشش کرے کہ قبلہ رُخ بیٹھے اور اپنے دل میں اس بات کا تصور کرے کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا ہے یہاں تک کہ اُس کو سکینہ اور وقار حاصل ہو جائے ـــ مخلوق کی تکلیف دہی کا تحمل کرے

اور بدسلوکی کرنے والے کے حق میں انتقاماً بدسلوکی نہ کرے بلکہ بدسلوکی کرنے والے کو معاف کردے اپنے علم وعمل پر نازاں نہ ہو۔ اپنے آپ کو چشم حقارت سے اور تمام مسلمانوں کو چشم احترام و تعظیم سے دیکھے۔ ہر سالک کو چاہیے کہ وہ تہجد بھی پڑھے ...... اگر ممکن ہو تو مغرب و عشا اور ظہر و عصر کے درمیان بھی نوافل پڑھ لے۔ چاشت کی نماز کا بھی خیال رکھے۔ غسل جمعہ کا اور طہارت کی حالت پر سونے کا بھی لحاظ رکھے۔ جمعہ کے دن جامع مسجد کو جلد چلا جائے اور اس جمعہ کے دن کو خاص طور پر آخرت کے لیے بنا دے (کم از کم) اس دن میں تو امور دنیا کی آمیزش نہ کرے۔ ہر روز صدقہ دے جتنا بھی ہو۔ کم ہو یا زیادہ ـــــ زیادہ نہ ہنسے ـــــ معدے کو ہلکا رکھنے کی کوشش کرے ـــــ نفلی روزے بھی رکھے ـــــ ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھ لے اور اس میں اضافہ کر دے تو اچھا ہے ورنہ ہر ماہ ایام بیض (۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ) کے روزے رکھے اور یہ کم سے کم ہیں ـــــ اپنے تمام جوارح کو مخالفت شرع سے محفوظ رکھے خاص طور پر آنکھ اور زبان کو قابو میں رکھے کہ آنکھ سے کسی ناجائز چیز کو نہ دیکھے اور زبان سے غیبت نہ کرے ـــــ بدنظری اور غیبت ان دونوں چیزوں میں لوگ زیادہ مبتلا ہیں ـــــ ـــــ راستے میں جب چل رہا ہو تو ذکر قلبی کرتا رہے کوئی قدم غفلت کے ساتھ نہ اٹھائے ـــــ میں نے جتنی باتیں ذکر کی ہیں اُن کو پورا کرنے پر وہی لوگ قادر ہوتے ہیں جو دنیا سے بے پرواہ ہوتے ہیں ـــــ (اور آخرت کا دھیان رکھتے ہیں) انسان کو چاہیے کہ تضرع و زاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ان باتوں کو طلب کرے اور یہ بھی جان لے کہ (اس دنیا میں) اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جنکو ان باتوں پر عمل کرنا نصیب ہے ـــــ اُن کا نصب العین ایک ہی نصب العین ہے (اللہ کو راضی کرنا اور آخرت کی طیاری) .....

نمازی کو چاہیے کہ نماز کی ہر حالت کی حفاظت کرے۔ بایں طور کہ قیام، رکوع اور سجدے وغیرہ میں جو کلمات زبان سے کہے اُسکے معنٰی دل کے اندر سمجھے تاکہ معنٰی کا دھیان اُس کے دل کے وسوسوں کو دور کر دے ـــــ یہ "اصل کبیر" ہے اسکو خوب یاد رکھے ـــــ اسی طرح تلاوت قرآن اور اذکار میں بھی معنٰی کا دھیان رکھے ـــــ اللہ ہی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ

(چودھویں مجلس)

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

۶ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۶۹ء (شنبہ) ۹ بجے دن

پہلے کچھ دیر قرآن شریف کا درس ہوا، پھر مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث پڑھی گئی، اس کے بعد مکتوباتِ امام ربانی کا ایک مکتوب ۳۶ بنام خواجہ صلاح الدین احمد آدمی، پڑھا گیا، اور اس کا ترجمہ سنایا گیا، اس کے بعد مجلس شروع ہوئی، حاصل کلام یہ تھا کہ معرفت سے پہلے آدمی کچھ اور رہتا ہے معرفت کے بعد کچھ اور، معرفت سے پہلے وہ جو معاملہ کرتا، اور زبان سے جو کہتا ہے، وہ اس کا فعل نہیں ہوتا اس کی جہالت اور ناواقفیت کا کرشمہ ہے، معرفت کے بعد گویا ایک نیا وجود ظہور میں آیا، اب اس کے ساتھ اس کے شایانِ شان معاملہ کیا جائے گا، اس پر واقعہ بیان فرمایا، کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ایک صاحب رہتے تھے، دو برس انھوں نے خدمت کی، ایک دن ان بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی فرمائش یا تمنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ حضور مجھے کیمیا کا شوق ہے، فرمایا کہ تم نے پہلے نہ بتایا، یہ تو معمولی بات ہے، اب اس کا سامان مہیا کرو، کیمیا بنانا سکھاؤں، انھوں نے عرض کیا کہ رانگ، کڑھائی سب ساتھ

رکھتا ہوں، ان بزرگ نے کہا اچھا کڑھائی چڑھاؤ کڑھائی میں جوش آیا تو دروازہ کے سامنے ایک بوٹی کیطرف اشارہ کرکے فرمایا یہ ڈالدو، اس کے ڈالتے ہی رانگ سیاہ ہوگیا، اوپر کی تہہ ہٹائی تو معلوم ہوا کہ چاندی ہے، وہ صاحب بہت خوش ہوئے، کہنے لگے کہ اس بوٹی کو تو میں روزانہ اپنے پاؤں سے روندتا ہوں، اور اس پر جوتا پہن کر چلتا پھرتا ہوں، فرمایا کہ نہیں تم اس کو نہیں روندتے تھے، تمہاری جہالت اس کو روندتی تھی۔

فرمایا کہ جہالت اپنا کام کرنا نہیں چھوڑتی، انسانی فطرت اپنا کام کرتی ہی رہتی ہے، دریا پر پل باندھا جاتا ہے، پائے زمین میں گلائے جاتے ہیں، پل پہاڑ کی طرح کھڑا رہتا ہے، مگر دریا نہیں مانتا، اس کے پایوں سے ٹکراتا رہتا ہے، ان کو ہلاکر گرا دینا چاہتا ہے، اسمیں کامیاب تو نہیں ہوتا، مگر اپنا کام نہیں چھوڑتا، پل پرانا ہو کر گر جاتا ہے، مگر دریا کی فطرت نہیں بدلتی، وہ قوت متضادہ ہر وقت اس سے ٹکراتی رہتی ہے، یہی انسان کا حال ہے، بنی اسرائیل کو دیکھیے کیسی کیسی آیات بینات، روشن معجزات دیکھے، اللہ نے سمندر ان کے لیے پایاب کردیا، اور وہ گزر گئے، اس سب کے دیکھنے کے بعد بھی ان کی جہالت نہ گئی، اور ان کی فطرت نہ بدلی، لوگوں کو بت پرستی کرتے دیکھا تو خود بھی بت پرستی کا شوق ابھر آیا، اور حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ ہمیں بھی پرستش کے لیے ایک نیا معبود بنا دیجیے "قالوا یا موسیٰ اجعل لنا الٰہاً کما لھم اٰلھۃ قال انکم قوم تجھلون"۔ (بولے کہ موسیٰ ہمارے لیے بھی ان کے معبودوں کی طرح ایک معبود بنا دو۔ موسیٰ نے کہا کہ تم بڑے جاہل لوگ ہو۔)

بعض لوگ نماز کے بھی پابند ہوتے ہیں، حج بھی کرلیتے ہیں، ذاکر شاغل بھی ہوتے ہیں، تجلیات اور انوار بھی ان کو نظر آتے ہیں، لیکن طہارت کے چھوٹے چھوٹے مسائل ان کو یاد نہیں ہوتے، اور ایک معمولی حکم شرعی پر بھی عمل کرنا دشوار ان کو ہوتا ہے۔

فرمایا کہ درستگی عقائد کے لیے ایک مکتوب بہت عمدہ ہے، مدت سے خیال آتا ہے کہ اس کو الگ چھاپنا چاہیے، اگر عقیدہ درست ہو تو اعمال خود درست ہوجائیں گے، اعمال اور عبادات کے بارے میں بھی ضروری ضروری ہدایات ہیں، گویا ایک دستور العمل ہے۔

راقم سطور کے دریافت کرنے پر کہ حضرت سید آدم بنوریؒ، اور خواجہ محمد معصوم

رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے میں کیا فرق ہے؟ (دونوں حضرت مجددؒ کے خلفائے خاص ہیں، اور دونوں سے الگ الگ سلسلے جاری ہوئے) فرمایا کہ دونوں طریق میں کوئی (بنیادی) فرق نہیں ہے، موقع اور وقت کے لحاظ سے دونوں حضرات نے سلوک کی تعلیم کی ہے، لوگ اس کو سلوک مقررہ سے الگ سمجھ لیتے ہیں، فرمایا کہ جہاں تک غور کیا، اس راہ میں سمجھا اور پڑھا ہوا کام نہیں دیتا، یہ تو الہامی چیز ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے اصلاح و تربیت کے طریقوں کا القاء ہوتا ہے، اُسی سے صحیح اصلاح و تربیت ہوتی ہے۔ حکیم سید ابو حبیب صاحب دسنویؒ کے صاحبزادے مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی آئے تھے، اُن کو اکثر سوالات کا جواب خلاف توقع ملا، وہ لطیفۂ قلب کو پوچھنے لگے، میں نے کہا کتاب اور کاغذ پر جس کو لطیفۂ قلب لکھا ہے، وہ قلب نہیں، حقیقت قلب کچھ اور ہے، جس طرح نقشہ میں جہاں "مکہ" لکھا ہوتا ہے، وہ مکہ نہیں ہے، مکہ کہیں اور ہے، اگر کوئی اس پر انگلی رکھ کر کہے، یہ مکہ ہے تو وہ مکہ نہیں ہے۔ انھوں نے دریافت کیا، کہ توجہ کس طرح دی جاتی ہے، اور توجہ کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے کہا کہ یہ لفظ غلط ہے، اغیار کا خیال نکال کر کے پہلے اپنے کو کامل بنانا چاہیے، جو بزرگ توجہ نہیں دیتے، اُن کی توجہ خود بخود پڑتی ہے۔ یہ مقررہ چیزیں کام تو دیتی ہیں، مگر کبھی گڑبڑ بھی ڈال دیتی ہیں، ان بزرگوں کے سارے ارشادات حدیثوں کا ترجمہ ہوتا ہے، حضرت مجدد صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے "کہ دوسرے طریقوں میں تعلقات ماسوی اللہ کا منقطع کرنا اور انفس و آفاق کی نفی کرنا طریق کا پہلا قدم ہے، اور اثبات پر مقدم ہے، اللہ نے مجھ کو القا کیا کہ ذات باری سے تعلق پیدا کرنا خود ماسویٰ سے منقطع ہونے کا سبب ہوگا، میں عرصہ تک اس پر غور کرتا رہا کہ اس کی دلیل و مآخذ کیا ہے؟

ماسویٰ اللہ سے انقطاع کے بغیر اللہ سے تعلق، اور اس کی ذات کا استحضار اور استقرار کیسے ہوگا؟ میری عادت تھی کہ جو خیال میرے دل میں پیدا ہوتا تھا، اس کو دل میں رکھتا تھا، استفسار نہیں کرتا تھا، اللہ تعالےٰ بزرگوں کے دل میں خود خیال پیدا فرما دیتا تھا

---

[۵۱] مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے برادر اکبر، اور حضرت پیر ابو احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز و خلیفہ،

اور مجھے اپنے سوال کا جواب مل جاتا تھا، ایک دن والد صاحب کو وضو کرا رہا تھا، فرمایا کہ حضور نے امام حسنؓ کو جو دعا سکھائی تھی وہ تم پڑھتے ہو؟ "اللّٰھمّ اقذف فی قلبی رجاءك واقطع رجائی عمّن سواك حتّٰی لا ارجو غیرك" میرا مطلب حل ہوگیا، کہ اس میں اللہ کی امید دل میں پیدا ہو جانے، اور اس کے جذر قلب میں متمکن ہو جانے کی دعا پہلے کی گئی ہے، پھر غیر اللہ سے امید منقطع ہو جانے کا سوال کیا گیا ہے، کہ یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے، کتنے عالی مرتبہ سلوک کی اپنے نواسہ کو تعلیم فرمائی گئی ہے، کیسی کیسی محنتیں اور مشقتیں لوگ برداشت کرتے ہیں، اللہ کے رسول صلعم نے کتنی آسانی سے تعلیم فرمادی ہے، لیکن کبھی اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

حیدر آباد میں سلسلۂ چشتیہ کے ایک مشہور شیخ حضرت شاہ خاموش صاحبؒ تھے۔ ان کا شعر ہے:-

بٹھایا سینکڑوں کر کر کے اس لیلیٰ کو محمل میں
جمایا کس مصیبت سے تصور یار کا دل میں

میرے دل میں آیا کہ یہ تو واقعہ کے خلاف بات ہے۔ تصور مصیبت سے جمایا نہیں جاتا، مٹایا اور مٹایا جاتا ہے، یہاں بالکل شروع میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا تھا، اس میں ایک پنجابی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا: کہ ذاکرین اپنا حلقہ، ذکر چھوڑ چھوڑ کر اس تبلیغ میں شامل ہوگئے ہیں۔ میں نے مجمع میں تو کوئی تردید نہیں کی، لیکن بعد میں اپنے دوستوں سے کہا کہ ذکر چھوڑا ہی نہیں جا سکتا، وہ ذکر ہی نہیں جو آسانی سے چھوٹ جائے، نمک کی کان میں جو گر جائے، وہ نکل نہیں سکتا، ع

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد

کوئی اگر ذکر (حقیقی) کو چھوڑنا چاہے تو ذکر اس کو نہیں چھوڑتا۔

کورائی میں ایک افغانی مفتی صاحب تھے، وہ سرحد میں کسی بزرگ سے بیعت تھے، وہ مجھ سے کہنے لگے، کہ ہم مراقبہ میں جب بیٹھتا ہے، تو نیند آنے لگتی ہے، میں نے کہا کہ بڑی عمدہ بات ہے، مراقبہ میں حواس ہی کو بہ تکلف معطل کیا جاتا ہے، نیند میں وہ بلا تکلف معطل ہو جاتے ہیں، یہ جو مراقبات کیے جاتے ہیں دماغی ہیں، ان میں خیال کو کسی ایک چیز پہ جمانا ہوتا ہے، لیکن جو مراقبات قلبی ہوتے ہیں، ان میں بیداری رہتی ہے، حدیث

میں آتا ہے: "تنام عینی ولا ینام قلبی"۔ (میری آنکھ سوتی ہے دل نہیں سوتا)، کسی کی انگوٹھی رات کو گم ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں چراغ لاؤ، میں کہتا ہوں کہ چراغ بجھا دو، تاکہ انگوٹھی اندھیرے میں چمکے اور نظر آجائے، جتنی یہ روشنی بڑھتی ہے، وہ روشنی ماند ہوتی ہے:۔ "إن فی ذلك لذكرى لمن كان له قلب أو ألقى السمع وهو شهيد" بے شک اس میں نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جن کے پاس دل ہو اور وہ متوجہ ہو کر سنیں۔

فرمایا کہ بعض حضرات کے یہاں مراقبات اصل ہیں، اور انھوں نے مراقبات کا ماخذ و دلیل "یتفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض" کو قرار دیا ہے۔ وہ عالم مراقبہ میں پوری سیر تکوینی کرتے ہیں۔ اس راہ کے سالکین کے یہ مصرعہ ورد زبان رہتا ہے[1]

بالا ردم بالا ردم، بالا تراز بالا ردم[1]

میں عرض کرتا ہوں، کہ اس میں مُسلم اور غیر مُسلم شریک ہیں، دونوں سیر تکوینی کرتے ہیں، اس تفکر سے پہلے ایک اور چیز ہو، جو اس نماز کے لیے بمنزلۂ وضو اور طہارت کے ہے، وضو اور طہارت نماز پر مقدم ہے، قرآن شریف میں ہے۔ "الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض"[2] جب اس تفکر سے پہلے ذکر ہو گا تو اخلاق و نفوس مزکّٰی ہو جائیں گے، اور یہ تفکر فی الخلق مُثمر معرفت، اور موصل الی اللہ ہو گا، یہ وہ تفکر ہے جس میں غیر مسلم شریک نہیں، پہلے اپنے دماغ کو مزکّٰی و مطہّر بنالو

---

[1] راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر حضرت نے ایک قادری بزرگ کی تصنیف جو قلمی اور قدیم تھی، نکال کر دکھلائی اس میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا، جس میں وسط میں اوپر سے نیچے کی طرف روح القدس، جبریل امین، عرش، کرسی، ...... لکھا ہوا تھا، اور کنارہ کی طرف زحل، مشتری، مریخ، شمس وغیرہ کے نام لکھے تھے یہ مراقبۂ تفکر کا ایک دائرہ تھا۔

[2] جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور حالت استراحت میں اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں۔

پھر اس دائرہ (خلق) سے نکلنے کی قوت پیدا ہوگی ورنہ یہیں کھیلتے رہ ہوگئے، راکٹ میں آتنی بلندی پر پہونچے، راکٹ ابھی بہت نیچے ہے کیونکہ چاند بھی خلق ہے۔ اللہ کے بندے خلق سے کہیں اونچے پہونچتے ہیں، اللہ کے کثیر ذکر سے دماغ مزکیّٰ اور مصفیٰ ہوجاتا ہے، اب جدھر سے جائیے گا وسعت ہی وسعت ہے، اللہ کے ذاکر کو تنگی ہوتی ہی نہیں ہے۔

فرمایا کہ نیچی داڑھی سب کی دیکھی، پائجامہ اونچا بہت کم لوگوں کو دیکھتا ہوں، حالانکہ میرے خیال میں جتنی تاکید و وعید اس پر آئی ہے، داڑھی پر نہیں آئی ہے۔

فرمایا کہ تنہا انسانی قوت سے کام نہیں ہوتا، جب انسانی طاقتوں نے ہتھیار ڈال دئیے ہیں، اور انسان نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا ہے، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ظاہر ہوئی ہے، اور اس کی قوت نے کام کیا ہے، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنی والی طاقت اور کوشش صرف کرے۔ یہی معنی ہیں آیت قرآنی کے: "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وإن اللہ لمع المحسنین"۔

(اور جو جان لڑوائیں گے ہماری خاطر ہم ضرور ڈالیں گے انھیں اپنے راستوں پر اور بے شک اللہ اپنے پرستاروں کے ساتھ ہے)

میں نے جب مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ مطلب بیان کیا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کئی بار سینہ سے لگایا، اور دور تک پہونچانے آئے، اگر محض اپنی قوت، انسانی عزائم اور ہمتوں سے کام لیا جائے گا، تو کام نہیں بنے گا۔ جب تدابیر معطل ہوجائیں اور ہمت ٹوٹ جائے تب معاونت خداوندی شروع ہوتی ہے، جہاں سپر اور ہتھیار ڈال دیے، وہیں اللہ نے سپر دی اور ہتھیار پہنائے، بدر کا کیا قصہ تھا؟ جب حضور صلعم نے فرمایا " اللھم إن تھلك ھذہ العصابۃ لن تعبد۔" (پروردگار گر تونے اس جمعیت کو ہلاک ہونے دیا تو پھر تیری پرستش کرنے والا کوئی نہ ہوگا) تو مدد آئی، سورہ یوسفؑ میں ہے: "حتّٰی إذا استیئس الرسل وظنوا أنھم قد کذبوا جاءھم نصرنا"۔

(یہاں تک کے جب مایوس ہونے لگے پیغمبر اور انھیں خیال گزرنے لگا کہ نصرت کا وعدہ یوں ہی تو نہیں تھا تو آگئی ہماری مدد)

ہتھیار ڈال دینے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے ہی سے ہتھیار ڈال دو، پہلے ہتھیار پہنو، پہن کر لڑو، پھر ایک موقع آئے گا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنی فرودگاہ سے یہ سوچ کر نہیں نکلے تھے کہ دریائے دجلہ میں گھوڑے ڈال دیں گے، جب موقعہ آگیا گھوڑے ڈال دیئے، اللہ نے جو قوت دی تھی وہ ختم کر دی، اب اللہ کی قوت نے دستگیری کی۔

ضلع بجنور میں ایک صاحب آملہ کا نوش دارو بناتے تھے، جو نہایت قوی ہوتا تھا اور جاں بلب مریضوں کے لیے جواہر مہرہ کا کام دیتا تھا، وہ کہتے تھے کہ آملہ کو جوش دیتے وقت، اسمیں ایک قوت پیدا ہوتی ہے، ٹھیک اسی وقت اس کو اتار لینا چاہیے اگر آگ پر رہنے دیا گیا تو وہ قوت ختم ہو جائے گی، اور آملہ بے کار ہو جائے گا۔ وہ اس کا ٹھیک وقت پہچانتے تھے، لڑکے کو بھی بتا مگر اس کو اس کی صحیح پہچان نہیں آئی۔ وہ اس کو بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، اسی طرح خاص موقعوں پر انسان میں ایمان و توکل کی ایک خاص کیفیت اور ایک روحانی طاقت ابھرتی ہے، اگر اسی وقت اس سے کام نہ لیا جائے، تو وہ ختم ہو جاتی ہے، پھر تکلف سے پیدا نہیں ہوتی، اگر حضرت سعد بن ابی وقاص اس وقت دیر لگاتے، اور تدابیر سے کام لیتے تو وہ اس طرح دریا کو عبور نہیں کر سکتے تھے، یہ قوت اختیاری، اور دائمی نہیں، بجلی کی طرح ظاہر ہوتی اور غائب ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے حضرت یعقوبؑ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند	کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
ز مصرش بوئے پیراہن شمیدی	چرا در چاہ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برق جہانست	دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم	گہے بر پشت پائے خود نہ بینم
اگر درویش بر حالے بماندے	سر دست از دو عالم بر فشاندے

فرمایا کہ جب کوئی آکر کہتا ہے کہ سب سے بڑا گنہگار میں ہوں، تو میں عرض کرتا ہوں کہ تمہاری ہی ضرورت تھی، یہ بڑے کام کی چیز ہے، اللہ کی راہ میں ان (معاصی) کی قربانی دو، نوٹوں کے توڑانے سے کام چلتا ہے، ملائی میں ملا کر کھائے نہیں جاتے، ان نوٹوں

کے توڑانے کے لیے بنک ہے، یہ توبہ اور استغفار کا بینک ہے، جہاں یہ نوٹ توڑ لے جاتے ہیں، اور جہاں ان کی مانگ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ومن یدع مع اللہ الٰہاً آخر لا برھان لہ بہ فإنما حسابہ عند ربہ إنہ لا یفلح الکافرون" (اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود کہ جس کے لیے کوئی دلیل اس کے پاس نہیں ہے تو اس کا حساب پروردگار کے پاس ہوگا۔ یاد رہے کہ کافر فلاح یاب نہیں ہو سکتا۔) اب اس کی اصلاح وتلافی کی تدبیر بتاتا ہے "وقل رب اغفر وارحم وأنت خیر الراحمین" (اور کہو کہ اے پروردگار بخش دے اور رحم فرما دے۔ کیونکہ تو سب سے اچھا رحم فرمانے والا ہے۔)

فرمایا کہ پہلے انسان دبلا پتلا، سوکھا اور لاغر ہوتا ہے، پھر وہ گوشت، گھی، میوے اور مقویات وعمدہ غذائیں کھاتا ہے، تو شادابی اور تازگی آتی ہے، گوشت چڑھتا ہے، پھر ورزش، کسرت کرتا ہے، پھر جب اس کا بدن کسرتی اور طاقتور ہو جاتا ہے، تو وہ میدان میں اترتا ہے، پہلوانوں سے دو دو ہاتھ کرتا ہے، اور کشتی لڑنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی تینوں مرحلے سورہ والعصر میں بیان کیے گئے ہیں۔ "إلا الذین آمنوا" یعنی ایمان لاکر، اپنے اعضاء رئیسہ اور دل و دماغ کو صحیح غذا پہونچاؤ، پھر ان پر عمل کرو، جو بمنزلہ کسرت و ورزش کے ہے۔ "وعملوا الصالحات" اب اکھاڑہ میں اترو، اور اپنے ایمان و عمل صالح کا جوہر دکھاؤ، دوسروں کو حق و صبر کی تلقین کرو، اب تم دعوت و تبلیغ کے قابل ہوئے، اب اس میں سستی کروگے، یا بخل سے کام لوگے، تو گنہگار ہوگے، "وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر"۔ اگر کوئی شخص تر و تازہ و فربہ ہو، اور وہ اپنی طاقت کا استعمال نہ کرے تو گنہگار، اور اگر تندرست و طاقتور ہونے سے پہلے کسی سے کشتی بدلے، اور اکھاڑہ میں خم ٹھونک کر اتر آئے، تو نادان اور قصوروار، ایمان و عمل صالح سے پہلے دعوت، غلطی، اور ایمان و عمل صالح کے بعد خاموش رہنا، اور دوسروں کو دعوت نہ دینا غلطی ہے، یہاں ایک لطو میاں تھے، بڑے کسرتی اور پہلوان مگر لڑے کسی سے نہیں۔

فرمایا کہ کئی بار یہ خیال آیا، کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہی صحابہ کرامؓ میں یہ حالات کیسے رونما ہوئے، اور ان میں اتنی جلدی

اختلافات کی صورت کیسے پیدا ہو گئی' غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو چیز جتنی اعلیٰ اور قیمتی ہوتی ہے' اتنی ہی نازک اور ذکی الحس ہوتی ہے۔ انسان کے اعضاء میں آنکھ بڑی اعلیٰ اور قیمتی چیز ہے اتنی ہی نازک اور ذکی الحس ہے' کہ ایک ذرا سا کوئلہ کا ذرہ برداشت نہیں کر سکتی' فوراً کھٹک پیدا ہو جاتی ہے' اس کے مقابلے میں پاؤں میں کتنی قوت برداشت اور صلاحیت ہے کہ کنکروں اور پتھروں پر چلتا ہے' اور کوڑے کرکٹ پر پڑتا ہے' اور اس میں فرق نہیں پڑتا' اچھا ہونا' ارفع ہونا دلالت کرتا ہے کہ نازک بھی ہے' آنکھ کو بار بار صاف کرنے اور دھوتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے' بال بھی آئے گا تو بے چین کر دے گا' جسمیں قوت زیادہ بڑھی ہوئی ہے نزاکت بھی زیادہ ہے۔

مولانا نعمانی کی تالیفات

جن کے مطالعہ سے دینی حقائق پر یقین اور عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

معارف الحدیث جلد اوّل ایمانیات' کفر و نفاق' ابواب آخرت' قبر' برزخ' قیامت' حشر' صراط' میزان' جنت' دوزخ اور تقدیر سے متعلق احادیث نبوی کی تشریح اور شکوک و شبہات کا اطمینان بخش جواب ... قیمت ۵/-

جلد دوم اصلاح اخلاق اور تزکیہ قلب و نفس سے متعلق احادیث اور دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والے حضورؐ کے مواعظ کی نہایت موثر تشریح۔ ہر صاحب ایمان کے لیے بہترین روحانی غذا ... قیمت ... ۵/۲۵

جلد سوم طہارت اور نماز سے متعلق ساڑھے تین سو سے زیادہ احادیث کی تشریح۔ شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ اور مجتہدانہ طرز فکر کی روشنی میں ... قیمت ۵/۵۰

جلد چہارم زکوٰۃ' صوم' حج سے متعلق احادیث کی تشریح اور احکام کے مقاصد اور حکمتوں کا بیان۔
قیمت ... ۵/۲۵ (مجلد کا اجرت ۱/۲۵)

معارف الحدیث جلد پنجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کلمات کے ذریعہ اللہ کا ذکر کرتے تھے اور مختلف احوال و اوقات میں جو دعائیں کرتے تھے اور جن کی آپ نے امت کو تلقین فرمائی وہ سب اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ حضورؐ کے ہر امتی کے لیے تحفہ ... قیمت ۶/۵۰

اسلام کیا ہے؟ (اردو) قیمت ... ۲/۵۰
اسلام کیا ہے۔ ہندی اڈیشن ۱/۴ انگریزی اڈیشن ۸/-

دین و شریعت ... قیمت ۳/۷۵
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے۔ قیمت ۵۰/
کلمہ طیبہ کی حقیقت ۵۰/ نماز کی حقیقت ۱/۲۰
برکات رمضان ۱/- ... آسان حج ۷۵/-
آپ حج کیسے کریں۔ حجاج کے لیے بہترین ہدایت نامہ ۲/-
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ ... قیمت ... ۷/-
مکتوبات خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ قیمت ۲/۵۰
حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت۔ قیمت ۳/۵۰
ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ۔ ۲/۵۰

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو

قرآن کی نوید فتح

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(۲)

مکر و فریب، سازشی ذہن، مجرمانہ و مریضانہ ذہنیت اور تخریبی ذہانت نے (جو احترام انسانیت کی منکر ہے اور عقل و اخلاق کے حدود کا کوئی لحاظ نہیں کرتی، جو انانیت اور منفی رُخ پر چلتی ہے) تاریخ میں متعدد بار بظاہر ایسی شاندار کامیابی اور فتوحات حاصل کی ہیں کہ لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کی فتح مندیوں اور پیش قدمیوں کو دیکھ کر اکثر انسانی تاریخ پر شبہ ہونے لگا اور اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ حق کی قوت و صداقت اور حُسنِ انجام اور اہلِ تقویٰ و اہلِ صدق کی فتح کا یقین متزلزل ہو جائے اور اس پر اعتماد جاتا رہے۔ اس تخریبی قوت نے بارہا تاریخ میں ایسے ہنگامے برپا کیے ہیں کہ ان کے سامنے عزم و استقامت کے پہاڑ بھی متزلزل ہو گئے اور بڑے سے بڑے فلسفی اور علماء مذاہب بھی اپنی جگہ سے ہل گئے۔ آزمائش کی ان نازک گھڑیوں میں جو حیرت و اضطراب اور شک وشبہ دلوں میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی نہایت بلیغ تصویر ہمارے سامنے رکھ دی ہے

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ — یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہو گئے

وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا أَتَاهُمْ
نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا
يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ
الْمُجْرِمِينَ ١

اور ان کو گمان ہونے لگا کہ ان سے
یونہیں کہدیا گیا، پہونچی ان کو ہماری
مدد بس بچادیا گیا اس عذاب سے جس کو ہم نے چاہا،
اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹایا جاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ
أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ
وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ
وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا
هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ
وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ٢

جب وہ آچڑھے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے
سے بھی اور جب پھیل گئیں آنکھیں
اور آگئے کلیجے منہ کو اور گمان کرنے لگے
تم اللہ سے طرح طرح کے گمان۔ یہ موقع
تھا جہاں آزمائے گئے مسلمان اور
ہلائے گئے بُری طرح۔

انسان کی نفسیات ہے کہ وہ ہر غلبہ و فتح سے متاثر ہوتا اور اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔ خواہ وہ کیسی ہی وقتی، عارضی، یا کیسی ہی حقیر اور غیر اہم فتح ہو۔ قرآن مجید نے اس نفسیات کا بہترین علاج پہلے ہی کردیا ہے۔ ارشاد ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ
كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ
قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ
وَبِئْسَ الْمِهَادُ ٣

یہ کافروں کا شہروں شہر دوڑ دوڑ پھرنا تمہیں
دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ چند دن کی بہار ہے۔
اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔
اور بُرا ٹھکانا ہے۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ
إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغْرُرْكَ
تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ٤

نہیں مجادلہ کرتے ہیں اللہ کی آیات میں
مگر کفر کرنے والے، سو نہ دھوکا دے تم کو
ان کا شہروں میں دور دورہ۔

---

۱ سورۂ یوسف آیت ۱۱۰ ۲ سورۂ احزاب ۱۱ ۳ آل عمران ۱۹۶ ۴ سورۂ مومن ۴

اس نے اس کمزور نفسیات اور ذہن کا بھی علاج کیا ہے جو آسانی کے ساتھ مکر و فریب اور جعل سازی و سازش کا شکار ہو جاتا ہے، اس کو بار بار تنبیہ اور آگاہ کیا ہے کہ ان سازشوں و فریب کاریوں اور ظاہری کامرانیوں کا انجام ذلت و ناکامی اور فضیحت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں، یہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور، بودی اور بے حقیقت ہیں۔

وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ[1]	اور بے شک گھروں میں سب سے بودا گھر کڑی کا گھر ہے۔ اگر یہ جانتے ہوں۔

اس نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ شر سے خیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا جس چیز کی بنیاد اور جڑیں اچھی زمین یا فطرت سلیم میں پیوست نہ ہوں وہ ہر لمحہ اور ہر وقت خطرے کی زد میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَمَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ[2]	یا وہ (اچھا ہے) کہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد رکھی ایک گرنے والے غار کے کنارے پر، پس وہ لے گرا اس کو آتش دوزخ میں؟ اور اللہ نہیں سمجھ دیتا ہے ظالم لوگوں کو۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ[3]	اور گندے کلمہ کی مثال ایک برے درخت کی سی ہے کہ اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جاوے کچھ بھی ثبات اسے نہ ہو۔

وہ حضرت موسیٰ کی زبان سے جادوگروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ[4]	کہا موسیٰ نے کہ تم جو لیکر آئے ہو وہ جادو ہے یقیناً اسے اللہ ابھی درہم برہم کرے گا اللہ نہیں بننے دیتا ہے فسادیوں کے کام۔

وہ مکر و فریب اور سازش و تخریب کا عام قانون اور اس کا انجام اور حشر بتاتے

---

[1] سورہ عنکبوت ۴۱ [2] سورہ براءت ۱۰۹ [3] سورۂ ابراہیم ۲۶ [4] سورۂ یونس ۸۱۔

ہوئے کہتا ہے۔

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا [1]	اور نہیں پڑتا ہے برے منصوبوں کا وبال اصل میں مگر منصوبہ سازوں پر۔ پس کیا وہ انتظار دیکھ رہے ہیں اگلوں کے حشر کا۔ سو تم اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤگے ہرگز۔ اس کے دستور میں کوئی تغیر تم کو نہیں ملے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ [2]	اور جو لوگ ناپاک سازشیں کرتے ہیں (اللہ اور رسول کے خلاف) اُن کے لیے بڑا سخت عذاب ہے اور رہیں ان کی سازشیں تو وہ کارگر ہونے والی نہیں۔

اس نے ایک ایسی عالمی حقیقت ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ جو زمان و مکان، نسل و وطن، کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست سے بالاتر اور ان سب پر غالب ہے، وہ ان لوگوں کی جو حکام و سلاطین کی کامیابیوں، مہم پسندوں اور حوصلہ مندوں کی فتوحات اور پیش قدمیوں سے مرعوب اور متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ پرواہ نہ کرتے ہوئے صاف اعلان کرتا ہے کہ

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ [3]	بس صبر سے کام لیجیے انجام کار کامیابی خدا ترسوں کے ہی لئے ہے۔
وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا [4]	اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل کا چراغ بجھ گیا بے شک باطل ہی کو نابود ہونا تھا۔

یہودیوں کے بالمقابل عرب باوجود اپنی ان تمام کمزوریوں اور خامیوں کے جنگی

[1] سورہ فاطر ۴۳ [2] سورہ فاطر ۱۰ [3] سورہ ہود ۴۹ [4] سورۃ اسراء ۸۱۔

نشاندہی راقم سطور کی اکثر تحریروں و تقریروں میں موجود ہے اور جن میں بہت صفائی گوئی و صراحت سے کام لیا گیا ہے انسانیت عامہ کی دعوت و ہدایت اور عالمی و بین الاقوامی پیغام کے حامل و داعی ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے، وہ اب بھی اس دین کے علمبردار ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سب سے پہلے نوازا اور مقام سبقت عطا فرمایا ان کے پاس وہ میراث اور وہ دولت مشترکہ ہے جس میں دنیا کی ساری قومیں اور نسلیں حصہ دار ہیں۔ اس میں یہود کے "بنی لاوی"[1] یا ہندوستان کے پنڈتوں اور برہمنوں کی طرح کی اجارہ داری نہیں، اس میں اعتبار نسل و خون کا نہیں بلکہ شوق و طلب، ذوق جستجو، حسن عمل، جہاد میں سبقت اور سعی و جدوجہد میں مقام فضیلت کا ہے۔ امام احمد ابن حنبل اپنی سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ

لو کان العلم بالثریا لتناولہٗ	اگر علم ثریا پر بھی ہوتا تب بھی فارس کے
اُناسٌ من ابناء فارس	کچھ لوگ اس کو حاصل کر لیتے[2]

عربوں نے ہمیشہ ان تمام لوگوں کا خوش دلی اور عالی ہمتی سے اعتراف کیا ہے جنھوں نے علوم دینیہ میں کمال پیدا کیا خواہ وہ کسی جگہ سے تعلق رکھتے ہوں انھوں نے ان کی امامت و پیشوائی تسلیم کی، اور ان کی تعریف اور مدح و توصیف میں وہ الفاظ استعمال کیے جو انھوں نے اپنے ہاں کے فضلا اور اہل کمال کے لئے بھی استعمال نہ کیے تھے۔ انھوں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶) کو حدیث میں امیر المومنین کا درجہ دیا۔ اور صحیح بخاری کے متعلق "اصح کتاب بعد کتاب اللہ" کے الفاظ استعمال کیے۔ امام ابو المعالی عبد الملک الجوینی نیشاپوری (م ۴۷۸) کو امام الحرمین کا لقب دیا۔ امام غزالی (م ۵۰۵) کو حجۃ الاسلام تسلیم کیا موالی اور اہل عجم پہلی صدی ہجری کی وسیع اسلامی مملکت میں مرجع علم اور سرچشمہ فیض بن چکے تھے۔ اور علم و افتاء، اور فقہ و حدیث کی مسند ان کے سپرد تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو طبقات، سیر اور تراجم کی کتابوں اور اسلامی تہذیب کی پوری تاریخ سے آشکارا ہے۔

---

[1] حضرت ہارون کی اولاد جو تمام مذہبی مناصب کی نسلاً بعد نسل حقدار ہیں۔

[2] مسند امام حنبل ج ۲ ص ۲۹۶

یہ تسلسل اسلام کی اِن روشن اور تابناک ابتدائی صدیوں میں اس طرح قائم رہا کہ علامہ ابن خلدون مغربی (م ۸۰۸) بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ عجیب بات ہے کہ ملت اسلامیہ کے اکثر اہل علم واہلِ کمال سرزمین عجم سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواہ علوم شرعیہ ہوں یا علوم عقلیہ، باوجود اس کے کہ ملت عربی ہے اور صاحب شریعت بھی عرب ہیں، چنانچہ علم نحو کے موسس سیبویہ ہیں اس کے بعد ابوعلی فارسی اور ان دونوں کے بعد زجاج، اور یہ سب عجمی نژاد ہیں۔ یہی تناسب علما، حدیث، علما، اصول، فقہا، متکلمین اور مفسرین میں بھی ہے[1]۔

عربوں میں ان کی فطرت سلیم کی وجہ سے انسانی مساوات کے اصول، اور انسانیت کے احترام کا جذبہ بنسبت دوسری قوموں کے زیادہ پایا جاتا ہے، وہ ان اصولوں کے اجرا اور ان پر عمل درآمد میں دوسری اقوام سے زیادہ حیت اور گرمجوش ہیں یہ اصول ان کی ان عظیم اور مبارک فتوحات میں ہمیشہ ان کا رہبر رہا جنھوں نے دنیا کو علم وتہذیب فضیلت و تقوٰی کے نئے آفاق سے آشنا کیا۔ اسی مساوات کی وجہ سے وہ مفتوح قومیں جو ہمیشہ فاتح اقوام سے بغض وعناد رکھتی ہیں ان سے محبت کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ سندھ اور ملتان کی بعض بُت پرست اقوام نے پہلی صدی ہجری میں عرب فاتح محمد بن قاسم کا بُت بناکر اپنے ان بتوں میں شامل کرلیا جن کی وہ پہلے سے پرستش کررہی تھیں یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت اور تعظیم کی وجہ سے تھا، اسی طرح مفتوح اہل سمرقند کے ساتھ حضرت عمر بن عبد العزیز نے جو مشفقانہ اور محبت آمیز برتاؤ کیا۔ اس نے ان کے دلوں میں ان فاتحین کی محبت اور اسلام کی عظمت پیدا کردی اور اس کی وجہ سے ان علاقوں میں اسلام بہت سرعت کے ساتھ پھیلا[2] ان قوموں نے نہ صرف اسلامی تہذیب قبول کی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ناشر المطبعۃ البھیتہ المصریہ ص۴۰۲

[2] فتوح البلدان البلاذری میں ہے کہ

جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو ان کے پاس اہل سمرقند کا ایک وفد پہونچا اور ان سے شکایت کی کہ قتیبہ نے جب اس علاقہ کو فتح کیا تھا تو انھوں نے اسلامی اصول و قواعد کے خلاف سمرقند پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں کو بسادیا۔ عمر بن عبد العزیز نے اپنے عامل کو لکھا کہ ایک قاضی مقرر کریں جو اس پر (باقی اگلے صفحہ پر)

بلکہ عربی زبان بھی اختیار کر لی اور ان اجنبی فاتحین کے اخلاق و عادات، دستور و قوانین اور زبان و لہجوں کو اس قومی ورثہ پر ترجیح دی جس کو وہ صدیوں اور نسلوں سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ کا مشہور مقولہ جو انھوں نے اپنے ایک بڑے فوجی قائد سے کہا تھا آج تک دنیا میں گونج رہا ہے۔ اور تاریخ عالم میں ثبت ہے۔

من متی استعبدتم الناس	تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا،
وقد ولدتھم امھاتھم	اپنی ماؤں کے پیٹ سے تو وہ آزاد
احرارًا	پیدا ہوئے تھے۔

عرب عہد جاہلیت اور عہد اسلام دونوں میں (اپنی فطرت، نشوونما، اور ان اصولوں اور قدروں کی وجہ سے جن پر وہ ایمان رکھتے تھے) سازشی ذہن و مزاج، دسیسہ کاری مکر و فریب، منافقت اور خفیہ سرگرمیوں سے بہت دور تھے، وہ کھلے ہوئے دشمن تھے اور کھلے ہوئے دوست، جنگ کرتے تو کھلے میدان میں، مصالحت کرتے تو اعلان کے ساتھ، ان کا کردار، ان کی امثال و حکم، ان کے تاریخی واقعات اور قبائلی جنگیں سب اس پر گواہ ہیں نفاق ان کی طبیعت ہی میں نہیں تھا۔ تقریبًا تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ مکہ میں نفاق اس لیے نہیں تھا کہ وہ خالص عربی ماحول رکھتا تھا، اور یہودیت و خارجی عناصر کی آلودگی سے پاک تھا نیز یہ کہ تمام ایسی آیات جن میں نفاق اور منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں۔ بعض مفسرین و اہلِ اصول نے مندرجہ ذیل آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) معاملہ میں فیصلہ صادر کرے۔ اگر وہ مسلمانوں کے اخراج کا فیصلہ کرے تو اُن کو اسی وقت شہر سے نکال دیا جائے۔ سب نے ابن حاضر الباجی کو قاضی تسلیم کیا اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان شہر چھوڑ کر چلے جائیں پھر اس کے بعد برابر کا مقابلہ ہو۔ اہل سمرقند نے جنگ کو بعید کیا اور اس بات پر تیار ہو گئے کہ مسلمان وہاں رہیں چنانچہ مسلمان وہاں آباد ہو گئے۔ یاد رہے کہ یہ فتح سمرقند کے سات سال بعد کا واقعہ ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ	اور تمہارے ارد گرد کے اعرابیوں میں سے
مُنَافِقُونَ ۚ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ	اور خود اہل مدینہ میں سے کچھ لوگ منافق
مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ	ہیں، نفاق کی حد کمال کو پہونچے ہوئے ہیں۔

اس لیے ہر اس خطہ زمین پر جہاں عربوں کی حکومت ہے، یا ان اقوام میں جو عربوں کی قیادت میں ہیں، ان تہذیبوں اور ثقافتوں میں جن کی رہنمائی ان کے ہاتھ میں ہے اس سیاست میں جس میں ان کا سرگرم اور اہم حصہ ہے کم از کم کسی خفیہ سازش خفیہ سرگرمیوں اور پس پردہ تحریکوں کا خطرہ نہیں۔ یہاں اخلاق میں نفاق اور تخریب و فساد پسندی قومی مصالح شخصی یا جماعتی انانیت کے لیے نئے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا کرنے کا ذہن، ایک گروہ کو دوسرے سے لڑانے کا شوق اس لیے نہیں پایا جاتا کہ ان کی قیادت ہمیشہ سے ایک خاص مزاج رکھتی ہے وہ صاف، بے لاگ، واضح اور فیصلہ کن ہے اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ اور شرق و غرب اور عجم و عرب کے معاملے میں امتیازی طرز فکر اور سلوک اس کی قومیت کے اجزاء ترکیبی سے خارج ہے۔

جہاں تک اس انتہا پسندانہ قومیت اور جاہلی عصبیت کا تعلق ہے جو بعض عرب علاقوں اور آبادیوں میں مصیبت و آزمائش بن گئی ہے اور اس عہد آخر میں بعض عربی قیادتوں نے اس کا علم اٹھا رکھا ہے وہ ایک خارجی، عارضی اور بیرونی عنصر ہے جو حقیقی عربی اسلامی مزاج کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ مزاج و ذہن پہلی فرصت میں اس پر غالب آئے گا۔ اور اس کی حقیقی شکل نکھر کر سامنے آجائے گی اس کو بالآخر اس ایمان کی آغوش میں پناہ ملے گی جو پہلے ہی سے اس کے جسم و جان میں پیوست ہے اور اس کے خون میں جاری و ساری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ	اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت
أَتْقَاكُمْ۔	والا وہ ہے جو اس کا سب سے زیادہ
	لحاظ و ادب کرتا ہو[1]

[1] سورۂ حجرات ۱۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے ساتھ۔"[۱]

اگر اسلام اللہ کا آخری اور ابدی پیغام ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بقاء، دوام کا ذمہ لیا ہے اگر قرآن آخری آسمانی کتاب ہے جس کی حفاظت و بقا کی ضمانت اللہ نے کی ہے۔ اور اس کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کی (ایک عقیدہ و اصول، مخصوص شخصیت قانون و شریعت اور پیغام و دعوت کی حامل قوم کی حیثیت سے) بقا کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور ان سب چیزوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل ضمانت ہے اور صاف اعلان ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝[۲] — بے شک ہم نے نازل کیا ہے۔ یہ نصیحت نامہ اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

تو پھر اس کے ساتھ عربوں کی بقا اور حفاظت کی بھی مکمل ضمانت موجود ہے۔ قرآن مجید کی بقا عربی زبان کے بغیر ممکن نہیں اور عربی زبان کی بقا اہل زبان کے بغیر ناممکن ہے اور یہ سب خلا میں نہیں اس آب و گل کی دنیا میں ہونا ہے۔ اس لیے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ ابدی، عالمی اور لافانی کتاب ایک ایسا معمہ یا چیستاں بن جائے جس کا کوئی سمجھنے والا ہی نہ ہو یا ایسا سربمہر راز ہو جائے جس کی دریافت اور جس سے افادہ ہی ناممکن ہو، تاریخی زبانوں کی طرح سطر سطر مٹ جائے جس طرح ہیروگلیفی، فینیقی اور حمیری زبانیں مٹ گئیں اور آثار قدیمہ میں پہونچ گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت اعلیٰ اور بلند و بالا ہے کہ وہ ایسی صورت کو حفاظت و بقا قرار دے اور اس کو عزت و سرفرازی سے تعبیر کرے اور اپنا یہ احسان اس امت اور پوری انسانیت کو بار بار یاد دلائے جو ہر نسل اور ہر دور کے لیے روشنی کا منیار ہے اس طرح یہ بات بھی حکمت کے خلاف ہے کہ یہ عرب ایک طویل عرصہ کے لیے غلام اور ذلیل و خوار بنا دیئے جائیں اور اپنی اس طاقت حیثیت اور صلاحیت سے محروم ہو جائیں جو بنی نوع انسان کی رہنمائی اور

---

[۱] ترمذی و دیگر صحاح [۲] سورۂ حجر ۹

انسانیت کی قیادت کے لیے ضروری ہے اور یہ پورا علاقہ یہودیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے جہاں سے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنی اطراف عالم میں پھیل گئی جس کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اسی طرح وابستہ اور جزء لاینفک ہے کہ اس کی مثال مذاہب کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی جہاں وہ بیت عتیق (بیت اللہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کے لئے گہوارۂ امن اور جائے پناہ قرار دیا ہے اور اس کو تعظیم و محبت اور عشق و شیفتگی کا سب سے بڑا مرکز بنایا ہے اور جہاں وہ مدینۃ الرسول ہے جس کو ہم مرکز وحی، آغوش اسلام اور کارگاہ تاریخ کہہ سکتے ہیں اگر عرب ذلیل ہوتے ہیں اور یہ خطۂ زمین جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں جو اسلام کا قلعہ اور حصار ہے اور اس کا سرچشمہ اور اصلی مرکز ہے ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو اسلام کی بقا اس کی عزت و سربلندی اور امن و اطمینان کی فضا میسر نہیں آسکتی خواہ سیکڑوں ہزاروں نئی اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں اور سیکڑوں سبز جھنڈے فضا میں لہرانے لگیں۔ چنانچہ بعض آثار اقوال میں آیا ہے کہ

اذا ذلّ العرب ذلّ الاسلام — اگر عرب ذلیل ہوئے تو اسلام ذلیل ہو جائے گا

اس لیے یہ غیر طبعی اور غیر فطری حالات بقا و ترقی کی صلاحیت خود ہی نہیں رکھتے، فطرت انسانی، عقل سلیم، منطق و استدلال، خواص اشیا، حقائق ثابتہ اور مذہبی نصوص آسمانی وعدے، تاریخ و جغرافیہ حتیٰ کہ خود صحتمندانہ اور حقیقت پسندانہ سیاست کا (جو عقل و رشد سے محروم ہو کر جنون و پاگل پن کی سرحدوں میں نہ پہنچ گئی ہو) بھی یہ فیصلہ ہے کہ

ل؎ وہ عامیانہ یا احمقانہ سیاست یا ڈپلومیسی جو امریکا اور روس نے عربوں کے معاملوں میں اختیار کر رکھی ہے وہ ایک روایتی سیاست ہے جس کا عقل و ذہانت، فیصلہ کی قوت، اخلاقی جرأت حیا، و غیرت اور اصول آدمیت سے کوئی تعلق نہیں وہ اکثر و بیشتر یہودی اثر و رسوخ کے زیر سایہ رہتی ہے۔ اس کا زیادہ تر انحصار اپنی ان کند ذہن سکریٹریٹ پرانے کاغذات اور فائلوں پر ہے جو حقائق پر مبنی نہیں ہوتے یہ سیاسی طرز اور طریقہ قوموں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ بڑھاپے کا شکار ہونے لگتی ہیں اور ان کے زوال کے دن قریب ہوتے ہیں۔

یہ حالات زیادہ دن تک برقرار نہیں رہ سکتے۔ اگر کچھ عرصہ یہ حالات باقی رہ جاتے ہیں تو اس غیر طبعی صورت حال کے لحاظ سے یہ مدت بھی طویل ہی سمجھی جائے گی۔

صیہونیت کی یہ وقتی فتح اور اس کے بعض مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل ایسی فتح نہیں جس کو ایک پیغام کی دوسرے پیغام پر، ایک فلسفہ کی دوسرے فلسفہ پر، ایک اُمت کی دوسری اُمت پر۔ ایک مذہب کی دوسرے مذہب یا حق کی باطل پر فتح کہی جاسکے۔ یہود کے پاس نہ پہلے دنیا کے لئے کوئی دعوت تھی نہ آج ہے۔ یہ معرکہ جو ۵ جون ۶۷ء کو پیش آیا وہ یہودیوں اور اُمتِ مسلمہ کے درمیان نہیں تھا، نہ یہودیوں اور عرب اقوام کے درمیان تھا۔ اس میں تو اس ملت اور ان عرب اقوام کو گھسنے کا اور اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ۵ جون کی اس جنگ سے اسلام کو بہت دور رکھا گیا۔ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت اس کو میدان جنگ سے ہٹا دیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک زیادہ عملی اور حقیقت پسندانہ قیادت کی ایک ناکارہ قیادت پر فتح ہے۔ یہود کی خوش قسمتی تھی کہ ہزاروں سال کے بعد ان کو پہلی بار ایک ایسی قیادت حاصل ہوئی جس نے وہ ننگ و عار اور داغ دھوڈالا جو ہزاروں سال سے ان کی پیشانی پر لگا ہوا تھا، اور ان کی نئی تاریخ بنائی، عربوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ ان کی قیادت نے بہت سے ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر کتاب کی ابتدائی فصلوں میں تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے ان کے ساتھ اور انکی تاریخ کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ اور ان کو ایک ایسی جگہ پہونچا دیا ہے جہاں سے آگے بڑھنا بھی مشکل ہے اور پیچھے ہٹنا بھی دشوار۔

اس کے باوجود قیادت کی غلطیاں (خواہ کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ایک عرصہ تک اپنا عمل کرتی رہیں۔ اور اثر ڈالتی رہیں) پھر بھی ایسی نوعیت رکھتی ہیں جن کی اصلاح ہوسکتی ہے اور جن میں تبدیلی بہر حال ممکن ہے۔

البتہ پیغام و دعوت، قوموں کی صلاحیت اور بقا و ترقی کی قوت اور فتح کا استحقاق ایک ایسا دشوار ترین اور پیچیدہ مسئلہ ہے جو کسی نئی دعوت اصلاحیت کو مستعار لیکر حل نہیں کیا جاسکتا نہ اس کے تن مردہ میں نئی روح ڈالی جاسکتی ہے۔

عربی اسلامی ملت کو کسی نئے پیغام کی ضرورت ہے نہ کسی نئے دین کی، نہ اس میں نئی روح ڈالنے کی، یہ اُمت، زندگی، قوت، حوصلہ وہمت بلکہ برق وشرر سے بھرپور ہے اور ہر وقت اپنے جذبہ قربانی اور جذبہ ایمانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مضطرب اور بیتاب ہے اس کے برخلاف اس کی قیادتیں (لیڈرشپ) سمندر کی ان موجوں کی طرح ہیں جو آتی جاتی رہتی ہیں، وہ کبھی کبھی تیز اُٹھ کر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہیں بعض اوقات کسی جہاز یا کشتی کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں اور ڈبو بھی دیتی ہیں لیکن بالآخر اس بحر زخار میں گم ہو جاتی ہیں اور ان کا پتہ بھی نہیں لگتا لیکن سمندر اسی طرح باقی رہتا ہے اور کسی وقت اپنے وجود اپنی شخصیت اور اپنے صفات واثرات سے محروم نہیں ہوتا۔

تاریخ میں ہمیں ان غضبناک موجوں کا بارہا مشاہدہ ہوا ہے، ان میں سے بعض موجیں تو اتنی بلند ہوئیں کہ انھوں نے آسمان کو چھو لیا لیکن اس کے بعد اسی سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔ کتنی حکومتیں قائم ہوئیں، کیسی کیسی قیادتیں ظاہر ہوئیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی بساط الٹ گئی، البتہ اسلام اسی طرح زندہ وتابندہ ہے۔ امت بھی وہی ہے اس کا پیغام بھی وہی، قرآن بھی وہی ہے اور ایمان بھی وہی۔

یہ حوادث وانقلابات اور یہ نشیب وفراز، وہ قدرتی تجربات ہیں جن سے دنیا کی زندہ اور بیدار قومیں ہمیشہ گزرتی ہیں، یہ وہ آزمائشیں اور امتحانات ہیں جن سے کھرے کھوٹے کا فرق معلوم ہوتا ہے اور قوم کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی بدولت وہ تکلیف وراحت ترقی وشدت ہر حالت کی عادی ہوتی ہے وہ فتح کے وقت غرور میں مبتلا نہیں ہوتی اور ناکامی وہزیمت کے بعد مایوسی کا شکار نہیں ہوتی

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ	تاکہ نہ تأسف ہو تم اس چیز پر جو تمہارے
وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ[1]	ہاتھ سے نکل گئی اور نہ نازاں ہو اس پر جو تمھیں دیدی گئی ہے

اس کی مثال اس زندہ اور صحت مند وتوانا جسم کی ہے جس کی قوت مدافعت اور قوت

---

[1] سورہ حدید ۲۳

برداشت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ صحت و مرض، ضعف و قوت، آب و ہوا کے اختلاف، موسموں کے تغیر اور اس طرح کی تمام چیزوں پر فتح حاصل کر لیتا ہے اور ہر قسم کے تلخ و ترش کا عادی ہو جاتا ہے جس طرح ایک صحت مند جسم کے لیے صحت کی ضمانت ہے خواہ اس کو درمیان میں ان تمام مراحل سے گزرنا پڑے۔ اسی طرح انسانیت کے لیے بہترین پیغام رکھنے والی اور ان صفات و خصوصیات کی حامل قوم کے لئے (جو سارے عالم کے لیے باعث خیر و سرچشمہ ہدایت ہے) فتح و نصرت بھی مشیت قدرت ہے اور قرآن مجید اس کی فتح کی ضمانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ	تم سے پہلے بھی سنت الٰہی کے بہت سے واقعات
فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا	گزر چکے ہیں، سو گھومو پھرو روئے زمین پر
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ	اور پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا
هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى	ہوا۔ یہ وضاحت ہے لوگوں کے لیے اور
وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا	ہدایت و نصیحت ہے خاص اہل تقویٰ کے لیے
وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ	اور تم نہ پست ہمت ہو اور نہ رنجیدہ کہ تم ہی
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَمْسَسْكُمْ	سربلند رہنے والے ہو اگر تم میں ایمان ہے۔
قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ	اگر تمھیں زخم آئے ہیں تو دشمن کو بھی اسی
مِثْلُهُ ، وَتِلْكَ الْأَيَّامُ	طرح زخم پہنچا ہے اور یہ دن تو ہم اسی
نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ	طرح لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا	رہتے ہیں۔ اور (اس سے) یہ بھی مقصد ہے
وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ، وَاللّٰهُ	کہ اللہ ایمان والوں کو دیکھ لے اور تم میں سے
لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ	بعض کو شہید بنائے۔ اللہ ظالموں کو نہیں
اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ	پسند کرتا ہے اور تاکہ پاک صاف کر دے اہل
الْكَافِرِينَ ۝ [1]	ایمان کو اور مٹا دے کفر کرنے والوں کو۔

[1] سورۂ آل عمران، ۱۳۷ — ۱۴۱

سائنس کی بے خدائیت کے خلاف

اقبال کا جہاد

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

اقبال دورِ حاضر کا سب سے پہلا مفکر ہے جس نے سائنس کی بے خدائیت (GODLESSNESS) کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا، وہ پر درد الفاظ میں کہتا ہے۔

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے علم کے ہاتھ میں خالی ہو نیام اے ساقی!

یہاں علم سے اقبال کی مراد سائنس ہے اور کوئی دوسرا علم نہیں، چنانچہ اقبال خود اپنے خطوط میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے۔ یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے"

اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عشق کی تیغ جگردار سائنس کی نیام کے اندر اپنی جگہ پر موجود تھی اور بعد میں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ کسی نے اس تلوار کو اس نیام سے اڑا لیا جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ یہ نیام اب تک خالی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے جو سارٹن (SARTON) اور برفال (BRIFFAULT) کی تحریروں سے اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سائنسی علوم کے بانی اور سائنسی طریق تحقیق کے موجد اسپین کے مسلمان تھے اور یہ مسلمان سائنس کے موجد اس لیے بنے تھے کہ ان کی مقدس کتاب قرآن حکیم نے ان کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ کیونکہ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ خدا کی معرفت کا سب سے پہلا ذریعہ ہے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ خدا کی ہستی اور خدا کی صفات جمال وجلال کے نشانات مظاہر قدرت کے اندر آشکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے خدا کی معرفت کی جستجو میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور اس سے جو نتائج حاصل کئے ان کو ضبط تحریر میں لائے۔ آج اسی قسم کے نتائج کو ہی ہم سائنس کا نام دیتے ہیں۔ چونکہ دنیا کے ان پہلے سائنسدانوں کی سائنس خدا کے عقیدے سے پیدا ہوئی تھی لہٰذا وہ خدا کے عقیدہ کے ارد گرد ہی گھومتی تھی۔ جب ہسپانوی مسلمانوں کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اسپین سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس یورپ کے ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو پولوسیت (PAULISM) یا جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں ایک پاک اور مقدس ہے اور دوسری ناپاک اور غیر مقدس۔ لہٰذا دنیا کے علم کو جسے سائنس کہا جاتا ہے خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس اور سائنس والوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی نے اس عقیدہ کے لیے مزید ثبوت بہم پہنچایا اور کلیسا اور ریاست کے افتراق نے جو دونوں کے طویل اور شدید جھگڑوں کے بعد ایک اٹل حقیقت کے طور پر رونما ہوا تھا۔ اس عقیدہ کو تقویت دی اور اس کے لیے راستہ صاف کیا۔ لہٰذا اس عقیدہ نے جامۂ عمل پہنا اور سائنس سے خدا کا نام خارج کر دیا گیا۔ یہ کلیت وجود میں تفریق پیدا کرنے اور خود حقیقت کائنات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ایک نامعقول اور ناپاک جسارت تھی جس کے پیچھے کوئی علمی یا عقلی دلیل موجود نہ تھی۔ تاہم سائنس کی بے خدائیت کا عقیدہ جو اس طرح عیسائیت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ عیسائی

مغرب کی دنیا میں متمکن ہوگیا۔ ظاہر بات ہے کہ سائنس میں اس عقیدہ کے جاگزیں ہونے ہونے کے بعد کوئی ایسے سائنسی نظریات پیدا نہ ہو سکتے تھے جو اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ لہذا ایسے سائنسی نظریات وجود میں آنے لگے جو درحقیقت اسی کی پیداوار تھے لیکن جن کو آسانی سے اس کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسے سائنسی نظریات میں ہم انیسویں صدی کی طبعیاتی مادیت اور میکانیت کو اور ڈارون کے میکانکی اور مادی نظریہ ارتقا کو شمار کر سکتے ہیں جنھوں نے اس خیال کو بظاہر ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا کہ قدرت میں کوئی تخلیقی یا راہنما قوت موجود نہیں اور خدا کا عقیدہ بظاہر دونوں کی تشریح کے لیے غیر ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ یہ بھول گئے کہ سائنس کی بے خدائیت درحقیقت ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو عیسائیت نے جنم دیا تھا اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔ اب بھی عیسائی مغرب کے سائنس داں ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنی سائنس کو ہر حالت میں اس راستہ سے بچائیں جو خدا کے عقیدہ کی طرف جاتا ہے اور خواہ کچھ ہو جائے اس کو سختی کے ساتھ اس چار دیواری کے اندر بند رکھیں جو سائنس کی بے خدائیت کے نامعقول عقیدہ نے اس کے اردگرد بنا رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ایسے حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں جو قدرت میں کسی ذہنی یا تخلیقی قوت کی کارفرمائی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں خواہ وہ ثبوت کتنا ہی بین اور آشکار کیوں نہ ہو۔ مثلاً وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت میں یہ سب چیزیں موجود ہیں، تنظیم۔ ترتیب۔ تجویز۔ تعمیر۔ تکمیل۔ وحدت، یکسانیت۔ تسلسل مقصدیت تناسب۔ توافق۔ ہم آہنگی۔ ارتقائی حرکت۔ زندہ حیوانات کی خود کارانہ نشو و نما جو ان کو برتر اور بلند تر مدارج حیات کی طرف خود بخود لے جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں کسی ذہنی قوت کے عمل کا پتہ دیتی ہیں اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں تو طبعیاتی اور حیاتیاتی علوم ممکن ہی نہ ہوتے۔ اس کے باوجود وہ ان کے وجود سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے کیوں کہ سائنس کی بے خدائیت کے مفروضہ کے ہوتے ہوئے وہ ان کی کوئی معقول تشریح نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کبھی ان حقائق سے سخت مجبور ہو جائیں

تو وہ ان کی تشریح کے لیے خدا کے تصور کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ کچھ من گھڑت اور فرضی مابعد الطبعیاتی تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جیمز جینز "ریاضیاتی ذہن" کو فرض کرتا ہے۔ برگسان کسی "قوت حیات" کا نام لیتا ہے اور ڈریش کسی "عالمی اسکیم" یا "انٹی لیچی" کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ تمام تصورات ناکافی اور ناتسلی بخش ہیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن تو کارفرما ہو لیکن اُس میں شخصیت کے دوسرے اوصاف مثلاً جذباتی یا اخلاقی موجود نہ ہوں یا قدرت میں ـــــ کوئی ایسی قوت اجسامِ حیوانات کی تخلیق اور تکمیل کے کاموں میں مصروف ہو جو سوچتی سمجھتی ہو اپنے مقاصد سے آگاہ ہو اور ان کو حاصل کرنے کی قدرت رکھتی ہو لیکن ایک کامل شخصیت نہ ہو۔ ہمارا تجربہ اس قسم کے لنگڑے تصورات کی نفی کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضیاتی فکر اور مقصدیت کے اوصاف جس وجود میں ہوتے ہیں وہ شخصیت کے باقی ماندہ جذباتی اور اخلاقی اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم قرآن حکیم کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچنے کے لیے مجبور ہیں کہ قدرت میں جو ریاضیاتی ذہن یا قوتِ حیات کارفرما ہے وہ خدا ہی ہے لیکن سائنس کی بے خدائیت کا مذہبی عقیدہ مانع ہے کہ مغرب کے سائنسداں بات ایسے الفاظ میں کہیں۔

اگرچہ بے خدا سائنس یہ نہیں کہتی کہ خدا موجود نہیں، لیکن وہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح سے کرتی ہے کہ گویا ان کا کوئی خالق نہیں اور اگر ہے تو اسکی صفات کا کوئی نشان ان کے اندر موجود نہیں۔ اس طرح سے وہ اس دروازہ کو بند کر دیتی ہے جس کی راہ سے خدا کی معرفت اور محبت کا نور سب سے پہلے انسان تک پہنچتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے کہ خدا کی معرفت کا پہلا ذریعہ انسان کے حواس ہیں جن کی مدد سے وہ مظاہرِ قدرت میں خدا کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر ہم خالق اور رب اور رحیم اور کریم اور عادل۔ اور حفیظ اور علیم اور سمیع اور بصیر، اور مومن اور مہیمن ایسے الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکتے جو خدا کی صفات کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے قرآن حکیم کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے

کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لیے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حواس کے بعد خدا کی معرفت کا دوسرا ذریعہ ذکر ہے جس کی مدد سے انسان قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر اور مسجد کے ایک کونہ میں بیٹھ کر بھی خدا کی صفات پر غور و فکر کر سکتا ہے کیونکہ وہ پہلے قدرت کے مشاہدہ سے اُن الفاظ کے معنی سمجھ چکا ہوتا ہے جو خدا کی صفات پر دلالت کرتے ہیں اس ذکر سے خدا کا حضور یا خدا کے قرب کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عشق یا محبت ہے اور شعور یا ادراک سے بالاتر سطح کی چیز ہے۔ اقبال نے اس مطلب کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

علم حق اول حواس آخر حضور | آخر او مے نگنجد در شعور

ایک اور جگہ وہ اس خیال کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے ؎

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام | وہ جس کی شان میں آیا ہے علَّمَ الاسماء
مقام ذکر ہے پیمائش زمان و مکان | مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

الغرض بے خدا سائنس خدا کا انکار کرنے کے بغیر انسان کو اس طرح سے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ خدا موجود ہی نہیں۔ بے خدا سائنس نے ہی اس نامعقول اور بے بنیاد عقیدہ کو رواج دیا ہے کہ ہر معیاری فلسفہ وہی ہے جس میں خدا ایک حقیقت کے طور پر مذکور نہ ہو یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں کائنات کے جس قدر فلسفے پیدا ہوئے ہیں مثلاً ڈارونزم۔ مارکزم۔ میکڈوگلزم۔ فرائڈزم۔ ایڈلرزم۔ بی ہیویرازم۔ لاجیکل پازیٹوزم۔ ہیومنزم وہ سب بے خدا ہیں........

....اور یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں انسانی فطرت اور انسانی اعمال کے جس قدر نظریات وجود میں آئے ہیں وہ بھی سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست، بے خدا فلسفۂ اخلاق، بے خدا اقتصادیات، بے خدا قانون، بے خدا فلسفۂ تعلیم، بے خدا نفسیاتِ فرد، اور بے خدا نفسیاتِ جماعت۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی سا معصوم سا اور بے ضرر سا تغیر نہیں جو صرف کتابوں ہی میں آ گیا ہو۔ اس نے انسان کی کتابوں کو ہی نہیں بدلا بلکہ اس کے جملہ عقیدوں۔ قدروں۔ منصوبوں، مقصدوں

اور حق و باطل۔ نیک و بد اور خوب و زشت کے معیاروں، حتیٰ کہ اُمیدوں اور آرزوؤں کو بدل کر اس کے اعمال و افعال کو بھی بدل ڈالا ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ جو سوچتا ہے وہی کرتا ہے۔ اگر اس کے افکار و آراء اور اس کے تصورات و نظریات بے خدا ہوں تو اس کے اعمال و افعال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ لہذا سائنس کی بے خدائیت عالم انسانی کا ایک بہت بڑا حادثہ ہے جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے اب دنیا میں کوئی ایسی ہمہ گیر اخلاقی اور روحانی قوت باقی نہیں رہی جو اندر سے انسانی اعمال کو ضبط میں لاکر صحیح راستہ پر ڈال سکے۔ یہی حقیقت ہے جو دور حاضر کے انسان کی تمام بدقسمتیوں اور پریشانیوں کا بنیادی سبب ہے، مثلاً عالمگیر جنگوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میزائیلوں اور ایٹم بموں کے بڑھتے ہوئے انبار، بین الاقوامی معیار اخلاق کا فقدان، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی سازشیں اور ان سے پیدا ہونے والے سیاسی قتل اور سیاسی انقلابات، اقتصادی خوشحالی کے باوجود اطمینان قلب کا فقدان اور ذہنی بیماریوں، خودکشیوں اور جرائم کی روز افزوں تعداد، آزاد جنسیت، طفولیتی بے راہ روی، علم اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے ضبط و نظم کا بگاڑ وغیرہ وغیرہ اس وقت ہر جدید کالج ایسے نوجوانوں کی تربیت گاہ ہے جو خدا اور مذہب اور اخلاق کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اکبر نے ایسے ہی کالج کے لیے کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور اگر کوئی پوچھے کہ مسلمانوں کے علمی، دینی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب کیا ہے؟ تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی سائنس کی بے خدائیت ہے جسے مسلمانوں نے بھی ہر جگہ اپنی یونیورسٹیوں میں اپنا لیا ہے۔ اقبال بڑے سوز اور درد کے ساتھ اپنے ساقی سے کسی ایسے کافر ادا محبوب کی شکایت کرتا ہے جس کے غمزۂ خونریز نے اللہ کا نام لینے والوں کی متاع دین و دانش کو لوٹ لیا ہے۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی　　یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

یہ کافر ادا محبوب منزل کا یہی بے خدا علم ہے جس نے مسلمانوں کے فکر کو اللہ سے بیگانہ

کر دیا ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنا پر اقبال نے سائنس کی بے خدائیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے وہ کہتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں
علم کو از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانہ افکار نیست
مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست — تا بجذب اندرونش راہ نیست

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتۂ دلپذیر تیرے لیے — کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیش خورشید بر مکش دیوار — خواہی ار صحن خانہ نورانی

اقبال ہماری توجہ بجا طور پر اس بات کی طرف مبذول کرتا ہے کہ اگر سائنس کو خدا کے تصور پر قائم کیا جائے تو ترقی کرتے ہوئے وہ ایسے غلط نتائج کو خود درست کرتی چلی جاتی ہے۔ بے خدا سائنس میں یہ خاصیت نہیں ہوتی کیونکہ وہ خدا کے تصور کی راہنمائی اور روشنی سے محروم ہوتی ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں — تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اقبال نے علم اور عشق کی ایک گفتگو نظم کی ہے جس میں وہ اپنے دلکش اشعار کی پوری قوت کے ساتھ سائنس کو خدا کے تصور کے ساتھ متحد کرنے پر زور دیتا ہے۔

سائنس کہتی ہے۔

نگاہم راز دار ہفت و چار است — گرفتار کمندم روزگار است
جہاں بینی بایں سو باز کردند — مرا با آں سوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم — بباز ار افگنم رازے کہ دارم

عشق جواب دیتا ہے۔

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است — ہوا آتش گزار و زہر دار است

چو با من یار بودی نور بودی | بریدی از من و نور تو نار است
بخلوت خانہ لاہوت زادی | ولیکن در نخ شیطاں فتادی
بیا این خاکدان را گلستان ساز | نہ گردوں نہشتہ جاوداں ساز
بیا یک ذرہ از درد دلم گیر | جہاں پیر را دیگر جواں ساز
ز روز آفرینش ہمدم استم | ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

صرف اتنی بات ہی نہیں بلکہ اقبال بڑے زور سے مسلمانوں کو اکساتا ہے کہ مستقبل کا عالمگیر ذہنی انقلاب سائنس اور خدا کے تصور کے الحاق سے پیدا ہوگا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اوٹھیں اور سائنس کو خدا کے ساتھ ملا کر اس عالمگیر ذہنی انقلاب کی قیادت کریں۔

غربیان را زیرکی ساز حیات | شرقیان را عشق رمز کائنات
زیرکی از عشق گرد و حق شناس | کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمسر بود | نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ | عشق را با زیرکی آمیزدہ

ہمارے نظریہ حیات کے ممکنات کے اندر اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ ہم عنقریب خدا کے تصور کو سائنس سے متحد کر کے مستقبل کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کی قیادت کریں گے جس کی پیش گوئی اقبال نے کی ہے۔ (بشکریہ میثاق لاہور)
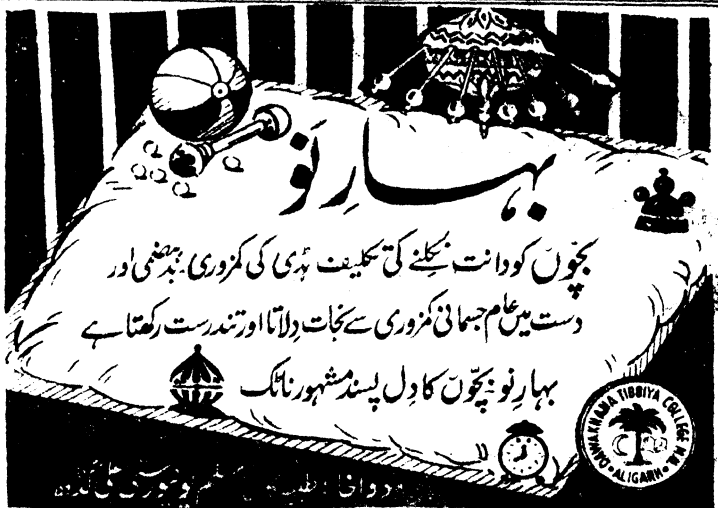
سُرمہ
دُرِ نجف
آنکھوں کی تمام بیماریوں کا دشمن
بینائی کا محافظ
اسے روز کا معمول بنائیے تو نگاہ انشاءاللہ آخر عمر تک قائم رہے گی۔
دُرِ نجف لگتا نہیں بلکہ ٹھنڈک اور فرحت پہنچاتا ہے۔
سرمے کیساتھ ہماری جستی کیمیائی سلائی بھی طلب فرمائیے۔
اور
۲۶ دواؤں کا
مرکب
ایک تولہ چھ روپے
دارالفیض رحمانی ڈپو

نئی مطبوعات

(کئی سال ہوئے تعارفِ کتب کا سلسلہ مرتب کی خرابیِ صحت سے رُک گیا تھا۔ اور پھر رُکا ہی رہ گیا۔ اس بار اللہ کے کرم سے اس کے از سرِ نو آغاز کا ارادہ پورا ہو گیا ہے۔ اس وقفہ میں آئی ہوئی تمام کتابوں کا فرض ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ چھ ماہ میں جن حضرات نے تبصرہ کے لیے کتابیں بھیجی ہیں وہ اگر اپنی مرسلہ کتابوں سے از سرِ نو مطلع فرما دیں گے تو انشاء اللہ ان کا تذکرہ ان صفحات میں آجائے گا ــــ مرتب)

تفسیر ماجدی جلد اول:۔ بڑی تقطیع۔ صفحات ۶۹۰۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بہتر۔ قیمت:۔ اٹھارہ روپیہ پتہ:۔ صدق بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق جدید نے ایک عرصہ سے اپنی تمام علمی اور ادبی صلاحیتوں کا اصل مصرف کتاب اللہ کی خدمت کو بنا رکھا ہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قرآن مجید کی تفسیر کا شرف حاصل کیا ہے۔ پیش نظر کتاب اُن کی اُردو تفسیر کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن پاکستان کی تاج کمپنی سے نکلا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں ترمیم اور اضافوں کے علاوہ ایک فرق یہ ہے کہ پہلے ایک ایک پارے کی جلد الگ الگ تھی اب کی سورۂ فاتحہ سے آلِ عمران تک اسی ایک جلد میں آگئی ہے۔

قرآن پاک کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بیحد قابل قدر ہے۔ ایک اہم بڑی کارآمد خصوصیت یہ ہے کہ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن پر لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر ایسا درجہ استناد بھی حاصل کر لیتی ہے کہ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ دوسری طرف سابقین کے افادات

پر کافی وسیع نظر بھی ہو جاتی ہے۔ دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء سابقین اور اُن کی اُمتوں کے حالات و واقعات نیز اُن کی شریعتوں کے احکام وغیرہ کی تشریح و توضیح میں اسرائیلیات پر اعتماد کرنے کے بجائے بڑی کاوش و تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اولاً عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید کو سامنے رکھا گیا ہے۔ پھر موجودہ مغربی محققین اور مصنفین کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جن پر مولانا کی نظر بڑی وسیع ہے اور تیسری خصوصیت جو اس دوسری ہی سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ تفسیر ماجدی میں ہمیں اسلام اور ادیان سابقہ کے تقابلی مطالعہ کا بھی موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ سائنٹفک تحقیقات کے حوالہ سے قرآن پر حرف گیری کی جو کوششیں ہمارے زمانہ میں ہوتی آرہی ہیں مولانا نے اُن کا طلسم توڑنے پر بھی توجہ دی ہے اور وہ اس کے اہل تھے۔

ترجمہ کا سفر مولانا نے مرشد تھانوی رح کی انگلی پکڑ کر طے کیا ہے' بس اتنا تصرف روا رکھا ہے کہ زبان کے جدید ادبی معیار کے اعتبار سے اس کی تجدید ہو جائے۔ اور ترجمہ میں اس پابندی کے بعد اس کا کہنا ہی کیا کہ قرآن کی ترجمانی میں مسلک جمہور پر بڑی سختی سے کاربند نظر آتے ہیں۔

مولانا کا خاص اسلوب تحریر ماقلَّ و دلَّ ہے تفسیر میں بھی اس کا رنگ یہی رہا ہے۔ اس لیے الفاظ کم اور مطالب زیادہ ملتے ہیں۔ نکتہ آفرینی بھی مولانا کا خاص مذاق ہے علمی' ادبی' فقہی' کلامی اور احسانی نکتے موقع و محل کی مناسبت سے خوب خوب آئے ہیں! اور سب سے آخر میں یہ کہ تفسیر کا افتتاحیہ بھی ایک خاصہ کی چیز ہے مستقل قدر و قیمت کا حامل۔ اللہ تعالیٰ کتاب کی باقی جلدوں کو بھی مولانا کی زندگی ہی میں اشاعت سے ہمکنار کرے۔

(ع ۔ س)

ما آتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا

معارف الحدیث

یعنی

احادیثِ نبوی کا ایک جدید اور جامع انتخاب

اردو ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ

جلد پنجم ۵

کتاب الاذکار والدعوات

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

ناشر:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ۔ لکھنؤ

بار اول ۱۲۵۰ | محرم ۱۳۸۹ھ اپریل ۱۹۶۹ء | مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ | قیمت مجلد ۷/۷۵ | غیر مجلد ۶/۵۰

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ

از نبیِ اُمّیے پیغام دہ

اُن سب اخوانِ دینی کی خدمت میں ـــــ جو

"نبیِ اُمّی" سیدنا حضرت محمد عربی (فداہ اُمّی وابی ورُوحی وقلبی) پر

ایمان رکھتے ہیں

اور آپ کی ہدایت اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں اپنی اور تمام اولادِ آدمؑ کی

نجات کا یقین کرتے ہیں

اور اس لئے آپ کی تعلیم اور طرزِ زندگی سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں

آئیے

علم و تصور ہی کے راستہ سے مجلسِ نبویؐ میں حاضر ہو کر

آپؐ کے ارشادات سُنیں!

اور

اس چشمۂ انوار سے

اپنے تاریک دلوں کے لئے روشنی حاصل کریں!

عاجز و عاصی

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

فہرست مضامین "معارف الحدیث جلد پنجم" بقید صفحہ

عنوان، یا مضمون کا اشاریہ	صفحہ

دُعا سے متعلق ھدایات — ۱۲۲

دُعا کے چند آداب — ۱۳۰

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں — ۱۴۴

نماز میں، اور نماز کے بعد کی جانے والی دُعائیں — ۱۴۵

مختلف اوقات و احوال کی دعائیں — ۱۶۷

صفحہ	عنوان، یا مضمون کا اشاریہ
۲۹۲ ۳۰۲	صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ مانگی ہو اور امت کو اس کی تلقین نہ فرمائی ہو۔ اس سلسلہ کی ۱۵ حدیثیں۔
۲۹۷	"عذابِ قبر" اور "فتنۂ قبر"۔ "عذابِ نار" اور "فتنۂ نار" کا فرق
۲۹۸	دولت مندی و خوش حالی اور اسی طرح فقر و تنگدستی نعمت بھی ہے اور فتنہ و آزمائش بھی
۳۰۴	غیر طبعی اور ناگہانی موت کی جن صورتوں کو "شہادت" بتایا گیا ہے ان سے پناہ مانگنے کی وجہ
۳۰۶	بیماری اور بُرے اثرات سے تحفظ کے لئے استعاذہ کی دعائیں
	استغفار و توبہ
۳۰۸	توبہ و استغفار کی حقیقت اور ان کا باہمی تلازم
۳۱۱	توبہ و استغفار بلند ترین مقام (صـ۳۰۹)۔ توبہ و استغفار کے باب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ
۳۱۴	گناہوں کی سیاہی اور توبہ و استغفار سے اُس کا ازالہ اور کامل صفائی
۳۱۷	غفّاریت کے ظہور کے لئے گناہوں کی ضرورت
۳۲۱	بار بار گناہ اور بار بار استغفار کرنے والے (صـ۳۲۰) کس وقت تک کی توبہ قابلِ قبول ہے
۳۲۴	مرنے والوں کے لئے سب سے بہتر تحفہ استغفار (صـ۳۲۳) زندوں کی دعاؤں سے مُردوں کے درجات میں ترقی
۳۲۷	عام مومنین کے لئے استغفار (صـ۳۲۵) عام مومنین کے لئے استغفار کی غیر معمولی برکت و مقبولیت
۳۲۸	توبہ و انابت سے بڑے سے بڑے گناہوں کی معافی
۳۳۱	"ننانوے آدمیوں کا قاتل سچی توبہ سے بخشدیا گیا" اس حدیث کے بارے میں ایک اصولی اشکال اور اس کا جواب
۳۳۱	توبہ کرنے والے کافروں اور مشرکوں کے لئے بھی منشورِ رحمت
۳۳۳	**توبہ و استغفار کے خاص کلمات**
۳۳۹	سیّد الاستغفار (صـ۳۳۵) حضرت خضرؑ کا استغفار
۳۴۲	استغفار کی برکات
۳۴۵	استغفار پوری اُمت کے لئے امان (صـ۳۴۳) توبہ و استغفار سے اللہ کتنا خوش ہوتا ہے
۳۴۶	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہوئی ایک مسافر بدو کی عجیب و غریب مثال
۳۴۸	توبہ کرنے والے گنہگار بندے سے اللہ تعالیٰ کے خوش ہونے کے موضوع پر شیخ ابن القیمؒ کا رُوح پرور عارفانہ کلام۔

صفحہ	عنوان، یا مضمون کا اشاریہ

صلوٰۃ وسلام

ـــــــــــ ت ـــــــــــ ـــــــــــ ج ـــــــــــ

تفسیر قرآن

الاتقان فی علوم القرآن (اردو)

علامہ سیوطیؒ امت محمدیہ کے مشہور مصنفین میں ہیں۔
"الاتقان" ان کی ممتاز ترین تصنیف ہے۔ جس کو ان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، یہ قرآن فہمی کے لیے بنیادی کتاب ہے۔ تفسیر قرآن سے متعلق متقدمین کی صدہا کتابوں کے علمی جواہرات اس میں محفوظ ہیں۔ بڑے سے بڑے علماء بھی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ دو جلدوں میں

قیمت کامل ۳۶/-

"تفسیر تدبر قرآن" (جلد اول)

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

قرآن پاک کی تفہیم کے بارے میں اس کو بجا طور پر اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ قرآن بے شک اللہ ہی کا کلام ہے۔ آفسٹ کی طباعت بڑا کتابی سائز، ... صفحات نہایت حسین اور مضبوط جلد، قیمت ۳۰/-

تفسیر ماجدی (جلد اول)

(از مولانا عبدالماجد دریا بادی)

مشتمل بر سورۂ فاتحہ و بقرہ و آل عمران، نیا اڈیشن مکمل نظر ثانی اور بکثرت اضافوں کے ساتھ۔
ضخامت ... صفحات، بڑا سائز، مضبوط جلد

قیمت ۱۸/-

مولانا دریا بادی کے تفسیری رسائل

مولانا دریا بادی نے قرآن مجید سے متعلق خاص خاص موضوعات پر چند مستقل رسائل بھی لکھے ہیں قرآن مجید کے ہر طالب علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔
قرآنی شخصیتیں ۲/۲۵، حیوانات قرآنی ۲/-
قصص و مسائل ۲/-، بشریت انبیاء ۲/۵۰

درس قرآن (مکمل سات جلدوں میں مجلد)

گھر بیٹھے قرآن سمجھئے اور سمجھائیے

نہایت سادہ انداز میں قرآن کی تعلیم کو پیش کرنے والا ایک قابل قدر سلسلہ۔ اس کے ذریعہ ہر گھر میں درس قرآنی جاری کیا جا سکتا ہے۔ عوامی افادیت کے خیال سے ایک ایک صفحہ کے سبق کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ ہر منزل کی الگ الگ جلد

قیمت مکمل سیٹ ۶۰/-

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم)

امم سابقہ کے سلسلہ میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر پورا ایک کتب خانہ ہے۔

قیمت مکمل چار جلد، غیر مجلد ۲۸/-

فہم قرآن

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

اسمیں خاص طور سے ان لوگوں کی غلطی واضح کردی گئی ہے جو حدیث نبوی اور سلف صالحین سے بے نیاز ہو کر قرآن سمجھنے کے دعوے کرتے ہیں۔ ..... قیمت ۴/-

وحی الٰہی (از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

مسئلہ وحی پر محققانہ کتاب ہے جس میں وحی اور اس کے متعلقہ گوشوں پر جدید اسلوب میں بحث کی گئی ہے قیمت ۳/-

الفوز الکبیر (اردو)

اہل علم کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ فن تفسیر کے اصول و مبادی پر شاہ ولی اللہؒ کا یہ مختصر رسالہ بے نظیر ہے۔ اس سے قرآن فہمی کی کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ..... قیمت ۱/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

حدیث نبوی اور اس کے متعلقات

بخاری شریف کامل (اردو)

بخاری شریف کو امت نے قرآن مجید کے بعد صحیح ترین اور سب سے زیادہ مستند کتاب مانا ہے اس کا قابل اعتماد ترجمہ ہے۔ تین ضخیم جلدیں اعلیٰ کاغذ قیمت مجلد ۴۵/-

زبدۃ البخاری (اردو)

یہ بخاری شریف کی جامع اور مکمل تلخیص ہے۔

قیمت مجلد ۱۳/-

الادب المفرد (اردو)

یہ امام بخاری کی ایک مستقل تصنیف ہے جس میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات و ہدایات اور سنن و معمولات کو جمع کیا ہے جن کا تعلق باب معاشرت و اخلاق سے ہے۔ آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا شوق رکھنے والوں کے لیے قابل قدر تحفہ ہے۔

قیمت مجلد ۱۲/-

حصن حصین (ترجمہ مع متن عربی)

ذخیرۂ حدیث میں جس قدر دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و ماثور ہیں وہ سب اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ حل مشکلات اور دفع بلیات کے لیے اس کا ختم مجربات میں سے ہے۔ قیمت مجلد ۱۲/-

کتاب الآثار (مترجم اردو)

قریباً نو سو آثار کا گراں قدر ذخیرہ جس کو امام اعظمؒ نے چالیس ہزار احادیث و آثار سے منتخب فرمایا۔

قیمت مجلد ۱۰/-

بلوغ المرام (مترجم)

حدیث کی مشہور درسی کتاب ہے۔ قیمت مجلد ۱۲/-

ترجمان السنۃ (۴ جلد)

(از حضرت مولانا بدر عالم مہاجر مدنی)

یہ کتاب اپنی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے تعارف سے بے نیاز ہے قیمت جلد اول ۱۲/- جلد دوم ۱۲/- جلد سوم ۱۲/- جلد چہارم ۱۲/- مجلد کے لیے ہر جلد پر دو روپے زیادہ

علوم الحدیث (ترجمہ اردو)

اصل کتاب کے مصنف لبنان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر صبحی صالح ہیں۔ ترجمہ غلام احمد صاحب حریری نے کیا ہے اپنے موضوع پر جامع فاضلانہ کتاب ہے — اس کے خاص خاص موضوعات یہ ہیں:

حجیت حدیث — تاریخ تدوین حدیث — حدیث اسلامی قانون کی بنیاد — اصول حدیث — حدیث کی کتابوں اور ان کے مؤلفین کا تعارف۔ — کتاب کی نوعیت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ پانچ سو سے زیادہ صفحات، نفیس کاغذ، نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، قیمت مجلد ۱۶/-

عجالۂ نافعہ مع شرح فوائد جامعہ

فن حدیث پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بے نظیر اور مفید ترین تصنیف ہے۔ شارح نے اس کی افادیت میں بے حد اضافہ کر دیا ہے اب کو فن حدیث کی انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ قیمت مجلد ۱۵/-

ابن ماجہ اور علم الحدیث

(از فاضل گرامی مولانا عبدالرشید نعمانی)

عہد رسالت سے امام ابن ماجہ کے زمانہ تک کی تاریخ تدوین حدیث اور سنن ابن ماجہ پر محققانہ تبصرہ قیمت ۸/-

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)

ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ کا تذکرہ اور تدوین حدیث کی مختصر تاریخ، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ۔ قیمت مجلد ۲/۵۰

فن اسماء الرجال ائمہ حدیث کا عظیم کارنامہ

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی دوسری تصنیف شروع میں مولانا علی میاں ندوی کا مقدمہ۔ حدیث کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قیمت ۱/۰۵

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت کی منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ

از علامہ شبلی نعمانیؒ و سید سلیمان ندویؒ

از جلد اول تا پنجم (ششم اس وقت زیر طبع ہے) قیمت ۶۶/۵۰

زاد المعاد اردو (چار جلدوں میں)

از حافظ ابن القیمؒ

سیرت پاک پر گذشتہ صدیوں میں لکھی جانے والی کتابوں میں علم و تحقیق کے لحاظ سے "زاد المعاد" کا خاص مقام ہے۔ ...... قیمت مکمل ۴۸/-

اصح السیر (از مولانا حکیم عبد الرؤف دانا پوری)

سیرت نبوی پر نہایت محققانہ اور مستند کتاب قیمت ۱۰/-

دعوت اسلام۔ علامہ اقبال کے استاد سر تھامس آرنلڈ کی شہرۂ آفاق تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کا اردو ترجمہ جو سر سید احمد خاں کے ایما پر مولوی عنایت اللہ دہلوی نے کیا تھا۔ قیمت مجلد صرف ۱۰/-

پیغمبر عالم۔ (از مولانا عبد الصمد رحمانی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر ایک نہایت فاضلانہ کتاب ۶/۷۵

رحمت عالم (از علامہ سید سلیمان ندوی)

عوام اور طلبہ کے لیے سیرت کے موضوع پر ایک مختصر لیکن جامع تصنیف .... قیمت ۲/-

مقالات سیرت (از ڈاکٹر محمد یوسف قدوائی)

سیرت کے موضوع پر آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ مولانا علی میاں نے اس کتاب کے مقدمہ میں دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ .... قیمت ۵/-

پہلی تقریر سیرت۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ کی معرکۃ الآرا تقریر۔ ۱/۷۵ دوسری تقریر سیرت " " ۲/۵۰

الفاروق

علامہ شبلی نعمانی کا مشہور و مقبول شاہکار قیمت ۶/۵۰

صدیق اکبر۔ الفاروق کے بعد سیرت صدیق پر محسوس ہونے والے خلا کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی اس فاضلانہ کتاب نے پُر کر دیا ہے۔ قیمت صرف ۸/-

تاریخ ردّۃ۔ عہد صدیقی کی بغاوتوں اور عسکری سرگرمیوں کی مفصل تاریخ۔ ... قیمت ۴/-

حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط۔ ڈاکٹر خورشید احمد کی فاضلانہ تصنیف جو اس وقت زیر طبع ہے۔

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ از ڈاکٹر خورشید احمد ...... قیمت صرف ۸/-

حضرت عثمان کے سرکاری خطوط۔ مصنفہ ڈاکٹر خورشید احمد ...... قیمت ۴/-

حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور ان کی فقہ

اپنے موضوع پر نہایت ہی مفید اور فاضلانہ تالیف ۷/-

حضرت ابو ذر غفاریؓ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا گیلانی مرحوم کے علم و عرفان کا آئینہ قیمت [illegible]

فاطمہ کا چاند۔ از مولانا عبد الصمد رحمانی ... ۲/۲۵

شہید کربلا۔ از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

قیمت ۱/۵۰

اشاعت اسلام۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی مشہور و معروف تصنیف .... قیمت صرف ۶/-

خلفاء راشدین اور اہل بیت کرام کے تعلقات

قیمت ۱/۰۵

اسوۂ حسنہ۔ مولانا ظفیر الدین مفتاحی کے قلم سے ۳/-

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سوانح ــــ اور ــــ تذکرے

تاریخ دعوت و عزیمت (سوم) محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری کا تذکرہ مولانا علی میاں کے قلم سے قیمت .. .. -/٥

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ از پروفیسر خلیق احمد نظامی ایک قابل مطالعہ اہم کتاب .. .. -/٨

حیات ابن القیم (اردو) قاہرہ یونیورسٹی کے استاد عبدالعظیم شرف الدین کے قلم سے .... قیمت ..... -/١٥

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ شاہ صاحب کا سیاسی، دینی، علمی احوال اور ان کا تجدیدی کارنامہ ٤/٥٠

تذکرۃ الرشید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی مکمل سوانح حیات، قیمت ..... -/١٠

سوانح حضرت رائے پوریؒ نظر ثانی اور اہم اضافات کے بعد دوسرا ایڈیشن .... قیمت ٦/

سوانح مولانا محمد یوسفؒ داعی اسلام حضرت جیؒ کی سوانح حیات........ قیمت .... -/١٠

تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قیمت.... ٢/٥٠

سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ از سید محمد الحسنی ایڈیٹر تعمیر حیات قیمت ٦/

مولانا محمد احسن نانوتویؒ از محمد ایوب قادری ایم اے قیمت ...... -/٤

علمائے ہند کا شاندار ماضی مولانا سید محمد میاں کی شہرۂ آفاق کتاب ٤/٥٠

آپ بیتی ظفر حسن ایبک پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ایک مجاہدانہ منصوبے کے ساتھ ہندوستان سے کابل ہجرت کرنے والے مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء کی سرگزشت انھیں کے ایک ہمسفر کے قلم سے...... قیمت کامل ٩/٥٠

البرامکہ (اردو) یہ کتاب صرف ایک شخص کی سوانح حیات ہی نہیں بلکہ ایران کی قدیم عظمت کی کہانی اور عہد عباسی کے عظیم الشان تمدن و تاریخ اسلامی کے ایک درخشاں دور کی تصویر ہے -/١٥

اوراق گم گشتہ (از رئیس احمد جعفری ندوی) ہندوستان کی آزادی میں جان و مال کی بازی لگانے والے مسلمان لیڈران مولانا محمد علی مولانا شوکت علیؒ حسرت موہانی، شیخ الہند اور ان کے رفقاء و تلامذہ کی کوششوں و کارناموں کی تاریخ ساتھ میں تحریک خلافت اور ہندوستان سے کابل ہجرت کی تاریخ بھی ملاحظہ کیجئے ٹائپ کی طباعت، سفید اعلیٰ کاغذ، بڑا کتابی سائز، صفحات ١٠٠٠ قیمت مجلد -/٣٠

تاریخ فلاسفۃ الاسلام (اردو) کندی، فارابی بوعلی سینا، امام غزالی، ابن رشد و ابن خلدون جیسے فلاسفۂ اسلام کے مکمل حالات .... قیمت ٨/٧٥

ان کہی کہانی سابق کمانڈر انچیف آف انڈیا جنرل بی ایم کول کی "ان کہی کہانی" جس نے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا اس میں بعض اہم رازوں کو افشا کیا گیا ہے۔ اسی لیے حکومت سے مصنف پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ انگریزی سے ترجمہ........ قیمت .... -/١٧

"جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" سابق صدر پاکستان محمد ایوب خاں کی خود نوشت سیاسی ڈائری........ قیمت ..... -/١٥

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

ندوۃ المصنفین دہلی کی مطبوعات

لغات القرآن (مکمل ۶ جلدوں میں) ۲۳/-
تدوین قرآن ۱/۵۰
رہنمائے قرآن ۱/-
قرآن اور تعمیر سیرت ۶/-
اسلام کا اقتصادی نظام ۸/-
اسلام کا نظام عفت وعصمت ۵/-
اسلام کا زرعی نظام ۵/-
اسلام کا نظام مساجد ۵/-
اسلام کا نظام حکومت ۸/-
اسلام میں غلامی کی حقیقت ۵/-
غلامان اسلام ۸/-
تاریخ ادبیات ایران ۸/-
تاریخ گجرات ۸/-
تاریخ علم فقہ ۶/-
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۴/-
اسلام اور فلسفۂ اخلاق ۱۰/-
العلم والعلماء ۵/-
سیرت النعمان ۳/-
عروج وزوال کا الٰہی نظام ۳/-
منتخبات اللغات مجلد عکسی ۲۰/- غیر مجلد عکسی ۱۸/-
مسلمانوں کا عروج وزوال ۷/-
مسلمانوں کا نظم مملکت ۷/-
مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت حصہ اول ۹/- حصہ دوم زیر طبع
نیل سے فرات تک ۳/-
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۳/-

دار المصنفین اعظم گڑھ کی مطبوعات

سیرۃ النبی از جلد اول تا پنجم (ششم اس وقت زیر طبع ہے) ۷۵/۵۰
مہاجرین اول ۳/- دوم ۴/-
سیر الانصار اول ۲/- دوم ۵/-
سیر الصحابہ ششم ۳/- ہفتم ۳/۵۰
اسوۂ صحابہ اول ۶/- دوم ۸/-
سیر الصحابیات ۳/- تابعین ۱۰/۵۰
اہل کتاب صحابہ وتابعین ۳/-
تاریخ اسلام (مکمل چار جلدوں میں) ۲۴/-
تاریخ دولت عثمانیہ کامل ۱۹/-
تاریخ صقلیہ کامل (دو جلدوں میں) ۱۸/-
تاریخ اندلس ۸/۵۰
تاریخ فقہ اسلامی ۱۰/-
اسلام کا سیاسی نظام ۶/-
ہماری بادشاہی ۴/-
گجرات کی تمدنی تاریخ ۷/-
الغزالی ۸/-
المامون ۵/-
سیرت عمر بن عبدالعزیز ۵/-
حیات شبلی ۸/-
محمد علی کی ڈائری مکمل ۱۹/-
مقالات سلیمانی ۱۸/۵۰
صاحب المثنوی ۱۰/۵۰
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ۱۶/۲۵
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے ۱۲/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے ۷/-

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

فقہ و فتاویٰ

علم الفقہ از حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ۱۶/-
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل (مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ قیمت ۲۱/-
فتاویٰ رشیدیہ کامل ۔ ۔ ۔ ۔ ۸/-
تاریخ علم فقہ ۲/۲۵

تصوف و اصلاح نفس

تزکیۂ نفس از مولانا امین احسن اصلاحی ۶/-
تبلیغ دین از امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۲/۵۰
ارشاد السالکین از مولانا عبدالباطن جونپوری ۱/۵۰
کلمات اکابر از مولانا اسحاق بنارسی ۱/۵۰
وحدۃ الوجود والشہود ۱/-
وجد و سماع ۱/۳۷
شمائم امدادیہ ۲/-
مکتوبات شیخ الاسلام کامل ۱۶/۵۰

احقاق حق و ابطال باطل

تقریر دلپذیر از مولانا محمد قاسم نانوتوی ۴/۵۰
تحقیق مذاہب از مولانا مطیع الحق دیوبندی .. ۲/-
اثبات النبوۃ از مجدد الف ثانیؒ ۲/-
تحفۂ اثنا عشریہ (اردو) ۱۵/-
تقویۃ الایمان (کلاں) ۱۲/-
براہین قاطعہ از حضرت مولانا خلیل احمدؒ .. ۵/-
رد بدعت از مجدد الف ثانی ۱/۲۵
بدعت کیا ہے از مولانا عامر عثمانی ۲/-
چالیس بدعتیں .. .. -/۶۲

انگریزی زبان میں دینی کتابیں

وہاٹ اسلام از از مولانا محمد منظور نعمانی
ترجمہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی قیمت ۸/-
اسلامک فیتھ اینڈ پریکٹس از مولانا محمد منظور نعمانی
ترجمہ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی زیر طبع
اسلام اینڈ دی ورلڈ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ترجمہ۔ ڈاکٹر آصف قدوائی قیمت ۱۲/-
مسلمس ان انڈیا از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ترجمہ۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ۶/-
قادیانزم از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۷/-
لائف آف محمد ۱۰/-
دی ورچیوز آف صلوٰۃ از شیخ الحدیث مدظلہ ۲/۵۰
دی اسٹوریز آف صحابہ (حکایات صحابہ) ۵/-
دی بلیسڈ پرافٹ (رحمت عالم) ۲/-
ٹیلس آف دی پرافٹ (قصص النبیین اول) ۱/۴۰
اسلام ایٹ دی کراس روڈ ۴/-
اے کال ٹو مسلم .. .. .. -/۵۰
اے گریٹ انگلش مسلم .. .. .. -/۴۰

لغات

مصباح اللغات۔ عربی اردو ڈکشنری۔
از مولانا عبدالحفیظ بلیاوی۔ پچاس ہزار سے زیادہ
عربی الفاظ کی تشریح۔ قیمت مجلد .. ۲۰/-
اردو عربی ڈکشنری۔ از مولانا عبدالحفیظ بلیاوی
اردو سے عربی جدید اڈیشن نظر ثانی اور قیمتی اضافوں کے ساتھ ۱۶/-
قاموس القرآن از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ۱۰/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

تصانیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔
اردو -/۶ انگریزی -/۱۲
تذکرہ مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی قیمت ۲/۵۰
تاریخ دعوت و عزیمت سوم۔ قیمت مجلد -/۶
سوانح حضرت رائے پوری۔ قیمت -/۶
ہندوستانی مسلمان اردو -/۵ انگریزی -/۶
قادیانیت۔ اردو -/۳ عربی -/۴ انگریزی -/۶
اسلامیت و مغربیت کی کشمکش ...... قیمت -/۵
کاروان مدینہ .... قیمت -/۳

تصانیف مولانا احمد سعید دہلوی

جنت کی کنجی ...... قیمت ۲/۵۰
دوزخ کا کھٹکا ...... قیمت ۲/۵۰
موت کا جھٹکا ...... قیمت .... -/۵
رسول کی باتیں ...... قیمت ...... -/۲
مشکل کشا ...... قیمت ۲/۵۰
پردہ کی باتیں ...... قیمت ۱/۳۰
جنت کی ضمانت ...... قیمت ...... -/۱
خدا کی باتیں ...... قیمت ۲/۸۰
پہلی تقریر سیرت ...... قیمت ۱/۷۵
دوسری تقریر سیرت ...... قیمت ۲/۵۰

تصانیف مولانا عبدالباری ندوی

تجدید دین کامل ...... قیمت ...... -/۶
تجدید تعلیم و تبلیغ ...... قیمت ...... -/۳
تجدید معاشیات ...... قیمت ...... -/۵
تجدید تصوف و سلوک ...... قیمت ...... -/۵

تصانیف حضرت شاہ ولی اللہؒ

"حجۃ اللہ البالغہ" کامل دو جلدوں میں مجلد
اصل عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ از علامہ عبدالحق
صاحب تفسیر حقانی ...... قیمت ...... -/۳۰
"ازالۃ الخفا" اردو ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں مجلد -/۳۰

تصانیف حضرت حکیم الامت تھانویؒ

تعلیم الدین ...... قیمت ۱/۴۰
حیات المسلمین ...... قیمت ۱/۴۰
اصلاح الرسوم ...... قیمت ۱/۶۰
اعمال قرآنی مترجم ...... قیمت ۱/۶۰
بہشتی زیور۔ کامل۔ غیر مجلد قیمت ...... -/۱۲
مواعظ حسنہ۔ کامل ...... قیمت ۵/۵۰
دین کی باتیں ...... قیمت ۲/۸۰

تصانیف حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا مدظلہ

تبلیغی نصاب۔ مجلد چرمی ۷/۵۰
" " سادہ .... -/۶
حکایات صحابہ۔ اردو -/۱ انگریزی ۳/۵۰
خصائل نبوی، شرح شمائل ترمذی -/۶
فضائل نماز ...... قیمت .... -/۸۰
فضائل رمضان -/۵۵ فضائل قرآن -/۶۰
فضائل ذکر ۱/۶۰ فضائل حج مجلد ۳/۵۰
فضائل تبلیغ ...... قیمت .... -/۳۰
فضائل صدقات۔ مجلد چرمی (کامل) ۷/۵۰
فضائل درود شریف ...... قیمت ۱/۷۵
الاعتدال فی مراتب الرجال (اسلامی سیاست) ۳/۵۰

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 37 No. 2 MAY 1969

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے ــ کیا کہتا ہے؟
تالیف ــ مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے۔ یہانتک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۲۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs 5-00

فی کاپی ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ..... -/۴
پاکستان سے ..... -/۴

شمارہ ۳	بابت ماہ ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ مطابق جون ۱۹۶۹ء	جلد ۳۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

———(گزشتہ سے پیوستہ[1])———

تحریکِ پاکستان کی حمایت، جن لوگوں نے ملّت کے دنیوی مفاد کے علاوہ، بقول مولانا دریابادی اس "فریبِ نفس" یا خوش فہمی کے ماتحت بھی کی کہ ——"جب حکومت اپنی ہوگی تو لازمی طور پر قانونِ اسلام رائج ہوگا"—— اُن میں سے عوام تو صاف معذور قرار دیے جا سکتے ہیں کہ وہ کہلاتے ہی "کالانعام" ہیں۔ لیکن پڑھے لکھے اور ہوشمند خصوصاً اہلِ دین اور اہلِ علم دین کے لیے بظاہر کوئی عذر نہیں بنتا کہ ان کے لیے اس غلط فہمی کی کیا گنجائش تھی! اسلامی حکومت اور اسلامی اخوت کے لیے عصرِ حاضر کی پیدا کردہ مشکلات اور نئے عمرانی تصورات کی فتنہ سامانیوں کا انھیں علم و ادراک نہ سہی، لیکن تحریک کی خالص دنیوی اساس اور قیادت کی دین سے ناواقفیت، پھر اس کی غیر اسلامی حیات و معاشرت۔ اور اسی کے ساتھ عام طور پر ملّت کی بھی اس پہلو سے ناگفتہ بہ حالت، کیا یہ چیزیں اس غلط فہمی کو روکنے کے لیے کچھ کم تھیں (کہ جب حکومت اپنی ہوگی تو لازمی طور پر وہاں اسلام حکمراں ہوگا اور معاشرہ اسلامی اُصولوں میں ڈھلے گا)۔

مولانا دریابادی زید مجدہم کی تحریر فی الواقع تو یہ تاثر بھی دیتی ہے کہ تحریکِ پاکستان کی

---

[1] سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ صفر مطابق مئی ۱۹۶۹ء۔

بنیاد ہی دینی نہ تھی کہ اس پر اسلامی حکومت کی تعمیر کا خواب دیکھا جاتا۔ لیکن اس تاثر کے مقابلہ میں جس تاثر کا زیادہ گہرا نقش قائم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ جو چیز اس "اپنی حکومت" کے اسلامی حکومت بننے میں حائل ہو گئی وہ اصل میں خارجی فضا کی ناسازگاری تھی، جس نے نسلی و لسانی، جغرافیائی و معاشی تفرقہ کا زہر پھیلا کر کسی مذہبی رابطہ کو اساسِ مملکت بننے کی پوزیشن میں نہیں رہنے دیا ہے ـــــ اور پھر اس کا مطلب کچھ ایسا نکلتا ہے کہ تحریک کی غیر دینی اساس اور غیر دینی قیادت کے باوجود اگر خارجی فضا سدِّ راہ نہ ہوتی تو پاکستان ایک اسلامی حکومت کے سانچہ میں ڈھل سکتا تھا۔

مولانا کا اگر ایسا ہی خیال ہے تو اس سے ادب کے ساتھ اختلاف ہے۔ جدید آفاقی تمدن کی اس فضا نے بیشک آج کسی بھی خطۂ زمین میں اسلامی حکومت کے قیام کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ لیکن اس "مشکل" کو ناممکن کے معنیٰ میں لینا تو ایک ضرورت سے زیادہ مایوسی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کو ناممکن بنانے والی چیز صرف ان شرائط کا فقدان ہے جن کا تقاضہ اس نظامِ حکومت کی فطرت کرتی ہے۔ یہ شرائط پورے ہوں تو پھر کسی خارجی مانع میں یہ طاقت نہیں کہ ان کے فطری نتیجہ کو روک سکے ـــــ اصل میں معاملہ اول سے آخر تک تمام ہی شرائط کے فقدان کا تھا اور ایسے میں خارجی حالات کی عدم مزاحمت تو کیا ساری دنیا ل کر خواہش مند بھی ہوتی تو نیک دل لوگوں کا یہ خواب اسی طرح اپنی تعبیر کے لیے ترستا اور تڑپتا رہتا۔ قصور جدید آفاقی تمدن کا بالکل نہیں، خطا اپنی ہی تھی کہ آکاس بیل کو انگور کی بیل سمجھ بیٹھے اور بڑی دلفریب اُمیدیں رس بھرے خوشوں کی باندھ لیں ـــــ حالانکہ بات کھلی ہوئی تھی کہ جب تحریک کو قوم میں اسلامی زندگی کی جدوجہد سے کوئی واسطہ نہیں، اسلامی مزاج اور آداب کا اس میں کوئی گزر نہیں، قائدِ تحریک کا نہ ذہن دین سے آشنا، نہ عمل۔ اور قوم کی غالب اکثریت ع "اُمتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں" کا مصداق! تو آخر اس تحریک سے حاصل ہونے والا اقتدار کیونکر حکومتِ الٰہیہ کا نمونہ بن کے نکلے گا؟[۵]

[۵] واضح رہے کہ یہاں تحریکِ پاکستان سے وابستہ دُنیوی امیدوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ جو کچھ گفتگو ہے وہ دینی امیدوں اور دینی خوابوں کی ہے۔

یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ ان سب خامیوں کے باوجود، جب نعرہ اسلامی حکومت کا لگ رہا تھا اور کم از کم عوام (حقیقت ناآشنائی کے ساتھ ہی سہی) اسی جذبہ سے سرشار ہو کر مطالبہ پاکستان کا دم بھر رہے تھے۔ اور لیڈروں کے بارے میں بھی یہ فرض کر لینے کی کوئی قطعی بنیاد نہیں تھی کہ ان نعروں سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا کبھی انھیں احساس ہی نہیں ہو سکتا، تو یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ قیام پاکستان کے بعد جب نظام حکومت کا مسئلہ آئے گا تو تحریک کا دینی عنصر کچھ افہام و تفہیم کی مدد سے اور کچھ عوام کی پرجوش تائید کے دباؤ سے (جس کی امید بجا طور سے کی جاسکتی تھی اور جسے پورا کرنے کا موڈ بھی عوام کے ایک بڑے طبقے نے قیام پاکستان کے فوراً بعد سنجیدگی کے ساتھ دکھایا) نظام حکومت کو اسلام کے راستہ پر ڈالنے میں (تحریک کا یہ دینی عنصر) کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اس توقع کے ساتھ یہ اندیشہ بھی بہرحال کوئی مخفی حقیقت نہیں تھا کہ اصل قیادت کو پتہ نہیں احساس ذمہ داری کی توفیق ملے یا نہ ملے، یا اس کے ذہن میں اسلام کا کوئی ایسا تصور پختہ طور سے جاگزیں ہو، جس میں یورپ کے "فیض یافتہ" عموماً مبتلا ہوتے ہیں۔ اور جو اصل اسلام کے لیے ایک آفت جاں ہے۔ تو پھر دینی عنصر کی کیا چل پائے گی (جبکہ یہ یوں بھی رکاب دار ہیں اور اقتدار کے ملنے پر اس کی کنجیاں بھی اسی غیر دینی قیادت کے ہاتھ میں ہوں گی، جن کے وسائل سے کام نے کر دہ عوام کو فریب بھی دے سکتی ہے۔ اور اپنی بے پناہ مقبولیت کے زور پر طرح طرح کے حربوں سے عوام کو اس دینی عنصر سے برگشتہ کر دینے میں بھی اس کی کامیابی بعید از قیاس نہیں ہے۔ برصغیر کے سب سے زیادہ موثر اور فعال دینی عنصر کو اس نے اپنی مخالفت پر ایسے حربوں ہی سے مسلم عوام میں بری طرح مجروح کر کے آخر رکھ ہی دیا تھا! ــــ یہ امکانات کا ایک بالکل حقیقی اور بدیہی پہلو تھا۔ پیش پا افتادہ حالات و واقعات اس سے آگاہی دے رہے تھے۔ مگر بڑے بڑے دانا اور اہل علم و نظر، ان آگاہیوں کو ان سنی کرتے ہوئے ان نعروں کے ہمنوا بن ہی گئے کہ پاکستان کا مطلب ہے، ایک "اسلامی" حکومت۔ اقامت شریعت۔ اور احیاء خلافت!

کیا شبہ ہے کہ یہ ایک ماتم انگیز کم نظری تھی ــــ ایسی فریب خوردگی تھی، جس پر جتنی بھی

"حیرت کی جائے کم ہے ـــــ محترم مولانا عبدالماجد صاحب نے جو کچھ بھی اس پر لکھا ہے' وہ ذرا بھی ایک واقعی حقیقت کے اعتراف سے زیادہ نہیں! حقیقت یہی ہے کہ ہماری بے پناہ توانائیاں، ہمارے حیات آخریں حوصلے اور تلاطم خیز دلولے اصل میں اسلام ہی کے نام پر تحریک پاکستان کی نذر ہوئے' حالانکہ جو چیز اس تحریک کی ساخت میں سب سے کم یقینی تھی' وہ اسلام ہی کی سربلندی تھی۔ اور یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی جسے محسوس کرنے کے لیے دین سے کچھ واقفیت اور عقل عام سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت ہرگز نہ تھی!

لیکن ہماری اس بدقسمتی کا تو جواب ہی نہیں کہ جس نقطہ پر عقل وفکر کا یہ المیہ تمام ہوا' وہیں سے ایک دوسرے المیہ کا باب کھل گیا جو اس سے کہیں زیادہ ماتم خیز تھا اور جس میں ہر روز ایک نیا ورق شامل ہو رہا ہے۔ اب یہ "ایک باب" نہیں رہا، کتاب بن گیا ہے۔ ایسی ضخیم کتاب جسے مستقبل کا مؤرخ پتہ نہیں کتنی جلدوں میں قلمبند کر سکے! ـ اس اجمال کی کچھ تفصیل، کسی دوسرے پر تنقید کے لیے نہیں' خود تنقیدی کے جذبے سے حوالۂ قرطاس ہے۔ خدا کے لیے اسی نظر سے اسے دیکھئے! کوئی بری نیت اس میں نہ تلاش کیجیے۔

عین اس وقت جبکہ مطالبہ پاکستان کا نعرہ اٹھا' ملت اسلامیہ ہند کے فکری افق پر ایک نیا ستارہ ایک نئی تابش کے ساتھ ابھرا ہوا تھا۔ اس نے مطالبہ پاکستان کی ابتداء سے پہلے ہی متحدہ قومیت والے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے خطرات کے بڑے بھیانک پہلو سامنے لا کر آناً فاناً ان کے "سواد اعظم" کی تشکر آمیز نگاہیں اپنی طرف کھینچ لی تھیں۔ اس کے دلائل کی قوت اور اسلوب بیان کی طاقت نے "متحدہ قومیت" کے حامیوں پر بڑے مخمصے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اور پاکستان کا نعرہ اٹھا تو اس کے حامیوں اور علمبرداروں کو کم از کم منفی دلائل کی پہلے سے پوری طرح تیار زمین مل گئی تھی۔ لیکن ادھر یہ نعرہ اٹھا اور ادھر اس کے خشمگیں تیور اس کے مقابل ہو گئے ـــــ پاکستان کا مطلب بتایا گیا "لا الٰہ الا اللہ" یعنی وہ سرزمین جہاں اللہ کا حکم چلے گا۔ اس سحر انگیز نعرہ پر اسنے پوری قوم رقصاں نظر آئی۔ ارباب عقل و خرد اور اہل علم ونظر کو بھی اس نے دیکھا کہ اس طوفان میں ان کے لنگر ٹوٹ رہے ہیں۔ ـــــ حالانکہ اس کی نظر میں تحریک پاکستان سے "فروغ "لا الٰہ الا اللہ" کا کوئی

امکان نہ تھا ــــ اُس کی تنقید اور تفہیم کا رُخ اب اُسی بھرپور طریقہ پر اُن لوگوں کی طرف پھر گیا جو اب تک اس کے مدح خواں اور قدرداں تھے۔

اس نے کہا کہ: اسلامی حکومت کا نصب العین بے شک سب سے بلند تر سیاسی نصب العین ہے۔ ایک مسلمان قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں کہ وہ اسلام کا قانون نافذ کرنے کے لیے آمادۂ جہد ہو۔ لیکن اسلامی حکومت ایسی تحریکوں سے تو قائم نہیں ہوتی جیسی تحریک پاکستان کے لیے اٹھی ہے اس کے لیے تو ایک بالکل ہی دوسری طرح کی تحریک کی ضرورت ہے ــــ اُس نے کہا:

(۱) "یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنے ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو نیم کی حیثیت سے نشو ونما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اُٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اُس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اُسی ذہنیت اور اُسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں

....

....

اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اُس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گردوپیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اُٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں ....

..............اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئیں گے پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی۔ اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔"

اسلامی نظام حکومت اور دوسری قسم کی حکومتوں میں ہر ہر پہلو سے فرق بتاتے ہوئے اُس نے کہا کہ :-

(۲) "وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کی فوج، اس کی پولیس، اس کی خارجی سیاست، اس کے صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں، ان کی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اس کی عدالت کے کلرک، بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھہرتے۔ ان کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل نہیں.......... غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی اور ذہنی تربیت ان (دنیوی حکومتوں) کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں، اس کو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہلکار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء اپنی

انتظامی مشین کے تمام پرزے بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔" ......

اُس نے پاکستانی تحریک کے لائحہ عمل اور اُس کے دینی نعروں کے تضاد پر انگلی رکھتے ہوئے کہا کہ :-

(۳) "ہمارے ہاں یہ سمجھا جارہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جارہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے ....

.... اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجہ اتم وطنی حکومت میں اچھا خاصہ حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُلٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں۔ اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدیدار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اُس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلہ بنادینا اور سیاسی تربیت سے اُن کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے

تو ضرور مفید ہو سکتا ہے۔ اگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلاء کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"........

اس تنقید کے جواب میں جو باتیں حامیانِ پاکستان کی طرف سے کہی جاتی تھیں اور اپنی دینی امیدوں کو کچھ نہ کچھ حق بجانب ثابت کرنے کی جو کوشش یہ لوگ کرتے تھے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ایسے ہی بے لچک انداز میں کہا گیا کہ یہ سراسر خام خیالی ہے۔ یہ ناممکنات کا خواب ہے۔ یہ تاریخ اور اجتماعیات کے ابدی تجربوں کی نفی ہے! ___ لیجئے اصل الفاظ پڑھیے:-

(۴) "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا عمر ابن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود، نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں صرف اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے۔ اگر وہ صحیح

اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں۔ اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔"

یہ سینکڑوں صفحات میں سے بطور "مشتے نمونہ از خروارے" ہے۔ تنقید و تفہیم اور جزم و یقین سے لبریز یہ تحریریں ۴۰ء اور ۴۱ء میں ایک چشمۂ کہسار کی گھن گرج اور ایک تندی بے پناہ کے ساتھ اُبل رہی تھیں۔ متحدہ قومیت اور نیشنلزم والے آزاد ہندوستان ہی میں آزادی اسلام کا یقین رکھنے والوں میں سے بھی کچھ لوگ اُن حملوں سے اُکھڑ گئے تھے جو اُن کے فکر پر اس قلم نے پہلے کیے تھے، اب اُس کے مقابل دوسرے حلقے سے کچھ لوگ متزلزل ہوئے۔ ایک قلیل تعداد متذبذب اور بین بین کی تھی، وہ بھی اس آواز کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک نئی تحریک کی بنیاد پڑی جو مسلمانوں کو اُس راہ عمل کی دعوت دے گی جس سے صحیح معنی میں اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ معاملہ کو کس قدر سوچ سمجھ کر یہ لوگ اس نئی تحریک میں آئے ہوں گے! ابتلا مبالغہ سیکڑوں صفحات پڑھ کر۔ اور کسی جذباتی اپیل کے بجائے دلائل کی قوت سے متاثر ہو کر مسائل کے تجزیہ اور نتائج پر یقیناً پورے شعور کے ساتھ مطمئن ہو کر، انھوں نے اس نئی دعوت کو لبیک کہا تھا۔ یہ تصور بھی کرنا مشکل ہو کہ ان میں سے کوئی سرسری فکر سے داعیٔ تحریک کا ہم رکاب ہو گیا تھا۔ اور قیاس و گمان کی کیا بات! اُس ابتدائی دور والے ہی نہیں، بعد میں جو لوگ چلتی گاڑی پر بیٹھے ہیں اُن سے بھی پوچھئے تو اپنا طرۂ امتیاز یہی بتائیں گے، کہ ہر طرح سوچ سمجھ کر اور بہت کچھ پڑھ کر اس تحریک سے انھوں نے رشتہ جوڑا ہے —— تحریک کی بنیاد ہی اُس ابتدائی دور کے سراسر استدلالی لٹریچر پر ہے۔

لیکن اس مکمل شعوری تحریک کا حشر دیکھئے جس کا ہر ہر فرد نظریاتی نفی و اثبات کے ایک ایک پہلو پر حاوی تھا۔ جو دو آنے، چار آنے کی ممبری کا فارم بھر کر رکنیت کی سند نہیں پا گیا

تھا، بلکہ حکومت اسلامی کی حقیقت اور اُس کے وجود میں آنے کے طریقہ کا ٹھیک اس طور پر ادراک کر کے، جس طور پر ان سب چیزوں کو داعیٔ تحریک نے سیکڑوں صفحات میں پیش کیا تھا۔ ——— اور اس ادراک کے ماتحت اپنے فرائض اور طرز عمل کا بھی داعی کی تصریحات ہی کے مطابق احساس کر کے، باقاعدہ بارگاہ خداوندی میں عہد و حلف کے ذریعہ یہ سب لوگ تحریک میں شامل ہوئے تھے!

پاکستان کے لیے مسلم لیگ کی تحریک ۴۷ء تک چلتی رہی۔ اور یہ دوسری تحریک جو ساتھ ہی ساتھ وجود میں آئی تھی، اپنے نظریات کی مثبت اشاعت کے ضمن میں آخر تک اس خیال کی نفی کرتی رہی کہ پاکستان سے ایک "اسلامی" حکومت کی بنیاد پڑے گی اور "نسلی مسلمانوں" کا وہ مجموعہ جس پر پاکستانی علاقے مشتمل ہوں گے، اپنی حد درجہ اخلاقی، علمی اور فکری کج خرامیوں کے باوجود اور اُن تمام اہلیتوں کے فقدان کے باوجود، جو ایک "اسلامی" حکومت کو چلانے کے لیے درکار ہیں۔ اسلام کے اُس نظام حکومت ہی کو اپنی مملکت کے لیے منتخب کرے گا جو انتہائی بے لاگ قانونوں اور بے لچک اصولوں کا مجموعہ ہے اور جسے چلانے کے لیے نیچے سے اوپر تک خالص اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک نئی مشینری ناگزیر ہے[1]۔ چناں چہ اس بے لاگ اور بے لچک

---

[1] "آخر تک نفی" کی ایک مثال یہ ہے کہ ۲۵ اپریل ۴۷ء کو اس تحریک کے ایک لیڈر نے تحریک کے ایک اہم اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"اگر آپ فی الواقع نظام اسلامی کے خواہاں ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کے دلوں کو بدلیے۔ وہ دل ان جسموں کو بدلیں گے جن میں وہ دھڑک رہے ہوں گے۔ پھر وہ اجسام اپنے گھروں اور خاندانوں اور بستیوں اور شہروں کو بدلیں گے جن میں وہ رہتے ہوں گے۔ انکی سیرتیں، ان کی صورتیں، انکے معاملات، تعلقات، سیاست، تجارت، معاشرت اور تمدن ہر شے بدلتی جائیگی تا آنکہ وہ ایک ایسی سوسائیٹی اور جماعت بن جائینگے کہ انکے اندر کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا عملاً چلنا محال اور ناممکن ہو جائیگا۔ اور وہ نظام اسلامی وجود میں آئیگا جس کی ہر چیز اسلامی اور ہر جز سرتاپا اسلام ہوگا۔ اسلامی نظام ہمیشہ اسی طرح برقائم ہوا ہے اور آئندہ جب کبھی قائم ہوگا، اسی طرح ہوگا۔ جو لوگ اسکے سوا کسی دوسرے طریقہ کو بھی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ انکے اس دھوکہ کو جلد از جلد دور کریں۔"

نظریہ کی بنا پر پاکستان کی تحریک سے ذرہ برابر ہمدردی اس نئی تحریک نے نہیں دکھائی۔ اس کی نظر میں یہ ہمدردی ایک کارِ عبث ہی نہیں، اپنے آپ سے دشمنی تھی کیونکہ جیسا کہ کہا گیا تھا، ایسے بگڑے ہوئے اور نفس پرست مسلم معاشرہ کے ووٹوں سے تو:

"اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔" [1]

اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ:

"اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"

اس بے لاگ اور انتہائی صاف توقف کے عالم میں نظریۂ پاکستان (تقریباً اچانک) ایک واقعہ بن جاتا ہے اور اس دوسری تحریک کا ہیڈ کوارٹر بھی نوشتۂ تقدیر سے، اسی پاکستان میں منتقل ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ رکنیت کے انتہائی سخت معیار کی بنا پر اور پھر عام طور پر مسلمانوں کے لیے تحریک پاکستان کی بے پناہ جاذبیت کے نتیجہ میں، اس دوسری تحریک کو ابھی افراد ہی کہاں مہیا ہوئے تھے کہ تقسیم نے اس مٹھی بھر جمعیت کی بھی کم سے کم نصف طاقت سے ہیڈ کوارٹر کو محروم کر دیا ـــــ اب اس کو اپنے واضح نظریات اور نہایت بے لاگ خیالات کی رو سے کیا کرنا تھا؟ وہی نا! جسے آپ اس مضمون میں پیش کیے گئے پہلے ہی اقتباس میں پڑھ آئے ہیں! اور کس حد

---

[1] یہ اقتباس اوپر گزر چکا ہے۔ آگے کا اقتباس اسی عبارت کا حصہ ہے جو اس وقت چھوڑ دیا گیا تھا۔

تک کرنا تھا؟ اسی حد تک جس حد تک کارکردگی کو، اسی مذکورہ اقتباس میں، اسلامی حکومت کے قائم ہونے اور چلنے کے لیے ناگزیر بتایا گیا ہے[1] اور جس سے صرف نظر کرکے اسلامی حکومت کا خواب دیکھنے والوں سے کہا گیا تھا کہ:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔"
___ کیوں؟ اس لیے کہ ___ "اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگزاری، فینانس، تعلیمات اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے"

لیکن جونہی پاکستان وجود میں آیا اور اس تحریک کی اصل قیادت کو پاکستان کے حصہ میں جانا پڑا، اس نے وہ تبدیلی اختیار کی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا! ___ ۴۰ء سے ۴۷ء تک جو کچھ کہا جاتا رہا اس کا منطقی تقاضا تو صاف اور صریح تھا ہی کہ پاکستان بن گیا تو وہاں بھی اس کے لیے اپنے طریق کار میں کسی بنیادی تبدیلی کا سوال نہیں لیکن بات منطقی تقاضے ہی تک نہیں رہی تھی، ایک طرح سے اس پالیسی کا اعلان (Declarat-ion) بھی کردیا گیا تھا جسے ان الفاظ میں پڑھا جا سکتا ہے کہ:

"..... اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت (پاکستان) میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی[2] .... تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد مسلم حکومت کے انتظار میں اپنا وقت یا اُس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ

---

[1] ملاحظہ ہو اس مضمون کا صٹ

[2] کیونکہ تحریک پاکستان اس جدوجہد سے بے نیاز ہے! وہ بس ایک نام نہاد مسلم حکومت اُس کا نصب العین ہے۔ ع

سیدّ راہ ثابت ہوگی ؟"

مگر پاکستان بنتے ہی اور اس میں قدم رکھتے ہی یہ جماعت، جو مسلمانوں کے علمی، اخلاقی اور فکری حال کو کسی طرح بھی اس قابل سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اُس پر ایک اسلامی حکومت کی عمارت کھڑی کی جا سکے۔ جو حضرت عمر بن عبد العزیز (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے تجربہ کا حوالہ دیتی تھی کہ اپنی زبردست شخصیت اور مکمل حاکمانہ حیثیت، نیز اپنی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بھاری جمعیت اور خیر القرون کی قربت کے باوجود نظامِ حکومت کے انقلاب کی مہم میں صرف اسی لیے "قطعاً ناکام" رہے کہ "سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی" جس کے ارکان کا گویا عقیدہ تھا کہ "جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔" جو ایک اسلامی اسٹیٹ وجود میں لانے اور ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے اتنی طویل اور ہمہ جہتی تعمیری جدوجہد کو شرط لازم قرار دیتی تھی کہ چپراسی سے لے کر صدر جمہوریہ تک کی مشینری کے لیے ایک ایک پرزہ اسلام کے سانچے میں ڈھل کر تیار ہو جائے۔ اور ماہرین مالیات و معاشیات اور ماہرین قانون و سیاست ہی نہیں، مورخین و فلاسفہ اور سائنسدانوں تک کی ایک پوری فوج ایسی وجود میں آ جائے جو اپنے اپنے شعبہ میں اسلام کا بول بالا کرنے والی ہو ـــــ جو اس تخیل پر بھی کان دھرنے کو تیار نہیں تھی کہ ایک دفعہ اگر قومی بنیاد پر ہی کوئی مسلم اسٹیٹ قائم ہو جائے تو "رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔" یہی جماعت ـــــ پاکستان بنتے ہی ـــــ اپنی تمام علمی توانائیوں کے ذریعہ اس یقین کا اظہار کرنے لگی کہ مسلمانوں کے اس قومی اسٹیٹ کو تو محض مطالبوں اور نعروں کے جادو سے ایک اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے فقط چھ ہی مہینے ہوئے تھے، اور اس جماعت کی قیادت کو وہاں پہنچے ہوئے، اس سے بھی کم، کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ شروع ہو گیا کہ پاکستان کے "ایک اسلامی حکومت" ہونے کی قرارداد پاس کی جائے ـــــ یعنی ایک "قومی حکومت"

پر "اسلام کا "دہی" نمائشی لیبل" جلد سے جلد چپاں کر دیا جائے جس پر سب سے بڑا اعتراض تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ چیز ایک نام نہاد مسلم حکومت کو "اسلامی انقلاب" کا راستہ روکنے میں ایک غیر مسلم حکومت سے بھی زیادہ جری بنا دینے والی ہے ـــــ اس مقصد کے لیے خود اُسی شخصیت نے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے سرگرم دورے کیے' جس نے یہ ساری باتیں اپنی جماعت کا دین و ایمان بنائی تھیں' پبلک جلسے منعقد کرا کے لوگوں کو اُبھارا کہ وہ پورے زور و شور سے اس مطالبہ کی مہم میں جماعت کا ہاتھ بٹائیں اور پاکستانی قیادت کو اس آئینی اعلان پر مجبور کریں کہ پاکستان کا نظامِ حکومت اسلامی نظام ہو گا۔

پاکستان کے نعرہ پر تو مسلمان "دیوانہ" ہی اس تصور میں ہوا تھا کہ اسلام کی حکومت بنے گی۔ مسلم لیگ کی قیادت نے آنا کانی کی تو وہ قدرتی طور سے اس مطالبہ کے پر جوش ہمنوا بن گئے' جس کے لیے مسلم لیگ کے علماء کا طبقہ بھی اپنی ذمہ داری کے تحت سرگرم تھا چنانچہ ایک "قرار دادِ مقاصد" کی شکل میں یہ مہم کسی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہو گئی ـــــ اس قرار داد کی نوعیت کیا تھی اور کس دل سے پاس کرنے والوں نے پاس کی تھی؟ حقیقت تو اللہ جانے' مگر خود مطالبہ کے قائد اور داعیٔ انقلاب اسلامی کے کا تبصرہ اس پر یہ تھا کہ:

> "ان حضرات کے قرار دادِ مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی میم صاحب کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے اور وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کلمۂ اسلام پڑھ لے لیکن نہ اس کلمہ سے پہلے اُس کی زندگی میں کوئی تغیر آئے اور نہ اُس کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی ہی میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔"

> "درحقیقت یہ ایک ایسی بارش تھی کہ نہ جس کے پہلے کوئی گھٹا اُٹھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی۔ اس قرار داد کے پاس ہونے کے دو چار دن پہلے تک بھی اس بات کے کوئی آثار نہیں تھے کہ کوئی واقعہ ہونے والا ہے۔ اس بارش

سے پہلے ٹھنڈی ہوا تک نہیں چلی۔ بلکہ اس کے برس جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک حادثہ تھا جو آیا اور گزر گیا۔" [۱]

اس قرارداد کے بارے میں ایسی رائے نہ صرف رکھنے، بلکہ علی الاعلان اُس کا اظہار کرنے کے باوجود، کہا گیا کہ "اس کے وہی معنی ہیں جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہیں۔" اور پھر طے کر دیا گیا کہ

"اس کلمے کو ادا کرنے کی وجہ سے ہماری ریاست اصولی حیثیت سے اسلامی ہو گئی ہے۔" [۱]

پاکستان بننے کے بعد کی یہ عملی پالیسی جو اس جماعت نے اپنائی، صحیح تھی یا غلط؟ اس سے واقعے میں اسلامی انقلاب کی منزل قریب ہوتی تھی، یا یہ پالیسی راستہ بھٹک جانے کے مترادف تھی؟ ان سوالات سے اس وقت کوئی بحث نہیں ہے! دیکھنے کی بات یہاں صرف یہ ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک سے بننے والے پاکستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ۱۹۴۱ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ایک بے پناہ قطعیت کے انداز میں کیا جاتا رہا تھا، اُن خیالات اور اس پالیسی میں بالکل مشرق و مغرب کی سمتوں جیسا تضاد تھا یا نہیں! اور اس پالیسی کو جماعت کے اساسی نظریات سے بالکلیہ روگردانی کے سوا کوئی بھی دوسرا نام دینا ممکن ہے؟ — لیکن قائدین نے تو جو کچھ بھی سوچ سمجھ کر یہ راہ اختیار کی ہو، حیرت اس پر ہے کہ متبعین میں سے ایک کی بھی آواز سننے میں نہیں آئی کہ یہ ہمارا قافلہ ایک دم سے کس طرف مڑ گیا! حالانکہ، جیسا اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان میں سے ایک ایک پوری طرح، اس نئی تحریک کے نفی و اثبات کو سمجھ کر اس میں آیا تھا۔ اور پاکستان کے بارے میں تو پوری صراحت کے ساتھ ان لوگوں کا ذہن یہ بنایا گیا تھا کہ (مسلم لیگ کے جیسے طریق کار اور اس کی جیسی قیادت کے ذریعہ) اس کے وجود میں آنے پر ہمیں اپنی منزل کے لیے کوئی شارٹ کٹ (آسان و مختصر راستہ)

---

[۱] یہ دونوں اقتباس براہِ راست اصل ماخذ سے نہیں لیے جا سکے ہیں، اس لیے ایک واسطہ پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اور یہی نوعیت صفحہ [illegible] کے حاشیہ [illegible] میں درج شدہ اقتباس کی ہے۔ حوالہ [illegible] کی معلومات آگے آ جائے گی۔ [illegible]

نہیں مل جائے گا۔ بلکہ وہی اور اسی طرز کی طویل جدوجہد یہیں وہاں بھی کرنی پڑے گی جو پاکستان نہ بننے کی صورت میں ناگزیر ہے! — انھیں بتایا گیا تھا کہ یہ ایک "لیموں کا" پودا نصب کیا جارہا ہے اور پودا درخت بن کر اس پر لیموں ہی کا پھل آسکتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کہے کہ "بار آوری کے مرحلے" میں اس سے "آم کے پھل" بھی لیے جاسکیں گے، تو اس دیوانے کی بات پہ نہ جانا — انھیں بتایا گیا تھا کہ یہ مسلمانوں کا ایک "قومی اسٹیٹ" بننے جارہا ہے، اس کے بارے میں اسلامیت کے وعدوں پر مت ریجھ جانا۔ اس کی اسلامیت بس ایک "نمائشی لیبل" ہوگی۔ اور اس لیبل کے ساتھ ایک نام نہاد مسلم حکومت اسلامی انقلاب کے راستہ میں اس سے بھی بڑی رکاوٹ ہو، جتنی بڑی رکاوٹ ایک غیر مسلم حکومت ہو سکتی ہے — لیکن ان ساری تفہیمات و تنقیحات کے باوجود پورا قافلہ بغیر ادنیٰ چون وچرا ہی نہیں، غایت جوش کے ساتھ اس مہم پہ کھڑا ہوگیا کہ اس "نام نہاد مسلم اسٹیٹ" پہ حقیقی مسلم اسٹیٹ کا لیبل لگوا کے رہا جائے۔ اور اس "لیموں کے درخت" پہ وہ جادو کیا جائے کہ پھل اس پہ سب کے سب نہیں تو تھوڑے بہت تو آم کے بھی ضرور آدیں! چنانچہ حاکمیت الٰہ کی قرارداد کا لیبل اس قومی اسٹیٹ پہ لگوا کر یہ لوگ مطمئن ہوگئے کہ اب اس "لیموں کے درخت" سے "آم کے پھل" لیے جا سکتے ہیں۔ اور پھر جب فصل کا وقت آیا تو یہ پورے اطمینان ہی کے ساتھ دوڑے کہ آموں ہی سے جھولیاں بھر کر لائیں گے۔

یعنی قیام پاکستان کے چوتھے ہی سال (۱۹۵۱ء) میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہونے پر اس جماعت نے بھی طے کر لیا کہ وہ اس میدان میں اترے گی۔ اور کم از کم ایک صوبے کی زمام حکومت کے لیے معرکہ آرائی کا جو موقع مل رہا ہے اس میں اسلامی اصولوں کے ساتھ وہ اپنے بس بھر پوری کوشش کرے گی کہ حکمراں جماعت نہ سہی تو ایک قابل لحاظ سیاسی طاقت ہی بن کر اس معرکہ سے ابھرے۔

کوئی شبہ نہیں کہ حصول طاقت کے اس پارلیمانی معرکہ میں جماعت نے ان اسلامی اصولوں کی بڑی سختی سے پاسداری کی جنھیں اس نے پاکستان بننے سے قبل کے دعوتی دور میں

اسلامی سیاست کے لیے ضروری بتایا تھا۔ مگر یہ بات جماعت کے کسی فرد کو اس موقع پر یاد نہ آئی کہ ان اسلامی اصولوں کی بارآوری کیلئے "ایک خاص قسم کی زمین پہلے تیار کر لینے کو بھی تو ضروری ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ بھی تو کہا گیا تھا کہ ہماری مسلم سوسائٹی کی حالت ہر پہلو سے بگاڑ کے اُس نقطے پر پہنچی ہوئی ہے کہ جب تک اُسے ایک طویل، صبر آزما اور ہمہ جہت جدوجہد کے ذریعہ اوپر سے نیچے تک بدلا نہیں جائے گا، اسمیں کم از کم جمہوری انتخاب کے راستہ سے تو صالحین کے برسراقتدار آنیکی کوئی شکل نہیں ہے حتیٰ کہ اس محال کو ممکن فرض کر لینے والوں، یا کسی دوسرے راستہ سے ایسی سوسائٹی میں برسراقتدار آجانے کی سوچنے والوں کو یہ بھی جتا دیا گیا تھا کہ آج کی مسلم سوسائٹی میں تو ایسے اقتدار کی کامیابی کا سوال ہی کیا، تابعین و تبع تابعین کا دور تھا، عمر بن عبدالعزیزؒ جیسی محبوب و محترم شخصیت حکمراں تھی (جسنے اپنے پیشرو کی طرف سے نامزدگی کے ذریعہ صاحب اقتدار ہو جانے کے بعد عامۃ المسلمین کے مجمع میں دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے انھیں اپنی مرضی سے کسی کو بھی خلیفہ چن لینے کی آزادی دی۔ اور اس پر بھی سب نے بیک آواز اُسی کا قلادۂ اطاعت اپنی گردنوں میں ڈالے رکھنا منظور کر لیا) اور وہ تنہا ایک شخص کی مرضی سے بہت کچھ ہو سکنے کا دور بھی تھا لیکن سوسائٹی[1] "بحیثیت مجموعی" چونکہ اُس کے اصلاحی منصوبے کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھی اس لیے اُسے "قطعاً" کامیابی نہیں ہو سکی — یہ بار بار اور زور شور سے دی ہوئی تمام آگاہیاں "دیگراں را نصیحت" بنکے رہ گئیں اور جماعت، خود اپنے ہی خیال کی رو سے ایک "زمین شور" میں — "سنبل" اُگانے کی جدوجہد[2] پوری طاقت سے جُٹ گئی۔ جس کا انجام وہی ہوا جس سے یہ لوگ خود ہی نہیں آگاہ تھے بلکہ دوسروں کو بھی چیخ چیخ کر آگاہ کرنے کی خدمت چھ سات برس انجام دیتے رہے تھے۔ یعنی ایک سیٹ بھی نہ ملی اور اسلامی اصولوں کی ساری چمک دمک۔ خاکم بدہن — خاک میں مل گئی! انکی اخلاقی اپیل ایک مسلم سوسائٹی میں اس طرح بے اثر ہو کر رہ گئی جیسے مردوں پہ آب حیات کا چھڑکاؤ انھیں زندگی نہیں دے سکتا! — نہیں! نہیں! کہیے کہ اسلامی اصول، ایک مسلمان قوم میں ٹھکرا دیے گئے۔ ان اصولوں کے ساتھ ووٹ مانگنے والے اس قابل بھی نہ ٹھہرے کہ انھیں سب نہیں چند سیٹیں ہی قوم دے دیتی — حالانکہ یہ وہی قوم تھی جس نے اسلامی دستور اور اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے میں ان لوگوں کا اسی طرح ساتھ دیا تھا جس طرح پاکستان کے مطالبہ میں مسلم لیگ کا!

یہ المیہ کیسے وقوع میں آیا؟ بالکل ویسے ہی اور انھیں اسباب کے ماتحت، جن اسباب کے ماتحت پاکستان سے وابستہ دینی امیدوں کا وہ المیہ جس کا ماتم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے کیا ہے۔ (باقی)

[1] یہ الفاظ اس جماعت کے سربراہ کے ہیں ورنہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ سوسائٹی کا وہ مٹھی بھر حصہ اصلاح کیلئے تیار نہ تھا جو اُس دور میں خلیفہ گری کرتا تھا۔ [2] فارسی کا ایک نصیحت آمیز شعر ہے ؎

زمین شور سنبل بر نیارد — درو تخم عمل ضائع مگرداں

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جس طرح ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری اپنے عہدہ پر ڈیڑھ ہی سال گزارنے کے بعد، یکایک قلبی حملہ کا شکار ہو کر ذرا سی دیر میں چل بسے تھے۔ ملک کے تیسرے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اپنے پانچ سالہ عہدہ کے دو سال پورے کرنے سے قبل ہی اسی طرح آناً فاناً زندگی کے آخری انجام سے دوچار ہو گئے ۔ بقا تو خدائے پاک ہی کے لیے ہے۔ انتظام کچھ بھی ہو جائے، موت کی دسترس کے لیے اس کے "کچھ" ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے حسنات کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر کرے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی علمیت اور دوسرے اوصاف و کمالات کے باوجود جو کسی زمانہ میں گنے چنے لوگوں ہی کو میسر آتے ہیں نیز ذاتی دینداری اور مشرقی وضع قطع کے باوجود اپنے ایک خاص مسلک کی بنا پر مسلمانوں میں عام طور سے وہ قدر و منزلت نہیں رکھتے تھے جو اُن کے علمی مقام، عالی دماغی اور دوسرے بلند اوصاف کی بنا پر ہونی چاہیئے تھی خصوصاً صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد تو اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اور اس حقیقت کو چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں کہ اُن کی موت پر اظہار ملال کرنے والوں میں حقیقۃً رنجیدہ ہونے والے کم اور رسم ادا کرنے والے زیادہ تھے۔ بظاہر ڈاکٹر صاحب نے صدر جمہوریہ بننے کے بعد سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو اسی انجام کے لیے راضی کر لیا تھا کس نیت سے راضی کر لیا تھا؟ اس کا حال خدا ہی جان سکتا ہے ۔

ان دنوں کے جس خاص طرز عمل نے ڈاکٹر صاحب کے اور مسلمانوں کے درمیان دوری بڑھائی اسے (کوئی اچھی سے اچھی بھی توجیہہ کر کے) اسلامی نقطۂ نظر سے قابل تنقید ہی کہا جائے گا، لیکن اب جبکہ ڈاکٹر صاحب گزر گئے ہیں۔ اور کسی ہمت افزائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، تو اس سلسلہ میں ایک بات ضرور احساس دلانے کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کے نقطۂ نظر سے جیسی بڑی چیز کو اس عہدہ پر قربان کر دیا، ویسی نہ سہی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں تو موجودہ سرکار دربار سے تعلق رکھنے پر ہم میں سے سبھی کو قربان کرنا پڑتی ہیں۔ اُن کا اعزاز نہ عہدہ بڑا تھا اُنھوں نے بڑی چیز قربان کر دی۔ چھوٹے اعزاز اور چھوٹے عہدہ کے لیے اس سے کم کی ضرورت ہوتی ہے لوگ اُسے قربان کر دیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ علمی خدمات کی سرکاری سند اور وظیفہ و خلعت کا اعزاز حاصل کرنے والوں میں شمولیت کے لئے بعض عالمان دین اور خادمان دین تک کوشاں ہوتے ہیں، حالانکہ اس سند و خلعت کے حصول کی رسمی کارروائی میں ایسے درباری آداب صدر جمہوریہ کے حضور میں بجا لانا ہوتے ہیں جن پر ایک دینی ضمیر کسمساہٹ ضرور محسوس کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہ بعض اوقات یہ اعزاز بالکل بلا استحقاق یعنی ایسی زبانوں کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے جن میں ان صاحب کا کوئی ادنیٰ کارنامہ نہیں ہوتا۔

غرض اس صورت حال کو بھی سامنے رکھئے تو ڈاکٹر صاحب کوئی نرالے "خطاکار" نہیں رہ جاتے بلکہ انکے طرز عمل کا ایک پہلو قابل داد ممکن ہے کہ اپنے کردار کے دو رُخ انھوں نے نہیں رکھے ذاتی جاہ کے لیے یا ملک ملت کی بھلائی کے لیے جس نیت سے بھی انھوں نے ایک خاص روش اختیار کی علی الاعلان کی اور اس پر تنقیدوں کی تعزیر آخر دم تک بے حیل وحجت برداشت کرتے رہے ـــ یہ کردار اگر فی نفسہ کوئی خوبی ہے تو اسے ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد "ہنر شن نیز بگو" کا فہرست میں آنا چاہئے۔

ہماری محدود واقفیت میں ڈاکٹر صاحب کا بنیادی کردار یہی جرأت و مسلک پرستی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج (موجودہ یونیورسٹی) کو دور طالب علمی میں بے دھڑک خیرباد کہا تو اس کی تہ میں اُن کے کردار کی یہی بناوٹ تھی۔ اور صدر جمہوریہ بنکر ایک حیران کن روش اپنائی تو اس کے بے دھڑک پن میں بھی یقیناً یہی چیز کار فرما تھی۔ ہم جس مسلک کو حق سمجھتے ہوں اس کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے کردار کی یہ خصوصیت یقیناً ایک قابل تقلید نمونہ بنائی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے وہ نقوش بھی نظر انداز کرنے کی چیز نہیں ہیں جو انھوں نے اپنی عین جوانی میں (جرمنی سے ڈگری یافتہ ہونے کے باوجود) اپنے بزرگوں کی قائم کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بقا کیلئے ایک طویل ایثار و جفاکشی اور نفس کشی کی شکل میں قائم کیے۔ اور جو اُن کی وفات کے بعد کافی تفصیل سے ذکر میں آرہے ہیں۔ ہم اگر صرف اتنا یاد رکھیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کا عہدہ پانے کے بعد فلاں فلاں (یعنی) خلاف اسلام طور اختیار کئے، تو اس سے شاید ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ ان کی خوبیاں اپناکر ہم خود کو منفرد فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ہاں یہ بھی چاہیے تو مرحوم کے دور صدارت کی یادوں سے یہ سبق لے لیجیے کہ اس عہدہ پر پہنچنے کی خواہش موجودہ ہندستان میں کسی مسلمان کو نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہاں معاملہ کچھ ویسا ہے کہ ؎ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ۔ ۔ ۔ ۹ مئی ہی کا ایک اور سانحہ ـــ جو بڑی خوشخبری اور فخر کے انداز میں ہندوستانی اخبارات میں نکلا ہے ـــ شاید نظر سے گزرا ہوگا۔

"بمبئی۔ ۳ مارچ ۔ بنگلور کی مس نگہت فقیر محمد گزشتہ رات یہاں شنمو کھانند ہال میں ہونے والے مقابلۂ حسن میں مس انڈیا ۱۹۶۹ء منتخب کی گئیں۔"

ـــ اور اس کے آگے ان ۱۸ سالہ مس صاحبہ کے سینے، کمر اور کولہوں کی ناپ دی گئی ہے جس میں انھوں نے اپنے مقابلہ کی ۱۳ حسیناؤں کو مات دی۔

یہ آج اس طرح کی کوئی پہلی خبر نہیں ہے۔ منتخب ہوں یا نہوں، کتنی ہی نگہتیں ان شرمناک مقابلوں میں برسوں سے حصہ لے رہی ہیں۔ مگر آپ نے کبھی پڑھا یا سنا کہ کسی مسلم جماعت یا مسلم خیلات پر مسلمان بیٹیوں کے ہاتھوں اسلام کی اس آبرو ریزی سے وہ ردعمل ہوا ہو جو غیروں کی طرف سے ہونے والی کسی دل آزار و جگرخراش حرکت پر ہوتا ہے؟ پروہ ہی نہیں جلد

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ

پندرھویں مجلس

(مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

۷ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء (یکشنبہ)

آج چونکہ اتوار تھا، حاضرین کا بڑا ہجوم تھا، شروع میں تعداد کم تھی حضرت بھی معمول کے مطابق بیٹھے بیٹھے ارشاد فرماتے رہے، اس کے بعد حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ اتوار کی مجلس میں دفاتر کے ملازمین، کالجوں کے اساتذہ و معلمین اور شہر کے شرفاء و اہل علم جو ہر اتوار کو اہتمام کے ساتھ آتے ہیں، آنا شروع ہوئے، اور اندر باہر سب جگہ بھر گئی، حضرت پہچان پہچان کر بڑی شفقت کے ساتھ سمجھدار، تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے پاس بلاتے اور قریب بٹھاتے رہے، تھوڑی دیر کے بعد مخلصین کے عرض کرنے کے باوجود دیوار کے سہارے کھڑے ہوگئے اور بلند آواز سے تقریر فرمانی شروع کی۔ پھر جب صحن میں زیادہ مجمع ہوگیا، تو درمیانی حصہ میں کرسی پر بیٹھ گئے، حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ کمر کے درد و ضعف کی وجہ سے بغیر دو آدمیوں کے سہارے کے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، لیکن جوشِ تقریر اور وفورِ مضامین میں تقریباً ہر دو جملوں کے بعد از خود کھڑے ہو جاتے۔ ۹½ بجے سے ۱۲½ بجے تک تین گھنٹے تقریر کا

سلسلہ جاری رہا۔ اس میں کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ مرتبہ کھڑے اور بیٹھے ہوں گے، آواز اسی طرح بلند اور پرجوش رہی، اور تعب وضعف کا نام ونشان نہیں معلوم ہوتا تھا، ساڑھے بارہ بجے کے قریب اپنی نشست گاہ پر آکر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر جوش پیدا ہوا اور کھڑے ہو کر تقریر فرمانے لگے، یہ دیکھ کر نواب سید ظہور الحسن خاں صاحب نے (جو بستر علالت سے کئی روز کے بعد اٹھ کر آئے تھے) راقم سطور سے کہا کہ جب تک ہم اور آپ نہیں اٹھیں گے یہ سلسلہ جاری رہے گا، اور حضرت کو تعب بہت ہو جائے گا، سلسلۂ کلام جاری تھا کہ وہ اور راقم سطور باہر نکل آئے، بعد میں معلوم ہوا کہ چند منٹ اور سلسلۂ کلام جاری رہا، پھر ختم فرما دیا، اور حاضرین مجلس منتشر ہو گئے۔

آج چونکہ مختلف طبقات کے لوگ شریک محفل تھے، اور بڑی تعداد متوسط تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگوں کی تھی، اس لیے تقریر پر اصلاحی رنگ غالب تھا، اور زیادہ زور اعمال و اخلاق کی اصلاح، شریعت اور سنت کی پیروی، اور اسلامی زندگی اختیار کرنے پر تھا، اُن مضامین کو حذف کرتے ہوئے جو پچھلے ملفوظات میں آچکے ہیں، اس مجلس کی خاص خاص باتیں اور قابل ذکر نکات درج کیے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ مولانا روم؟ نے ایک قصہ بیان کیا ہے، جو بڑا سبق آموز ہے، کہ ایک بادشاہ ایک غریب عورت پر عاشق ہو گیا، اس کو اپنے حرم میں داخل کیا، خاصۂ شاہی روز کھانے کے لیے پیش کیا جاتا، لیکن اس سے کھایا نہ جاتا، کھانا اس کے بدن کو نہ لگتا، وہ تن بدن دبلی ہوتی چلی جاتی، حکماء نے ہزار تدبیریں کیں، کارگر نہ ہوئیں، اس کی بھوک نہ کھلی، آخر اس کنیز نے خود ہی عرض کیا کہ مجھے تنہا ایک مکان میں کر دیجئے، میرے حصہ کا کھانا وہیں پہنچا دیا جایا کرے، ایسا ہی کیا گیا، چند دن میں اس کی رنگت بدل گئی، اشتہا کھل گئی، اور وہ شکم سیر ہو کر کھانے لگی، حکماء کو تجسس ہوا کہ وہ کون سا معجون، یا کشتہ استعمال کرتی ہے، جس سے اس کی حالت میں اتنا تغیر ہوا۔ انھوں نے چھپ چھپ کر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا مختلف طاقوں میں الگ الگ رکھ دیتی ہے۔ ہر طاق کے سامنے کھڑے ہو کر صدا لگاتی ہے، میاں بچوں کی خیرات! میاں بہت دیر سے کھڑی صدا

لگا رہی ہوں، اپنے بچوں کی خیرات، اپنے بچوں کا صدقہ، یہی عمل وہ دیر تک کرتی، پھر کھانا اٹھا کر کھاتی، معلوم ہوا کہ وہ فقیرنی تھی، خیرات اس کے منھ کو لگی ہوئی تھی، در در سے ٹکڑا مانگ کر پیٹ بھرتی تھی، وہاں شاہی دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، اس کے حلق سے یہ کھانے نہیں اترتے تھے، جب اس نے اپنی عمر بھر کا شیوہ شروع کیا، تو اس کی بھوک کھل گئی، اور معدہ کام کرنے لگا۔

بزرگانِ دین کے کلام میں بڑے لطیف اشارات ہوتے ہیں، ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں نعمت کا جو خوان مفت مل گیا، اس کی قدر نہیں ہوئی، اور ہم دُبلے ہونا شروع ہوئے، ہم بھی دوسری قوموں کے دروازے سے بھیک جمع کر کرکے کھانا چاہتے ہیں، اسی سے ہم موٹے ہوں گے، سابقہ قوموں کی جفائیں، بلائیں اور ذلتیں دیکھو تو اس نعمت وسہولت کی قدر آئے گی۔

حضرت نے سورہ بقر کی آیات: "فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ" الخ (پھر جب کوچ کیا حضرت طالوت نے لشکر کے ساتھ تو کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمائے گا) آیات تلاوت فرما کر ان کی تفسیر فرمانی شروع کی، فرمایا کہ آج کل جب لشکر روانہ ہوتے ہیں، تو رسد کا بڑا عمدہ انتظام کیا جاتا ہے، ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ اہلِ لشکر کو دوسروں سے اچھا کھلایا پلایا جاتا ہے۔ آسودگی اور فارغ البالی کے اسباب زیادہ مہیا کیے جاتے ہیں، لشکر کے جنرل محفوظ اور میدانِ جنگ سے بہت دور مقام پر بیٹھ کر فوجوں کو لڑاتے ہیں، لیکن اسلامی لشکر فاقہ مستوں، اور تنگ حالوں کا لشکر ہوا کرتا تھا، ان کی رسد فاقہ، بھوک پیاس تھی، یہی حضرت طالوت کے لشکر کا حال تھا، کوسوں چلے پانی نہ ملا، زبان سوکھ گئی، کچھ لوگوں نے کہا "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ" (آج ہم میں جالوت اور اُس کے لشکر سے لڑنے کی تاب نہیں ہے)۔ کہا رہ جاؤ! اللہ کو تمہارے رہنے کی پرواہ نہیں، اب جو گھر بار چھوڑ کر چلے، تو رسد کا کیا ذکر، پینے کو پانی بھی نہ ملا، فرمایا گیا "إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ" یہ پرانا قصہ نہیں، آج کا قصہ ہے۔ آج بھی حرام کے دروازے بہت کھلے ہیں، اتنے پیاسے ہونے کے بعد کہا گیا:

"فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي"۔ جو آخری پیاس کے بعد بھی پی لے، وہ ہمارے ساتھ نہ ہے، آج بھی کہا جاتا ہے کہ آمدنی کافی نہیں، بچے بھوکے مر رہے ہیں، حرام کا مال لے لو، رشوت لے کر آمدنی بڑھاؤ، سودی قرضہ لو، آج بھی انبیاء کی آوازیں آتی ہیں "فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي"۔ جو ناجائز طریقہ زندگی اختیار کرلیں گے، وہ ہم میں سے نہیں ہیں، "إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ" (ہاں مگر بس ایک چلّو پینے والا مستثنیٰ ہے) حلال قلیل آمدنی پر قناعت کرو، رشوت وغیرہ سے بچو، جنھوں نے مان لیا، اللہ نے اُن کی پیاس بجھا دی، جنھوں نے نہ مانا وہ پیتے پیتے مر گئے، یہ اسلام میں داخل ہونے کا پہلا دروازہ ہے، عبدیت کے دائرہ میں داخل ہو جاؤ، سب دروازے کھل جائیں گے، میں نہ اپنی جان کا مالک ہوں نہ اپنی اولاد کا "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہر قسم کے معبودانِ باطل کا سر قلم کرتا ہے، ہر قسم کی انانیت کو توڑتا ہے، یہاں "انا" کی گنجائش نہیں، اب میرا کچھ نہیں سب "خدا" کا ہو چکا ہے۔" إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (بے شک اللہ نے خرید لی ہے ایمان والوں سے اُن کی جان اور اُن کے مال اس وعدہ پر کہ اُن کا بدلہ جنت ہے)

فرمایا کہ یہ شکایت عام ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، لیکن جب آدمی عدالت میں حاکم کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو گھر کی بے سروسامانی، بچوں کی بیماریاں، اور بازار سے سودا سلف لانے کا خیال بھی نہیں آتا، اگر کوئی ان چیزوں کو یاد بھی دلائے، تو آدمی کہتا ہے کہ یہاں تو جان و مال، عزت و آبرو کی پڑی ہوئی تم ان باتوں کو یاد دلاتے ہو، بڑے نقصان کے سامنے چھوٹا نقصان نقصان نہیں ہے

بلبل و گل ۔ رہے رہے نہ رہے ہم کو غم ہے چمن کے جانے کا

ہزاروں آدمی نماز میں کھڑے ہوتے ہیں، عدالت میں جا کر اس کا تماشہ دیکھو، پچاسوں خط آتے ہیں، لیکن ایک میں بھی یہ فرمائش نہیں ہوتی، کہ دعا کیجیے کہ جب میں حاکم کے سامنے کھڑا ہوں تو دوسرے کا خیال نہ آئے، لیکن جب احکم الحاکمین کے سامنے کھڑے ہوتے ہو، تو پھر غیر کا خیال کیسے آتا ہے؟

فرمایا، مجھے طب، اور فلکیات کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرنے اور اس کی نشانیوں کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد ملی، اتنی کسی علم سے نہیں ملی، میں نے طبی اصول سے بڑے بڑے نتائج نکالے، اور سبق حاصل کیے، ایک مثال دیتا ہوں، ہلیلہ بلیلہ، آملہ وغیرہ ان سب کو سالم ایک جگہ رکھ دیجئے، مہینوں ساتھ رہیں گے، ان میں سے کوئی دوسرے کی تاثیر قبول نہیں کرے گا، جب تک یہ سب الگ الگ منھ بنائے ہوئے رہیں گے، اُن کے پاس رہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، سب کا مزاج الگ الگ سب کی تاثیر علیحدہ علیحدہ، اب اس کی ترکیب یہ ہے کہ ان سب کو کوٹ کر باریک کیا جائے، بڑائی مغایرت ہے، سب کو توڑ کر باریک کر لینے سے یہ بڑائی ختم ہو جاتی ہے، اور یہ سب یک ذات ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں وہ ہاون دستہ بھی بتا دیا ہے، جس میں ان سب کو ڈال کر کوٹ کر باریک کرتے ہیں، قرآن شریف میں آپ خود ہی وہ ہاون دستہ تلاش کیجئے، جس میں امت کے تمام افراد کو کوٹ کر باریک کیا جاتا ہے، اور ہر ایک کی "انا" ختم ہو جاتی ہے، سب کُٹ کُٹا کر، پس پسا کر ایک مرکب سفوف بن جاتے ہیں، یہ ہاون دستہ کیا ہے، حوادث اور مصائب اور امتحانات کا ہاون دستہ، دیکھئے قرآن شریف میں آتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ	اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کچھ ڈر، کچھ
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ	بھوک اور جان و مال نیز پیداوار
وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۔	میں کچھ کمی سے۔

اب اس کے بعد وہ معجون تیار ہوگی، جس میں کوئی جز علیحدہ نہیں، لیکن ابھی پھر ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ فعل و انفعال کا واسطہ ہے، یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ ایک جزو دوسرے جزو میں اثر انداز ہو، اور مزاجوں میں تداخل پیدا ہو، طبی اصول کے مطابق وہ چاشنی ہے، جو واسطہ کا کام دیتی ہے مگر یہ چاشنی بھی ایک تناسب سے ہونی چاہیے۔ وہ حد سے نہ بڑھ جائے، ورنہ مضر ہوگی اور معجون کو بدمزہ کر دے گی۔

پھر اس کو ایک مدت تک گرم رکھا جاتا ہے، اب اس کا نام معجون ہوا، اس پر "اِنَّ

هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً " کا لیبل لگایا جاتا ہے، اسی کے لیے ہے " يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ " اب افراد کثیرہ نے ایک مزاج پیدا کر لیا، ہماری غلطیاں آپ سے درست ہوں گی، آپ کی غلطیاں ہم سے، یہ واسطہ صحبت کا ہے " وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً " (اور پیدا کر دی تمہارے درمیان محبت و رحمت) مدینہ میں اوس اور خزرج برسوں سے لڑ رہے تھے، اس لیے کہ اجزا، کوٹے نہیں گئے تھے، " اِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ " اب صحبت نبویؐ ملی، اور حوادث و مصائب کے ہاون دستہ میں کوٹے گئے، وہ چاشنی پیدا ہوئی جس سے ایک دوسرے سے چپک گئے تو وہ اتحاد پیدا ہوا، جو اور کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، " لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ " (اگر تم روئے زمین کی ساری دولتیں خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت نہیں ڈال سکتے تھے لیکن اللہ نے ان میں یہ الفت ڈال دی)

جب تک اجزائے متفرقہ کو ایک دوسرے سے چپکانے والی یہ چاشنی نہیں ہوتی، وہ مجموعہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں متباین اجزا ہوتے ہیں، ہر جزء روٹھا ہوا، ہر جزء پھولا ہوا، بلیلہ، ہلیلہ، آملہ، فلفل سیاہ سب ایک دوسرے سے الگ، فرمایا گیا

" تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى " — تم انھیں متحد گمان کرتے ہو حالانکہ اُن کے دل متفرق ہیں۔

پھر جب یہ معجون، یا مجموعہ تیار ہو جائے گا، اور الگ الگ مزاجوں کے بجائے، ایک مزاج پیدا کرے گا، تو وہ تھوڑی ہی سی معجون بڑے بڑے امراض دفع کر دے گی (اور اس کا قلیل کثیر پر غالب آئے گا) فرمایا گیا:

" كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ " — کتنی مٹھی بھر جماعتیں ہیں کہ بھاری جمعیتوں پر غالب ہوئی ہیں اللہ کے حکم سے اور اللہ برداشت والوں کے ساتھ ہے۔

اصل میں اُمت کے افراد کو ملا کر بھی ایک معجون تیار کرانی منظور تھی، الگ الگ معجونیں تیار نہیں کرانی تھیں، سب کے لیے لیبل ایک ہی تجویز تھا،

"وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً" اور تمہاری یہ جماعت ایک جماعت ہے۔

لیکن چونکہ اتنا بڑا ایک ہی ہاون دستہ ملنا مشکل تھا، اس لیے الگ الگ ہاون دستوں میں ان کو کوٹنے، پیسنے اور کوٹ کنا کر معجون بنانے کی اجازت دی گئی، لوگوں نے ان کو الگ الگ معجون سمجھ لیا، اب وہ الگ الگ طریقے ایک دوسرے سے مغایر ہو گئے اور مستقل بالذات سمجھے جانے لگے۔

اس معجون کی خاصیت بتائی گئی کہ

"لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ" نہیں مزہ چکھیں گے وہ اس میں موت کا مگر ایک بار اور دور رکھے گا اللہ انکو عذاب جحیم سے۔

البتہ کھانے میں معجون کڑوی ضرور ہے "حفت الجنۃ بالمکارہ" (جنت خلاف طبع امور سے ڈھکی ہوئی ہے)

تاخیر اشاعت

افسوس ہے کہ لکھنؤ کے شدید شیعہ سنی فساد کی وجہ سے الفرقان کی کتابت میں تاخیر ہو گئی جس کی بنا پر زیر نظر شمارہ ایک ہفتہ کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے اب حالات اعتدال پر آرہے ہیں اس لئے امید ہے کہ آئندہ شمارہ ٹھیک وقت پر شائع ہو گا۔ (منیجر)

ماہنامہ میثاق لاہور

حکومت پاکستان نے بھارت کو رسائل و کتب بھیجنے پر پابندی لگا دی ہے۔ قارئین ماہنامہ "میثاق" آگاہ رہیں کہ جب تک یہ حکم نافذ ہے انھیں "میثاق" کا کوئی شمارہ نہ ل سکے گا۔

منیجر ماہنامہ "میثاق" لاہور

پردہ اور قرآن

از مولانا امین احسن اصلاحی

(پردہ اس وقت کا ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جس کا ہر مسلم گھرانے سے تعلق ہے۔ زیر نظر مضمون ہماری رائے میں اس موضوع پر اسلامی احکام اور قرآنی نقطۂ نظر کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ یہ اگرچہ اس مسئلہ سے متعلق پاکستان کے خاص حالات کی تحریک سے لکھا گیا ہے مگر بنیادی طور پر اس معاملہ میں ہندوستان و پاکستان اور اسی طرح دوسرے ممالک کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے الفرقان میں بھی اس کو معاصر عزیز میثاق کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

مسئلہ کی نوعیت پردہ کا مسئلہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تو اس قدر اہم ہے کہ اس کو تمام معاشرتی مسائل کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ خانگی زندگی کی ساری مسرتیں اور خوشحالیاں اس پر مبنی قرار دی جا سکتی ہیں۔ صرف افراد کا بننا اور بگڑنا ہی نہیں بلکہ حکومت کے ضعف و استحکام کا بھی بہت بڑی حد تک اس پر انحصار ہے۔ اس کے بارہ میں اگر ہم نے کوئی غلط روش اختیار کر لی تو اس سے صرف ہماری معاشرتی زندگی ہی متاثر نہیں ہوگی بلکہ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ہمارے تمام اخلاقی اقدار بھی متاثر ہوں گے لیکن جو حضرات آج اخبارات میں اس پر خامہ فرسائی فرما رہے ہیں (یا فرما رہی ہیں) ان میں سے کسی کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے کسی کالج یا اسکول کے مباحثہ میں

جس مبلغ علم اور جس درجہ کے احساس ذمہ داری کے ساتھ لڑکے شریک ہو جایا کرتے ہیں، اس سے بھی کم تر درجہ کے علم اور احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ لوگ اس مباحثہ میں کود پڑتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے علم یا ان سے استدلال کی تو ان حضرات سے توقع ہی کیسے ہو سکتی ہے! خالص عقلی، معاشرتی اور اجتماعی پہلوؤں سے جو کچھ اس مسئلہ پر کہا جا سکتا ہے اس کا بھی کوئی اثر ان کی تحریروں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ مردوں کی طرف سے عورتوں کو پردے کے خلاف اُکسانے کے لیے جذباتی اپیلیں ہیں، اصل دین پر "دین ملا" کے نام سے چوٹیں ہیں، پردہ کے حامیوں پر رجعت پسندی اور ترقی دشمنی کے طعنے ہیں۔ اس طرح عورتوں کی طرف سے پردے کی زندگی پر حقارت آمیز پھبتیاں ہیں، گھر کی بندشوں اور پابندیوں پر گالیاں اور کوسنے ہیں، ملا کے دین پر صلواتیں اور لعنتیں ہیں۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں آپ کو ان تحریروں میں بکثرت مل جائیں گی۔ ان موتیوں سے جہاں تک جی چاہے دامن بھر لیجیے لیکن اگر آپ یہ دیکھنا چاہیں کہ کسی بات پر سنجیدگی سے کوئی دلیل لائی گئی ہو تو آپ کوشش اور تلاش کے باوجود بھی، اس طرح کی کوئی چیز نہ پا سکیں گے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بے پردائی کے ساتھ ہماری ساری معاشرتی زندگی کی بنیادیں اکھیڑ رہے ہیں۔ وہ اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ان کا یہ کارنامہ پاکستان کی تمدنی و معاشرتی تعمیر کے سلسلہ کی ایک مبارک کڑی ہے۔

ذہنی بدحالی اس بحث میں حصہ لینے والے جتنے بھی ذکور و اناث ہیں خدا کے فضل سے سب مسلمان ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ پردے کے معاملہ میں جو کچھ خدا اور رسول نے کہا ہے۔ اس سے اس کو انکار نہیں ہے! انکار جس چیز سے ہے وہ "دین ملا" ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہر شخص قرآن کی اتنی بات کو تو لے لیتا ہے جتنی اس کی خواہشوں کے مطابق ہے اور جو بات اس کی خواہش کے خلاف نظر آتی ہے اس سے اس طرح کترا جاتا ہے گویا وہ بھی دین ملا کے تحت داخل ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پیچھے تو چلنا چاہتے ہیں اپنی خواہشوں کے لیکن ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے چل رہے ہیں۔ یہ ہماری قوم کی ذہنی بدحالی اور اخلاقی گراوٹ کی نہایت

کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس کے اکثر افراد کا یہ حال ہے کہ یہ بیک وقت کئی کئی مسلکوں کے ساتھ محبت اور ایک ہی ساتھ کئی کئی دینوں پر تھوڑا تھوڑا عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اس انتشار ذہن اور اس منافقانہ سیرت کے ساتھ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ان بھاری ذمہ داریوں کو کس طرح سنبھال سکیں گے جو اُن پر آن پڑی ہیں۔

ان مضامین سے اہل علم کے تو کسی غلط فہمی میں پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ممکن ہے ان کے بُرے اثرات ہمارے ان بھائیوں اور بہنوں تک متعدی ہوں جو اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ اسلام پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بسا اوقات دھوکے میں پڑ جایا کرتے ہیں۔ ہم ان کی رہنمائی کے لیے چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں پردہ سے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں۔ ان کو بیان کر دیں۔ اس سے ہمارے ان بھائیوں کو بھی فائدہ پہونچے گا جنھوں نے اس اخباری مباحثہ کے دوران میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تاویل و تفسیر کی بعض پرانی مشکلوں کی وجہ سے وہ صحیح نقطۂ نظر پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

قرآن میں پردہ کے احکام کی نوعیت

قرآن مجید میں پردہ سے متعلق تین طرح کے احکام ہیں:۔

۱۔ ایک وہ احکام ہیں جو خاص کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو مخاطب کر کے یا ان سے متعلق، عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے دئیے گئے ہیں لیکن مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ ان کا حکم اُمت کی تمام ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لیے عام ہے۔ خطاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ شروع میں معاشرتی اصلاح کا یہ پہلا قدم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں ہی سے اٹھایا گیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام اُمت کی خواتین کے لیے نمونہ ہونے کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج اور آپ کے اہلبیت پر ان ہدایات و احکام کی ذمہ داری زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ عائد ہوتی تھی۔ یہ احکام سورۂ احزاب کی آیات (۳۲، ۳۳، ۵۴، ۵۵) میں ہیں۔

۲۔ دوسرے وہ احکام ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ دوسری عام خواتین بھی شامل ہیں اور جن میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ کسی مسلمان عورت کو کسی ضرورت سے جب گھر سے باہر قدم نکالنے کی کوئی ضرورت پیش آجائے تو اس حالت میں اس کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ احکام سورہ احزاب کی آیات (۵۹، ۶۰) میں ہیں۔

۳۔ تیسرے وہ احکام ہیں جو عام مردوں اور عورتوں کو مخاطب کرکے گھروں کے اندر آنے جانے سے متعلق دیئے گئے ہیں اور جن میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان جب اپنے کسی بھائی کے گھر میں داخل ہو تو اس کو کن آداب و قواعد کی پابندی کرنی چاہیے اور گھر کی عورتوں پر ایسی حالت میں پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ احکام سورۂ نور میں بیان ہوئے ہیں۔

اب ہم ان تینوں قسم کے احکام کی تفصیل بیان کریں گے۔

پہلی قسم کے احکام

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو خطاب کرکے پردہ سے متعلق یہ ہدایات دی گئی ہیں:۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ	اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں کی
إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ	مانند نہیں ہو۔ اگر تم میں خدا ترسی ہے
بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي	تو دوسروں سے بات کرنے میں لگاوٹ
قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا	کی کوئی بات زبان سے نہ نکالو کہ جس
مَّعْرُوفًا وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ	کے دل میں نفاق کا روگ ہے، کوئی
وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ	غلط توقع کر بیٹھے اور اچھی بات کہو اور
الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ	اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور گذرے
وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ	ہوئے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا	اپنے آپ کو دکھاتی نہ پھرو اور نماز
يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ	قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس
عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ	کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ

الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کرے اے
تَطْهِيرًا۔	نبی کے گھر والو اور تم کو پاک کرے جیسا کہ
(۳۲-۳۳-احزاب)	چاہیے۔

پھر مردوں کو بتایا ہے کہ اگر ان کو پیغمبر کے گھروں میں سے کسی گھر میں جانا پڑے تو ان کو کن آداب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا	اے ایمان لانے والو، نہ داخل ہو تم پیغمبر
تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا	کے گھروں میں مگر جب تم کو کھانے کی اجازت
أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ	دی جائے، نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے
غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا	کی تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے
دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ	تو جاؤ اور جب کھا چکو تو فوراً منتشر ہو
فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ	جاؤ اور نہ لگ جاؤ باتوں میں، یہ باتیں
لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ	نبی کو دکھ پہنچا رہی تھیں لیکن وہ تمہارے
يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي	لحاظ کی وجہ سے کہتا نہ تھا لیکن اللہ حق کے
مِنكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي	اظہار میں نہیں شرماتا اور اگر تم کو پیغمبر
مِنَ الْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ	کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردہ
مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن	کی اوٹ سے مانگو۔ یہ تمہارے دلوں کے
وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ	لیے بھی زیادہ پاکیزگی بخش طریقہ ہے اور
أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ	ان کے دلوں کے لیے بھی پاکیزگی بخش ہے
وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن	اور تمہارے لیے زیبا نہیں ہے کہ تم اللہ
تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَن	کے رسول کو دکھ پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے
تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن	کہ اس کے بعد اس کی بیویوں سے کبھی نکاح
بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ	کرو۔ یہ باتیں اللہ کے نزدیک بڑے گناہ
كَانَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمًا ۞	کی ہیں۔ خواہ تم کسی بات کو راز میں رکھو

إِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ إِخْوَانِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآءِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَآ أَبْنَآءِ أَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ (۵۳-۵۵-احزاب)

یا اس کو ظاہر کرو۔ اللہ ہر بات سے واقف ہے۔ البتہ نبی کی بیویوں پر ان کے باپوں اور بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں، بھانجوں اور دینی بہنوں اور ان کے غلاموں کے بارہ میں کوئی الزام نہیں ہے اور اے نبی کی بیویو! اللہ سے ڈرو۔ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں پردے کے احکام

اوپر کی آیات سے پردہ کے متعلق مندرجہ ذیل احکام نکلتے ہیں۔

(ا) عورتوں کو عام حالات میں نامحرم مردوں سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کسی خاص ضرورت سے گفتگو کی نوبت آہی جائے تو زبان سے ہرگز کوئی ایسی لگاوٹ کی بات نہ نکالیں جو سننے والے کے دل میں گدگدی پیدا کرے اور وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے۔

(ب) مسلمان عورت کی اصلی جگہ اس کا گھر ہے۔ (وقرن فی بیوتکن) اس وجہ سے صرف کسی خاص ضرورت ہی سے اس کو گھر سے قدم باہر نکالنا چاہیے۔ محض سیر سپاٹے، تفریح اور نمائش کے لیے بن سنور کے نکلنا جاہلیت ہے۔ اور ایک مسلمان شریف زادی کے لیے جاہلیت کی روش اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) کسی مسلمان کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے گھر دعوت وغیرہ کے سلسلہ میں جانا پڑے، تو گھر میں اجازت کے بعد داخل ہو اور اس کو چاہیے کہ وقت کے وقت پہونچے اور کھانا کھاکے فوراً واپس ہو جائے یہ نہ کرے کہ گھنٹوں پہلے سے دھرنا دے کہ بیٹھ جائے اور پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی سرکنے کا نام نہ لے جس سے گھر کی بیبیوں کی آزادی یا ان کی پردہ داری میں خلل پیدا ہو۔

(د) اگر گھر کی بیبیوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگے۔ دندناتا ہوا انکے سامنے نہ چلا جائے۔

صرف وہ اعزا ان پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو محرم ہوں۔ مثلاً باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے وغیرہ یا گھر کے غلام نیز عورتوں میں سے صرف دینی بہنوں ہی کی آزادانہ آمد و رفت گھروں کے اندر اسلام نے پسند کی ہے۔ خبیثات اور منافقات کے اختلاط سے بسا اوقات بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس کا تجربہ خود عہد رسالت میں حضرت زینبؓ کے معاملے میں ہو چکا ہے۔

گھر سے باہر کا پردہ اوپر کی آیات سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ عام حالات میں عورت کے لیے گھر سے باہر نکلنا اسلام نے پسند نہیں کیا ہے۔ صرف کسی خاص ضرورت ہی کے لیے اس کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس خاص حالت میں بھی اگر گھر سے باہر قدم نکالنے کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کیا قید لگائی ہے؟ ایسی صورت میں عورت کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر بڑی چادر لے لے اور اس کا گھونگھٹ چہرہ پر لٹکا لے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں
وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ	کی عورتوں کو حکم دے دو کہ جب وہ گھروں
يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَا	سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں پر اپنی بڑی
بِيبِهِنَّ ط ذٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ	چادر کا حصہ لٹکا لیا کریں۔ اس سے توقع
يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط	ہے کہ ان کا شریف زادی ہونا واضح ہو
(۵۹ - احزاب)	جائے اور وہ ستائی نہ جائیں[1]۔

---

[1] جس زمانہ میں یہ حکم نازل ہوا ہے اُس زمانہ میں مدینہ میں منافقوں کا زور تھا۔ مسلمان عورتیں جب ضرورت کے لیے باہر نکلتیں تو وہ ان کو چھیڑتے اور جب ان سے بازپرس کی جاتی تو عذر کر دیتے کہ ہم نے سمجھا کہ کوئی لونڈی ہے۔ اس سے بعض ذہین لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حکم ہنگامی حالات کے لیے تھا جس کو بعد میں سورۂ نور کی آیات نے منسوخ کر دیا۔ آگے چل کر ہم نے سورۂ نور کی آیات کا جو صحیح محل بتایا ہے۔ اس سے اس غلط خیال کی خود تردید ہو جائے گی۔

اس آیت میں جلباب کا لفظ آیا ہے۔ جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو سارے جسم کو چھپالے۔ عرب کے شریف خاندانوں کی خواتین عموماً جب باہر نکلتیں تو اس طرح کی چادر اوڑھ کر نکلتیں۔ پنجاب میں پرانی وضع کی بڑی بوڑھیوں میں اب تک اس طرح کی چادروں کا رواج ہے اور وہ اس کو نئی طرز کے برقعوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے نزدیک بھی فیشنی برقعوں کے مقابل میں یہ چادریں جسم کو زیادہ چھپانے والی اور بدنگاہی سے زیادہ بچانے والی ہیں۔ یہی جلباب ہے جس کی جگہ بعد میں تمدن کی ترقی سے برقعہ نے لی ہے۔ اس وجہ سے برقعہ کی نسبت یہ بحث تو ہو سکتی ہے کہ اس کی موجودہ ترقی یافتہ شکلوں میں اس سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے یا نہیں، جو اسلام نے ادنائے جلباب (بڑی چادر کا گھونگھٹ لٹکانا) سے پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن یہ کہنا تو انتہائی جہالت کی بات ہے کہ برقعہ محض ملا کی ایجاد ہے۔ قرآن و اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

گھروں کے اندر کا پردہ اب آئیے سورۂ نور کی آیتوں پر غور فرمائیے جو گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ان پر غور کرنے سے پہلے دو باتیں بطور تمہید پیش نظر رکھنی ضروری ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان آیات کا تعلق رشتہ داروں، عزیزوں، گھر کے کام کاج کرنے والے ملازموں اور اعتماد کے دوستوں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف معاشرتی زندگی کو پُر لطف، خوشحال اور آسان رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلق رکھنے والوں کو گھروں میں آنے جانے، ملنے جلنے اور اجتماعی و انفرادی طور پر کھانے پینے کی اجازت دی جائے اور دوسری طرف صحیح اخلاقی نقطۂ نگاہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان پر کچھ ایسی پابندیاں بھی عاید کی جائیں کہ گھروں کی زندگی میں بدنگاہی اور بد چلنی راہ نہ پائے۔ اسلام کو، جو دین فطرت ہے۔ یہ دونوں مطالبات پورے اعتدال و توازن کے ساتھ ملحوظ رکھنے ہیں۔

(ب) دوسری بات یہ یاد رکھیے کہ عرب میں مشترک خاندانی نظام (Joint Family System) کا رواج نہیں تھا۔ ہر بالغ جب شادی کر لیتا اپنا گھر الگ بسانے کی کوشش کرتا۔ باپ کا گھر الگ، چچا کا گھر الگ، بھائی کا گھر الگ، بہن کا گھر

الگ اور خود اس کا اپنا گھر الگ۔ اس طرح ایک ہی خاندان کے بہت سے الگ الگ گھر بن جاتے۔ جو علیحدہ علیحدہ بھی ہوتے اور باہم دگر فطری اور معاشرتی علائق میں مربوط بھی۔

(ج) تیسری بات یہ ہے کہ سادہ تمدنی زندگی کی وجہ سے اس زمانہ میں عموماً تو زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکوں کا رواج تھا اور نہ دروازوں پر پردے پڑے ہوتے تھے۔

عرب کی معاشرتی اور تمدنی زندگی سے متعلق ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر سورۂ نور کی ان آیتوں کو پڑھیے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا
بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا
وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝
فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا
تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِن
قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ
لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ لَّيْسَ
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ
مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ۝
قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ
وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ
لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝
وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ
وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ

اے ایمان والو! نہ داخل ہو اپنے گھروں
کے سوا دوسروں کے گھروں میں جب
تک تمہارا ان سے انس نہ ہو اور تم اس
گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ تمہارے لیے
بہتر ہے تاکہ تم کو یاد دہانی حاصل ہو جایا
کرے۔ اگر گھر کے اندر کسی کو نہ پاؤ تو اس
وقت تک نہ داخل ہو جب تک تمہیں اجازت
نہ ملے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ
جاؤ تو لوٹ جاؤ۔ یہ تمہارے لیے زیادہ
پاکیزگی بخش طریقہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے
ہو اس سے باخبر ہے۔ تمہارے لیے ان گھروں
میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ::
جن میں عورتیں نہ رہتی ہوں اور ان میں
تمہارا کوئی کام ہو اور اللہ جانتا ہے جو
کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے
ہو۔ گھروں کے اندر داخل ہونے کی صورت
میں مسلمانوں کو یہ حکم دو کہ وہ اپنی نگاہیں

مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

(۲۷-۳۱- نور)

نیچی رکھیں اور اپنی شرم کی جگہوں کی احتیاط کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی بخش طریقہ ہے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم کی جگہوں کو محفوظ کر لیں اور اپنی زینت کی چیزوں میں سے کسی چیز کو ظاہر نہ کریں مگر جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو اور وہ اپنی اوڑھنیوں کے بکل اور لیا کریں۔ اپنے گریبانوں پر اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپوں یا اپنے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی دینی بہنوں یا اپنے غلاموں کے سامنے یا اپنے ایسے ملازموں کے سامنے جو عورت کی ضرورت سے مستغنی ہو چکے ہوں یا اپنے بچوں کے سامنے جو ابھی سرے سے عورتوں کے بھید سے واقف ہی نہ ہوئے ہوں اور زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی زینت کا اظہار ہو اور اللہ کی طرف رجوع کرو اے ایمان والو تم سب تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق اصولی قوانین

مذکورہ بالا آیات میں گھروں کے اندر داخل ہونے سے متعلق مندرجہ ذیل

ہدایات دی گئی ہیں۔

۱۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے زنانہ مکان کے اندر داخل نہیں ہوسکتا مگر دو شرطوں کے ساتھ ایک یہ کہ گھر والوں کے لیے وہ اجنبی نہ ہو۔ بلکہ ان کے ساتھ اس کا انس اور ربط ضبط ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ داخل ہونے سے پہلے سلام کر کے داخل ہونے کی اجازت حاصل کرے۔

انس کی صورتیں کئی ایک ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ گھر والوں کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری کا تعلق رکھتا ہو یا صاحب خانہ کا قابل اعتماد دوست ہو۔ یا گھر والوں کے ساتھ خدمت اور غلامی کا تعلق رکھتا ہو۔

سلام اجازت حاصل کرنے کا ایک مہذب اور بابرکت طریقہ ہے۔ اور اس کی صورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ دروازے پر تین مرتبہ سلام کرے۔ اگر کوئی جواب اور اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جائے۔

۲۔ اگر گھر پر صاحب خانہ موجود نہ ہو تو جب تک اجازت نہ ملے داخل نہ ہو۔ اور اگر لوٹ جانے کو کہا جائے تو بلا تکلف لوٹ جائے۔

۳۔ جو مکانات زنانہ نہ ہوں مذکورہ بالا اجازت کی شرط سے مستثنیٰ ہیں مثلاً مردانہ بیٹھکوں میں ہر شخص آجا سکتا ہے۔

۴۔ داخل ہونے والے مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھے۔ اور شرم کی جگہوں کے معاملہ میں پوری احتیاط برتے۔

۵۔ اس حالت میں گھر کی بیبیاں مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

(ا) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ (ب) اپنی شرم واحتیاط کی جگہوں کو پوری طرح محفوظ کرلیں (ج) اس طرح سمٹ سمٹا جائیں اور کپڑوں کو اس طرح سنبھال لیں کہ ان کی زینت کی چیزیں ظاہر نہ ہوں۔ صرف وہ زینت اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو مثلاً لباس کا ظاہری حصہ (د) اپنی اوڑھنیوں کے بکل ماریں تاکہ سینہ چھپ جائے (ھ) چلتے پھرتے زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ پازیب کی جھنکار سنائی دے۔

۶۔ تمام محرم اور نامحرم عزیزوں اور متعلقین کے لیے گھروں کے اندر آنے جانے میں مذکورہ بالا قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ البتہ عورت کے لیے زینت کی چیزوں کے اظہار کی جو ممانعت ہے اس سے شوہر اور محرم اعزا یعنی باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے وغیرہ مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح ملازم کے ساتھ غیر اولی الاربۃ (عورت کی ضرورت سے مستغنی) کی قید لگا کر یہ واضح کر دیا کہ جوان ملازم کے سامنے اظہار زینت جائز نہیں اور ملازم اور غلام دونوں کا ذکر چونکہ آیت میں الگ الگ موجود ہے اس وجہ سے ملازم کو غلام پر قیاس کرنا بالکل غلط ہوگا۔ ایک عام خادم اور غلام میں معاشرتی اور نفسیاتی اعتبار سے آسمان و زمین کا فرق ہے۔ نابالغ بچوں کو بھی اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دینی بہنوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قطامہ عورتوں کے سامنے شریف زادیوں کو اظہار زینت سے بچنا چاہیے، مبادا وہ کسی فتنہ میں مبتلا کر دیں۔

بعض ضروری تشریحات گھروں کے اندر کے پردہ کے متعلق یہ اصولی قوانین ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کے سوال پر اس سے متعلق بعض مزید تشریحات اور ہدایات نازل ہوئیں، جو یہ ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ۚ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ	اے ایمان والو، تمہارے غلام اور قریب البلوغ بچے تین اوقات میں اجازت لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کے بعد یہ تین اوقات تمہارے پردوں کے ہیں۔ ان کے علاوہ اوقات میں تمہارے اوپر اور ان کے اوپر اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ بے اجازت آئیں جائیں۔ تم ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو۔ اس طرح اللہ اپنی

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۵۸-۶۰-نور)

آیتوں کو واضح کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور جب تمہارے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اس طرح اجازت لیں جس طرح ان سے پہلوں نے اجازت لی ہے اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح کرتا ہے اور اللہ علم والا ہے اور حکمت والا ہے اور بوڑھی عورتیں جو اب نکاح کی امیدوار نہیں ہیں۔ ان پر اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے کپڑے الگ کریں بشرطیکہ زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہوں اور احتیاط رکھیں تو ان کے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

بعض رخصتیں اور ان کے حدود

مذکورہ بالا آیات میں تین ہدایتیں بیان ہوئی ہیں۔

(۱) غلاموں اور نابالغ بچوں کو گھر کے اندر آنے جانے کے لیے ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت اور عشا کے بعد اجازت لینی ضروری ہے۔ ان اوقات میں بلا اجازت آنے میں اندیشہ ہے کہ وہ گھر والوں کو کسی ایسی حالت میں دیکھ لیں۔ جس حالت میں دیکھنا نامناسب ہو۔ یہ ضرورت کے لحاظ سے اوپر والے احکام میں گویا تخفیف کی گئی ہے۔

(۲) نابالغ بچوں کے لیے یہ رخصت صرف اس وقت تک ہے۔ جب تک وہ نابالغ ہیں۔ بلوغ کے بعد ان کو بھی اجازت کے اسی عام قاعدہ پر عمل کرنا پڑے گا جو سب کے لیے بیان ہوا ہے۔

(۳) بوڑھی عورتوں کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ وہ پردہ کے تمام ضوابط کی پابندی کریں لیکن اگر اظہار زینت مقصود نہ ہو تو وہ گھروں کے اندر بھی اور باہر بھی پردہ کے اس خاص اہتمام سے

آزاد رہ سکتی ہیں جو اوپر بیان ہوا ہے۔ مثلاً بُکل مارنے اور گھونگھٹ لٹکانے کی ان کو ضرورت نہیں ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اس کے بعد ایک اور شبہ کی طرف توجہ فرمائی جو اوپر کے احکام کی وجہ سے اس وقت بہت سے ذہنوں میں پیدا ہو چلا تھا۔ وہ یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ اسلام نے گھروں کے اندر آنے جانے پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ قریبی اعزہ بھی ان قیود سے نہیں بچ سکے ہیں تو ایک طرف لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ شاید اسلام سوشل زندگی کی آزادیوں اور دلچسپیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اعزاء احباب ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملیں جلیں اور ایک دوسرے کے یہاں کھائیں پئیں، دوسری طرف بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بہتوں کے مریض اور معذور اعزاء جو ان پابندیوں سے پہلے اپنے رشتہ داروں کے گھروں میں پڑے رہتے تھے۔ ان پابندیوں کے بعد وہ ایک نہایت راحت بخش آزادی سے محروم ہو گئے۔

قرآن نے ان دونوں شبہوں کو صاف کر دیا کہ ان پابندیوں کو عائد کرنے سے مقصود نہ تو سوشل زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کرنا ہے نہ معذوروں اور عاجزوں کو کسی زحمت میں ڈالنا ہے۔ نہایت شوق کے ساتھ اپنے اقربا اور اپنے دوستوں کے گھروں میں آؤ جاؤ۔ اور ایک دوسرے کے یہاں جماعتی اور انفرادی شکل میں جس طرح چاہو کھاؤ پیو۔ البتہ اجازت حاصل کرنے کے لیے سلام ضرور کر لیا کرو۔ اگر یہ چیز کوئی پابندی ہے تو یہ ایسی پابندی ہے جو تمہارے لیے بھی اور گھر والوں کے لیے بھی بہت سی برکتوں کا باعث ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا	نہ کسی نابینا پر کوئی حرج ہے نہ کسی لنگڑے
عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا	پر نہ کسی بیمار پر اور نہ خود تم لوگوں پر کہ کھاؤ
عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰى	پیو اپنے گھروں میں یا اپنے باپوں کے گھروں
أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوْا مِنْ	یا اپنی ماؤں کے گھروں میں یا اپنی بہنوں کے
بُيُوْتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أُمَّهَاتِكُمْ	گھروں یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں میں یا
أَوْ بُيُوْتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ	اپنے بھائیوں کے گھروں یا اپنے ماموؤں

اَخَوَاتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِکُمْ اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ اَوْ صَدِیْقِکُمْ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْکُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (۶۱۔ نور)

کے گھروں میں یا اپنی خالاؤں کے گھروں میں یا اس کے گھر میں جو تمہاری تولیت اور اہتمام میں ہیں یا اپنے کسی دوست کے گھر میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم کھاؤ یہ اجتماعی شکل میں یا الگ الگ۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہو تو سلامتی بھیج کر اپنے آپ پر، خدا کی طرف سے سلامتی! برکت اور پاکیزہ۔ اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی آیتوں کو تاکہ سمجھو۔

اوپر کے مباحث کا خلاصہ

اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن شریف میں دو طرح کے پردے کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ایک اس صورت کے لیے جب عورت کو گھر کے باہر نکلنا پڑے اور اجنبیوں سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ دوسرے اس صورت کے لیے جب گھر کے اندر خود اس کے یا اس کے شوہر کے اعزا و اقربا، اور متعلقین و ملازمین اور اس طرح کے لوگ آئیں۔ پہلی صورت سے متعلق حکم سورۂ احزاب میں دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت اپنے اوپر بڑی چادر لے کر نکلے اور اس کا گھونگھٹ چہرے پر لٹکائے۔ دوسری صورت سے متعلق احکام سورۂ نور میں دیئے گئے ہیں اور اس سلسلہ کے اصولی مسائل یہ ہیں۔

(۱) کوئی اجنبی شخص بغیر کسی تعلق کے کسی کے زنانہ مکان کے اندر داخل نہ ہو۔

(۲) اہل تعلق میں سے جو داخل ہو وہ اجازت لے کر داخل ہو۔

(۳) داخل ہونے والا اپنی نگاہ نیچی رکھے اور اپنی شرم کی جگہوں کے معاملے میں پوری احتیاط برتے۔

(۴) گھر کی عورتیں، اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، سمٹ سمٹا کر رہیں، زینت کی چیزوں میں سے اگر کسی چیز کا اظہار ہو، تو مجبوراً ہو۔ بکل مار لیا کریں..... زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں۔

(۵) زینت کی چیزوں کا اظہار صرف شوہر اور محرم عزیزوں کے سامنے جائز ہے۔ نیز غلام اور بوڑھے ملازم اور نابالغ کے سامنے بھی ان کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) غلاموں اور نابالغ بچوں کے لیے ہر وقت اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ صرف ان اوقات میں اجازت لینا ضروری ہے جو اوقات خاص پردہ کے ہیں اور جن میں ان کا اچانک آجانا ان کے لیے بھی اور گھر والوں کے لیے بھی احتیاط اور حیا کے منافی ہے۔

(۷) بوڑھی عورتوں کے لیے رخصت ہے۔ وہ بغیر برقعہ کے باہر نکل سکتی ہیں بشرطیکہ اظہار زینت مقصود نہ ہو۔ اگرچہ بہتر یہی ہے کہ وہ بھی پردہ کے احکام کی پابندی کریں۔

اصولی احکام کے تحت بعض رخصتیں

پردہ سے متعلق یہ اصولی اور بنیادی قوانین ہیں۔ جو خود قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اور جن کے بارہ میں کسی شبہ یا اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ان میں کسی پہلو سے اختلاف ہو سکتا تھا (اور ہوا ہے) تو وہ صرف یہ پہلو ہے کہ عام طور پر لوگ سورۂ نور اور سورہ احزاب کے احکام کے الگ الگ موقع و محل سے واقف نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس مسئلہ پر جو کچھ اب تک لوگوں نے لکھا ہے۔ اس میں ایک سخت قسم کا تناقض پایا جاتا ہے اور اس تناقض کی وجہ سے ان کے نتائج بحث جس قدر پردہ کے حامیوں کے لیے مفید ہیں اسی قدر بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی پردہ کے مخالفوں کے مفید مطلب ہیں۔ اس مضمون میں اس تناقض کو پوری طرح رفع کر دیا گیا ہے۔ اور پردہ سے متعلق تمام آیات کے صحیح صحیح محل کو متعین کر دیا گیا ہے جس کے بعد کسی منصف اور خدا ترس آدمی کے لیے اس معاملہ میں راہِ حق سے انحراف کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی ہے اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں کجروی اختیار کرے تو وہ شخص یا تو سخت ہٹ دھرم ہے یا سخت کج فہم اور ایسے شخص سے کبھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ کسی حق کو اپنی خواہش کے خلاف قبول کریگا خواہ وہ حق کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو۔

ان احکام پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پردہ کے بارہ میں خواہ گھروں کے اندر کا پردہ ہو یا گھروں سے باہر کا — ہم کو نہایت واضح اور قطعی ہدایات دی ہیں۔ ان واضح اور قطعی احکام کے بعد اس باب میں اگر کوئی چیز سکھانے اور بتانے

کی باقی رہ گئی تھی تو وہ صرف بعض جزوی اور ضمنی مسائل تھے جو یا تو اہل علم کے اجتہاد پر چھوڑ دیے گئے ہیں یا پیغمبر کے قول و عمل سے ان کی تشریح ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کلیات کے تحت خاص خاص حالات کے لیے جو رخصتیں ملی ہوئی ہیں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ وہ اس کو ایک نظر دیکھ سکتا ہے۔ اگر پولیس یا جج کو کسی عورت کی شناخت مطلوب ہو تو ان کو بھی اجازت ہے کہ وہ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی ضرورت کے تحت ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بھی یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ کسی اجنبی عورت کو دیکھ یا چھو سکتا ہو، علیٰ ہذا القیاس ناگہانی حالات (Emergency) کے لیے یہ قوانین بڑی حد تک نرم کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً کسی مکان میں اگر آگ لگ جائے یا کوئی عورت پانی میں ڈوب رہی ہو تو اس حالت میں مقدم یہ ہے کہ عورت کی جان بچانے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ اس کوشش میں پردہ کے شرعی احکام کا لحاظ نہ رکھا جا سکے۔ اسی طرح سفر (خصوصاً سفر حج) اور جنگ کی حالت میں بھی ضرورت و مصلحت سے بعض مستثنیات اور رخصتیں ہیں جن کی احادیث میں تصریح آگئی ہے۔ نیز اس سلسلہ کے بعض دوسرے ضمنی اور جزوی مسائل بھی ہیں جو ائمہ مجتہدین نے کھول دیے ہیں اور وہ فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ تمام جزوی اور ضمنی مسائل اپنے باب کے اصولی اور بنیادی احکام پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان جزوی مسائل سے اسی طرح کے حالات کے لیے کچھ اور احکام استنباط کر لیے جائیں لیکن یہ بات بالکل غلط ہوگی کہ ان رخصتوں اور مستثنیات کو اصل قرار دے کر پردے سے متعلق تمام بنیادی اصولوں کو ڈھا دینے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی جسارت دین کے معاملہ میں صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شریعت سے بالکل جاہل ہیں۔

روایات اور احادیث میں اگر ایسے واقعات ملتے ہیں کہ دوران جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیویوں نے پردہ کا قوانین کا لحاظ نہیں رکھا تو یہ اس بات کا ثبوت تو بلاشبہ ہے کہ عام حالات کے لیے اسلام نے پردہ کے جو احکام دیئے ہیں، خاص طرح کے حالات پیش آجانے سے ان میں بہت بڑی حد تک ڈھیل کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ اس

بات کا ثبوت ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نے سرے سے کوئی حکم ہی نہیں دیا ہے اور عورتوں کو اذن عام ہے کہ وہ کھلے بندوں جہاں چاہیں پھریں۔ اگر یہ طرزِ استدلال صحیح مان لیا جائے تو ایک شخص یہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام میں سرے سے وضو کا کوئی حکم ہی نہیں دیا گیا ہے۔ کیونکہ بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے محض تیمم کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قیام نماز کا کوئی ضروری رکن نہیں ہے۔ کیونکہ صحابہ اور صحابیات میں سے بہتوں نے بیٹھ کے نمازیں ادا کی ہیں۔ اگر یہ طرزِ استدلال غلط ہے اور ظاہر ہے کہ غلط ہے تو یقیناً ان لوگوں کا استدلال بھی صحیح نہیں ہو سکتا جو بعض مستثنیات کی بنا پر، جن کا تعلق مخصوص حالات سے ہے۔ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردہ کا کوئی حکم نہیں ہے اور "ملاؤں" نے یہ چیز اپنی طرف سے گڑھ کے بعد میں مسلمانوں کی زندگی کے اندر شامل کر دی ہے۔

مروجہ پردہ اور قرآنی پردہ اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ قرآن میں پردہ کے متعلق نہایت واضح اور تفصیلی احکام ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ سورۂ نور میں مردوں اور عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا جو حکم دیا ہوا اس کا تعلق دراصل گھر کے اندر کے پردہ سے ہے جہاں اپنے عزیزوں اور تعلق کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو باہر کے پردہ کے بارے میں وہی ادنائے جلباب (اوپر بڑی چادر لینا اور اس کا گھونگھٹ چہرے پر لٹکا لینا) کا حکم ہے جو سورۂ احزاب میں دیا گیا ہے نیز زینت کے اظہار کی ممانعت اور ناگزیر طور پر ظاہر ہو جانے والی زینت کے استثنا کا تعلق بھی گھر کے اندر کے پردہ سے ہے ان کو باہر نکلنے کی صورت سے جو لوگ متعلق کرتے ہیں انہوں نے قرآن شریف پر غور نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک سخت قسم کے تضاد اور تناقض میں مبتلا ہیں۔

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ جس طرح موجودہ بے پردگی قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح مروجہ پردہ بھی بہت بڑی حد تک قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ بالخصوص گھروں کے اندر کے پردہ سے متعلق قرآن نے جو احکام دئیے ہیں وہ تو یک قلم بدل ڈالے گئے ہیں۔ ان کی جگہ یا تو ایک بالکل غلط قسم کی آزادی اور بے قیدی نے

سے رکھی ہے۔ یا ایک بالکل ناروا قسم کی پابندی نے یا تو یہ حالت ہے کہ قریب کے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی لوگ اس طرح کے پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں جس قسم کا پردہ اجنبیوں اور بیگانوں سے ضروری قرار دیا گیا ہے یا یہ حالت ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ قرابت و رشتہ داری کی کوئی ادنیٰ وابستگی بھی ہو جاتی ہے، ان کے لیے سرے سے کسی قسم کے پردہ کی ضرورت ہی نہیں خیال کی جاتی۔ اس افراط و تفریط کا نتیجہ یا تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے خاندانوں کی اجتماعی زندگی متاثر ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان وہ انس اور وہ ربط و ضبط باقی نہیں رہ جاتا ہے جس کو اسلام نے باقی رکھنا چاہا ہے اور جس کی بربادی اسلامی معاشرہ کی بربادی کے ہم معنی ہے۔ اس افراط و تفریط سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن نے جس حد تک ڈھیل دی ہے اس سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، اور جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اسی طریقہ پر عمل کرنے سے وہ اجتماعی زندگی وجود میں آئے گی جس میں عفت اور آزادی دونوں چیزیں پورے اعتدال و توازن کے ساتھ موجود ہوں گی اور جس کے اندر ہی اس صحیح اسلامی اخلاق کی تربیت ممکن ہو سکے گی جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے پسند فرمایا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ

وصایا اور نصائح کے آئینے میں

—— مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

وصیت —— عبدالعزیز کو

مجھ سے عبدالعزیز نے سوال کیا ہے کہ میں اُن کو وصیت کروں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے تمام دینی احباب و متوسلین کو فائدہ پہونچائے ......
بس میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور جو باتیں دل و دماغ میں حاضر تھیں ان کو لکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے ——

اے طالب! وصیت ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ جس کی استعداد، کامل ہے اُس کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ صحتِ ایمان کے بعد اپنے اوپر تین چیزیں لازم کرے۔

(۱) تقویٰ اللہ —— اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اپنے اعضاء کو شرع کی منع کی ہوئی باتوں سے قولاً وفعلاً محفوظ رکھے۔ بندہ۔ جب اللہ تعالیٰ سے اپنے اعضاء و جوارح کو قابو میں رکھ کر ڈرتا ہے تو یہ تقویٰ اُس کے باطن کی طرف سرایت کر جاتا ہے اور اُس کا قلب کینہ، حسد، جھوٹ، تکبر، ریا، سُمعہ (دکھاوٹ، بناوٹ) تصنع اور تزئین سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ ظاہری و باطنی دونوں حیثیت سے متقی بن جاتا ہے۔

(۲) زُہد فی الدنیا —— زہد اس وقت متحقق ہوتا ہے جبکہ نفس غذا، لباس

اور مکان میں بقدرِ حاجت سے زائد مطالبے کو ساقط کر دے۔ نیز مخلوق کی تعریف و مدح سے اور طلب جاہ و مرتبہ اور اس کے لئے منافسے سے بھی دست بردار ہو جائے۔

(۳) دوامِ عمل ــــــ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کبھی قلب اور جوارح دونوں سے اور کبھی فقط قلب سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اکثر وہ لوگ ہیں جو مجاہدۂ اسباب و اکتساب میں اپنی جانیں کھپاتے کھپاتے مرجاتے ہیں اور اُن کی ہمتیں (کامل استعداد والوں کے) مقصد عالی کو پانے میں قاصر ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے حسبِ حال یہ وصیت ہے کہ وہ حدودِ شرع کی رعایت اور فرض نمازوں کا اہتمام کریں۔ (یہ واضح رہے کہ) فریضۂ نماز کا حُسن، حضورِ قلب ہے۔ میں ان کو یہ بھی وصیت کرتا ہوں کہ وہ تلاوت اور رکوع و سجود کے تمام اذکار اور نماز کی تمام شکلوں اور حالتوں میں دل اور زبان کو جمع کرنے میں امکانی کوشش کریں ــــــ کوئی اس بات پر قانع نہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قلب کی بجائے قالب لے کر جائے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں زبان سے اور دل سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وصیت کرتا ہوں۔ قلب سے تو ہر مجلس و محفل میں اور ہر راستے میں خاص طور سے کھانے کے وقت اور وضو کے وقت۔ اس لیے کہ کھانے اور وضو کے وقت ذکر کرنے والے کے قلب پر شیطان کا ورود نہیں ہوتا۔ نماز میں وسوسہ بھی کم آتا ہے ــــ

میں اپنے دینی بھائیوں کو ہمیشہ طہارت پر رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ بندے کو مناسب یہ ہے کہ جب وہ بے وضو ہو دوبارہ وضو کر لے۔ اس لئے کہ وضو، مومن کا ہتھیار ہے۔ جہاں تک ہو سکے قبلہ رو بیٹھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ مراقبہ کرے (دھیان جمائے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں بیٹھا ہے۔ اس طرح اُس کا قول و فعل درست ہو جائے گا۔ جب سوئے تو وضو کی حالت میں سوئے اور قبلے کی طرف چہرہ ہو ــــ اور سب سے زیادہ نافع وصیت یہ ہے کہ قیام لیل (تہجد) کا خیال رکھے۔ یہ تہجد صالحین کا طریقہ ہے۔ کوئی ایسا نہ کرے کہ اُس کی پوری رات اس حالت میں گذر جائے کہ اُس نے رات کے کسی نہ کسی حصے میں نفل نہ پڑھے ہوں۔

...... (یہ بھی ملحوظ رہے کہ) موت کا دھیان بیجا اُمید و آرزو کی درازدامانی کو کوتاہ کرتا ہے ...... یہ بھی پسندیدہ بات ہے کہ کوئی دن صدقے سے خالی نہ رہے اور کوئی ہفتہ بلا روزے کے نہ ہو....... میں وصیت کرتا ہوں کہ کسی مسلمان کا ذکر ہو تو خیر کے ساتھ ہو...... اپنے نفسوں پر باب تاویل نہ کھولیں ـــــ اور دینی بھائیوں کو یہ بھی چاہیئے کہ وہ نماز صبح کے بعد دنیا کا کلام نہ کریں۔ یہاں تک سورج ایک نیزہ بلند ہو جائے پھر اُس مجلس کو چند رکعات (اشراق) پڑھ کر ختم کریں ـــــ

وصیت ـــــ اپنے صاحبزادے عماد الدینؒ کو

اے میرے پیارے بیٹے! میں تجھے تقویٰ اللہ اور خشیت کی وصیت کرتا ہوں۔ نیز حق اللہ، حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حق والدین اور تمام مشائخ کے حقوق کے ادا کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ بس اس صورت میں اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہوگا۔

علانیہ اور پوشیدہ دونوں حالتوں میں اللہ کا دھیان رکھنا ـــــ قرأت قرآن، ظاہراً وباطناً سرّاً وعلانیۃً، فہم و تدبر، تفکر اور حُزن و بکا کے ساتھ کرتے رہنا۔ تمام احکام میں (سب سے پہلے) قرآن کی طرف رجوع کرنا۔ اس لئے کہ قرآن مجید اللہ کی مخلوق پر اللہ کی حجت و برہان ہے۔ قرآن کے حقوق کا لحاظ رکھنا۔ راہِ علم سے یک گام بھی اِدھر اُدھر نہ ہونا۔ فقہ کو حاصل کرنا، جُہّال صوفیہ میں سے نہ ہو جانا۔ بازاری قسم کے لوگوں سے علٰحدہ رہنا اس لئے کہ وہ دین کے چور اور طریق (راہِ حق) کے رہزن ہیں ـــــ سنت کی پابندی تجھ پر لازم ہے۔ اہلِ توحید کے اعتقاد پر قائم رہنا اور بدعات سے بچتے رہنا اس لیے کہ ہر بدعت، گمراہی ہے۔ امرد لڑکوں، (اجنبی) عورتوں اور اہل بدعت سے نیز (بلا ضرورت) اغنیاء اور عوام سے اختلاط کم کرنا۔ ان سے میل جول کرنے سے دین برباد ہوگا۔ دنیا کی چیزوں میں تھوڑی پر قناعت کر لینا۔ خلوت کو لازم رکھنا۔ اپنی خطاؤں پر گریہ وزاری کرنا۔ حلال روزی کھانا۔ اس لئے کہ یہ امر مفتاح الخیرات (نیکیوں کی کنجی ہے) ـــــ حرام چیزوں کو نہ چھونا اگر ایسا کیا تو

قیامت کے دن تجھ کو آگ چھوئے گی۔ حلال کپڑا پہننا، ایسی صورت میں حلاوتِ ایمان اور حلاوتِ عبادت محسوس کرے گا۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ اور اس بات کو نہ بھول کہ تو اس کے سامنے (ایک دن) کھڑا ہوگا۔ صلوٰۃ اللیل اور صیام النہار پر عملدرآمد رکھنا۔ جماعت کی نماز نہ چھوڑنا ...... ریاست وامارت کو طلب نہ کرنا اس لئے کہ جو ریاست وامارت کو پسند کرے گا وہ کبھی فلاح یاب نہ ہوگا ......

تیرے اوپر سفر بھی لازم ہے تاکہ تیرا نفس پست ہو۔ قلوبِ مشائخ کی طرف متوجہ رہنا ــــ کوئی تیری تعریف کرے تو پھول نہ جانا اور اگر کوئی تیری مذمت کرے تو غمگین نہ ہونا۔ مدح وذم تیرے نزدیک برابر ہوں۔ تمام مخلوق خدا کے ساتھ اپنے اخلاق اچھے رکھ اور تواضع اختیار کر۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے " جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو اونچا اٹھائے گا ــ اور جو تکبر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرادے گا۔"

ہر حال میں ہر نیکوکار اور بدکار کا اکرام کر۔ تمام انسانوں پر رحم کر چھوٹے ہوں یا بڑے اللہ کی تمام مخلوق کو نظرِ رحمت سے دیکھ (زیادہ) مت ہنس اس لئے کہ ضحک (ہنسنا) غفلت کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اور قلب کو مردہ کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ ہنسنے سے منع فرمایا ہے اور ضحک کو موتِ قلب کا باعث قرار دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " اگر تم وہ بات جان لو کہ جس کا علم مجھے ہے تو تم کم ہنسو اور زیادہ گریہ وزاری کرو " ــــ اللہ کی طرف سے ڈھیل کی وجہ سے بےخوف نہ ہو جانا اور اللہ کی رحمت سے مایوس کبھی نہ ہونا۔ خوف ورجا کے درمیان زندگی بسر کرنا۔

اے بیٹے! دنیا طلبی کو ترک کر اس مردار دنیا کو (ضرورت سے زیادہ) طلب کرنے میں دین کے چلے جانے کا خوف ہے ــــ صوم وصلوٰۃ کا خیال رکھنا حالتِ فقر میں، پرہیزگار، ادب شعار، فقیہ اور عالم کی حیثیت سے زندگی گزارنا۔ جہال صوفیہ سے یکسو رہنا مشائخ کی جان ومال سے خدمت کرنا مشائخ کے قلوب اور ان کے ضبطِ اوقات اور ان کی سیرت

پردہ یاں رکھنا۔ مشائخ کی باتوں کا انکار نہ کرنا ہاں اگر خلافِ شرع کوئی بات ہو تو انکار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر تو نے خواہ مخواہ مشائخ پر اعتراض کرنا شروع کر دیا تو تجھے کبھی بھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔ لوگوں سے سوال اور اُن سے قرض لینے کا معاملہ نہ کرنا۔ کوئی چیز کل کے لیے (خواہ مخواہ) ذخیرہ کر کے نہ رکھنا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ روز، تازہ رزقِ مقسوم مہیا کرتا ہے۔ سخی النفس والقلب بن۔ اللہ تعالیٰ نے جو دیا ہے اُس کو (صحیح مصرف میں) خرچ کر۔ بخل سے۔ حسد سے مکر و فریب سے پرہیز کرنا اس لیے کہ بخیل اور حاسد دوزخ میں جائیں گے۔

اپنے حال کو مخلوق پر ظاہر نہ کرنا اور ظاہر کو خواہ مخواہ مزین نہ کرنا اس لیے کہ ظاہر کی ٹیپ ٹاپ باطن کی خرابی کا سبب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رزق عطا کرنے کے جو وعدے فرمائے ہیں اُن وعدوں پر بھروسہ کر۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے رزق کی ضمانت لے لی ہے۔ خود ارشاد فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (زمین پر چلنے والا کوئی جاندار نہیں ہے مگر اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے)۔ تمام مخلوق سے (رزق کے سلسلے میں) بالکل مایوس ہو جانا۔ مخلوق سے جی نہ لگانا۔ حق بولنا اور مخلوق میں سے کسی کا سہارا نہ ڈھونڈھنا۔

تجھے لازم ہے کہ خصوصیت سے اپنے نفس کی حفاظت کا اہتمام کرے اور لایعنی باتوں سے بچتا رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "انسان کے اسلام کی خوبصورتی سے ہے یہ بات کہ وہ لایعنی اور بیکار باتوں سے پرہیز کرے"۔ ـــــــــ ...... کھانے پینے، سونے اور کلام کرنے میں کمی کرنا ـــــــــ ...... تیرا عمل خالص ہو، تیری آنکھ رونے والی، تیری دُعا جہد و سعیٔ عمل ہو تیرے کپڑے پُرانے، تیرے رفقاء، فقراء ہوں۔ تیرا گھر مسجد، تیرا مال فقہ، تیری زینت زُہد، تیرا مونس رب کریم ہو۔

کسی سے بھائی چارہ اور دوستانہ اُس وقت تک نہ کرنا جب تک اُس کے اندر پانچ خصلتوں کو نہ پالے۔

(۱) وہ مالداری کے مقابلے میں فقر کو مقدم رکھنے والا ہو۔

(۲) جہالت کے مقابلے میں علم کو اختیار کرنے والا ہو۔

(۳) علم کے مقابلے میں عمل کو زیادہ پسند کرنے والا ہو۔

(۴) دنیا پر آخرت کو فوقیت دینے والا ہو۔

(۵) (اللہ کے راستے کی) ذلت کو (دنیاوی) عزت پر ترجیح دینے والا ہو۔ علاوہ ازیں وہ علم ظاہر و باطن میں کامل و بصیر ہو ——— نیز وہ موت کے لیے مستعد ہو۔

اے بیٹے! دنیا اور اس کی ظاہری رونق و زینت پر فریفتہ نہ ہو جانا، دنیا ظاہر میں سرسبز، پُر رونق اور پُر از حلاوت معلوم ہوتی ہے (حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے) .... بمطابق ارشاد نبوی دنیا میں اس طرح زندگی بسر کر گویا کہ تو مسافر ہے ....

(بقیہ مضمون صن۲۰) نسوانی شرم و حیا کی بھی دھجیاں، دختران اسلام کے ہاتھوں اُڑ رہی ہیں، بکھر رہی ہیں لیکن آپ اس اندرونی دیمک کے خلاف کوئی محاذ قائم کیے بغیر اُس بیرونی یلغار سے نبرد آزمائی ہی کو ساری خدمتِ اسلام سمجھے ہوئے ہیں جو مسلم پرسنل لا کے خلاف سر اٹھا رہی ہیں ——— آزادئ نسواں کی اس شیطانی دُھن پر رقص کرنے والے اپنے اس طبقۂ اناث کی موجودگی میں، جس کی تعداد جنگل کی آگ جیسی بڑھ رہی ہے، آپ اس یلغار کو روک سکتے ہیں جو اسی طبقہ کے نام پر اُٹھی ہے؟

یہ ہمارے معاشرہ کا صرف ایک پہلو ہے' ورنہ حقیقت میں وہ ہر پہلو سے کم و بیش دیمک خوردہ ہو چکا ہے۔ اور اسی لیے اس کو کسی بھی پہلو کے بیرونی حملوں سے بچانے کی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ ان کا روگ باہر نہیں اندر ہے، اور یہ اندر کا روگ ہی باہر کے حملوں کو دعوت دے رہا ہے۔ اور ان کی ہمت بڑھا رہا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو مریض مانے بغیر بس مظلوم سمجھا جائے گا۔ یہ روگ بڑھتے رہیں گے۔ اور ہم چیخ پکار کے سوا کچھ کر کے نہیں دکھا سکیں گے ——— ٹائمز بی کے مضمون وہ جان فروشانہ مظاہرہ! اور نگہت فقیر محمد کے کارنامہ پر یہ سناٹا! ——— کاش کوئی یہی بتا دے کہ وہاں تماشائیوں میں جوانانِ اسلام بالکل نہیں تھے!

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

ایک یادگار واقعہ

محمد منظور نعمانی

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے حادثۂ ارتحال پر تقریباً ایک مہینہ گزر چکا ہے اور ان دنوں میں اُن کی شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا ـــــ راقم سطور اب سے ۲۵ سال پہلے کا ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے جس کا آج تک ذہن پر تاثر ہے۔

تمہید کے طور پر یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات قریباً ایک سال کی طویل علالت کے بعد ۴۴ء کے وسط میں ہوئی تھی، یہ عاجز اُن کی اس آخری علالت کے آخری ۴۔۵ مہینوں میں زیادہ تر انکی خدمت میں بستی نظام الدین (دہلی) کے تبلیغی مرکز میں مقیم رہتا تھا، اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب سے شناسائی ہوئی ـــــ موصوف اُن دنوں قریب قریب ہر جمعہ کو اور کبھی کبھی ہفتہ کے دوسرے دنوں میں بھی اوکھلے سے پیدل نظام الدین آکر فجر کی جماعت میں شریک ہوتے تھے[۱] اور اکثر نماز فجر کے بعد بھی کافی دیر ٹھہر کر واپس تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کا یہ معمول کچھ دنوں جاری رہا ـــــ

---

[۱] اوکھلا اُس بستی کا نام ہے جس میں جامعہ ملیہ واقع ہے، اُس سے نظام الدین کا فاصلہ ۴۔۵ میل کے قریب ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میوات کے مشہور قصبہ نوح میں ایک تبلیغی اجتماع ہوا' یہ عاجز بھی اُس میں شریک ہوا تھا' اور ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ دہلی سے نوح جانے کے لیے لاری کی اگلی سیٹ پر ہم دونوں کو ساتھ ہی بٹھایا گیا تھا جس کی وجہ سے راستہ میں باتیں کرنے کا پورا موقع ملا۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قریبی عزیز مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی مرحوم[۱] بھی ساتھ تھے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علی گڑھ کالج کے پرانی ساتھی تھے ـــــــ ڈاکٹر صاحب غالباً ایک روز جلسہ میں شریک رہ کر اگلے ہی دن کسی خاص ضرورت سے واپس ہوگئے اور ہم دونوں سے وعدہ لے گئے' کہ واپسی میں کچھ دیر کے لیے اوکھلے اُن کے پاس ٹھہرینگے اور اطمینان سے کچھ باتیں کریں گے۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں ایک ہی کار سے نظام الدین کے لیے روانہ ہوئے۔ اللہ کی مشیت کہ ہماری کار راستہ میں بگڑ گئی اور اس کی درستی میں کئی گھنٹے لگ گئے' جس کی وجہ سے ہم لوگ رات کو بہت تاخیر سے اوکھلے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہونچے ـــــــ یہ بہت معمولی حیثیت کا ایک چھوٹا سا نو تعمیر مکان تھا (بعد میں کسی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ یہ اتنا چھوٹا سا مکان ڈاکٹر صاحب ہی نے اپنی رہائش کے لیے بنوایا ہے)

مکان میں چند کرسیاں تھیں جو بجائے بید کے مونجھ کے موٹے قسم کے بازوں سے گھی تھیں' میں نے بازوں سے بنی ہوئی اس طرح کی کرسی اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی' اس لیے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ خود آپ کی ایجاد ہے؟ بتایا کہ اس جنگ (۳۹-۴۴ء

---

[۱] مولوی ظہیر الحسن صاحب مرحوم حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی عزیز اور کاندھلہ کے رئیس تھے' پورے علاقہ میں ان کا خاص وقار اور اثر تھا' ۴۷ء کے خونی دور میں مکان پر اپنی نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے' کسی ظالم نے گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔

کی دوسری جنگ عظیم) کے شروع ہونے سے پہلے میں جرمنی میں تھا، وہاں جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت پہلے سے اُن سب چیزوں کو ذخیرہ کیا جارہا تھا جو جنگ میں کسی طرح کام آنے والی تھیں اور اُن کی جگہ دوسری چیزوں سے کام چلایا جارہا تھا، چمڑا بھی ان ہی چیزوں میں سے تھا، چناں چہ وہاں عام طور سے جوتے تک چمڑے کے بجائے باندوں کے بنے ہوئے استعمال کیے جارہے تھے، کرسیوں میں بھی باند استعمال ہو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ اس میں لاگت کم آتی ہے اور مضبوطی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کھانے کے بارہ میں پوچھا، ہم لوگوں نے کہا کہ اب نظام الدین جاکر کھائیں گے، اصرار فرمایا کہ یہیں کھالو اس بہانے کچھ دیر بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔ ہم لوگوں نے منظور کرلیا ـــــ وہاں ایک جرمن خاتون بھی تھیں (جو غالباً جامعہ ملیہ میں تعلیم پانے والے بچوں کی مربیہ اور اتالیق تھیں) انھوں نے چند منٹ میں اسٹوو پر پہلے چائے تیار کرکے ہمارے سامنے رکھ دی۔ اور اس کے لیے بڑی معذرت کی کہ دودھ کم ہے اور اس وقت کہیں سے دستیاب ہونے کا امکان نہیں ہے ـــــ اس کے بعد اسی اسٹوو پر اُن خاتون نے ہمارے لیے اپنے یورپین طریقہ پر بغیر نمک مرچ کے کچھ سبزی اُبالی، اُس وقت گھر میں صرف ایک ہی انڈا تھا وہ بھی اُبالا اور یہ سب چیزیں ہمارے سامنے میز پر لگادیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کھانا جو روزمرّہ کے معمول کے مطابق اُن کے لیے جامعہ کے باورچی خانہ سے آیا رکھا تھا وہ بھی میز پر لگا دیا گیا، ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ بیٹھ گئے لیکن ہمیں یقین دلایا کہ آج وہ کسی مجبوری سے کھانا نہ کھانے کا فیصلہ کرچکے ہیں اس لیے کھانے میں شریک نہیں ہوئے، ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر کے بعد رخصت ہوکر نظام الدین چلے آئے۔

یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا جو کھانا اُس دن ہم لوگوں کے حصہ میں آیا وہ بہت ہی معمولی قسم کا کھانا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ۲-۳ ٹھنڈی روٹیاں تھیں اور پتلے شوربے کا سالن تھا، غالباً اسی وقت ڈاکٹر صاحب سے دریافت

سرموں کا بادشاہ
دُرِ نجف
۲۵ سالوں سے آپ کی خدمات انجام دے رہا ہے
طب قدیم کا ایک نادر شاہکار
آنکھوں کی تمام بیماریوں اور کمزوریوں کو دُور کرتا ہے
نگاہ کو گرنے اور تھکنے نہیں دیتا۔
رات کو استعمال کیجئے تو دن بھر اپنی آنکھوں میں تروتازگی اور نکھار محسوس کریں گے
اسکا استعمال آخر عمر تک بینائی کا تحفظ اور امراض کی مدافعت کرتا ہے۔
انتہائی خوبی یہ ہے کہ اپنے بیش بہا فوائد کے باوجود یہ آنکھوں میں لگتا اور کرکتا نہیں ہے بلکہ سکون اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔
ایک تولہ
۶ ماشہ
محصول و پیکنگ
روپیہ
کوئی سی بھی تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصول و پیکنگ معاف
استعمال کے بعد جن بے شمار حضرات نے تعریفی تحریریں عنایت فرمائیں اُن میں سے چند نام۔
مولینا حسین احمد مدنی
مولینا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
مولینا شبیر احمد عثمانی
مفتی عتیق الرحمٰن صاحب
موجودہ ورکنگ صدر جمعیۃ العلماء ہند
مولینا ابو اللیث صاحب
امیر جماعت اسلامی ہند
حکیم کنہیالال صاحب وید سہارنپور
ڈاکٹر ظفر یار خاں صاحب
سابق ملٹری سرجن
پتے کا پتہ۔ دار الفیض رحمانی نمبر ۔ بلڈنگ۔ دیوبند (یوپی)

تذکرۂ مجدد الف ثانی
"مجدد الف ثانی نمبر" الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزارے (از سنہ ۱۰۰۱ تا سنہ ۲۰۰۰) کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں اس عرصہ میں خاص کر
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے "الف ثانی" کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی۔ نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۳۵۲ ۔ سائز متوسط ۔ قیمت ۔ ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 37 NO. 3 JUNE 1969

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

تذکرہ مجدد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سالے کا مجدد امت
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں عالم
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۲۵۲ • سائز متوسط • قیمت
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 3-75

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصولڈاک کا اضافہ

فی کاپی ...... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/
پاکستان سے ۴/

جلد ۳۷	بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۹ء	شمارہ ۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اولیں

——— از عتیق الرحمن سنبھلی

(گذشتہ سے پیوستہ — ۴)

اس سلسلۂ مضمون کا واحد مقصد مسلمانوں کی اُن فکری اور جذباتی کمزوریوں کی دریافت ہے جن کے زیر اثر وہ دینی اور ملّی جدوجہد میں نہایت آسانی سے اور بعض وقت نہایت حیرت انگیز طور پر، غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ اور جس کے نتیجہ میں عرصۂ دراز سے محرومیوں اور نا امیدیوں کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اس نوعیت کے مضمون میں مختلف تحریکوں کا تفصیلی جائزہ تو ناگزیر ہے لیکن تنقید پیش نظر نہیں ہے۔ اس لیے نہایت سختی کے ساتھ اس کی کوشش ہے کہ تنقید کا رنگ نہ آنے پائے۔ لیکن اس کے باوجود غیر شعوری طور پر ایسا ہو سکتا ہے۔ پس اگر کسی کو مضمون کے کسی حصہ میں ایسا رنگ نظر آئے تو ہم پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ اور توجہ دلانے پر انشاء اللہ مزید احتیاط پر نظر رکھی جائے گی۔

اسلام اور کتاب وسنت کی حکومت کا تصور اہلِ دین کے لیے (بلکہ عامۃ المسلمین کے لیے بھی) اتنا سحر انگیز ہے اور طبیعتیں اس کے لیے اسقدر ترس گئی ہیں، کہ ایک چھوٹی امید بھی ذرا سا چہرہ دکھلائے تو بس دل قابو سے باہر۔ سارا پڑھا لکھا اور قوت فکر و فیصلہ جواب دے جاتے ہیں۔ پاکستانی تحریک کی بنیاد، اس کے انداز اور قیادت کا غیر دینی حال بجائے خود، یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے، کہ ایسی تحریک سے جو مملکت وجود میں آئے گی، اُس کا نظامِ حکومت آپ سے آپ اسلامی ہونے کا تو سوال ہی کیا، یہ بھی بہت مشکوک ہے کہ اہتمام و تفہیم یا عوامی دباؤ کی طاقت سے برسرِ اقتدار

لوگوں کو اس راستہ پر لگا دیا جائے یا ان سے جگہ خالی کرالی جائے ـــــ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر تفصیل سے دکھایا گیا، ایک طاقتور قلم اور پھر اس کی طاقت سے وجود میں آنے والی جماعت نے بھی ہر چند سمجھایا اور پیش پا افتادہ حقیقتوں کے ذریعہ سمجھایا، کہ یہ امیدیں دھوکہ دیں گی، حسرت اور داغ بنیں گی۔ ان سے باز آجاؤ اور اسلامی حکومت کا قیام چاہتے ہو تو اس کے واقعی راستہ پر چلو۔ مگر کسی نے سُن کے نہ دیا، کہ جب پوری قوم اسی امید اور آرزو پر ساتھ دے رہی ہے تو آخر کس میں طاقت ہے کہ ایک جمہوری نظام کے اندر قوم کی آرزوؤں کو بروئے کار نہ آنے دے۔ ـــــ ٹھیک یہی وہ سبب تھا جس نے آٹھ دس سال کے اندر ہی اس ناصح جماعت کو بھی مسلم لیگ کے مقام پر پہونچا دیا۔

پاکستان کا قیام جس طرح اور بہت سوں کے نزدیک ناممکن سی بات تھی غالباً ان ناقدین کا خیال بھی اس کے بارے میں یہی تھا، اس لیے جب تک پاکستان بن نہیں گیا ان لوگوں کو اپنے انکار اور طریق کار پر مضبوطی سے ساتھ قائم رہنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ لیکن جب یہ مسلم مملکت "بہت مشکل" اور "قریباً غیر ممکن" کے تخیلات کو روندتی ہوئی وجود میں آگئی، پھر تبادلۂ آبادی نے اسے تقریباً سو فی صدی مسلم آبادی کا ملک بھی بنا دیا، تو آخر یہ کسی دوسری مٹی کے تو نہیں تھے، بلکہ حامیانِ پاکستان سے بھی بڑھ کر اسلامی حکومت کے خواہاں تھے۔ اس مسلم مملکت کے وجود میں آجانے نے (جس کے لیے اسلامی حکومت کے نام پر مسلمانوں کو متحرک کیا گیا تھا) اور اسکے تقریباً صد فی صد مسلم آبادی کے منظر نے ان کے دل میں بھی امید کی وہ گدگدی پیدا کر ہی دی جو بہت سے اہل علم و دانش کے دلوں میں اس مملکت کے محض تصور سے پیدا ہو گئی تھی اور جس نے اسلامی حکومت کی دیرینہ خواہش کو علم و فکر کے قیل و قال پر غالب کر دیا تھا۔ اس مضمون کی پچھلی قسط میں اس ناقد جماعت کے بانی کے جس مقالہ سے بہت سے اقتباسات پیش کیے گئے تھے، اس مقالہ کی ابتدا اس پیراگراف سے ہوتی تھی:-

> اس مقالہ میں مجھے اس عمل (PROCESS) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار

ہو رہا ہے۔ مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہونچنے کے لیے تجویز کیے جارہے ہیں جن سے وہاں تک پہونچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہونچنا۔ اس خام خیالی (LOOS - THINKING) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہوگئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (SCIENT-IFIC) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔"

اس عبارت کے زیر خط کیے جانے والے الفاظ میں جو بات کہی گئی ہے اس پر ہم نے اپنے تجزیہ میں صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ اسلامی حکومت کی یہ خواہش ہی' ایک دینی جذبہ سے تحریک پاکستان کی عمومی حمایت کا باعث ہوگئی۔ لیکن آگے جو یہ بات مذکورہ عبارت میں کہی گئی ہے کہ اسلامی حکومت کی نوعیت اور اسے وجود میں لانے کے لائحہ عمل کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی، اس کے عمومی انداز سے ہٹیں تو کیا شاید کسی بھی حقیقت پسند کو اتفاق نہ ہو سکے گا۔ پاکستانی تحریک کے حامیوں میں ایسے علماء اور دینی فکر و نظر کے حامل بھی موجود تھے جو ان حقائق کو جاننے اور سمجھنے میں صاحب تحریر بالا سے کم نہ تھے، مگر مدتوں کی تڑپتی ہوئی خواہش نے محض ذرا سی امید کا روئے دلربا دیکھ کر علم و نظر کے صاف اور صریح تقاضوں کو دبا لیا۔ اور بعینہٖ یہی سانحہ اُن ناقدین کو پیش آیا کہ جب پاکستان نے ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کے اور ایک خالص مسلم مملکت کا منظر پیش کر کے انھیں بھی اس امید کے دائرۂ کشش میں داخل کر لیا، تو پھر یہ بھی اپنے آپ کو نہیں روک سکے اور ان کے سائنٹیفک طریق فکر کی طاقت اس خواہش کے آگے جواب دے گئی جو ان میں بظاہر کچھ زیادہ ہی موجود تھی۔

لیکن یہ دوسرا سانحہ اس لیے زیادہ افسوسناک ہے کہ یہ حضرات تحریک پاکستان کی ابتدا سے اس کی انتہا کے دن تک نہ صرف خود اس حقیقت پر گہری نظر اور جزم و یقین کا اظہار کر رہے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے سمجھانے میں لگے ہوئے تھے کہ نظامِ اسلامی کے قیام کا راستہ صرف ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کسی دوسرے نظام کا چلنا محال ہو جائے۔ سوسائٹی اور عام معاشرہ کو اس ڈھنگ پر لائے بغیر کسی دوسرے طریقے سے اس نظام کو وجود میں لے آنے کا خواب جو لوگ دیکھتے ہیں وہ سخت دھوکے

میں ہیں ـــــ اس درجہ ذہنی بیداری اور اس بیداری کی برسوں علمبرداری کے باوجود بکلیت ان حضرات کا خود اسی دھوکے میں مبتلا ہو جانا جس میں دوسروں کے مبتلا ہونے پر وہ سر پیٹتے پیٹتے تھکے جا رہے تھے، انھیں مسلم ووٹروں کے بل پر الیکشن کی بازی جیتنے کا خواب دیکھنا جن کے بارے میں وہ دوسروں کو سمجھاتے تھے کہ "ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے" اسے اگر پہلے سانحہ سے کہیں بڑا سانحہ اور فکر و نظر کا شدید ترالمیہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

مگر افسوس یہ ہے کہ بات اس دھوکے کے پہلے ہی مرحلہ پر رک نہیں گئی۔ اور جو کچھ حامیانِ پاکستان کو جتایا گیا تھا اس کی صداقت خود اپنے ہی تجربے میں دیکھ کر بھی ان لوگوں کو احساس نہیں ہوا کہ وہ کیسی المناک غلطی کر بیٹھے ہیں، بلکہ احساس ہوا تو کیا ہوا؟ کہ ہم لوگوں نے ضرورت سے زیادہ اصول پرستی اور دیانتداری کا مظاہرہ کیا ورنہ شاید ایسی چوٹ نہ ہوتی۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد پنجاب کی ریاست بھاولپور میں انتخابات ہوئے تو ان میں بھی نہ صرف حصہ لیا گیا بلکہ کامیابی کے لیے وہ ناجائز طریقے بھی کسی حد تک اختیار کیے گئے جنھیں انتخاباتِ پنجاب میں حکمراں پارٹی کو اختیار کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اور جو ہر قیمت پر اقتدار چاہنے والوں اور اُن کے ورکروں کا ہندوستان و پاکستان میں وطیرہ ہے ـــــ لیکن اس بات سے یہ لوگ انکار کرتے ہیں، اس لیے قابلِ اعتماد شہادتوں کے باوجود ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں اپنے بلند بانگ انکار و نظریات کے برعکس جو راستہ "اسلامی تحریک" اختیار کر کے ۱۹۵۱ء میں انتخابی اور الیکشنی معرکہ آرائی تک پہونچی تھی وہ بدلا نہیں گیا۔ بلکہ اس معرکہ آرائی کے آنکھ کھول دینے والے نتائج کے باوجود انھیں پاکستانی عوام کے بل پر، پاکستان کو دستوری اعتبار سے اسلامی مملکت بنوانے کی وہ جدوجہد اس جماعت کی تمام سرگرمیوں کا ماحصل بنی رہی جو ۱۹۴۸ء میں شروع کی گئی تھی اور اُن طریقوں سے بنی رہی جن کے بارے میں جماعت کی تاسیس کے پہلے ہی دن سربراہِ جماعت نے ان الفاظ میں تصریح اور تنبیہہ کی تھی کہ

"تحریک اسلامی اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے اور اس کا ایک مخصوص طریق کار ہے جس کے

ساتھ دوسری تحریکوں کے طریقے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے جو لوگ اب تک مختلف قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جن کی طبیعتیں اُنھیں کے طریقوں سے مانوس رہی ہیں اُنھیں اس جماعت میں آکر اپنے آپ کو بہت کچھ بدلنا ہوگا۔ جلسے اور جلوس، جھنڈے اور نعرے، یونیفارم اور مظاہرے، رزولیوشن اور ایڈریس، بے لگام تقریریں اور گرما گرم تحریریں اور اس نوعیت کی تمام چیزیں ان تحریکوں کی جان ہیں مگر اس تحریک کے لیے سمِّ قاتل ہیں۔ یہاں کا طریق کار قرآن اور سیرتِ محمدیؐ اور صحابہؓ کی سیرتوں سے سیکھئے اور اس کی عادت ڈالیے۔ آپ کو زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے پیچھے آجائیں اور آپ انھیں ہانکتے پھریں۔ آپ کو ان میں حقیقتِ اسلامی کی معرفت پیدا کرنی ہے۔ عرفان حقیقت کے بعد ان میں یہ عزم پیدا کرنا ہے کہ اپنی انفرادی زندگی اور گردوپیش کی اجتماعی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق بنائیں اور جو کچھ باطل ہو اس کو مٹانے میں جان و مال کی بازی لگا دیں۔"

کیسی تصریح اور تنبیہ ہے، کہ کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا گیا ہے! —— مگر اللہ رے سحر امیڈیا بقول مولانا دریابادی "فریب نفس"[۱]! کہ اس "ناخوب" کو "خوب" ہونے اور تحریک اسلامی کے ساتھ جوڑ کھانے میں کسی تدریج کی بھی ضرورت نہیں پڑی! جلسے ہی نہیں کیے گئے، جلوس بھی نکالے گئے۔ اور "دستوری ہفتے" منا کر ان تمام "سمِ قاتل" چیزوں میں سے جس چیز کی ضرورت سمجھی گئی وہ عینِ دین سمجھ کو نوشِ جان کی گئی اور اس طرح عوام پر ٹھیک مسلم لیگ مارکہ "اسلامی" سحر طاری کر کے (نہ کہ ان میں حقیقتِ اسلامی کا عرفان پیدا کر کے) اپنے مطالبات کا ہمنوا بنالیا گیا —— یعنی اس "اسلامی تحریک" نے نہ صرف وہ راستہ چھوڑ کر جسے وہ کسی مملکت میں نظام اسلامی کے قیام کا واحد ذریعہ سمجھتی تھی، وہ راستہ اختیار کر لیا جس کے عبث اور لاحاصل ہونے پر اس کے جزم و یقین کی کوئی انتہا نہیں تھی، بلکہ وہ تمام طور طریقے بھی پورے شرح صدر کے ساتھ اپنا لیے جو اس دوسرے راستے کے لوازم میں تھے —— اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ کسی بھی چیز کے لوازم سے مفر کہاں!۔

---

[۱] یاد رہے کہ یہ لفظ مولانا دریابادی نے تحریک پاکستان کی حمایت کے سلسلہ میں اپنے اور اپنے جیسے دوسرے حضرات کے لیے استعمال کیا ہے۔

بہرحال پاکستان کو عوامی طور پر "اسلامی" بنانے کے بجائے دستوری طور پر "اسلامی" بنانے کی یہ سرگرم جدوجہد، مسلم لیگ کے دینی عنصر کی اندرونی کوششوں کے ساتھ مل کر کچھ پالینے اور پھر کھو دینے کے درمیان جھولتی ہوئی، آٹھ سال بعد (یعنی ۱۹۵۶ء میں) ایک ایسا دستور بنوانے میں کامیاب ہوئی، جس کے ذریعہ اس "اسلامی تحریک" کے رہنماؤں کی نظر میں بھی بس وہ "کم سے کم شرائط" پوری ہوتی تھیں جو کسی دستور مملکت کے "اسلامی" کہلانے کے لیے ناگزیر ہیں، اور اس کے باوجود یہ کامیابی ارباب اقتدار کی سخت مزاحمت اور بار بار کی مایوسیوں کے پس منظر میں، اس تحریک کے لیے فتح مبین قرار پائی!

لیکن یہ "کامیابی" بذاتِ خود تو اسلامی نظام کو وجود میں نہیں لا سکتی تھی۔ یہ تو بس اتنی کامیابی تھی کہ دستور میں چند اسلامی دفعات کی کڑوی گولیاں ارباب اقتدار کے حلق سے زبردستی اتروادی گئی تھیں۔ یعنی وہی صورت تھی جو "قراردادِ مقاصد" کی منظوری میں پیش آئی تھی اور جس پر اس تحریک اسلامی کے قائد کا تبصرہ یہ تھا کہ:

> "ان حضرات کے قراردادِ مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی میم صاحب کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرنا چاہے اور وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کلمۂ اسلام پڑھ لے۔" الخ

بلکہ جتنی سخت مزاحمت ان دفعات کے قبول کیے جانے میں پیش آئی تھی اس کی بنا پر معاملہ قراردادِ مقاصد کی منظوری سے بھی بدتر اور ناقابلِ اطمینان تھا۔ اس لیے ظاہر تھا کہ اقتدار اگر ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہتا تو یہ دفعات زیادہ سے زیادہ زینتِ قرطاس بنی رہتیں، یا ایسی شکل میں نفاذ پذیر ہوتیں جن سے نظامِ حکومت کی غیر اسلامیت میں کوئی فرق ہی نہ آتا۔ اس لیے قدرتی بات تھی کہ جو لوگ دستور کی اسلامیت کے لیے کوشاں ہوئے تھے وہ اس دستور کے ماتحت ہونے والے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی حصہ لیتے تاکہ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ رہنے پائے۔

چنانچہ تحریک نظامِ اسلامی کے سربراہوں نے اسی قدرتی طرز پر سوچا کہ انھیں انتخاب کے معرکہ میں اترنا ہے۔ لیکن اس قدرتی تقاضے کے عملی پہلوؤں پر جب انھوں نے غور کیا تو کچھ ایسے حقائق اور

اُن کے وہ تقاضے سامنے آئے جو ۱۹۵۱ء کے انتخابی نتائج ہی کی طرح پکار کر کہہ رہے تھے کہ آگے راستہ بند ہے۔ اب تک جو غلطی ہوئی سو ہوئی، اب ایک دم پیچھے لوٹ کر اسی راستہ کو پکڑنا چاہیئے جسے آٹھ برس پہلے ایک جھوٹی امید کی دسوسہ کاری سے شارٹ کٹ کے دھوکے میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہ آواز نہ صرف اسی طرح صدا بصحرا ثابت ہوئی جس طرح ۱۹۵۱ء کے انتخابی نتائج کا سبق رائیگاں گیا تھا۔ بلکہ اس ساحرۂ امید نے، جو آٹھ برس سے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، اس بناؤ بگاڑ کی گھڑی میں وہ افسوں قائدِ تحریک کے کان میں پھونکا، کہ "اسلامی انقلاب" کا جو فلسفہ اور ایک اسلامی تحریک" کا جو طریقِ کار انھوں نے کبھی خونِ جگر سے لکھ کر[1] اپنے ہی جریدہ میں نہیں جریدۂ عالم پہ ثبت کیا تھا، اس کی بالکل نفی کرنے والا ایک نیا فلسفہ اور نیا طریق زبانِ حال سے گزر کر زبانِ قال پہ بھی جاری ہو گیا! — کیسا نیا فلسفہ! جو سابق نظریہ ہی کی نفی نہیں کرتا تھا، بلکہ مطلق دینی فکر کے لیے وہ بلائے بے اماں اور اس "جفائے وفا نما" کا نمونہ تھا کہ ع۔

میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

آئیے کچھ تفصیل اس اضطراب انگیز و لرزہ خیز اجمالی بیان کی ہو جائے!

۱۹۵۶ء میں پاس ہونے والے پاکستانی دستور کے ماتحت جو نئے سرے سے انتخابات ہونے تھے ان میں حصہ لینے کے لیے سوچتے وقت اس جماعت کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ "ہم ہر جگہ اپنے معیار مطلوب کے مطابق نمائندے کھڑے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے ناگزیر ہے کہ الیکشن میں کھڑے ہونے والے دوسرے ایسے لوگوں کی بھی حمایت کی جائے اور انھیں ووٹ دیئے اور دلوائے جائیں جو ہمارے مقصد (نظام اسلامی کا قیام) کے لیے مفید ہو سکتے ہوں[2]" — لیکن اس میں یہ قباحت تھی کہ دوسرے تمام لوگ یا آزادانہ (INDEPENDENT) طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر "خود امیدوار بن کر" کھڑے ہوتے۔ (کیونکہ جمہوری انتخابات کا یہی مروجہ طریقہ ہے) اور امیدواری سسٹم وہ چیز تھی جس کو یہ تحریک نہ صرف شروع سے ناجائز بتاتی آئی تھی، بلکہ انتخاباتِ پنجاب ۱۹۵۱ء

---

[1] جس کے اقتباسات اس مضمون کی گذشتہ قسط میں دیے گئے تھے۔ [2] اقتباس بالمعنیٰ۔

کے موقع پر بھی اس سسٹم سے اجتناب کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک نیا سسٹم اس نے ایجاد کیا تھا اور اپنی اس پالیسی کے سلسلہ میں احادیث نبوی سے مسئلہ کی توضیح کے ساتھ "زمانہ کے تجربات کا بھی حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ :

"... اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت ..... نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جسٹ کاٹ دی جائے۔ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لیے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کہیں اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔"

جمہوری انتخابات کی تاریخ میں یہ انقلابی اعلان اس جماعت نے اپنی "انتخابی جدوجہد" نامی پمفلٹ میں کیا اور پارٹی ٹکٹ اور امیدواری سسٹم کے بجائے انتخابی حلقوں کی "عوامی پنچایتیں" قائم کیں جو اپنے حلقہ کے صالح ترین اور اہل ترین شخص کو نامزد کریں اور اسے گوشے میں بٹھا کر اس کے انتخاب کی جدوجہد اس جماعت کی رہنمائی میں از خود کریں۔

علاوہ ازیں "ووٹروں کا ایک عہد نامہ" مرتب کیا گیا جس کی چار دفعات میں سے تیسری دفعہ یہ تھی کہ

(۳) "میں کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہیں دوں گا جو خود امیدوار بن کر کھڑا ہو اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔"

یہ تھا امیدواری سسٹم اور پارٹی ٹکٹ سسٹم کے بارے میں اس جماعت کا موقف! جس کی رو سے شمہ برابر گنجائش اس بات کی نہیں نکلتی تھی کہ کسی آزاد امیدوار یا پارٹی ٹکٹ والے امیدوار کی حمایت میں کوئی ادنیٰ دلچسپی بھی لی جاسکے اور دوسری طرف اس جماعت کو یہ حقیقت کھلے طور سے نظر آرہی تھی کہ ہم تنہا الیکشن لڑکر اقتدار میں تبدیلی نہیں لاسکتے! ــ اولاً یہ ناتوانی والی حقیقت بجائے خود کہہ رہی تھی کہ ابھی انقلاب قیادت اور قیام نظام اسلامی کا وقت نہیں آیا کیونکہ اُس وقت کی علامات یہ بتائی گئی تھیں کہ

"سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک (تحریک نظام اسلامی) میں کھنچ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی۔ اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔" (ملاحظہ ہو الفرقان ماہ جون ص۷)

اور ظاہر ہے کہ جب اس کے برعکس خود اپنا عالم یہ محسوس کیا جارہا ہو کہ ہم "پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں" کے مقابلہ میں عوامی نمائندگی کی بازی جیتنا تو درکنار اُن کے مقابلہ کے لیے ہر جگہ آدمی بھی نہیں فراہم کر سکتے، تو اس سے بڑھ کر اور کونسی علامت اس بات کی ہوگی کہ اقتدار پر کمنڈ ڈالنے کا وقت ابھی نہیں آیا ــ لیکن اب اسے سحر طلب کہیے یا "فریب نفس" کہ ایک محسوس حقیقت کی یہ بظاہر خاموش، لیکن بہ باطن گونجتی ہوئی آواز شرفِ سماعت سے بھی شاید محروم رہی۔

اس حقیقت حال کی آواز کے بعد دوسرا درجہ اس مسئلہ کا تھا کہ امیدواری سسٹم کو انتہائی قطعیت کے ساتھ شرعاً ناجائز اور تجربۃً اُم الخبائث کہہ چکنے کے بعد کیونکر ایسے لوگوں کی حمایت کی جا سکتی ہے جو انفرادی یا جماعتی حیثیت سے "امیدوار" بن کر الیکشن میں آرہے ہوں؟ اور کیونکر انھیں نظامِ اسلامی کی اقامت کے لیے کارآمد تصور کیا جاسکتا ہے؟ جبکہ "امیدوار" بن کر الیکشن میں آنے کو کسی آدمی کے "غیر صالح اور نااہل" ہونے کی "پہلی اور کھلی ہوئی علامت" قرار دیا جاچکا ہے! اور خدا و بندگان خدا کے سامنے اعلان کیا جاچکا ہے کہ "ایسا آدمی جب کہیں اور جہاں کہیں سامنے

آئے۔ لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اور اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے"!۔۔۔ مسئلہ کی یہ نوعیت بآواز بلند کہہ رہی تھی کہ "امیدوار" بن کر الیکشن میں حصہ لینے والے کسی شخص کو بھی، اقامتِ نظامِ اسلامی کے مقصد میں "کار آمد" مان لینا، اپنی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ خدا اور بندگانِ خدا کے سامنے کیے ہوئے اعلان و اظہار سے وہ روگردانی ہوگی جس کے بعد خدا اور اُس کی شریعت کو اپنی خدمات سے معاف کر دینا ہی مناسب ہو سکتا ہے!۔۔۔ یہ آواز زیادہ دور کی نہیں تھی، صرف چار پانچ سال پیچھے کے ماضی سے اُٹھ رہی تھی اور وقت کا پورا ماحول اس سے آشنا بھی تھا، اس لیے سماعت سے تو محروم نہیں رہی۔ لیکن اس کے جواب میں وہ افسوں ساحرۂ امید یا شوقِ طلب نے دوسری طرف سے پھونکا جس نے نہ صرف اس آواز کی تمام اثر انگیزی کی روک تھام کر لی، بلکہ وہ نیا فلسفۂ انقلابِ اسلامی، قائد تحریک کی زبان پر جاری کر دیا جس کا ماتم ہم تفصیل سے پہلے ہی کر آئے ہیں۔

قائد تحریک نے مسئلہ کی اس نوعیت کے باوجود ۔۔۔ جو کم سے کم اتنا تقاضہ ضرور کرتی تھی کہ اگر الیکشن لڑنا ہی ہے تو صرف اپنے دم سے لڑا جائے، کسی "امیدوار" قسم کے آدمی کی نہ حمایت کی جائے نہ جوابی حمایت ایسوں سے لی جائے ۔۔۔ (اس کے باوجود قائد تحریک نے) کہا کہ نہیں! الیکشن لڑا جائے گا اور امیدوار قسم کے مفید مطلب آدمیوں سے بھی انتخابی سمجھوتہ کیا جائے گا۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ[1]

---

[1] یہاں یہ بات بھی علم میں رہے کہ آگے جو فرمودات آرہے ہیں ان کا تعلق تنہا امیدواری سسٹم کے مسئلہ سے نہیں ہے، بلکہ حامیانِ جماعت میں سے بعض حضرات نے یہ سوالات بھی اُٹھائے تھے کہ جو دستور پاس ہوا ہے وہ کم سے کم درجہ میں بھی (جماعت کے معیارِ مطلوب کے مطابق) "اسلامی" کب ہے؟ کہ اُس کے ماتحت الیکشن میں حصہ لیا جا سکے! اور اگر اس کو مطلوبہ حد تک اسلامی بنانے نیز قانون سازی کو کتاب و سنت کا پابند بنوانے کے لیے الیکشن میں حصہ لیا جا رہا ہے تو پھر اُن اوصاف کے حامل اشخاص ہی کو ابھارنے قانون ساز میں پہنچانے کی جدوجہد ہونے چاہیے جو دستور کی کامل اسلامیت کے معنی جانتے ہوں اور کتاب و سنت کا علم رکھتے ہوں۔ امیدواری کے مسئلہ کے علاوہ یہ سوال بھی آگے درج کیے جانے والے فرمودات میں پیش نظر تھا۔

"جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو، بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اُسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔"

اس معاملے میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ حکمت عملی ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو وہ قافلہ میں شامل ہی نہیں ہوتا یا پھر قافلہ کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا۔ اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے جو قوت اس کے پاس اس وقت موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے کیا نتائج ہوں گے۔"

مزید: ——

"جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

"یہاں (یعنی عمل کی دنیا میں) آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا بھی ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لیے راستہ کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے، کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقدم اہمیت دینی چاہیے۔ اور کن اصولوں میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔"

یہ اصول شکنی اور راستہ بدلی کا فلسفہ کس قلم سے نکل رہا ہے؟ جس قلم نے کبھی اس طرزِ فکر پر تنقید

ملامت کے بے پناہ گرز برسائے تھے اور اپنی طاقت بھر تمام بخیئے اُدھیڑ ڈالے تھے۔ سب کچھ نقل کیجئے تو ایک کتاب بن جائے گی، اس لیے بس چند اقتباسات پڑھ لیجئے :۔

"آزادی پسند علماء" اور ان کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر براہِ راست حکومت الٰہیہ کی جدوجہد کے راستہ پر۔ع) آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کی جدوجہد کرتے اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے..... اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: اولاً تو ہم یہاں قلیل التعداد ہیں۔ پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومتِ الٰہیہ کا خواب

کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سر دست اس کے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑکر سب سے پہلے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنا ہے، اپنی حکومت قائم کرلیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کرلیں گے۔"[۵۱]

نیشنلسٹ علماء اور مسلم لیگی لیڈروں کا جو طرزِ فکر اس عبارت میں پیش کیا گیا ہے اس میں اور اس فلسفۂ حکمتِ عملی میں جو اوپر نقل کیا گیا، سوائے اس کے کیا فرق ہے، کہ ایک جگہ سیدھے سادے اور عذر خواہانہ طریقہ سے..... بات کہی گئی ہے اور دوسری جگہ اسی طرزِ فکر کو تعبیر و بیان کی مہارت سے ایک ایسی عملی "حکمت و دانائی" کے قالب میں ڈھال دیا گیا، جو عذر و معذرت کے بجائے ایک طنطنے کا آئینہ دار ہے۔ اور اس پر تنقید کی نظر اٹھاتے ہوئے آدمی کو خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بے عقل نہ بتا دیا جاؤں! تعبیر وادا کے پالش سے نیچے اتر کر دیکھئے تو حقیقت دونوں جگہ ایک ہے۔ لیکن اس طرزِ فکر کا مظاہرہ جب تک نیشنلسٹ علماء یا مسلم لیگ کے زعماء کر رہے تھے، اس وقت ان کے بارے میں اس قلم نے دو ٹوک فیصلہ صادر کیا کہ

"بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے راستہ میں ان کو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انھوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (Tec-hnique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں ہے۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔"[۵۲]

---

۵۱ تحریر ص۲۲۔ ۵۲ ایضاً۔

اور پھر یہ بتا کر کہ اس تحریک (دین حق) کی تاریخ میں "ان مشکلات" سے ہزار گنا زیادہ مشکلات ہمیشہ ہمیشہ پیش آئی ہیں، ارشاد ہوا کہ

"پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے"۔[۵]....

اس کے بعد ذرا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

....."جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پاتے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اس قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں ......مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اٹھے اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟"[۶]

مذکورہ بالا اقتباسات میں جو سطریں زیر خط کر دی گئی ہیں، ذرا ان پر خاص طور سے غور کیجئے! کیسی بیخ کنی اس طرز فکر کی کی گئی ہے، جسے بعد میں "حکمت عملی اور "Practical Wisdom" کے مرعوب کن ناموں سے اپنے لیے جائز ہی نہیں لازم قرار دینے کی ٹھانی گئی؟۔

الیکشن کے امیدواری سسٹم کے بارے میں ۱۹۵۱ء کی وہ قرارداد یاد کیجئے جس میں کہا گیا تھا کہ:

"ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے

---

۵ تحریر ۱۹۵۱ء　　۶ ایضاً۔

اُن میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت نے فیصلہ کیا ہو کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے"۔ الخ

۔۔۔ ۱۹۵۶ء میں اسی ناپاک طریقِ انتخاب کو گلے لگانا ایک حکیمانہ قدم قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اس دلیل سے قرار دیا جا رہا ہے کہ اس سے منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی میں آسانی ہوگی! مگر اس سے پہلے جب کوئی دوسرا اس قسم کی حکمتِ عملی کو برتتا ہوا دکھائی دیا تھا اور لوگ اس "حکیمانہ" رویہ کو مقصدِ اصلی کی خاطر انگیز کرتے نظر آتے تھے تو کہا گیا تھا کہ

"تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دُنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہئیں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اُسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے اُلٹا اسی کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی اور ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اس کی خصوصیت کیا باقی رہی"۔[1]

اور اسی سلسلہ کی تحریروں میں آپ ایک جگہ اس محرّرہ بالا مضمون کو بیان کرنے والی یہ حدیث بھی پڑھ سکتے ہیں کہ "انّ اللہ لا یمحو السیّئ بالسیّئ ولکن یمحو السیّئ بالحسن انّ الخبیث لا یمحو الخبیث"۔[2]

غرض کہاں تو غیر منقسم ہندوستان کی مشکلات اور یہاں کے ناموافق حالات بھی ناقابلِ اعتبار تھے اور اصرار تھا کہ واقعات کی اسی ناسازگار دنیا میں نہ صرف سیدھے سیدھے حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا جائے بلکہ اس کے مقدس اور پاکیزہ طریقِ کار سے بھی سرِ مو انحراف نہ کیا جائے۔

---

[1] تحریر ۱۹۴۵ء۔ [2] ترجمہ: اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ اچھائی سے برائی مٹتی ہے۔ ایک ناپاک چیز سے دوسری ناپاک چیز نہیں مٹائی جا سکتی۔ ع۔

اس کے اُصولوں کی طاقت و اثر انگیزی اور اپنے عزم صادق پر بھروسہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ منزلِ مقصود ہاتھ نہ آئے تب بھی کوئی غم نہیں ــــ کیونکہ یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں[۱] ــــ اور کہاں پاکستان کی نسبتاً بہت کم مشکلات میں یہ درس دیا جانے لگا کہ بھائی مشکلات و موانع بھی تو کوئی چیز ہیں، ان سے صرفِ نظر کر کے اُصولوں پر ایسا زور کیسے دیا جا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں ان مشکلات و موانع سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے اور منزلِ مقصود کے بجائے خالی اُصول ہاتھ میں رہ جائیں؟

یہ اصول پرستی نہیں بے عقلی ہے! ــــ اور اسی پر بس نہیں، بلکہ کسی نے جب اس پر ٹوکا اور زیادہ نہیں صرف اتنا چاہا کہ عمل آپ جو چاہیں کریں اس کے جواز (JUSTIFICATION) کے لیے ایسا فلسفہ مت ایجاد کیجیے جو اسلام کے تمام اُصولوں کے لیے قینچی بن جائے[۲]۔ تو اس پر ٹھیک وہی ردِ عمل تھا جو سنہ ۴۸ء میں اس طرح کے طرزِ عمل والوں کا بتایا گیا تھا کہ "اور جو تھیں اس سے روکنا چاہے اسی کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو"[۳]

گویا: ــــ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساقی کا ایک جام
نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی

یا پھر شیفتہ کی کہی یاد کیجیے:۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
اب کیا بتائیں رات ہمیں کس کے گھر ملے

ــــــــــــــــــ (باقی)

ندائے ملّت اور الفرقان! صفر (مطابق مئی) کے شمارہ میں اپنی صحت کے سلسلہ میں اظہارِ حال کرتے ہوئے ضمناً اس کا ذکر بھی آ گیا تھا کہ ندائے ملّت سے اب راقم حروف (عتیق الرحمٰن) کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بے تعلقی کی ایک بڑی

---

[۱] تحریر سنہ ۴۸ء۔ [۲] اس فلسفہ کی یہ نوعیت ان نام نہاد "شرعی دلائل" کی بنا پر بن گئی تھی جو اس کے حق میں پیش کیے جا رہے تھے۔ ہم نے یہاں ان کو طوالت کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ اس سب کی تفصیل الفرقان سنہ ۸۸ء اور سنہ ہجری کے فائلوں میں ملے گی۔

[۳] اس ردِ عمل کی تفصیل دیکھنی ہو تو الفرقان بابت ماہ جمادی الآخر سنہ ۸۸ھ دیکھنا چاہیے۔

ناخوشگوار کہانی ہے۔ اسی وجہ سے باوجود احساسِ ضرورت کے ماہ صفر والے نوٹ سے پہلے (یعنی چھ مہینے تک) اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اور یہ ذکر بھی بالکل ضمنی اور مجمل نوعیت کا تھا۔ لیکن خیال تھا کہ اس سے کسی حد تک وہ ضرورت بھی پوری ہوگئی ہوگی جس کا برابر احساس تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ ضمنی تذکرہ بہت سوں کے لیے ناکافی رہا۔ چنانچہ بعض ناظرین الفرقان تک کے ایسے خطوط ابتک دفتر الفرقان میں آتے ہیں جن میں ندائے ملت کے متعلق شکایات یا مشورے بھی درج ہوتے ہیں۔ مجبوراً ذرا زیادہ صراحت کے ساتھ مکرّر عرض کیا جارہا ہے کہ ندائے ملت سے نہ اب میرا کوئی تعلق ہے اور نہ والدِ ماجد مدظلہ (مولانا نعمانی) کو اس سے کچھ سروکار ہے اور اس حالت پر چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا ندائے ملت کے سلسلہ میں ہم لوگوں سے کوئی خط وکتابت نہ کی جائے ـــــ بلکہ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ ندائے ملت کے سابق ایڈیٹر ان وارکانِ ادارہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اور برادرم حفیظ نعمانی وغیرہ کا بھی کوئی تعلق اخبار سے اب نہیں ہے ـــــ ہاں ایک تعلق ندائے ملت سے اب بھی ہم لوگوں کا ہے، جس کا ذکر ماہ صفر والے نوٹ میں آیا تھا یعنی وہ چھ مقدمات جو یو۔پی گورنمنٹ کی طرف سے ندائے ملت کے بعض مضامین کے سلسلے میں چل رہے ہیں۔ جن میں سے پانچ کا تعلق میری ذات سے ہے اور ایک برادرم حفیظ پر ہے۔ اور ان سے کوئی مطلب ندائے ملت کے موجودہ کارپردازوں کو نہیں ہے۔ لہٰذا اس معاملے سے اگر کسی کو دلچسپی ہو تو اس میں بیشک ہم لوگوں ہی سے رابطہ قائم کرنا مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ معاملات میں براہِ راست دفتر ندائے ملت سے مراسلت کرنی چاہیے۔

ناظرین الفرقان سے ایک درخواست

ـــــ از محمد منظور نعمانی

میری اہلیہ ۵-۶ مہینے سے سخت علیل ہیں۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے جتنے علاج ممکن ہوسکتے تھے اُن سب کے باوجود ابھی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے جس کا قدرتی طور پر میرے سارے کاموں پر اثر پڑ رہا ہے، الفرقان کے ناظرین سے دینی تعلق کی بنا پر درخواست ہے کہ ان کی صحت کاملہ عاجلہ کے لیے دُعا فرما کر احسان فرمائیں ـــــ واجرکم علی اللہ تعالیٰ

ـــــ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ ـــــ

درسِ قرآن (مرکزی والی مسجد)

۲ صفر ۱۳۸۹ھ، ۲۰ اپریل ۱۹۶۹ء

دُنیا اور آخرت میں فیروزمندی کی شرط
ایمان وتقویٰ اور خداوندی ہدایت کی پیروی

حمد وصلوٰۃ، اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۝

المائدہ ع ۹

اور اگر یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے اور تقوے والی زندگی اختیار کرتے تو ہم ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیتے اور آخرت میں ان کو جنّاتِ نعیم (چین و آرام کے بہشتی باغوں) میں داخلہ دے دیتے (جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی وہ سب نعمتیں بھرپور پاتے جن کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کی زبانوں پر وعدہ کیا گیا ہے)

اور اگر وہ تورات و انجیل کی اور اس مقدس کتاب کی جو ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے اب اتاری گئی ہے (یعنی قرآن پاک کی) پابندی کرتے (اور ان کی ہدایات پر

ٹھیک ٹھیک چلتے) تو اپنے اوپر سے اور نیچے سے (یعنی ہر طرف سے) اللہ کا رزق پاتے

ـــــ (لیکن صورت حال یہ ہے) کہ ان میں (تھوڑے سے لوگوں کی) ایک جماعت تو

(افراط و تفریط کے بغیر) ٹھیک راستہ پر چلنے والی ہے اور اکثریت ان میں سے ایسی ہے

کہ اس کا کردار بہت برا ہے۔ (سورہٴ مائدہ آیت ۶۵ تا ۶۶)

تفسیر و تشریح:۔ یہ سورہٴ مائدہ کے نویں رکوع کی آخری آیتیں ہیں۔ ان سے اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب خاصکر یہودیوں کی روحانی گراوٹ اور صلاح و سعادت سے محرومی کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا گیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں انھوں نے اخلاق اور انسانیت کی ساری حدوں کو توڑ ڈالا ہے۔ حد یہ ہے کہ اذان جیسی مقدس چیز کو (جس میں اللہ کی توحید و کبریائی کا اعلان اور نماز جیسے بابرکت عمل کی دعوت ہے) انھوں نے تمسخر و استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی نقل اتارتے اور منھ چڑاتے ہیں (وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا)

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ اُن میں اسقدر بگاڑ آگیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ معصیتیں ان میں عام ہوگئی ہیں بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ "اِثْم و عُدْوَان" اور "اَكْلِ سُحْت" یعنی گندے غلیظ گناہوں سے اور بندگانِ خدا پر ظلم و زیادتی کرنے اور حرام کمانے اور کھانے سے ان کو خاص دلچسپی ہوگئی ہے اور یہ سب لعنتی اعمال ان کے مرغوب و محبوب مشاغل بن گئے ہیں، وہ دن رات انہی میں منہمک رہتے ہیں اور اس چیز نے ان کی روحوں کو بالکل مسخ کر دیا ہے۔ (تَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝)

اس کے بعد خصوصیت سے اُن کے مذہبی پیشواؤں کے بارہ میں فرمایا گیا تھا کہ انھوں نے مداہنت کا مجرمانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ ان خبیث اعمال کو گوارا کرنے لگے ہیں روک ٹوک بالکل نہیں کرتے۔ (لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝)

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ ان کی روحیں اب اتنی مردہ ہوگئی ہیں کہ اسلام اور

مسلمانوں کی دشمنی میں یہ خدا کی شان میں بھی گستاخیاں کرتے ہیں۔ استہزا اور تمسخر کے طور پر کہتے ہیں "یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ" (مسلمانوں کے اللہ میاں کا ہاتھ آج کل تنگ اور خالی ہو گیا ہے اس لیے ان کے پیغمبر اپنے آدمیوں سے چندوں اور [illegible] کی اپیل کرتے رہتے ہیں) معاذ اللہ ــــــ اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ یہود اپنی ان گستاخیوں اور زباں درازیوں کی وجہ سے رحمت الٰہی سے محروم کر دیے گئے ہیں اور خداوند قہار کی لعنت کا نشانہ بن گئے ہیں (وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا) ــــــ پھر اس لعنت خداوندی کے ان کی زندگی پر جو اثرات پڑے ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا تھا "وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝" یعنی اب ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ فساد کے لیے ہو رہی ہے۔

ــــــ یہ اگرچہ اپنے کو دنیا کی برگزیدہ نسل کہتے ہیں اور اللہ کے مقدس نبیوں سے نسبت جوڑتے ہیں۔ لیکن ان کا کردار یہ ہے کہ اللہ کے سارے پیغمبر جس صلاح کے پھیلانے کے لیے آئے تھے یہ اس کے خلاف فساد پھیلانے کی مہم چلا رہے ہیں۔ اور ہدایت کی اس روشنی کو بجھا دینا چاہتے ہیں جو سارے نبی اپنے اپنے وقت پر لائے تھے اور جو مکمل شکل میں خدا کے یہ آخری نبی لے کر آئے ہیں ــــ اور ایسے لوگ کبھی خدا کی محبت و عنایت اور اس کے پیار کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ محروم ہی رہیں گے (وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝) یہ میں نے گزشتہ ہفتہ کے درس کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد متصلاً یہ آیتیں ہیں جو میں نے اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کیں ــــ ان میں مشفقانہ اور خیر خواہانہ انداز میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان اہل کتاب سے کوئی عناد نہیں ہو گیا ہے۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے اور ایمان کے بجائے کفر کی راہ اختیار کر کے

اور صلاح و تقویٰ کی جگہ نفسانیت اور معصیت کا راستہ اپنا کے خود ہی اپنے کو اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت اور جنت سے محروم کر لیا ہے۔ اگر یہ لوگ اللہ کے پیغمبر پر ایمان لاتے اور تقوے والی زندگی اختیار کرتے جس کی دعوت اللہ کے سارے پیغمبر اور اللہ کی طرف سے آنے والی ساری کتابیں اور سارے صحیفے دیتے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے قانونِ رحمت کے مطابق ان کے پچھلے گناہ قصور سب معاف کر دیے جاتے اور آخرت میں یہ اللہ کے جوارِ رحمت جنت میں جگہ پاتے۔ لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ؕ ——— اور اگر آخرت پر ایمان ہو تو کسی بندہ کی سب سے بڑی خوش بختی اور کامیابی یہی ہے کہ اس کے گناہ قصور معاف کر دیے جائیں، ان کا کوئی حساب نہ ہو اور دارِ آخرت میں جنّت نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر اہلِ کتاب اللہ کے اور اس کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے راستہ پر ٹھیک ٹھیک چلتے تو آخرت میں مغفرت اور جنّت کے علاوہ اور اس سے پہلے اس دنیا میں بھی یہ ہر طرح کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازے جاتے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ؕ

اور یہ اہلِ کتاب اگر تورات و انجیل کی تعلیمات پر اور اس ہدایت پر ٹھیک ٹھیک چلتے جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لیے اب نازل کی گئی ہے ——— یعنی قرآنِ پاک ——— تو اوپر سے اور نیچے سے، ہر طرف سے رزق پاتے اور زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جاتے، ان پر اوپر سے بھی نعمتوں کی بارش ہوتی اور زمین بھی ان کے لیے رزقِ الٰہی کے خزانے اگلتی۔

ان دو آیتوں سے اوپر کی آیتوں میں بلکہ پچھلے کئی رکوعوں میں اہلِ کتاب خاص کر ان میں سے یہودیوں کی بد اعمالیوں اور اس کے نتیجہ میں ان پر اللہ کی لعنت و غضب کا ذکر کیا گیا تھا اور ان کا انداز ترہیبی تھا۔ ان آخری دو آیتوں کا انداز ترغیبی ہے ان میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اہلِ کتاب اگر کفر و عصیان کے بجائے ایمان اور تقوے کی راہ اختیار کرتے

اور اپنے گندے جذبات اور نفسانی خواہشات کی اتباع کے بجائے اللہ کی مقدس کتابوں توراۃ و انجیل اور قرآن حکیم کی ہدایات کی پیروی کرتے تو آخرت میں "جنّٰتُ النعیم" کے وارث بنائے جاتے اور وہاں کی کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے اور آخرت سے پہلے اس دُنیا میں بھی ان پر اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوتا کہ زمین سے بھی ان کو فراوانی سے رزق ملتا اور آسمان سے بھی ان پر رحمتوں اور برکتوں کی بارش ہوتی ۔ مطلب یہ ہو کہ اس دُنیا میں جو نعمتیں زمین سے حاصل ہوتی ہیں وہ بھی ان کو ملتیں اور جن نعمائے الٰہیہ کا نزول آسمان سے ہوتا ہے وہ ان سے بھی بہرہ یاب ہوتے۔

میرے نزدیک ان دونوں آیتوں کا مدّعا اور پیغام یہ ہے کہ ان اہلِ کتاب کے لیے جو الحاد و انحراف اور بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم ہوگئے ہیں اب بھی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر یہ اپنی اصلاح کرلیں، کفر و عصیان کا طریقہ چھوڑ کے ایمان و تقویٰ کا راستہ اختیار کرلیں اور نفسانی خواہشات اور گندے جذبات کی غلامی کے بجائے خداوندی ہدایت کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں تو دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں سے اب بھی پورا پورا حصہ لے سکتے ہیں۔

یہ بات اگرچہ یہاں اہلِ کتاب کے بارہ میں اور ان میں سے بھی خاص کر یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمائی گئی ہے لیکن درا صل یہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون اور اس کا ازلی دستور ہے۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قوموں کا یہ حال بیان فرمانے کے بعد کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے اور ان کی ہدایت پر چلنے کے بجائے کفر و نافرمانی کا راستہ اختیار کیا اور ان پر خدا کا غضب اور عذاب نازل ہوا ——— فرمایا گیا ہے۔

"وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" ○

(اور اگر ان بستیوں والے کفر و نافرمانی کے بجائے ایمان و تقویٰ کا راستہ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے) اس آیت سے

اور زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عام اور ہمہ گیر قانون اور ازلی ابدی سنت اللہ ہے کہ جو قوم اور امت ایمان اور تقوے والی زندگی اختیار کرلے وہ آخرت میں جنت کی نعمتوں کے علاوہ اس دنیا میں بھی زمین و آسمان کی برکتوں سے نوازی جائے گی

جس زمانہ میں مسلمانوں کی عام زندگی ایمان اور تقویٰ والی تھی، ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ شروع شروع میں تو ابتلائی اور امتحانی دور رہا جو ایمان والوں کی تربیت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس مرحلہ کو طے کر لینے کے بعد ان پر ہر طرف سے نعمتوں کی بارش ہی بارش تھی۔ اور چیزوں کے علاوہ زمینی پیداوار میں برکت کا یہ حال تھا کہ ابوداؤد شریف جو صحاح ستہ کی اہم کتابوں میں سے ہے اس کے مؤلف اور جامع امام ابوداؤد نے خود اپنا مشاہدہ لکھا ہے کہ زمین کی پیداوار میں ایسی برکت تھی کہ مصر کے بازار میں میں نے ایسے کھیرے دیکھے جن میں سے ایک کو میں نے اپنے بالشت سے ناپا تو وہ تیرہ[۱۳] بالشت تھا۔ اسی طرح انھوں نے لکھا ہے کہ وہیں میں نے ایسے لیموں دیکھے جن کو بیچ سے دو[۲] حصے کر کے ایک حصہ کو اونٹ کی پیٹھ پر ایک جانب اور دوسرے حصہ کو دوسری جانب لادا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل نے بیان فرمایا کہ انھوں نے ایسے گیہوں دیکھے جن کا ایک دانہ بصرہ کی کھجور کی گٹھلی کے برابر تھا۔

یہ دراصل "لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" کا ایک ظہور تھا۔

— لیکن کسی قوم اور امت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی زندگی اجتماعی اور عمومی طور پر ایمان اور تقوے کی ہو، نفاق اور فسق و فجور اگر ہو بھی تو بالکل دبا ہوا ہو — لیکن اس کے برعکس اگر کسی قوم اور امت کی حالت یہ ہو کہ اس میں آخرت سے بے فکری، اللہ و رسول کی نافرمانی اور فسق و فجور عام ہو تو اگرچہ اس میں کچھ صالح اور متقی لوگ اور اولیاء اللہ بھی ہوں تو وہ قوم اجتماعی حیثیت سے ان نعمتوں اور برکتوں کی مستحق نہیں رہتی — سورۂ مائدہ کی جو آیتیں اس وقت زیر درس ہیں انکے آخری حصہ میں

یہ بات بھی بڑی صراحت کے ساتھ فرما دی گئی ہے، اہل کتاب کی محرومیوں کے تذکرہ کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا ہے۔

"مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ○

یعنی ان اہل کتاب کی حالت یہ ہے کہ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ اور ایک تھوڑی سی تعداد تو بیشک ایسی ہے کہ اس کی روش ٹھیک ہے اور وہ راہِ راست پر ہے یعنی اس میں خدا ترسی اور فکرِ آخرت ہے اور وہ لوگ خداوندی ہدایت کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان میں کی بڑی تعداد بداعمالیوں اور بدکرداریوں میں مبتلا ہے۔ "وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ"۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ جب کسی امت کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کی اکثریت کی زندگی نافرمانی اور فسق و فجور کی ہو تو اگر اس میں کچھ بندے اعلیٰ درجہ کے صالح اور متقی اور اولیاء اللہ بھی ہوں تو اُمت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہی رہے گی۔

ہم مسلمان آج بالکل اسی حال میں ہیں۔ قرآن پاک میں اُن اہل کتاب کے حق میں فرمایا گیا تھا مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ○ یہ لفظ بہ لفظ آج کے مسلمانوں پر صادق ہے اور یہ کسی مخصوص علاقہ یا کسی خاص ملک کے مسلمانوں کا حال نہیں ہے، بلکہ پورے عالم اسلامی کی حالت یہی ہے مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ○ ان الفاظ میں قرآن پاک نے زمانۂ نبوت کے اہل کتاب کی تصویر کھینچی تھی۔ آج یہ اُمتِ مسلمہ کی زندگی کی تصویر ہے۔ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ○

بیشک اس اُمت میں آج بھی اصحاب صلاح و تقویٰ اور اولیاء اللہ کی ایک خاصی تعداد ہے۔ لیکن چونکہ اکثریت بلکہ غالب ترین اکثریت خداوندی ہدایت سے بے پرواہ ہو کر من مانی زندگی گزار رہی ہے اس لیے اُمت ان نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہے جن کے دروازے ایمان و تقوے والی قوموں کے لیے کھولے جاتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں پر ایسے برے حالات آئیں گے اور وہ اس اس طرح تباہ و برباد کیے جائیں گے تو امہات المومنین میں سے غالباً حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ حضرت کیا اس زمانہ میں اُمت صالحین سے خالی ہوجائے گی؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس وقت بھی اُمت میں اللہ کے کچھ صالح بندے ہوں گے۔ انھوں نے عرض کیا۔

أَنُهْلَكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ يَا رَسُولَ اللهِ؟

حضرت کیا ہم ایسی حالت میں بھی ہلاک و برباد کردیے جائیں گے جبکہ ہم میں اللہ کے کچھ صالح بندے بھی ہوں گے؟

آپ نے ارشاد فرمایا

نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ

ہاں جب خباثت یعنی فسق و فجور کا اُمت میں غلبہ ہوگا تو صلحاء کے ہوتے ہوئے بھی ہلاکتیں اور بربادیاں آئیں گی۔

اس وقت پورے عالم اسلامی میں مسلمان جن ذلتوں سے دوچار ہو رہے ہیں اور جس کی سب سے زیادہ تکلیف دہ مثال اسرائیلی حکومت اور عربوں کے معرکہ میں سامنے آئی ہے اس کا حقیقی اور بنیادی سبب یہی ہے کہ اُمت کی موجودہ زندگی نے اس کو خدا کی نصرت سے یکسر محروم کردیا ہے۔ ایمانی نقطۂ نظر سے بنیادی اور حقیقی سبب یہی ہے۔ ظاہری اسباب و تدابیر کے لحاظ سے جو کوتاہیاں ہیں وہ دراصل اس کے ثمرات و نتائج ہیں، اور علاج صرف یہی ہے کہ پھر سے ایمان و تقویٰ کی زندگی اُمت میں عام ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی ابدی منشور ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۝

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

وصایا اور نصائح کے آئینے میں

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

وصیّت ——— بعض فقراء کو

مجھ سے میرے ایک دوست نے (اللہ تعالیٰ تمام احباب کو توفیقِ نیک دے) نفس اور نفس کے مکر و فریب کی شرح چاہی ہے۔ اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ میں دنیا کے کچھ علاقوں میں گھوما ہوں۔ میں نے بہت سے اُمور کا تجربہ کیا ہے بڑے بڑے کاموں پر سوار رہا ہوں، بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہے اور چیزوں کی کڑواہٹ اور مٹھاس کو چکھا ہے۔ کتابوں کی چھان بین کی ہے، علماء کی خدمت میں رہا ہوں۔ عجائبِ قدرت کا مطالعہ کیا ہے (اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ) میں نے کوئی شے عمر اور دُنیا سے زیادہ جلد زوال پذیر ہونے والی نہیں دیکھی اور موت و آخرت سے زیادہ قریب کوئی چیز نہیں پائی ...... میں نے قناعت کے اندر دنیا و آخرت کی بھلائی اور طمع کے اندر تمام جہان کی برائی دیکھی۔ میں نے سب سے زیادہ نقصان والا اس شخص کو دیکھا جو اپنے اوقات کو (لیت ولعل اور) لیت وسوف میں گزارتا ہے۔ میں نے سب سے اچھی زینت تواضع کو پایا اور سب سے بُری چیز بخل کو ——— میں نے وہ چیز جو

جامع شر ہو حسد کو پایا اور کسی شخص کے سامنے دست سوال دراز کرنے میں ذلت کی موت پائی ۔ مجھے حیاتِ ابدی ، سوال سے بچنے اور اپنے حال کو پوشیدہ رکھنے میں نظر آئی ۔ کوشش اور جد و جہد میں میں نے توفیق کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ـــــ میں نے ہر حریص کو محروم دیکھا اور جس کسی کو طالبِ دنیا دیکھا مغموم پایا ...... ذلت و خواری میں نے ان لوگوں میں مشاہدہ کی جو طاعتِ مخلوق میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور عزت و شرف ان لوگوں میں دیکھا جو طاعتِ خالق میں مصروف ہیں ..... میں نے عاقل اگر دیکھا تو اس شخص کو جو آخرت کی طرف متوجہ ہے ـ دنیا کے راغب کو میں نے بس دنیا ہی میں مشغول اور جان کھپاتے دیکھا ۔ دُنیا سے بے پرواہ کو فارغ البال اور مطمئن پایا ۔ اور یہ بھی دیکھا کہ جو واقعی "مرید" ہے وہ (سچا) طالب ہے اور جو فقط مریدی کا دعویٰ ہی دعویٰ کرتا ہے اس کو کاذب پایا ۔ میں نے برکتِ رزق اور برکتِ عمر طاعتِ خداوندی میں دیکھی اور دُنیا و آخرت دونوں (کی کامیابی) متابعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی ـــ میں نے داخلۂ جنت اکلِ حلال میں دیکھا ـــ جان لے اے فقیر! (اللہ تعالیٰ تجھے توفیق دے) کہ فقر و درویشی کی زینت اور بنیاد اُن چیزوں پر ہے جن کو میں بیان کرتا ہوں :۔

تیرا زادِ راہ تقویٰ اللہ ہو ۔ تیری پونجی افلاس ہو ۔ تیرا سفر اخلاص ہو ۔ تیرے انفاس مراحل ہوں ۔ تیری منزل قبر ہو ۔ تیرا ساتھی یقین ہو ۔ تیری تدبیر عجز و انکساری ہو ..... تیرا گھر خلوت ہو .... تیری مجلس مسجد ہو ، تیرا درس حکمت ہو ، تیری نظر عبرت ہو ، تیری محافظ حیا ہو .... تیری عادت حُسنِ خُلق ہو ..... تیری معلّم قناعت ہو ۔ ..... تجھے نصیحت کرنے والے مقابر ہوں ، تیرے واعظ حوادثِ ایام ہوں ، تیرا اسماع ذکرِ موت ہو ..... تیرا ہتھیار وضو ہو ، تیری سواری پرہیزگاری ہو ، تیرا دشمن شیطان ہو ۔ تیرا عدو نفس ہو ۔ دُنیا تیرے نزدیک ایک قید خانہ ہو اور خواہشِ نفس تیری نظر میں داروغۂ جیل ہو ۔ تیری رات تطوع (نفل) ہو اور تیرا دن استغفار ہو .... تیرا قلعہ دین ہو ، تیرا شعار شرع ہو ، تیری محبوب کتاب اللہ ہو ، تیری انیس سُنّتِ رسول اللہ ہو ، تیرا راس المال ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ حُسنِ ظن اور تیرا اشغل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ہو ـــــ نفسِ امّارہ سے

بچارہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کو تمام اشیاء میں شریر ترین بنایا ہے۔ اور یہ نفس تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہر وقت موجود ہے ..... نفس کی مثال اس چور کی ہے جو گھر کے تمام ساز و سامان سے خوب واقف ہو۔ نفس کی صفات مذمومہ یہ ہیں کہ وہ شر سے محبت اور خیر سے بغض رکھتا ہے۔ عہد (عبدیت) سے مخالفت اور بیجا خواہشات سے موافقت رکھتا ہے تو اسے طاعت کی طرف بلائے گا وہ تجھے معصیت کی جانب تحریک کرے گا..... نفس، شہوت و خواہش کے معاملے میں چوپایوں کے مانند ہے۔ نفس خوف کے عالم میں بلی کی طرح ہو جاتا ہے اور امن کے زمانے میں شیر اور چیتا بن جاتا ہے۔ نفس کی ایک بری عادت یہ بھی ہے کہ وہ فقر و فاقہ سے تو ڈرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ سے اور اس کے عذاب الیم سے نہیں ڈرتا۔ نفس شیطان کے قبضہ میں ہے اور اس کے بہت سے مددگار ہیں جیسے دنیا اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ اور دنیا کے متعلقات۔ نفس کے ہر مددگار کے پاس لشکر، فوجیں، خیل و حشم اور زینت حیات دنیا کے سلسلے کی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ جیسے کثرتِ نوم، کثرتِ اکل، کثرتِ ضحک و مزاح ..... حبِ دنیا، مالداری، تکبر، حسد، چغلی، عاداتِ ذمیمہ، شربِ خمر، ارتکابِ معاصی، لہو و لعب، جمع مال، طولِ آمال ـــــ جس کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اس کو نفس کے عیوب سے آگاہ کر دیا۔ اور نفس کو مسخر کرنے میں اعانت فرمائی۔

تو نفس کے منھ میں تقوے کی لگام لگا دے اور اس کو تواضع و انکسار کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ عقل کو اس کا رعقال (بندھن) بنا دے، شرع کو اس کا قید خانہ اور عبادات کو اس کا داروغہ بنا دے۔ ـــــ عبادت و طاعت کے اندر بھی نفس کی طرح طرح کی مکاریاں اور عیاریاں دخل انداز ہو جاتی ہیں اور یہ مکاریاں معصیت والی مکاریوں سے بھی زیادہ بری ہوتی ہیں۔ مثلاً عبادت کو دکھانے کے لیے سنوارنا، قیمتِ عمل طلب کرنا۔ ریاکاری، نفاق اور اس بات کو پسند کرنا کہ لوگ ہاتھ چومیں، خوب تعریف کریں، بادشاہوں اور مالداروں کی توجہ ادھر ہو جائے، دنیا والوں میں آنا جانا ..... تصنع اور بناوٹ، اپنے روزوں اور نمازوں کا اظہار۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے کم کھانا۔

اپنی کرامات کی تشریح و تشہیر، اپنے وجد اور بکار کا ذب کا اعلان۔ ہونٹوں کا چلانا آنکھوں سے اشارے کرنا۔ مالداروں سے میل ملاپ، مریدین کی کثرت، زیارت نسواں۔ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی خیریت چاہتا ہے تو اس کو نفس کے عیوب سے خبردار کر دیتا ہے ـــــ والحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین ـــــ

اکبر اور نقطوی تحریک

از پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

[پروفیسر محمد اسلم صاحب کا ایک گرانقدر مقالہ "اکبر کا دین الٰہی اور اس کا پس منظر" ذی الحجہ ۸۸ھ اور محرم ۸۹ھ کے شماروں میں نظر نواز ہو چکا ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ زیر نظر مقالہ خاص الفرقان کے لیے تحریر فرمایا ہے اور حسب سابق بڑی نادر تحقیقات پیش کی ہیں ——]

اکبر کے مریدوں میں ابوالفضل سر فہرست تھا۔ اور بدایونی نے ایک موقع پر اُسے "مجتہد دین و مذہب نو" کے لقب سے ملقب کیا ہے[1]۔ جن لوگوں نے اکبر کو گمراہ کیا ان میں بھی ابوالفضل کا نام سب سے اوپر تھا۔ جہاں تک ابوالفضل کا تعلق ہے وہ ملحد تھا اس کی اپنی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں ہی اس پر فتوے لگنے شروع ہو گئے تھے[2]۔ ابوالفضل فطرتاً الحاد کی طرف مائل تھا اور ایک بار اس نے باتوں باتوں میں بدایونی سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ چند روز وادی الحاد کی سیر کروں۔ بدایونی نے کہا کہ اگر نکاح کی قید اٹھا دو تو پھر اس سیر کا لطف دوبالا ہو جائے گا[3]۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ

---

[1] منتخب التواریخ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء جلد ۲ ص ۲۰۳۔

[2] آئین اکبری، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۶۹ء جلد اول، ص ۱۸۹۔

[3] منتخب التواریخ، جلد ۲، صفحہ ۲۶۲۔

ابوالفضل کے دل میں اسلام کے متعلق شکوک پیدا ہو چکے تھے اور ـــــ فزادھم اللہ مرضاً کے مصداق یہ شکوک دن بدن بڑھتے گئے اور آخر کار وہ مبدا و معاد کا انکار کر کے ملحد ہو گیا۔

عبدالقادر بدایونی اور خواجہ کلاں عبید اللہ (ابن خواجہ باقی باللہ) دونوں نے شریف آملی کو ابوالفضل کی گمراہی کا سبب بنایا ہے[54] شریف آملی کے متعلق ان دونوں بزرگوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ وہ محمود بسیخوانی کا پیرو تھا اور اس کا شمار نقطوی فرقہ کے "رؤسا" میں ہوتا تھا۔ اس فرقہ نے دسویں صدی میں ایران اور ہندوستان کے ہزاروں لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ اور ایران میں تو اس فرقہ کو اتنا فروغ ہوا کہ اس کے پیرووں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی اور شاہ عباس اول کا سنگھاسن ڈولنے لگا۔ شاہ نے اپنا تخت و تاج خطرے میں دیکھ کر ہزاروں نقطویوں کو ۱۰۰۲ھ ہجری میں تہ تیغ کر ڈالا[55] سبھی مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ اس قتلِ عام میں کچھ نقطوی جان بچا کر ہندوستان چلے آئے اور یہاں آکر اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگے[56] ان میں شریف آملی بھی تھا جو ابوالفضل کا دستِ راست مانا جاتا تھا۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور تہران یونیورسٹی کے پروفیسر صادق کیا کی تحقیق کے مطابق نقطوی فرقہ کا بانی محمود بسیخوانی گیلان کے ایک گاؤں بسیخوان کا رہنے والا تھا[57] بچپن ہی میں اس کے دل میں حصولِ علم کی آرزو چٹکیاں لینے لگی۔ اتفاق سے ان دنوں ایران میں فضل اللہ استرآبادی اور اس کے حروفی فرقہ کا بڑا شہرہ تھا۔ محمود اس کی شہرت سن کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے اکتسابِ فیض کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد دونوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا اور محمود نے فضل اللہ

---

۵۴ بدایونی، ص ۲۶۶، ۲۶۷۔ !! مبلغ الرجال، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔ ورق ۴۲ الف۔

۵۵ تاریخ عالم آرائے عباسی، مطبوعہ تہران ۱۳۱۴ھ ج ۲، ص ۳۲۵۔

۵۶ !۔ ایضاً۔ !! نقطویان یا پسیخانیان، مطبوعہ تہران ۱۳۲۰ش، ص ۹-۱۰۔ !!! منتخب التواریخ جلد ۲، ص ۲۴۶

۵۷ !۔ تاریخی و ادبی مطالعے مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۱ء ص ۱۔ !! نقطویان یا پسیخانیان، ص ۵۔

سے علیحدگی اختیار کرلی اور ۶۰۰ھ ہجری میں نقطوی فرقہ کی بنیاد رکھی[۵۸]

محمود پسیخوانی کے مخالفین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ وہ کسی زمانے میں بڑا عابد و زاہد تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ آبادی سے دور عبادت و مراقبہ میں مشغول رہتا اور درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر اپنا گزارا کرتا۔ ایک دن وہ ایک ندی کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اسے پانی میں کوئی چیز بہتی نظر آئی۔ جب وہ چیز اس کے قریب آئی تو اس نے اُسے بغور دیکھا، وہ ایک تر و تازہ گاجر تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اس گاجر کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اسے کھا گیا۔ اس کے بعد وہ ہر روز وقت مقررہ پر وضو کے لیے ندی پر آتا اور ایک بہتی ہوئی گاجر اس کی طرف آتی اور وہ اسے پکڑ کر کھا لیتا۔ وہ اس پر خوش تھا کہ خدا نے اس کے رزق کا اس طرح انتظام کر دیا ہے۔

محمود پسیخوانی کو گاجریں کھاتے ہوئے دو ماہ گزر گئے تو اس کے دل میں یونہی ایک خیال آیا کہ دیکھنا تو چاہیے کہ روزانہ یہ گاجر کہاں سے آتی ہے۔ اگلے روز وہ وقت مقررہ سے پہلے ندی پر پہونچا اور پانی کے بہاؤ کے خلاف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک برہنہ عورت ندی کے کنارے بیٹھی ــ زردک را در محلِ مخصوصِ خود میفرستد و می برآرد و ساعتے بداں عمل قیام نمود چوں از کار پرداخت و آتش تو قان او فرو نشست آں زردک را در آب از دست فرو ہشت[۵۹] محمود نے دور سے یہ منظر دیکھا تو خدا کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔ "اے خدا تو اپنے مخلص بندوں کو ایسی چیزیں کھانے کے لیے دیتا ہے؟ اس واقعہ کے بعد وہ اسلام ہی سے پھر گیا اور اس نے الحاد و زندقہ کا پرچار شروع کیا[۶۰] اس نے اپنے عقائد پر تیرہ رسالے لکھے جن میں "بحر و کوزہ" سب سے گیا گزرا ہے۔ اس کے اندراجات کے متعلق بدایونی لکھتا ہے کہ ـــــ فضلاتے[۶۱]

---

۵۸ ایضاً ــ "ذے در سال ۸۰۰ ایں دین نو را پدید آورد"۔

۵۹ مبلغ الرجال، ورق ۳۱ ب ۔ ۶۰ ۔ ایضاً ورق ۳۲ الف

۶۱ الفرقان: مقالہ نگار نے متن اور حواشی میں ایسے تمام الفاظ جدید فارسی رسم خط میں (یعنی یائے معروف سے) لکھے تھے۔ ہم نے اپنے ناظرین کی سہولت کے لیے ایسے تمام الفاظ کو اپنے یہاں کے مانوس رسم خط میں تبدیل کردیا ہے۔

کہ در آنجا خوردہ گوش از شنیدن آں تے میکند۔[11] اس خدا بیزار کے رؤسائے مذہب میں سے شریف آملی اکبر کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا اور ابوالفضل نے اس سے یارانہ گانٹھ لیا۔[12]

شریف آملی (ایران میں) نقطوی فرقہ کا ایک سرگرم مبلغ تھا اور اس کی تبلیغ وسعی سے ہزارہا لوگ اس فرقہ میں شامل ہو گئے۔ جب شاہ عباس نے نقطویوں کا قتلِ عام شروع کیا تو وہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر ایران سے بھاگ نکلا۔[13] بدایونی اور خواجہ کلاں؟ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ایران سے بھاگ کر اس نے بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ شیخ حسین خوارزمی کی خانقاہ میں پناہ لی اور صوفیوں کی طرح رہنے لگا۔[14] اس کی طبیعت کو چونکہ درویشی سے کوئی مناسبت نہ تھی اس لیے اس نے ہرزہ سرائی اور شطاحی کو اپنا شعار بنا لیا۔ جب مولانا محمد زاہد کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو انھوں نے اسے اپنی خانقاہ سے نکال دیا اور وہ دکن (ہندوستان) چلا آیا۔

دکن میں ان دنوں شیعیت کا دور دورہ تھا۔ وہاں لوگوں نے شریف آملی کو شیعی عالم سمجھتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ چونکہ فطرتاً بد باطن تھا اس لیے اس نے شیعیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے عقائد کا پرچار شروع کیا۔ جب لوگوں کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو وہ اس کے درپئے آزار ہوئے۔ بدایونی کے الفاظ ہیں کہ۔ حکامِ دکن میخو استند کہ لوحِ ہستیٔ او را از نقشِ حیات پاک سازند، عاقبت بر سواریِ خر قرار یافتہ برسوائی تشہیرش نمودند۔[15] (حکام اس کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اس میں تخفیف کر کے اسے گدھے پر سوار کر کے گھمانے کی سزا دی گئی)

دکن سے جان بچا کر شریف آملی شمالی ہندوستان چلا آیا اور پہلی ہی ملاقات میں

---

[11] منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۴۷۔ [12] مبلغ الرجال، ورق ۳۲ الف

[13] تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد ۲۔ ص ۴۷۵ [14] مبلغ الرجال، ورق ۳۲، الف،

منتخب التواریخ جلد ۲، ص ۲۴۶ [15] ایضاً۔

اُس نے بادشاہ کے سامنے "حرفہائے ناہموار" کہے جو پسند خاطر ہوئے۔ اکبر نے ہزاری منصب دے کر اُسے اپنے مقربین کے زمرہ میں شامل کر لیا[16]۔ یہیں سے اس کی دوستی ابوالفضل کے ساتھ شروع ہوئی اور اسی کے توسط سے ابوالفضل نے ایران کے نقطویوں کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا۔ خواجہ کلاں[17] رقمطراز ہیں کہ شریف آملی، محمود پسیخوانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مراتب چہارگانہ کا، جو ابوالفضل کے اجتہاد کا نتیجہ تھے، پرچار کیا کرتا تھا[18]۔ اس نے بھی بحر و کوزہ کے طرز پر "ترشح ظہور" نام کی ایک کتاب لکھی تھی جو "مہملات" پر مشتمل تھی[19]۔ شریف آملی کے حواریوں نے اسے ۔۔۔ مجدد مائیہ عاشر مشہور کر رکھا تھا[19]۔ اس لیے سرکاری حلقوں میں وہ بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسکندر منشی کی روایت ہے کہ اکبر اسے اپنا پیر و مرشد مانتا تھا اور اس کی تعظیم و تکریم بالکل ایک پیر کی طرح کرتا تھا[20]۔ بادشاہ اور وزیر کی دیکھا دیکھی ان کے مصاحب بھی اس کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آتے تھے۔

بدایونی نے کیا خوب لکھا ہے کہ۔ "چوں ہندوستان وسیع است و میدانِ اباحت دراں عرصۂ فراخ و کسی را با کسی کاری نہ تا ہر کس بہر طریقہ باشد، باشد[21]"۔ شریف آملی خود کہیں جگہ سے جان بچاتا ہوا اکبر کے ہموار کردہ ۔ میدانِ اباحت ۔ میں آکر معزز و مکرم ہوا۔ جب ایران میں نقطویوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوا تو بہت سے نقطوی وہاں سے بھاگ کر ہندوستان چلے آئے[22]۔ ان میں جو پڑھے لکھے یا کسی فن میں ماہر تھے انھوں نے شریف آملی کے توسط سے اکبر کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں دربار اکبری میں دو نقطوی شاعر

---

[16] مبلغ الرجال۔ ورق ۳۲ب [17] ایضاً [18] منتخب التواریخ جلد ۲، ص ۲۴۷
[19] ایضاً ص ۲۴۶ [20] تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد ۲، ص ۴۲۵۔
[21] منتخب التواریخ جلد ۲، ص ۲۴۶۔ [22] نقطویان یا پسیخانیان، ص۔ ۹ ۔ ۱۰
"از پیروان دینہای گوناگوں و نہضت زندگانی را نیز بہند رہنمون شد۔ اندک اندک ہندوستان جایگاہ دانشمندان و ہنرمندان ایران و پناہگاہ گریختگان ایں سامان گشت۔"

وقوعی نیشاپوری اور تشبیہی کاشی بڑے معزز و مکرم نظر آتے ہیں۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ ابوالفضل کے ساتھ ان کے بڑے عمدہ مراسم تھے اور اس کے ہاں ان کی آمد و رفت بھی رہتی تھی[۲۳]۔

وقوعی نیشاپوری کے متعلق بدایونی لکھتا ہے کہ یہ ــــ "مغضوب الرب وملعون خلق" ــ تناسخ اور نظریۂ ارتقاء کا قائل تھا۔ ایک بار کشمیر جاتے ہوئے لشکر شاہی نے بھنبر کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اتفاق سے وقوعی کسی کام سے مجھ سے ملنے آیا۔ میرے خیمہ کے باہر بڑے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے، جونہی اس کی نظر ان پر پڑی ــ "بحسرت گفت کہ آہ بیچارہا منتظر اند کہ تاکی بقالب انسانی بر آئند"[۲۴] اس سے نقطویوں کے عقائد پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

تشبیہی کاشی بھی ابوالفضل کے توسط سے اکبر کے دربار میں باریاب ہوا تھا۔ اس نے ایک موقع پر اکبر کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اس نے اکبر کو مخاطب کر کے یہ کہا ــ "چرا بکجز دیدہ شدہ تقلید یان را برمی انداز ید تا حق برکز قرار یابد"[۲۵] بدایونی نے ابوالفضل کے گھر میں تشبیہی کاشی کے ہاتھ میں محمود بسیخوانی کا ایک رسالہ دیکھا تھا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا ــ "یا اللہ المحمود فی کل فعالہ استعین بنفسك الذی لا الٰہ الا ھو الحمد للہ الذی وجد نعمہ بوجود کلیاتہ واظہر وجود الکلیات عن نفسہ سہو بہم کلیا و ھو یعلم نفسہ ولا نعلم نفوسنا ولا ھو وھو کون لا کائن الا بہ ومکان لا یکون بغیرہ وھو ارحم الراحمین"[۲۶]۔

بدایونی کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں شاعر عوام کو دعوت الحاد دیا کرتے تھے اور تشبیہی کاشی نے تو خود کو ابوالفضل سے مجتہد بھی تسلیم کروالیا تھا[۲۷]۔ ابوالفضل کے نقطویوں کے ساتھ ربط و ضبط رکھنے سے لوگوں کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ وہ بھی نقطوی ہے۔ ہندوستان کے باہر بھی اس کے الحاد کا چرچا تھا، چنانچہ

---

[۲۳] منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۰۵۔ [۲۴] ایضاً۔ ص ۳۰۹۔ [۲۵] ایضاً۔ ص ۲۰۵۔
[۲۶] ایضاً۔ [۲۷] ایضاً۔ ص ۲۰۴-۲۰۵۔

مشہور ایرانی مؤرخ اسکندر منشی کی اس کے متعلق یہ رائے ہے ــ "شیخ ابو الفضل ولد شیخ مبارک کہ از ارباب فضل و استعداد ولایت ہند و در ملازمت پادشاہ عالیجاہ جلال الدین محمد اکبر پادشاہ تقرب و اعتبار تمام یافتہ بود ایں مذہب داشت و پادشاہ را بکلمات واہیہ وسیع المشرب ساختہ از جادۂ شریعت منحرف ساختہ بود۔"[۲۸]

اسکندر منشی لکھتا ہے کہ جب شاہ عباس نے نقطویوں کا قتل عام کیا اور ان کے سرغنہ میر سید احمد کاشی کا گھر لٹوایا تو اس کے گھر سے ابو الفضل کا ایک خط نکلا۔ اس خط کے مضمون سے یہ معلوم ہوا کہ ابو الفضل بھی نقطوی فرقہ کا پیرو تھا[۲۹] سر سید احمد خاں نے بھی تشبیہی کاشی کے سوانح حیات کے حاشیہ پر ابو الفضل کے متعلق لکھا ہے کہ ــ "از سر آغاز آگہی شوریدگی دارد و بآئین محمودیان میزند"[۳۰] خواجہ کلاں بھی ابو الفضل کو محمود پسیخوانی کا پیرو بتلاتے ہیں[۳۱] آئندہ سطور میں ہم نقطویوں کے عقائد بیان کریں گے اور ان کی روشنی میں یہ جائزہ لیں گے کہ ان مؤرخوں کا یہ دعوی کہاں تک صحیح ہے کہ ابو الفضل نقطوی تھا۔

نقطوی فرقہ کے پیرو ــ "عالم را موجود باعتبار میدانند و ترتیب ثواب و عقاب بر عمل و کردار اعتقاد نکنند"[۳۲] اسکندر منشی لکھتا ہے کہ ــ "آں طائفہ بمذہب حکماء عالم را قدیم شمردہ اند و اصلاً اعتقاد بحشر اجساد و قیامت ندارند و مکافات حسن و قبح اعمال را در عافیت و مذلت دنیا قرار دادہ بہشت و دوزخ ہمانرا می شمارند"[۳۳] شاہنواز خاں ان کے متعلق لکھتا ہے کہ ــ "علم نقطۂ الحاد و زندقہ و اباحت و توسیع مشرب است مثل حکماء بقدم عالم گردند و انکار حشر و قیامت نمائند و مکافات حسن و قبح اعمال و جنت و نار در عافیت و مذلت دنیا قرار دہند۔"[۳۴]

وہ نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جمادات و نباتات ترقی

---

[۲۸] تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد ۲، ص ۳۲۵۔ [۲۹] ایضاً [۳۰] آئین اکبری، جلد سوم، حاشیہ بر صفحہ ۳۱۵
[۳۱] مبلغ الرجال، ورق ۲۱، الف [۳۲] ایضاً ورق ۲۵، الف [۳۳] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ۲، ص ۳۲۵
[۳۴] مآثر الامراء، جلد اول، مطبوعہ ۱۸۸۸ء، کلکتہ، ص ۶۱۹۔

کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں۔[۳۵] قومی ہیثاوری نے پتھروں کو دیکھ کر یہی کہا تھا۔ "کہ آہ ایں بیچارہا منتظر اند کہ تا کے بقالب انسانی بر آیند"[۳۶]

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں ڈالو گے وہ اُگ آئے گا۔ اس کے اُگنے میں قدرت خدا کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ عمل تاثیر کواکب و عناصر کے تحت ہوگا۔[۳۷]

خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ یہ لوگ قرآن پاک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں اور مسائل شریعت کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اہل الرائے نے بنائے ہیں۔[۳۸] اس فرقہ کے پیرو نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور جب کسی مسلمان کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدا کو آسمان پر ماننا اور سر زمین پر رکھنا بھی بھلا کوئی عقل کا کام ہے۔[۳۹] اسی طرح جب یہ لوگ حجاج کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ان کا کیا گم ہو گیا ہے جس کی تلاش میں یہ ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔[۴۰] قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان بے زبانوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جو انھیں جان سے مارتے ہو۔[۴۱] ماہ رمضان کا نام ان ملحدوں نے ــــ ماہ گرسنگی و تشنگی ــــ رکھا ہوا ہے۔[۴۲]

ان ملحدوں کا یہ کہنا ہے کہ جو قطرۂ آب انسان کی خلقت کا سبب ہے بھلا اس کے باہر نکلنے سے غسل کیونکر واجب ہوتا ہے؟ حالانکہ اسی راہ سے پیشاب، جو کہیں زیادہ ناپاک ہے نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔[۴۳] اس فرقہ کے پیرو ماں بہن کی حرمت کے بھی قائل نہیں ہیں۔[۴۴] اسی طرح یہ گروہ نقلیات کا منکر اور عقلیات کا داعی ہے اور ہر اسلامی شعار کا مذاق اڑانا ان کا بہترین شغل ہے۔[۴۵]

نقطویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اول ظہور سے محمود پسیخوانی تک آٹھ ہزار سال کی مدت

۳۵؎ دبستان مذاہب، مطبوعہ ۱۸۰۹ء لکھنؤ، ص ۳۰۰۔ ۳۶؎ منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۸۹
۳۷؎ مبلغ الرجال، ورق ۲۵ الف۔ ۳۸؎ ایضاً، ورق ۲۵ ب۔ ۳۹؎ ایضاً۔ ۴۰؎ ایضاً۔
۴۱؎ ایضاً۔ ۴۲؎ ایضاً۔ ۴۳؎ ایضاً۔ ۴۴؎ ایضاً۔ ۴۵؎ ایضاً۔

ہوتی ہے۔ یہ دور عربوں کی سیادت کا دور تھا۔ کیونکہ اس مدت میں پیغمبر صرف عربوں ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ محمود بسیخوانی کے ظہور سے عربوں کی سیادت ختم ہو گئی لہٰذا آئندہ آٹھ ہزار سال تک پیغمبر عجمیوں ہی میں پیدا ہوا کریں گے[۴۶]۔

ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب عناصر میں قوت پیدا ہوتی ہے تو معدنی صورت نباتی خلعت پہنتی ہے۔ پھر کسوت حیوانی اس کے جسم پر چست ہوتی ہے۔ جب اس میں شان اور شوکت پیدا ہوتی ہے تو انسان کامل کے مرتبہ تک پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح ظہور آدم تک اجزائے انسانی ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے یہاں تک کہ مرتبۂ محمدی آیا پھر بھی قدم کمال کی طرف بڑھتا رہا تو محمود کا درجہ آ گیا[۴۷]۔ چنانچہ "نبعثك مقاماً محموداً"[ع۵] میں اسی کی طرف اشارہ ہے[۴۸]۔

ان کا کلمہ — لا الٰہ الا المرکب المبین — ہے اور "مرکب مبین" سے یہ لوگ انسان مراد لیتے ہیں[۴۹]۔ اس فرقہ کے بانی نے "لیس کمثلہ شئی" کو حذف کر کے اس کی جگہ قرآن میں "انا المرکب المبین" لکھ دیا تھا[۵۰]۔

محسن فانی لکھتا ہے کہ نقطویوں کی ایک خاص دُعا ہے جسے وہ سورج کی طرف منھ کر کے پڑھتے ہیں[۵۱]۔ اسی طرح وہ انسان کامل کی پرستش کرنے اور اس کو حق کا مترادف جانتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ جب دو نقطوی ملتے ہیں تو وہ سلام مسنون کے بجائے اللہ اللہ کہتے ہیں[۵۲]۔ نقطویوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لیے محمود کا لایا ہوا دین قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں[۵۳]۔

---

[۴۶] دبستان مذاہب، ص ۳۰۱۔ [۴۷] ایضاً، ص ۳۰۰

[۴۸] یہ عبارت ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی ہے۔ میں نے خود ترجمہ کرنے کے بجائے یہ عبارت ان سے مستعار لے لی ہے۔ [۴۹] تاریخی و ادبی مطالعے، ص ۷۰۔ [۵۰] دبستان مذاہب، ص ۳۰۰۔

[۵۱] ایضاً، ص ۳۰۲۔ [۵۲] ایضاً۔ [۵۳] ایضاً — "دین محمد منسوخ شدہ، اکنون دین، دین محمود ست"۔

[ع۵] الفرقان: غالباً آیت قرآنی "ان یبعثك ربك مقاماً محموداً" کو اس طرح لکھا گیا ہے۔

ہمارے عہد میں بعض اہل علم کو اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ دین الٰہی کی بنیاد میں نقطویوں کا بھی کافی حصہ ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس بات کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اکبر اور اس کے حواریوں کے عقائد کا موازنہ نقطویوں کے عقائد سے کرتے اور تاریخ پاک و ہند کے طلباء کے سامنے ایک نئی چیز پیش کرتے۔ ہم نے اپنے طور پر ان عقائد کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اکبر اور اس کے حواریوں نے اکثر و بیشتر عقائد نقطویوں سے مستعار لیے تھے۔

۱۔ نقطوی تناسخ کے قائل ہیں اور اس کے بغیر وہ جزا و سزا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں[۵۰] کہ بیربر، دیوی، پرکوتم اور بھاون نے اکبر کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ تناسخ کے بغیر عذاب و ثواب بے معنی ہے اور وہ تناسخ پر یقین رکھنے لگا۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ ___ میفرمودند آنکہ ساوی کتب برگوید کہ برخے عصیاں گرائی باستاں بصورت بوزنہ و خوک برآمدند، باور افتد[۵۴] یعنی اکبر کہا کرتا تھا کہ جب میں یہ سنتا تھا کہ خدا نے فلاں فلاں قوم کو ان کے گناہوں کی پاداش میں بندر اور سور بنا دیا تھا تو یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن جب سے میں تناسخ کو ماننے لگا ہوں تب سے یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ ایسا ممکن ہے۔ اکبر ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر تناسخ کا قائل ہوا تھا۔ لیکن نقطویوں کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ جب خانِ اعظم بنگالہ سے آکر اکبر کی خدمت میں باریاب ہوا تو اکبر نے اس سے کہا "ما دلائل قطعی بر حقیقت تناسخ یافتہ ایم، شیخ ابوالفضل خاطر نشان شما خواہد کرد[۵۵]" ہمارا یہ خیال ہے کہ اس نے ___ دلائل قطعی ___ شریف آملی، وقوعی نیشاپوری اور تشبیہی کاشی کی صحبت میں رہ کر فراہم کیے تھے۔

۲۔ نقطوی حشر و نشر کے قائل نہیں ہیں۔ اکبر بھی حشر و نشر پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔

۵۰۔ ملاحظہ ہو مقالہ نگار کا مقالہ "اکبر کا دین الٰہی اور اس کا پس منظر" شائع شدہ الفرقان ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ۔
۵۴۔ آئین اکبری، جلد ۳، مطبوعہ ۱۸۶۹ء لکھنؤ ص ۳۰۳۔ ۵۵۔ منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۳۰۰۔

بدایونی کے الفاظ ہیں ـــ "در ہر رکنے از ارکانِ دین و در ہر عقیدہ از عقائدِ اسلامیہ چہ اصول چہ فروع مثل نبوت و کلام و رؤیت و تکلیف و تکوین و حشر و نشر شبہات گوناگوں بتمسخر و استہزا آوردہ"[56]

۳۔ نقطوی قرآن حکیم کو نبی اکرمؐ کی تصنیف بتاتے ہیں۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ ابوالفضل نے میرے والد کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ قرآن حکیم حضور سرور کائناتؐ کی تصنیف ہے۔[57]

۴۔ جب دو نقطوی ملتے تھے تو سلام مسنون کے بجائے وہ اللہ اللہ کہتے تھے۔ جب اکبر کے دو چیلے ملتے تھے تو ایک اللہ اکبر کہتا اور دوسرا جواب میں جل جلالہ کہتا تھا[58]

۵۔ نقطویوں کی ایک خاص دعا ہے جسے وہ سورج کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے۔ اکبر بھی سورج کی بڑی تعظیم کرتا تھا اور اس کی طرف منہ کر کے ایک خاص دعا پڑھا کرتا تھا جس میں سنسکرت زبان میں سورج کے ۱۰۰۱ نام آتے تھے[59]

۶۔ نقطویوں کا یہ کہنا تھا کہ دینِ اسلام کی میعاد ختم ہو چکی ہے، اس لیے اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ اکبر بھی عقیدۂ الفی (یعنی نبوت محمدیؐ کی مدت ایک ہزار سال) پر یقین کامل رکھتا تھا اور اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ دینِ اسلام کی میعاد ختم ہو چکی ہے لہذا اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے[60]

(۷) نقطوی انسانِ کامل کی پرستش کرتے اور اسے حق کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اکبر کا بھی قریب قریب یہی عقیدہ تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب ٹوڈرمل کے ٹھاکر چوری ہوئے اور اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تو اکبر نے اس سے کہا تھا کہ ٹھاکروں کا غم نہ کرو۔ میں جو موجود ہوں میرے درشن کر کے بھوجن کر لو[61]

(۸) نقطوی غسلِ جنابت کے قائل نہیں ہیں۔ اکبر نے بھی غسلِ جنابت منسوخ کر دیا تھا اور

---

[56] ایضاً۔ ص۔ ۳۰۷ [57] مآثر الامراء۔ جلد ۲۔ ص ۲۱۷ [58] آئینِ اکبری، جلد اول، ص ۱۹۲
[59] منتخب التواریخ۔ جلد ۲۔ ص ۳۲۶ [60] ایضاً، ص ۳۰۱
[61] مآثر الامراء۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۵۔

بقول بدایونی فیضی تو جنابت کی حالت میں تفسیر "سواطع الالہام" کی تصنیف میں لگا رہتا تھا۔[۶۲]

۹۔ نقطوی مناسک حج کا تمسخر اڑاتے ہیں، اکبر نے بھی حجاج پر پابندی لگادی تھی، بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر سے حج پر جانے کی اجازت مانگنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔[۶۳]

۱۰۔ نقطوی اباحت کے قائل ہیں۔ ابوالفضل نے بھی ایک بار بدایونی سے کہا تھا کہ ــــ "میخواہم کہ روزے چند در وادیٔ الحاد سیرے بکنم"[۶۴] بدایونی نے فوراً جواب دیا "اگر قید نکاح از میان بر میدارید بدنیست"[۶۵] ہمارے خیال میں یہ اباحت کی طرف ہی اشارہ تھا۔ بدایونی کے علاوہ خواجہ کلاںؒ نے بھی شیخ مبارک اور ابوالفضل دونوں پر مسلک اباحت پر گامزن ہونے کا الزام لگایا ہے۔[۶۶]

۱۱۔ نقطوی عقلیات کے قائل ہیں اور نقلیات کے منکر۔ اکبر بھی اپنے حواریوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ اگر کسی مسئلہ کا تعلق عقل کے ساتھ ہو تو وہ مجھ سے دریافت کرو اور اگر وہ شریعت سے متعلق ہو تو ان ملاؤں سے پوچھو۔[۶۷]

۱۲۔ نقطویوں کا یہ خیال ہے کہ شریعت کے مسائل "اہل رائے" نے بنائے ہیں۔ اکبر جس سے ناراض ہوتا اسے وہ "فقیہہ" کہہ کر پکارا کرتا تھا۔[۶۸]

فیضی جام شراب ہاتھ میں اٹھا کر کہا کرتا تھا ــــ "ایں پیالہ را بکوری فقہاء می خوریم"۔[۶۹]

۱۳۔ نقطوی اسلام اور شعائرِ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ابوالفضل اپنی تحریروں میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں کا ذکر کرتا ہے انھیں ــــ پیروانِ احمدی کیش[۷۰] کوتاہ بیں[۷۱]

---

[۶۲] منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۳۰۰۔ [۶۳] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۲۹ ــــ نام نمی تواں برد و بمجرد طلبیدن رخصت مجرم واجب القتل میشود۔ [۶۴] ایضاً، ص ۲۶۲۔ [۶۵] ایضاً۔ [۶۶] مبلغ الرجال ورق ۳۳ الف [۶۷] منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۳۰۰۔ [۶۸] ایضاً، ص ۳۲۹ [۶۹] ایضاً، ص ۳۰۹۔ [۷۰] آئین اکبری، جلد ۲۔ ص ۱۲۵۔ [۷۱] ایضاً جلد ۳، ص ۲۹۴۔

گم گشتگانِ بیابانِ ضلالت [۵۲] سادہ لوحانِ تقلید پرست [۵۳] اور گرفتارِ زندانِ تقلید [۵۴] کے تحقیر آمیز کلمات سے یاد کرتا ہے۔ نیز اس نے عباداتِ اسلامی کے خلاف رسائل بھی لکھے تھے [۵۵]

۱۴۔ فیضی کو تفسیر بے نقط لکھنے کا خیال بھی نقطویوں سے مل کر آیا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ اکبر اور اس کے حواریوں کے نقطویوں کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے اور دینِ الٰہی کی بنیاد میں نقطوی مذہب کو کافی دخل تھا۔

---

[۵۲] مہابھارت مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، ص ۱۰۔ [۵۳] آئین اکبری، جلد ۳، ص ۲۹۳۔

[۵۴] مہابھارت، ص ۳۵ [۵۵] منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۳۰۲۔

اسلامی تحقیق

اس کے معنی و مدعا اور دائرہ کار

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

(۱)

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب اہل علم کے حلقہ کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ہمیں اُن سے اُسوقت سے تعارف ہوا جب غالباً ۱۹۵۱ء میں اُنکی کتاب "قرآن اور علم جدید" تبصرہ کے لیے آئی۔ اس کے بعد اقبال اکیڈمی (کراچی) کے ڈائرکٹر اور اکیڈمی کے سہ ماہی مجلہ اقبال ریویو کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اُن کے مضامین اس علمی مجلہ میں دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ مندرجہ ذیل مضمون موصوف کے دل کی پکار ہے جسے ہم معاصر عزیز میثاق لاہور کے صفحات سے اسکی قابل توجہ اہمیت کی بنا پر نقل کر رہے ہیں)

افتتاحیہ الفاظ

اقوام عالم ایک باہمی جنگ میں مصروف ہیں جو کبھی پر امن ہوتی ہے اور کبھی تشدد آمیز لیکن ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس جنگ میں نظریات و تصورات کی قوت ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ جو قوم اس جنگ میں فتح یاب ہو کر بالآخر دُنیا کے کناروں تک پھیل جائے گی اور پھر ہمیشہ وہاں موجود رہے گی۔ وہ وہ نہیں ہوگی جس کے پاس جوہری آلات زیادہ ہوں گے بلکہ وہ ہوگی جس کے نظریۂ حیات کے تصورات سب سے زیادہ معقول اور مدلّل اور دلکش اور دلنشین ہوں گے۔ جو قوم نظریاتی محاذ پر اپنی حفاظت نہیں کرتی وہ محض فوجی محاذ پر طاقتور بن کر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی۔ اور جو قوم نظریاتی

محاذ پر طاقتور بن جائے اسے کسی فوجی محاذ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی زندگی کے اس نازک دور میں جب ہم دوسری قوموں کے نظریات کی طرف سے اپنی بقا کے لیے ایک خطرناک چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں جب ہم اسلام کی ایک نہایت ہی معقول اور مدلل سائنسی توجیہہ پیش کریں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تمام معقول اور دلکش سائنسی تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے۔ جو اپنی صحیح اور پاکیزہ صورت میں فقط مسلمان قوم ہی کے پاس ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو اسلام کی روح ہے اور انسان اور کائنات کے صحیح اور سائنسی نظریہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق و تجسس کی تمام قوتوں کو بروئے کار لاکر اسلامی تعلیمات کو ایک ایسے سائنسی نظریہ کائنات کی شکل دیں جس سے انکار کی گنجائش موجود نہ رہے۔ ہمارے اسلامی تحقیق کے تمام اداروں کو اس اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اسلامی تحقیق ہمارے لیے کوئی غیر ضروری تفریحی شغلہ نہیں جسے ہم اپنی فرصت یا سہولت کے مطابق اختیار کریں یا نہ کریں بلکہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے! اگر ہم اس کی طرف بروقت اور پوری تندہی کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے تو ہمیں یقینی موت کا منتظر رہنا چاہیے اور پھر ہمارے بعد خدا کوئی قوم اور پیدا کرے گا۔ جو اسلام کا یہ کام کرے گی۔

اسلامی تحقیق کے معنی

اسلام جیسا کہ اسے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس لائے ہیں، ان مقدس تعلیمات کا نام ہے جو قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسلامی تحقیق کی تعریف اس طرح سے کرنی چاہیے کہ اسلامی تحقیق وہ تحقیق ہے۔

جس کا موضوع ہماری ان مقدس کتابوں کے مشتملات ہوں۔ اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ان مشتملات کو لوگوں کے لیے زیادہ قابل فہم بنایا جائے۔

اس تعریف کی روشنی میں ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی تحقیق میں کون سی چیزیں شامل ہیں اور کونسی شامل نہیں۔ مثلاً اس میں وہ سب تحریریں شامل ہوں گی جو مسلمان علماء نے (ا) ان مقدس کتابوں کے متعلق یا (ب) ان کتابوں کے متعلق جو ان مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں

ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔ پھر چونکہ یہودی یا عیسائی مستشرقین نعمت ایمان سے بے نصیب ہونے کی وجہ سے ہماری مقدس کتابوں کو مقدس کتابوں کی حیثیت سے نہیں سمجھ سکتے اور ان سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کو مقدس کتابوں کے مقدس مشتملات کی حیثیت سے دوسروں کے اذہان کے قریب لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یا ایسا کرنے کی نیت ہی رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلامی تحقیق سے وہ تمام تحریریں خارج سمجھی جائیں گی جو یہودی اور عیسائی مستشرقین ہماری کتابوں کے متعلق یا ان کتابوں کے متعلق جو ہماری مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں، ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔

میکانکی اور اصلی اسلامی تحقیقات

اسلامی تحقیق کی دو قسمیں ہیں یا تو یہ میکانکی ہوتی ہے یا اصلی، مثلاً مقدس کتابوں یا مقدس کتابوں پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کی کوئی لغات یا کوئی اشاریہ تیار کرنا یا اس کے مشتملات کا ترجمہ کرنا یا ان کو نئی ترتیب دینا یا ان کا اختصار لکھنا یا کسی ایسے تاریخی قسم کے یا کسی اور نوعیت کے مواد کا جو اُن کے مضمون سے تعلق رکھتا ہو اس غرض سے جمع کرنا کہ اس کے حوالے آسانی سے میسر آجائیں، میکانکی اسلامی تحقیق ہے جبکہ مقدس کتابوں کے مضمون کی علمی تشریح یا تفسیر یا توسیع کرنا، اصلی اسلامی تحقیق ہے۔۔۔۔ اصلی اسلامی تحقیق میکانکی اسلامی تحقیق سے بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اسلام کے معنی یا اس کی روح سے ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت اسلامی تحقیق سے ایسی ہی تحقیق مراد ہے۔ اس قسم کی اسلامی تحقیق کے لیے تعلیمات اسلام کی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور اسلام کی ایسی بصیرت صرف اس عالم دین کا حصہ ہو سکتی ہے جو اسلام پر ایسا خالص اور پختہ ایمان رکھتا ہو کہ وہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شدید محبت کی صورت اختیار کرے اور جو اسلام کے مذہبی اور اخلاقی ضبط اور نظم کو دل و جان سے قبول کر چکا ہو اور اس پر متواتر عمل پیرا ہو۔ پھر یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی عالم دین مقدس کتابوں کے بار بار کے مطالعہ سے ان کی روح میں نہ گھس جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی اطاعت سے انسان اور کائنات کا وہی نظریہ پیدا نہ کر لے جو خدا نے آپ کی معرفت ہم تک پہنچایا ہے چونکہ اس قسم کی اسلامی تحقیق صرف خدا اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کی شدید محبت کے سرچشمہ سے ہی پھوٹ سکتی ہے۔ لہٰذا وہ دوسروں میں بھی اسلام کی محبت پیدا کرتی ہے۔ اس قسم کی اسلامی تحقیق کی مثال شاہ ولی اللہؒ، غزالیؒ، رومیؒ، محی الدین ابن العربیؒ، ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور اقبالؒ ایسے حکمائے دین کی کتابیں ہیں۔

اصلی اسلامی تحقیق کے وظائف

چونکہ اصلی اسلامی تحقیق ہمیشہ اسلام کی عقلی اور علمی بنیادوں کے خلاف زمانہ کے عقلی اور علمی چیلنج کا جواب ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ دو اہم وظائف ادا کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ان فلسفیانہ افکار کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ابطال کرتی ہے جو اس خاص زمانہ میں رواج پاکر مسلمان کے یقین و ایمان پر ایک مخالفانہ اثر پیدا کر رہے ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتی ہے۔ اور تمام صحیح تصورات کو جو اس زمانہ میں دستیاب ہوسکتے ہوں کام میں لاکر اسلامی افکار و اعتقادات کی مدافعت کرتی ہے۔ یہ دو وظائف ادا کرنا اس کے لیے اس طرح سے ممکن ہوتا ہے کہ اسلام کا محقق اسلام کی شدید محبت اور اس کی صحیح تشریح اور تعبیر کرنے کی شدید خواہش کی وجہ سے ایک ایسا صحیح وجدان حاصل کر لیتا ہے اور اشیاء اور حقائق کے بارہ میں ایک ایسا صحیح نقطہ نظر پیدا کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ صحیح افکار کو غلط افکار سے بآسانی تمیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کے وظائف

میکانکی اسلامی تحقیق کے لیے اسلام کی کسی بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی اور چوں کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسلام کی محبت کا نتیجہ ہو لہٰذا وہ اسلام کی محبت کو نہ منعکس کرتی ہے اور نہ اسے دوسروں میں پیدا کر سکتی ہے۔ میکانکی اسلامی تحقیق کی اہمیت فقط یہ ہے کہ وہ اسلام کے عام طالب علم کے لیے اسلام کی مقدس کتابوں کا مطالعہ آسان کرتی ہے اور ان مقدس کتابوں کے مضمون کو اصلی اسلامی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے عالم دین کی آسان دسترس میں لاکر اس کی تحقیقی ضرورتوں کی خدمت اور اعانت کرتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اصلی اسلامی تحقیق سے شغف

رکھنے والا عالم دین ایک ایسا ماہر تعمیرات ہے جو ایک خوبصورت عمارت کا نقشہ تیار کرکے اسے تعمیر کی ساری منزلوں سے گذارتا ہے اور میکانکی اسلامی تحقیق پر کام کرنے والا پڑھا لکھا آدمی ایسا محنتی مزدور ہے جو تعمیر میں کام آنے والی اینٹوں کو ڈھو کر اس ماہر تعمیرات کے قریب لے آتا ہے۔

مشرقی تحقیق

ہوسکتا ہے کہ بعض وقت اسلام کی مقدس کتابوں پر خالص میکانکی تحقیق کا باعث یہ ہو کہ تحقیق کرنے والے کو اسلام سے محبت ہے لیکن اس کے کامیاب تتبع کے لیے اسلام کی صداقت پر ایمان ویقین کی موجودگی ایک شرط کے طور پر قطعاً ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں یہودی اور عیسائی مستشرقین بھی اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس دور میں اس کے اصلی موجد مغرب کے یہودی اور عیسائی مستشرقین ہی ہیں لیکن ایسی حالت میں اسے اسلامی تحقیق کا نام دینا ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ اس حالت میں یہ ایک وسیع تر تحقیق کا حصہ ہے جسے مشرقی تحقیق کہا جاتا ہے اور جسے مغرب میں علماء کے ایسے گروہ نے ایجاد کیا تھا جو اپنے آپ کو "مستشرقین" کا نام دیتا تھا۔ کیونکہ وہ مشرقی ادب اور السنہ سے دلچسپی رکھتا تھا اور انھیں جاننا چاہتا تھا۔ مشرقی تحقیق سراسر ایک میکانکی عمل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کار یہ ہوتا ہے کہ ماضی میں عربی، فارسی، سنسکرت، چینی، انڈونیشی اور ترکی ایسی مشرقی زبانوں میں تاریخ، مذہب، فلسفہ، لغت، سائنس اور ادب وغیرہ کے موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کا ترجمہ باحاشیہ، بااختصار، بااشارہ تیار کیا جائے یا ان کی تشریح یا توسیع یا تنقید بہم پہونچائی جائے۔

شروع میں اس تحقیق کے اغراض ومقاصد کلیتہً مشنری یا تبلیغی تھے۔ اس کے بعد جب اروپائی طاقتیں مشرق میں اپنی نوآبادیاں بنانے لگیں تو اس کے اغراض ومقاصد تبلیغی ہونے کے علاوہ انتظامی اور سیاسی بھی ہوگئے۔ مشرقی مطالعات سے اہل مغرب کا ایک مقصد بلا ریب یہ ہے کہ وہ اپنے ذوق دریافت کو مطمئن کریں اور ایک ایسی تہذیب کے مخفی آثار کو بے نقاب کرکے اپنی تفریح کا سامان بہم پہونچائیں جو ان کے خیال میں ہمیشہ کے لیے مٹ چکی ہے اور اپنی جگہ پر اس تہذیب کو چھوڑ گئی ہے جو اس سے کئی درجہ بلند تر اور برتر ہے اور جس کے وہ خود علمبردار

ہیں۔ ان کا مقصد ویسا ہی ہے جیسا کہ ٹیکسلا کی کھدائی سے ہمارا ہے کہ ہم اس کے ذریعے ماضی کے متعلق لوگوں کی خواہش کی تشفی کے لیے یا ان کی تفریح کا ایک شغل پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی پرانی تہذیب کے دفن کیے ہوئے نشانات کو بے حجاب کرتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے مٹ چکی ہے۔ اب جبکہ مغرب کی تمام یونی ورسٹیاں اپنے ہاں مشرقی مطالعات کی کرسیاں قائم کر کے مشرقی تحقیق کی سرپرستی کر رہی ہیں مشرقی تحقیق مغرب اور مشرق دونوں میں ایک باعزت اور زر آفریں پیشہ بن گئی ہے۔ وقت کے گزرنے سے مستشرقین نے مشرقی تحقیق کا ایک خاص فن ایجاد کر لیا ہے جو ہمارے السنہ شرقیہ کے طالب مغرب کی یونی ورسٹیوں میں اُن سے سیکھتے ہیں۔ اب مشرق کی بہت سی یونیورسٹیوں میں بھی مشرقی علوم کی کرسیاں قائم ہو چکی ہیں اور یہ کرسیاں بالعموم ان لوگوں نے سنبھال رکھی ہیں جن کو مغربی مستشرقین نے مشرقی تحقیق کے فن کی تربیت دی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی تحقیق کا تعلق ہے۔ یہ فن اس کے میکانکی حصہ کے لیے کسی قدر سودمند ہو تو ہو ورنہ محض بے کار ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب

عربی اور فارسی کی کتابوں پر جو بالعموم مسلمانوں نے لکھی ہیں مستشرقین کی تحقیق کا سبب نہ اسلام کی محبت ہے اور نہ مسلمان علماء اور فضلا کی قدر دانی۔ بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، ان مستشرقین کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بالعموم ایک شدید قسم کا تعصب موجود ہوتا ہے لہٰذا جب بھی وہ اپنے میکانکی کام سے ذرا ہٹ کر مسلمان کے معتقدات اور نظریات کی توجیہہ کرنے لگتے ہیں۔ تو ان سے یہ توقع کرنا بھی عبث ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی موافقانہ رائے قائم کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیق کا ایک حصہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعتراضات سے معمور ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے کام کے اس حصہ کو نظر ثانی کے بعد اُنکی غیر منصفانہ تنقید سے پاک کریں لیکن جس حد تک مستشرقین کے کام کی اس قسم کی نظر ثانی مسلمانوں کی ایسی تصنیفات کے متعلق ہو گی جو اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر ہیں، ہم اسے میکانکی قسم کی اسلامی تحقیق بھی نہیں کہہ سکیں گے۔ بلکہ ہم اسے فقط ایسی مشرقی تحقیق کا نام دیں گے جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہو۔ اصلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایسی کتابوں پر جو اسلام کے علاوہ

اور موضوعات پر ہوں، مسلمانوں کی ساری تحقیق کو ہم مشرقی تحقیق ہی کا نام دے سکتے ہیں۔

ایک غلط نام

بدقسمتی سے اس دوسری قسم کی تحقیق کو بھی غلط طور پر اسلامی تحقیق کا نام دیا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی و فارسی کتابوں پر تحقیق ہے لیکن درحقیقت عہد قدیم کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کو اسلامی کتابیں کہنے کا جواز اتنا ہے جتنا اس بات کا جواز کہ ہم ایک مسلمان کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز کو اسلامی میز کہہ دیں اگر یہ کتابیں اسلامی کتابیں ہیں اور ان پر تحقیق اسلامی تحقیق ہے تو پھر اس زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھی ہیں، کیا وجہ ہے کہ ہم ان کو اسلامی کتابیں نہ کہیں اور ان پر تحقیق کو اسلامی تحقیق کا نام نہ دیں لیکن نہ ہم ان کتابوں کو اسلامی کتابیں کہتے ہیں اور نہ ان پر تحقیق کو اسلامی تحقیق کا نام دیتے ہیں تو پھر ہم کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ گزشتہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی اس قسم کی کتابوں کو اسلامی کہہ کر پکاریں۔

آسمانی یا خدائی علم کے برخلاف ذہنی علم غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ غیر واضح بھی ہو سکتا ہے اور واضح بھی منظم بھی ہو سکتا ہے اور غیر منظم بھی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ یہودی یا عیسائی یا اسلامی ہو۔ علم ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ وہ ایک ہی منبع سے صادر ہونے والا ایک ہی نور ہے جو کبھی ایک فرد پر اور کبھی دوسرے فرد پر، کبھی ایک قوم پر اور کبھی دوسری قوم پر اپنی خوشی سے چمکتا ہے۔ ذہنی علم مذہبوں اور قوموں سے بالا ہے۔ یہی وجہ ہے جو لوگ اس علم کی تحصیل یا تحقیق میں منہمک ہوتے ہیں، مذہب یا قومیت سے قطع نظر کر کے ایک دوسرے سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

مشرقی تحقیق کا ایک خاصّہ

چونکہ مشرقی تحقیق فقط ایک میکانیکی عمل ہوتا ہے اور اس کے پاس کوئی نئی چیز کسی کو دینے کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کا ایک خاصّہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت زور دیتی

ہے۔ مثلاً ایک مشرقی محقق اپنی پوری زندگی یہ ثابت کرنے پر صرف کر دے گا۔ کہ ایک مصنف یا اس کی کتابوں کا صحیح نام یہ ہے اور وہ نہیں۔ یا فلاں شخص جس مقام پر پیدا ہوا تھا۔ وہ فلاں گاؤں سے اتنے میں شمال کو تھا اور جنوب کو نہیں۔ یا جس تاریخ کو پیدا ہوا تھا وہ پانچ دن پہلے تھی اور پیچھے نہیں۔ اگرچہ وہ شخص خود ایک عالم کے طور پر کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور بالکل اس قابل ہو کہ فراموش کر دیا جائے لیکن وہ اس لیے اہم سمجھا جاتا ہے کہ کسی پرانی کتاب میں اس کا نام آگیا ہے۔

مسلمان مستشرق کا اصلی کام

اگر مشرقی تحقیق کا مقصد یہ ہوتا کہ مشرق کے گزشتہ علماء اور فضلاء کے علمی کارناموں کو اُجاگر کیا جائے اور اس میں شک نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مشرق علوم و فنون میں کرہ ارض کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ تھا) اور اس کا تعلق دورِ حاضر کی علمی ترقیوں کے ساتھ واضح کیا جائے تو پھر بھی یہ اسلامی تحقیق کا کام نہ ہوتا اگرچہ یہ عمومی طور پر علم کی بہت بڑی خدمت ہوتی۔ کیونکہ اس سے نوعِ انسانی کی علمی جدوجہد کے ماضی کو اس کے حال کے ساتھ جوڑ کر اس کے تسلسل کو آشکار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس وقت مشرقی تحقیق کا کام مغرب میں ان خطوط پر ہو رہا ہے اور نہ مشرق میں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے نہ صرف عہدِ قدیم کی علمی دنیا سے بلکہ عصرِ حاضر کی علمی دنیا سے بھی پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے لیکن یہ وہ اصلی کام ہے جو مستشرقین کو بالخصوص مسلمان مستشرقین کو انجام دینا چاہیے۔

آخر جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ہمارا مقصد علم کی جستجو ہونا چاہیے نہ کہ مشرقی علم کی جستجو علم نہ مشرقی ہو سکتا ہے، نہ مغربی۔ کم از کم ہمارے بزرگوں نے علم کی کوئی ایسی تقسیم نہ کی تھی اور نوعِ انسانی کے جن بیش بہا علمی کارناموں کا سہرا آج ان کے سر باندھا جا رہا ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ اگر درخشندہ علمی ستاروں کا وہ طویل و عریض جھمگھٹا جو مسلمان علماء اور فضلاء پر مشتمل تھا اور اب غائب ہو چکا ہے۔ یکایک پھر زندہ ہو جائے وہ بلا توقف اس بات کی کوشش کریں گے کہ مغرب کے سارے علوم کو سیکھ کر ان کے ماہرین جائیں۔ اگر مشرقی تحقیق سے مراد فی الواقع علم کی جستجو ہے تو یہ بات اس مدعا سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کہ ایسی تحقیق یا ایسے مطالعہ کے لیے

لفظ مشرقی کا اور مسلمان علماء کے لیے لفظ مستشرقین کا استعمال ترک کر دیا جائے۔ ان الفاظ کا استعمال ہم نے در حقیقت اہل مغرب کی کورانہ تقلید میں شروع کیا تھا جو مستقل طور پر مغرب میں رہتے ہیں اور اپنا ایک مستقل مشرق رکھتے ہیں۔ ہم مشرق میں بھی رہتے ہیں اور مغرب میں بھی تمام زبانیں ہماری ہیں۔ دنیا بھر میں مشکل سے کوئی ایسی زبان ہوگی جو کم از کم چند مسلمانوں کی مادری زبان نہ ہو۔ تمام صحیح علم جو مشرق یا مغرب میں آج تک پھیلا ہوا ہے، ہمارا ہے کیونکہ ہمارے خدا کی کائنات کا علم ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم "مشرقی تحقیق" کے نام کو "علوم قدیمہ و وسطی کی تحقیق" کے نام سے بدل دیں اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دے کر اس میں ان کتابوں پر تحقیق کو بھی شامل کرلیں جو قدیم زمانہ میں نہ صرف عربی، فارسی، سنسکرت، چینی اور ترکی ایسی زبانوں میں لکھی گئی تھیں جن کو مشرقی زبانیں کہا جاتا ہے۔ بلکہ لاطینی اور یونانی ایسی قدیم اور بائی زبانوں میں بھی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

میکانکی اسلامی تحقیق اور اصلی اسلامی تحقیق بعض اوقات ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہوجاتی ہیں

بعض وقت اصلی اسلامی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے اصلی تحقیق کی کسی پیداوار کے اندر مقدس کتابوں کے مشتملات کی ترتیب نو یا ترکیب جدید کی صورت میں میکانکی تحقیق کے کچھ عناصر شامل ہوجاتے ہیں یا میکانکی تحقیق پر ان مشتملات کی تشریح یا تفسیر کا بھی ایک رنگ چڑھ جاتا ہے۔ تاہم اسلامی تحقیق کی کسی پیداوار کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ اس میں اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر زیادہ موجود ہے۔ اگر اس میں درستی اور علم کے اعتبار سے بلند معیار رکھنے والی اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر زیادہ ہوگا تو اس کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوگی یہی سبب ہے کہ اقبال، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، غزالی، رومی اور محی الدین ابن عربی کی اسلامی تحقیق دوسرے سینکڑوں علماء متقدمین و متاخرین کی تحقیق سے بدرجہا زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر عالم دین نے اپنے زمانہ میں اسلام کی وہ جدید علمی اور عقلی تشریح بہم پہونچائی ہے جس کی اس کے زمانے میں لوگوں کو ضرورت تھی۔ اقبال نے اسلام کی جو تشریح کی ہے اس کی شدید ضرورت کا زمانہ ابھی موجود ہے۔

(باقی)

نئی مطبوعات

کتاب الزہد والرقائق :

تالیف شیخ الاسلام عبداللہ بن مبارک مروزی رحمۃ اللہ علیہ۔
تحقیق و تعلیق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی دامت فیوضہم۔
ناشر:- مجلس احیاء المعارف۔ مالیگاؤں ضلع ناسک۔ ۸۱۹ صفحات
سفید اعلیٰ کاغذ، ٹائپ کی طباعت۔ قیمت غیر مجلد ۳۰ روپیہ۔

تعلق باللہ، خوف و خشیت، فکر آخرت، تزکیۂ اخلاق اور احسان و اخلاص پیدا کرنے والے مضامین پر مشتمل خاص حدیثیں احادیثِ رقاق کہلاتی ہیں اور محدثین اپنی کتابوں میں ان کو اسی عنوان کے تحت درج کرتے ہیں۔ زُہد بھی انھیں احادیث کا ایک شعبہ ہے۔

بہت سے محدثین نے مستقل کتابوں اور رسالوں کی شکل میں بھی ایسی احادیث کو الگ جمع کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب دوسری صدی ہجری کے عظیم القدر امام حدیث حضرت عبداللہ بن مُبارک (۱۱۸ھ تا ۱۸۱ھ) کی اسی صنف میں ایک ضخیم تالیف ہے جو غیر مطبوع اور مختلف مخطوطوں میں منتشر تھی۔ مسلمانانِ ہند بالخصوص علماءِ ہند کے لیے فخر کا مقام ہے کہ ایک جلیل القدر امام کی اس کتاب کو جو امام ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں اپنی صنف کی تالیفات میں "اجلّہا" کا درجہ رکھتی ہے، ان مختلف مخطوطوں کی مدد سے مرتب کرنے کا شرف انھیں میں کی ایک شخصیت (مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی) کے حصہ

میں آیا۔

مولانا اعظمی مدظلہ اس سے پہلے امام بخاری کے اُستاد امام حُمیدی کی مُسند کے اوراق پارینہ کو اسی طرح ایڈٹ کر کے زندہ کر چکے ہیں۔ اور اہل نظر نے اس معاملہ میں ان کی خصوصی اہلیت کو بہت تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ مولانائے محترم نے اپنی زندگی اسلاف کے اُن تصنیفی کارناموں کو منظر عام پر لانے ہی کے لیے وقف کر رکھی ہے جن کے صرف نام کتابوں میں آتے ہیں مگر وہ خود کتابی شکل میں ہاتھ نہیں آتے۔ اسی سلسلہ کا ایک اہم کام "مصنف امام عبدالرزاق الصنعانی" کی ترتیب ہے جس میں مولانا برسوں سے منہمک ہیں۔ اسی علمی ذوق وجستجو کے ذیل میں موصوف کو زیر تبصرہ کتاب کے ایک عکسی نسخہ کا پتہ چلا جو ریاست قطر کے سابق حکمراں شیخ علی بن عبداللہ کے کتب خانہ میں موجود تھا، یہ عکسی نسخہ ولی الدین جاراللہ لائبریری استانبول کے مخطوطہ کا فوٹوگراف تھا۔ حکومت قطر نے اس عکسی نسخہ کی مزید ایک کاپی کرا کے ازراہ علم نوازی مولانا کو ہدیہ کر دی۔ مزید تلاش میں مولانا نے اس کتاب کے دو مخطوطوں کا اور فوٹوگراف حاصل کیا، ایک اسکندریہ پبلک لائبریری ہے، دوسرا کتب خانہ ظاہریہ دمشق ہے۔ اور ان تینوں کے مقابلہ سے یہ نایاب کتاب مرتب کر کے پیش کی ہے۔

کتاب کے اصل صفحات ۶۹۶ ہیں۔ باقی ۱۲۳ صفحات میں ایک بسیط مقدمہ، کتاب کے مضامین کی فہرست اور مختلف قسم کے انڈیکس ہیں۔ تینوں نسخوں کے ایک ایک صفحہ کا فوٹو بھی نمونہ کے طور پر کتاب میں شامل ہے۔ اور ان نمونے کے صفحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے یہ کام انجام پایا ہوگا۔

مقدمہ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں اولاً زہد کی اسلامی حقیقت اور اس کے اقسام و درجات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد زہد و رقاق کے موضوع پر مستقل کتب و رسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر زیر نظر کتاب کے مختلف نسخوں کے حصول کی تفصیلات اور ان کا تعارف ہے۔ ہر نسخہ کی سند کے سلسلے میں راویوں کے تراجم دیے گئے ہیں۔ اسکے بعد بہت تفصیل سے حضرت عبداللہ بن مبارک کا تذکرہ ہے۔ (جس کا تلخیصی ترجمہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے قلم سے الفرقان بابتہ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ میں شائع ہو چکا ہے)

کتاب کے مذکورہ تین نسخوں میں سے تیسرا نسخہ (ظاہریہ) دراصل پہلے نسخے ہی کا تکملہ یا اس کا گم شدہ حصہ ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر اصل کتاب قرار دیا گیا ہے اور یہ گیارہ ابواب اور ۱۶۲۷ روایتوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا نسخہ (اسکندریہ) ایک دوسرے سلسلۂ روایت سے مستقل نسخہ ہے۔ اور اس میں پہلے اور تیسرے نسخے کی مجموعی تعداد سے زیادہ ابواب اور زیادہ روایات ہیں۔ اس (دوسرے) نسخے کی جو روائتیں ایک سے گیارہ تک ابواب ہی کے ذیل کی تھیں ان میں سے اکثر کو مولانا نے اپنی تعلیقات میں لے لیا ہے۔ باقی کو زائد ابواب کے ساتھ اصل کتاب کے خاتمہ پر ۱۳۲ صفحات میں درج کیا ہے[۱]۔ اور ان صفحات میں مندرج روایتوں کی کل تعداد ۴۳۶ ہے۔ اس طرح کتاب الزہد والرقائق کی روایتوں کی مجموعی تعداد ۲۰۶۳ ہو جاتی ہے۔

کتاب کے حواشی میں محدثانہ تحقیقات و تعلیقات کے علاوہ شروع میں ایک ۲۰ صفحے کی فہرست اس تحقیق پر مشتمل ہے کہ کتاب کی کون کون سی روایات مرفوع ہیں، کونسی مرسل اور کون سی موقوف۔ تحقیقات و تعلیقات میں اگر کہیں کوئی تسامح یا کوتاہی رہ گئی ہے تو اس کی تلافی آخر میں ۱۶ صفحے کی استدراکی فہرست سے کی گئی ہے۔ اسی طرح طباعت کے بعد مولانا کو جو اغلاط نظر آئی ہیں اُن کی بھی ضروری حد تک تصحیح کے لیے ۸-۹ صفحات بڑھائے گئے ہیں۔

افسوس ہے کہ تبصرہ کا باب بند ہونے کی بنا پر ہم اس گرانقدر کتاب کا تعارف بڑی دیر میں کرا سکے اس کی اشاعت کے اہتمام پر ادارۂ احیاء المعارف مالیگاؤں قابلِ مبارک باد ہے۔ اور امید ہے کہ اہلِ علم میں اس علمی تحفہ کا کما حقہ استقبال کیا جائے گا۔
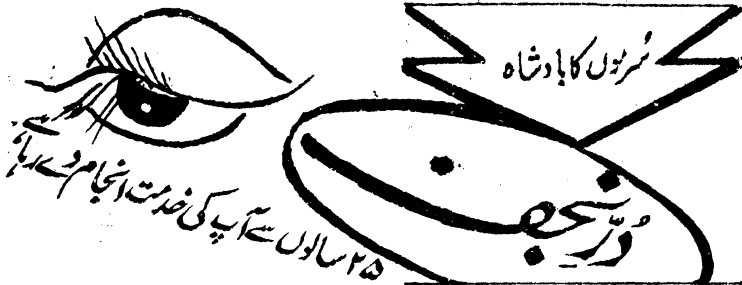
---

[۱] ہم نے شروع میں کتاب کے اصل صفحات ۶۹۶ لکھے ہیں ان میں یہ ۱۳۲ صفحات بھی شامل ہیں۔

سُرمیوں کا بادشاہ
سُرمۂ نجب
۲۵ سالوں سے آپ کی خدمت انجام دے رہا ہے
طب قدیم کا ایک نادر شاہکار
آنکھوں کی تمام بیماریوں اور کمزوریوں کو دور کرتا ہے
نگاہ کو گرنے اور تھکنے نہیں دیتا۔
رات کو استعمال کیجئے تو دن بھر اپنی آنکھوں میں تروتازگی اور نکھار محسوس کریں گے۔
اس کا استعمال آخر عمر تک بینائی کا تحفظ اور امراض کی مدافعت کرتا ہے۔
انتہائی خوبی یہ ہے کہ اپنے بیش بہا فوائد کے باوجود یہ آنکھوں میں لگتا اور کڑکتا نہیں ہے بلکہ سکون اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے
استعمال کے بعد جن بیشمار حضرات نے تعریفی تحریریں عنایت فرمائیں اُن میں سے چند نام:-
مولانا حسین احمد مدنی رح
مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
مولانا شبیر احمد عثمانی رح
مفتی عتیق الرحمان صاحب موجودہ ورکنگ صدر جمعیۃ العلماء ہند
مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند
حکیم کنہیا لال صاحب وید سہارنپور
ڈاکٹر ظفریار خاں صاحب سابق ملٹری سرجن
ایک تولہ 6/- روپیہ
۶ ماشہ 3½/- روپیہ
محصول پیکنگ 2/- روپیہ
کوئی سی بھی تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصول پیکنگ معاف

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL. 37 NO. 4 JULY 1969

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

تذکرۂ مجدّد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سالے (از ۱۰۰۱ھ تا ۲۰۰۰ھ) کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں عالم
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور ان سے پیدا ہونے والے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں
مجدّد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۳۵۲ ، سائز متوسط ، قیمت ۴/-
کتب خانۂ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندستان سے ۴/۰
پاکستان سے ۴/۰

جلد ۳۷ | بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ مطابق اگست ۱۹۶۹ء | شمارہ (۵)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ ستمبر تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

دارالعلوم دیوبند کا سانحہ:-

۱۴ر جولائی کو اتوار کا دن تھا، عصر و مغرب کے درمیان دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا ارجنٹ تار ملا ـــــ کہ

"اسٹرائک اور غیر معمولی حالات پر غور کرنے کے لیے عاملہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے فوراً آئیے"

اس تار کا تقاضا تھا کہ میں پہلی ٹرین سے روانہ ہو جاؤں اور اگلے ہی دن عاملہ کے جلسہ میں (جس کا میں بھی ایک ممبر ہوں) شرکت کروں ـــــ چونکہ دارالعلوم میں اسٹرائک یا کسی غیر معمولی بات کا کوئی علم نہیں تھا اس لیے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ ۲-۳ ہی گھنٹے کے بعد دوسرا تار ملا ـــــ کہ

"اسٹرائک اور سنگین حالات پر غور کرنے کے لیے ۱۷ر جولائی کو مجلس شوریٰ میں شرکت کیجیے"[۲]

میں نے سمجھ لیا کہ کوئی بہت ہی سنگین اور غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہے، اس کے لیے پہلے تو مہتمم صاحب نے دارالعلوم کی مجلس عاملہ بلانے کا فیصلہ کیا، بعد میں اس کو ناکافی سمجھ کر مجلس شوریٰ بلانا ضروری سمجھا جو دارالعلوم کے بارہ میں وہ بڑے سے بڑا فیصلہ کر سکتی ہے جس کو وہ دارالعلوم کی فلاح اور اس کے مقاصد کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھے۔

اگرچہ اہلیہ کی شدید علالت کی وجہ سے (جس کا ذکر دعا کی درخواست کے ضمن میں الفرقان کے

---

[۲] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

پچھلے ہی شمارہ میں کیا جا چکا ہے) میرے لیے سفر اس وقت آسان نہیں تھا، لیکن یکے بعد دیگرے جس طرح دو ارجنٹ تار ملے اس سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی صورت حال ہے اس لیے متوکلاً علی اللہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۶ر جولائی کی صبح روانہ ہو کر رات کو ۱۱ بجے دیوبند دار العلوم کے مہمان خانہ میں پہونچا۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا بلکہ دیکھا کہ اسٹرائک طلبہ نے تعلیمی مقاطعہ کے علاوہ پورے دار العلوم پر قبضہ کر رکھا ہے، اُس کے تمام دروازے اندر سے بند کر لیے ہیں، حتیٰ کہ مسجد کا وہ دروازہ بھی جو مہمان خانہ کے سامنے باہر سڑک کی جانب کھلتا ہے اندر سے بند ہے جس کی وجہ سے مسجد میں بھی نہیں جایا جا سکتا۔

۱۷ر سے ۲۰ر جولائی تک ۴ دن مسلسل مجلسِ شوریٰ کا اجلاس جاری رہا، حضرت مہتمم صاحب، نائب مہتمم صاحب، حضرات اساتذہ، دار الاقامہ کے نگراں حضرات اور بعض دیگر متعلقین دار العلوم کے بیانات سُنے اور تحریری رپورٹیں اور یادداشتیں پڑھیں جن میں اسٹرائک اور اس کے سلسلہ میں طلبہ کے افسوسناک بلکہ ناگفتہ بہ طرزِ عمل کا ذکر کیا گیا تھا اور جن سے اس تکلیف دہ واقعہ کے محرکات اور پسِ پردہ وجوہ واسباب پر بھی روشنی پڑتی تھی۔ اسٹرائک کی قیادت کرنے والے طلبہ سے بھی بہت تفصیل سے بات کی اور اُن کی سُنی، پہلے دن تقریباً دو گھنٹے ان کو دیئے۔

ان سب بیانات اور رپورٹوں سے جو صورتِ حال سامنے آئی اور جو تفصیلات معلوم ہوئیں اور جو کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ اس درجہ حیرت انگیز اور تکلیف دہ تھا کہ اپنی اس نوخیز برادری (دینی مدارس کے آج کل کے طلبہ) کی اسٹرائک جیسی حرکات ہی کی وجہ سے اُن سے سخت بدگمانی کے باوجود یہ عاجز تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہمارے یہ سرپھرے عزیز اس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) لہ الحمد للہ ادھر دو تین ہفتے سے اہلیہ کو افاقہ ہے اور حالت قابلِ اطمینان حد تک بہتر ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے میری درخواست پر ان کے لیے دُعا فرمائی۔"

مجلسِ شوریٰ نے اس سلسلہ میں جو بیان شائع کیا ہے اس کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں، ناظرین انہی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پانی کس حد تک پہونچ چکا تھا۔ بیان میں کہا گیا ہے

"دارالعلوم میں پورے اطمینان وسکون کے ساتھ تعلیم جاری تھی۔ طلبہ کو بلکہ دارالعلوم سے متعلق کسی عنصر کو بھی کوئی خاص شکایت ان دنوں میں یہاں کے انتظامی یا تعلیمی ذمہ داروں سے نہیں تھی کہ ۱۱ر جولائی سنہ ۱۹۶۹ء کو جبکہ جمعہ کا دن تھا اور اتفاق سے دارالعلوم کے انتظامی افسر اعلیٰ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور تعلیمی افسر اعلیٰ حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند دونوں دیوبند سے باہر تھے، طلبہ کے ایک شورش پسند عنصر نے اچانک ایک ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اپنے کسی مطالبہ کو دارالعلوم کے کسی ذمہ دار کے سامنے پیش کیے بغیر دارالعلوم کے احاطہ میں جلسہ بازی اور نعرہ بازی شروع کر دی اور اسٹرائک کا فیصلہ کر لیا اور پہلا قدم یہ اٹھایا کہ تمام درسگاہوں کی کنجیاں جو دفتر تعلیمات میں یکجا رہتی تھیں اچانک دفتر پر چھاپہ مار کر اپنے قبضہ میں لے لیں اور اعلان کر دیا کہ اب کسی استاد کو سبق پڑھانے کی اور کسی طالب علم کو پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اسی پر عمل کیا گیا۔"

"دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب اسی شب میں (یعنی جمعہ اور شنبہ کی درمیانی شب میں) تشریف لے آئے اور انھوں نے اسٹرائک کرانے والے طالب علموں کو بلایا، وہ لوگ اس وقت نہیں آئے، اگلے دن عصر بعد آئے، حضرت موصوف نے ان سے گفتگو فرمائی اور اسٹرائک وایجی ٹیشن بند کرنے کے لیے فرمایا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔

دارالعلوم کے انتظامی افسر اعلیٰ حضرت مہتمم صاحب ۱۲ر جولائی شنبہ کی صبح کو سفر سے واپس ہوئے تو انھیں قدرتی طور پر حیرت ہوئی کہ یہ کیسی اسٹرائک اور کیسا ایجی ٹیشن ہے جو کسی مطالبہ کے پیش کیے بغیر اس عجیب وغریب انداز میں چلایا جا رہا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ بس تخریب اور فساد ہی اصل مقصد ہے۔ اس کے باوجود حضرت مہتمم صاحب نے

ایک تحریری پیغام اُن طلبہ کے تین محترم اور بزرگ استادوں کے ذریعہ ان کے پاس ایسے وقت بھیجا جب ان کا جلسہ جاری تھا۔ اس پیغام کا حاصل یہ تھا کہ ہمیں ابھی تک یہی نہیں معلوم کہ آپ کا مطالبہ کیا ہے، اور آپ کیا چاہتے ہیں، جو مطالبہ ہو اس کو پیش کیجئے۔ ہم ہمدردی کے ساتھ غور کریں گے۔ جس وقت یہ بزرگ اساتذہ (جو ان طلبہ ہی کے نہیں بلکہ اُن کے بعض استادوں کے بھی استاد ہیں) جلسہ میں پہونچے تو ان طلبہ نے اپنے ان محترم استادوں کو اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ وہ حضرت مہتمم صاحب کے اس پیغام کو مائک پر خود پڑھ کر سُنادیں اور اس سلسلہ میں اپنی طرف سے بھی کوئی ناصحانہ بات کہنا چاہیں تو کہہ سکیں۔ انتہا یہ کہ ان حضرات کو مائک تک پہونچنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ اور حضرت مہتمم صاحب کا پیغام ایک حریف کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مائک پر پڑھ کر سُنایا اور اس کے ایک ایک جملہ پر نہایت حقارت انداز میں تنقید و تردید کی اور ان اساتذہ کو "واپس جاؤ" کے نعروں کے ساتھ رخصت کیا اور حضرت مہتمم صاحب کو جواب دیا کہ آپ سے ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے آپ فوراً ہنگامی مجلس شوریٰ منگل تک (یعنی تین دن کے اندر اندر) بلائیے ہم اپنے مطالبات مجلس ہی کے سامنے رکھیں گے۔ آپ سے بس ہمارا یہی مطالبہ ہے۔"

آگے مجلس شوریٰ کے بیان میں کہا گیا ہے۔

ان کے (اسٹرائکی طلبہ کے) متمردانہ رویہ سے قطع نظر بجائے خود ان کا یہ مطالبہ کہ فوراً مجلس بلائی جائے ہرگز لائق تسلیم نہیں تھا۔ لیکن حضرت مہتمم صاحب نے اپنی فطری نرم دلی کے تحت ان کے اس مطالبہ کو مان لیا اور جلسہ شوریٰ کی تاریخ ۱۲ر جولائی مقرر کر کے اراکین مجلس شوریٰ کو ارجنٹ ٹیلی گرام ۱۲ر جولائی ہی کو جبکہ اتوار کا دن تھا روانہ کر دیے۔ لیکن ان شورش پسند طلبہ نے اس پر بھی اسٹرائک ختم نہیں کی، بلکہ اسی دن دوسرا حیرت انگیز قدم یہ اُٹھایا کہ رات کو احاطۂ دارالعلوم کے تمام دروازے حتیٰ کہ مسجد کے دروازے بھی اندر سے بند کر لیے اور ان میں تالے ڈال کر پہرے بٹھا دیے اور پورے دارالعلوم پر بالکل اس طرح اپنا قبضہ کر لیا جس طرح فوجی انقلاب میں فوج دارالحکومت پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اپنے اساتذہ تک کو

دارالعلوم کی حدود میں داخل ہونے کی ممانعت کردی گئی۔ اگر کسی کو استثنائی اجازت دیجاتی تو وہ ان کے پہرے میں جا سکتا۔ تمام طلبہ کے لیے حکم جاری کردیا گیا کہ کوئی طالب علم اپنے کسی اُستاد سے بات نہ کرے۔ اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ مزید برآں طالب علموں کو پابند کیا گیا کہ وہ باہر نہ نکلیں اور جو جائے وہ اجازت سے پاس لے کر جائے۔ اور یہ پاس بھی منٹوں کی تحدید کے ساتھ جاری کیے جاتے۔ پھر جن سعادتمند طلبہ نے استادوں سے رابطہ رکھا یا جن کے بارے میں اس کا شک و شبہ بھی ہوگیا ان کو قید کیا گیا۔ ایذائیں دی گئیں۔

ایک رات کو بعض اساتذہ کو پتہ چلا کہ فلاں جگہ کچھ طالب علموں کو قید کیا گیا ہے، رات کو ایک بجے کے بعد چند اساتذہ وہاں گئے۔ دارالعلوم کے احاطہ کے اندر داخل ہو کر اُن بیچاروں کو نکال لانا اُن کے لیے ممکن نہ ہوا، دو طالب علم ایک تنگ و تاریک کمرے میں قید کیے گئے تھے، اس کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی جانب تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، یہ حضرات کسی طرح اُن سلاخوں کو موڑ لینے میں کامیاب ہوگئے اور اُن دو طالب علموں کو نکال لائے۔ ایک تیسرا طالب علم اُس کے قریب کے ایک ایسے ہی کمرے میں قید تھا اس کو بھی نکال لینے کی کوشش کی لیکن سلاخیں نہیں موڑی جا سکیں اس لیے اُس کو نکالا نہیں جا سکا۔ وہ بیچارہ سخت پیاسا تھا۔ ان اساتذہ نے اُنکو کھڑکی کی سلاخوں سے لوٹے کے ذریعہ اس طرح پانی پلایا جس طرح پنجرے میں پیاسے جانور کو باہر سے پانی ڈالا جاتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ عجیب حیرت انگیز اور بعض پہلوؤں سے ناقابلِ فہم صورت حال تھی۔"

یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے، جن دو مقید طالب علموں کو کھڑکی کی لوہے کی سلاخیں موڑ کر رات میں نکالا گیا تھا وہ ضلع مظفر نگر کے دیہات کے تھے، رہائی پاکر وہ بیچارے اپنے گھروں کو چلے گئے اور وہاں جاکر انھوں نے وہ سب کچھ بیان کیا جو دارالعلوم میں ہو رہا تھا۔ اور جو ان پہ گزرا تھا۔ قدرتی طور پر وہاں کے عوام میں سخت برہمی اور بیزاری پیدا ہوئی، مظفر نگر کے ایک عالم دین جو دارالعلوم ہی کے فاضل ہیں اور ذاتی طور پر دنیوی لحاظ سے

بھی صاحب وجاہت اور باوقار ہیں اور خود ایک مدرسہ کے مہتمم ہیں، اور واقفین نے بتایا کہ پورے علاقہ میں ان کا اثر ہے اور ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کے لیے علاقہ کے دیہات تک میں خود جاکر چندہ کرایا کرتے ہیں، انھوں نے خود مظفر نگر سے آکر مجلس شوریٰ کے ارکان کے سامنے بیان کیا کہ دیہات کے لوگ میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ دارالعلوم کے انہی طالبعلموں کے لیے ہم سے غلہ اور چندہ دلوایا کرتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کے بیان میں آگے کہا گیا ہے ____ کہ

"مجلس شوریٰ کے باہر سے آنے والے اراکین، ۸ر جولائی کی صبح سے پہلے پہونچ گئے۔ انھوں نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تمام اساتذہ اور دارالعلوم کا انتظامی عملہ، دارالعلوم سے باہر اور بے دخل ہے، دارالعلوم کے دروازے اندر سے بند ہیں، اور شورش پسند طلبہ نے گویا فوجی طرز کی اپنی حکومت اندر قائم کر رکھی ہے، اور عام طلبہ سے کوئی بات کرنا اساتذہ اور ذمہ داران انتظام اور مجلس شوریٰ کے اراکین کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ سخت پریشانی کی بات یہ تھی کہ دارالعلوم کا خزانہ اور لاکھوں کا کتب خانہ اور دوسری قیمتی املاک دارالعلوم کے احاطہ کے اندر تھیں۔

مجلس شوریٰ نے ۸ر جولائی کو اپنا کام شروع کیا، صورت حال اور اس کے اسباب و علل ممکن حد تک سمجھنے کی کوشش کی۔ دارالعلوم کے تمام متعلقہ عناصر سے الگ الگ باتیں کیں اور تحقیق حال کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے، ایجی ٹیشن کی قیادت کرنے والے طلبہ سے بھی کئی کئی گھنٹے تفصیلی گفتگوئیں کیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجلس کے اراکین نے اپنے مقام سے بہت نیچے اتر کر ان لوگوں سے بات کی لیکن اس کے آثار بھی محسوس نہ ہوئے کہ یہ راہ راست پر آنے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔"

ان طلبہ نے مجلس شوریٰ کے دوسرے دن (۱۰ر جولائی) سہ پہر کو ایک تحریر اپنے مطالبات کے بارہ میں بھی پیش کی جن میں سے بعض اگرچہ کسی طرح بھی قابل قبول بلکہ قابل غور بھی نہیں تھے مگر بعض ایسے بھی تھے جن پر غور کیا جا سکتا تھا اور کلی یا جزئی طور پر ان کو منظور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مجلس شوریٰ ہر پہلو پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ جو مطالبات اسٹرائک کے دباؤ اور ایسے اخلاق سوز

جارحانہ مظاہروں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو دینی تعلیم و تربیت کے لیے سم قاتل اور اس بنیادی مقصد کے لیے تباہ کن ہیں جس کے لیے دار العلوم قائم ہے، ان پر اس وقت قطعاً غور نہ کیا جائے، بلکہ پہلے دار العلوم اور اس کی املاک کو ان شوریدہ سروں کے قبضہ سے نکالا جائے جن سے کوئی حرکت بھی غیر متوقع نہیں ہے۔ اور ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے ہمیشہ کے لیے سب پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کے جارحانہ اور اسلامی تعلیم و احکام کے یکسر خلاف مظاہروں اور ان کے کرنے والوں کے لیے دار العلوم میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اور مجلس شوریٰ جو دار العلوم کی امین اور متولی ہے اس قسم کے فتنوں سے دار العلوم کی حفاظت کے لیے ہر وہ قدم اٹھائے گی جو اس مقصد کے لیے ضروری اور مناسب سمجھے گی۔

اس سلسلہ میں مختلف تجاویز سامنے آئیں آخر میں تمام اراکین اس پر متفق ہو گئے کہ موجودہ حالات میں یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ دار العلوم کو فی الحال عارضی طور پر بند کر دینے کا اعلان کر دیا جائے اور اس کے بعد دار العلوم کو طلبہ سے خالی کرا لیا جائے اور نقض امن اور املاک دار العلوم کی بربادی کے خطرہ کے پیش نظر حکومت اور پولیس کا تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مجلس نے یہی فیصلہ کیا اور ذمہ داران حکومت کو بھی اس کے بارے میں لکھ دیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۷ جولائی کو ایس، ڈی، ایم دیوبند کا ۱۶ جولائی کا مجریہ ایک نوٹس بھی حضرت مہتمم صاحب دار العلوم کو مل چکا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دار العلوم میں کوئی ایجی ٹیشن جاری ہے اور سنگین واقعات کا خطرہ ہے، اور آپ حکومتی انتظام سے مدد لینا نہیں چاہتے اس لیے آپ نوٹ کر لیں کہ اگر کوئی غیر معمولی اور پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی تو اس کی ذمہ داری آپ ہی پر ہو گی۔"

مجلس شوریٰ نے اپنے غور و فکر کے وقت اس نوٹس کو بھی سامنے رکھا تھا۔۔۔ اس کے علاوہ ارکان مجلس کے سامنے قریباً دس سال پہلے کا وہ واقعہ بھی تھا جب دار العلوم میں اسی طرح کی اور اسی پیمانہ کی ایک اسٹرائک کچھ شورش پسند طلبہ نے کرائی تھی، اس میں بھی نہایت افسوسناک اور تکلیف دہ حرکتیں ان کی طرف سے سامنے آئی تھیں جو دار العلوم اور اس سے نسبت رکھنے والی جماعت کے لیے باعث رسوائی تھیں (اگرچہ حالیہ اسٹرائک میں جو حرکتیں کی گئیں ان کے مقابلہ میں

وہ کم تر تھیں)　　اس وقت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے اور مجلس کے مؤثر رکن اور گویا رہنما تھے، مجلس نے پہلے صرف اُن چند طلبہ کے اخراج کا فیصلہ کیا جو اس کے نزدیک اس شورش کے اصل بانی اور سرغنہ تھے۔ لیکن جب اس فیصلہ کی تعمیل کی کوشش کی گئی تو ان سے کہا گیا کہ وہ دارالعلوم کی کتابیں واپس کردیں اور دارالاقامہ سے چلے جائیں تو وہ باقاعدہ جنگ پر آمادہ ہو گئے اور کتب خانہ کو آگ لگا دینے کی دھمکی مجلس کے علم میں آئی، جس کے بعد مجلس نے یہ ناگزیر سمجھا کہ اب دارالعلوم کو غیر معینہ عرصہ کے لیے بند کر دیا جائے اور ان شورش پسند طلبہ سے اس کو خالی کرانے اور کتب خانہ وغیرہ کی حفاظت کے لیے ذمہ داران حکومت سے بات کرکے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

لیکن چونکہ یہ بہت ہی غیر معمولی قسم کا اقدام تھا اس لیے طے کیا گیا کہ ارکان مجلس میں سے کوئی سہارنپور جائے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہم سے (جو جماعت دیوبند کے سب سے بڑے روحانی بزرگ تھے اور ہیں[1]) صورتِ حال اور مجلس کی رائے عرض کرکے استصواب کرلیا جائے۔ اگر ممدوح بھی اس سے اتفاق فرمالیں تو پھر دیں اس بارے میں ضلع مجسٹریٹ سے بات کرلی جائے۔

حضرت شیخ الحدیث سے استصواب کے لیے راقم سطور (محمد منظور نعمانی) کو نامزد کیا گیا اور ضلع مجسٹریٹ (کلکٹر) سے بات کرنے کے لیے مولانا محمد عثمان صاحب کو ساتھ کیا گیا ــــ ہم دونوں دارالعلوم کی جیپ گاڑی سے سہارنپور پہونچے، پہلے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال تفصیل سے عرض کی اور بتایا کہ مجلس نے مجبور ہوکر اب یہ سوچا ہے لیکن حضرت سے استصواب ضروری سمجھا ہے ــــ حضرت شیخ نے آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ جب حالات یہاں تک پہونچ چکے ہیں تو اس کے سوا چارۂ کار کیا ہے ــــ بہرحال حضرت نے مجلس کی رائے سے اتفاق فرمایا ــــ اس کے بعد ہم دونوں کو ضلع مجسٹریٹ سے ملنا تھا، اس کے لیے مولانا محمد عثمان صاحب مجھے لے کر پہلے اس وقت کے ایک بااثر کانگریسی لیڈر کے ہاں گئے جو ان کے دوست تھے (غالباً وہ ایم ایل اے بھی تھے اور جہاں تک یاد آتا ہے ان کا نام ماسٹر تبلورام تھا) مقصد یہ تھا کہ انھیں ساتھ لے کر کلکٹر سے ملیں، وہ

---

[1] اکثر ناظرین الفرقان کو معلوم ہوگا کہ حضرت شیخ الحدیث چند مہینے قیام کی نیت سے مدینۂ طیبہ تشریف لے گئے ہیں، تین مہینے ہوچکے ہیں امید ہو کہ انشاء اللہ شعبان تک واپی ہوگی۔ متع اللہ المسلمین بطول بقائہم۔

کچھ مصروف تھے اس لیے ہمیں ان کے ہاں دیر ہوگئی، اتنے میں دہیں حضرت شیخ الحدیث کا پیغام پہونچا کہ ابھی ابھی دیوبند سے مولانا حفظ الرحمان صاحب کا ٹیلیفون آیا ہے کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد طلبہ کے رویہ میں تبدیلی ہوگئی ہے اور ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ شاید اس آخری اقدام کی ضرورت نہ پڑے، اس لیے اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے گفتگو نہ کی ہو تو ابھی نہ کی جائے اور جلدی دیوبند واپسی کی کوشش کی جائے تاکہ تازہ صورت حال پر مشورہ ہو سکے، چنانچہ ہم لوگ واپس آگئے اور دارالعلوم بند کرنے اور اس سلسلہ میں حکومت سے تعاون لینے کی جو بات مجبوراً سوچی گئی تھی، الحمدللہ اس وقت اس کی نوبت نہیں آئی۔

بہرحال حالیہ اسٹرائک اور اس سلسلہ کے سنگین واقعات پر غور کرتے وقت مجلس کے سامنے دس سال پہلے کا یہ واقعہ بھی تھا، اور ان سب چیزوں کی روشنی میں سوچ سمجھ کر تین دن کے غور و فکر کے بعد مندرجہ بالا فیصلہ کیا گیا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا ـــــ اور ۱۹ر جولائی کو مغرب سے پہلے دارالعلوم طلبہ سے خالی کرا لیا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ اعلان لاؤڈ اسپیکر سے حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے کر دیا گیا کہ جو طالب علم آئندہ سے اپنا رویہ درست رکھنے کا فیصلہ کریں وہ مہمان خانہ میں آ کر ذمہ داران انتظام سے یا اپنے اساتذہ سے رابطہ قائم کریں اُن کو تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں گی، چنانچہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد نے ایسا ہی کیا۔ ان سب کے لیے کھانے وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا اور جو اپنے وطن جانا چاہتے تھے اُن کے لیے کنسیشن فارم بھی جاری کیے گئے، جنھوں نے کرایہ کے لیے روپیہ طلب کیا ان کو دارالعلوم سے قرض روپیہ دیا گیا۔ یہ سب مجلس شوریٰ کے فیصلہ سے ہوا۔

۳۵ طلبہ کا اخراج :-

یوں تو بظاہر طلبہ کی بہت بڑی تعداد اُن اسٹرائکی طلبہ کے ساتھ تھی اور وہ طلبہ بہت کم تھے جو علانیہ طور پر اس سے الگ تھے اور جنھوں نے کھلے طور پر اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا ـــــ لیکن ارکان مجلس شوریٰ کو اپنی درایت اور اپنے تجربوں کی بنا پر یقین تھا کہ اس شورش اور ہنگامہ کے اصل بانی اور ذمہ دار تھوڑے ہی ہوں گے، بہت سے سادہ دل اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ان کے جھوٹے پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر ان کا ساتھ دے رہے ہوں گے۔ بہت سے الگ ہوں گے مگر خاموش ہوں گے ـــــ اس طرح کی شورشوں میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ اصل بانیِ فساد ایک چھوٹی سی ٹولی ہوتی ہو۔

مگر وہ اپنی تنظیم اور جھوٹے پروپیگنڈے اور مفسدانہ ہتھکنڈوں اور چالبازیوں سے تھوڑے وقت کے لیے بہت سوں کو اپنے ساتھ لے لیتی ہے اور جو سلیم الطبع اور صلاح پسند اُن سے الگ رہتے ہیں چونکہ وہ منظم نہیں ہوتے، ان کا کوئی پلیٹ فارم نہیں ہوتا اور ان میں سے ہر ایک شر و فساد سے بچنا چاہتا ہے، اس لیے تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ دبے ہوئے اور نا محسوس رہتے ہیں۔ فرقہ دارانہ فسادات میں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں آئے دن ہونے والے اس طرح کے تخریبی ہنگاموں میں عموماً یہی ہوتا ہے۔ (چنانچہ ۱۹ر جولائی کو جب یہ ہنگامہ ختم ہوا اور عام طلبہ باہر آئے تو ان کے بیانات سے اس کی پوری پوری تصدیق ہوئی)

بہر حال مجلس شوریٰ کو یقین تھا کہ اس اسٹرائک اور جارحانہ شورش کے اصل بانی اور ذمہ دار چند ہی ہوں گے ـــــ طلبہ کی ایک بڑی تعداد کی تحریریں بھی حضرت مہتمم صاحب اور حضرات اساتذہ کے پاس مختلف ذریعوں سے ۱۹ر جولائی تک آچکی تھیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہم اس سے بَری اور بیزار ہیں۔ لیکن شرارت پسند طلبہ نے فضا ایسی بنا دی ہے کہ ہم اس وقت ان کی مخالفت نہیں کر سکتے، بہت سوں نے جان کے خطرہ تک کی بات لکھی تھی۔ (یہ تحریریں سیکڑوں کی تعداد میں دارالعلوم میں محفوظ ہیں)

الغرض مجلس شوریٰ نے ان سب حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے کیا کہ جن طالب علموں کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ وہ اس ایجی ٹیشن اور شورش کے اصل بانی اور ذمہ دار ہیں ان کو دارالعلوم سے خارج کر دیا جائے ـــــ اس کی تحقیق کے لیے جو ذرائع ہو سکتے تھے ان کو کام میں لا کر کئی سو اسٹرائکی طلبہ میں سے صرف ۲۵ کو مجلس شوریٰ نے اصل بانی اور ذمہ دار سمجھا اور دارالعلوم سے ان کے اخراج کا فیصلہ کیا ـــــ اس فیصلہ کے وقت مجلس کے سامنے مندرجہ ذیل حقائق بھی تھے۔

(الف) عام دینی مدارس اور خاص کر دارالعلوم دیوبند کی نوعیت یہ ہے کہ اس کا اصل موضوع و مقصد کوئی ڈگری دینا نہیں بلکہ طالبین کی دینی تعلیم و تربیت ہے، یہاں طالب علموں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ اُن کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے کے کپڑوں اور جوتوں تک کا انتظام مدرسہ کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ بعض ضروری اخراجات کے لیے نقد وظیفہ اس کے علاوہ دیا جاتا ہے، سیکڑوں روپے کی کتابیں ایک ایک طالب علم کو پڑھنے کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ کسی حکومت کے خزانے سے نہیں صرف اُن دیندار مسلمانوں کے چندہ سے ہوتا ہے جو وہ اللہ کی رضا اور اجر

آخرت کی امید میں اپنی کمائی میں سے دیتے ہیں۔ وہ قدرتی طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کا روپیہ ایسے طالب علموں کی تعلیم و تربیت، اور اُن کے کھانے پینے پر صرف ہوگا جو عالم دین اور حامل دین ہو کر نکلیں گے۔ وہ ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ اُن کا پیسہ ایسے لوگوں پر صرف ہو جو کارخانوں اور ملوں کے شورش پسند ہڑتالی مزدوروں کی نقالی دارالعلوم میں کریں، چھاپہ مار کر تمام درسگاہوں کی تالیوں پر قبضہ کرلیں، جو طالب علم پڑھنا چاہیں اُن کو حدیث و تفسیر وغیرہ کے اسباق پڑھنے سے بھی بجبر روکیں اور حدیث کا سبق پڑھنے والے طالب علموں کو گھسیٹ گھسیٹ کر اٹھائیں اور اپنے بزرگ استادوں کو سبق نہ پڑھانے دیں اور اُن کے ساتھ گستاخانہ طریقوں سے پیش آئیں۔

مجلس شوریٰ شرعی اور دستوری طور پر انھیں چندہ دہندگان کی وکیل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جن لوگوں کے متعلق اس کو تحقیق سے یہ معلوم ہو کہ انھوں نے اتنے بُرے کردار کا مظاہرہ کیا ہے اور اُن کی حیثیت قائدانہ اور ذمہ دارانہ رہی ہے ان کو دارالعلوم میں رہنے کی اجازت نہ دے۔

(ب) اس شورش اور ہنگامہ کے صف اول کے لیڈروں میں کئی ایک کے متعلق مجلس شوریٰ کے علم میں آیا کہ اس سے پہلے وہ بعض دوسرے دینی مدارس میں بھی ایسی مفسدانہ حرکتیں کر چکے ہیں جن کی بنا پر وہاں سے ان کا اخراج ہوا تھا اور انھوں نے اس کو چھپا کر اور بعض نے اپنا نام بدل کر دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ ان میں سے دو کے بارہ میں (جن میں ایک اس شورش کی ایکشن کمیٹی کے صدر صاحب بھی ہیں) بتایا گیا تھا کہ وہ مظاہر علوم سہارن پور کے مخرجین میں سے ہیں۔ پھر مظاہر علوم کے بعض اساتذہ سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی ــــ بہرحال مجلس شوریٰ نے ان طلبہ کے بارہ میں غور کرتے وقت ان کی اس خصوصیت کو بھی سامنے رکھا۔

(ج) قریب قریب تمام اساتذہ نے مجلس شوریٰ کو ایک تحریر مشترکہ طور پر پیش کی تھی جس میں اسٹرائک اور شورش کے سلسلہ میں طلبہ کی حرکات اور اساتذہ کے ساتھ گستاخانہ رویہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ دینی تعلیم و تربیت کے لیے استاذ اور طالب علموں میں جو تعلق ہونا چاہیے وہ ان طلبہ کے ساتھ اب باقی نہیں رہا ہے اس لیے ہم آئندہ ان کو پڑھانے سے معذور ہیں ــــ بعض اساتذہ نے گفتگو میں صفائی سے کہہ دیا کہ اگر ان طلبہ کے پڑھانے کے لیے ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم استعفا دے دیں گے ــــ مجلس شوریٰ کے نزدیک اساتذہ کا یہ موقف بالکل صحیح اور دارالعلوم

اور تھوسی تعلیم کی عظمت و وقار کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

بہر حال مجلس شوریٰ نے ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر اُن طالب علموں کا اخراج ضروری سمجھا جن کے متعلق اُسے تحقیق ہوا کہ اس شورش اور ہنگامہ میں ان کا کردار قائدانہ رہا اور یہ اس کے اصل ذمہ دار ہیں ـــــ اگر مجلس یہ نہ کرتی تو اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہتی

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق دارالعلوم کے طلبہ کی حالیہ شورش اور اسکے بارہ میں مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور اقدامات سے تھا۔ راقم سطور نے آج کی صحبت میں اس سوال سے بالکل تعرض نہیں کیا کہ دارالعلوم جیسی خالص دینی درسگاہوں میں جن کی دینی اور روحانی فضاؤں میں اس قسم کے ہنگاموں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں ایسے ہنگامے برپا ہونے لگے ہیں۔ ـــــ میں اس موضوع پر الفرقان کے انہی صفحات میں کئی بار اب سے پہلے بہت تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور پوری صراحت کے ساتھ ان درسگاہوں کی اُن داخلی کمزوریوں کی نشاندہی کرچکا ہوں جن کی وجہ سے ان میں بھی اس قسم کے فتنوں کا اُٹھنا ممکن ہوگیا ہے۔ راقم سطور کو اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ جب تک اپنی ان کمزوریوں کی اصلاح نہیں کی جائے گی شیطان کو اس قسم کے تخریبی فتنے برپا کرنے کا موقع ملتا ہی رہے گا، اس لیے اس کا مستقل علاج خود اپنا احتساب اور اپنی کمزوریوں کا ازالہ ہے۔ واللہ الموفق۔

حضرت مولانا عبد الغفور نقشبندی مہاجر مدنیؒ :-

[حضرت مولانا عبد الغفور صاحب نقشبندیؒ نے گزشتہ مئی میں مدینہ منورہ ہی میں وصال فرمایا، اتفاق سے رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی بھی ان دنوں مدینہ طیبہ ہی میں تھے، موصوف سے میں نے درخواست کی تھی کہ حضرتؒ کی وفات پر ایک نوٹ الفرقان کے لیے لکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا نے درج ذیل مختصر مضمون سپرد قلم فرما دیا ————]

یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً اسلام کا مبدأ ومعاد، ہر مسلمان کا ملجا اور ماویٰ اور ہر دینی و دُنیاوی نعمت کا مخزن ہے۔ یجبیٰ الیہ ثمرات کل شئی، اس لیے کسی دور میں وہ باکمال شخصیتوں، اہلِ قلوب اور اصحابِ دعوت وارشاد سے خالی نہیں رہے۔

ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اہلِ قلوب اور مشائخ کبار نے زندگی کا بیشتر حصہ دیارِ عجم میں صرف کیا پھر اسی بلد امین یا جوارِ رسولؐ میں آکر پناہ لی اور اپنی زندگی کے آخری دن یہیں بسر کیے۔ دورِ قدیم میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ، شاہ صبغت اللہ بھڑوچیؒ، سید آدم بنوریؒ، اور اس صدی کی ابتدا میں حضرت شاہ عبد الغنی مجددیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا عبد الحق الہ آبادی شیخ الدلائل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنے ان دو مشہور شعروں میں ان سب حضرات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے:

دریں پیری رہِ یثرب گرفتم	غزل خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام	کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ایسی متعدد شخصیتوں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے کسی اشارۂ غیبی یا تقاضائے قلبی سے حرمین شریفین ہی کو اپنی خدمت و دعوت کا مرکز بنایا اور انھوں نے وہاں بیٹھ کر عالمِ اسلام کے دور دراز گوشوں سے آنے والوں کی روحانی و باطنی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیا۔ اور اس طرح ان کا فیض دور دور پہونچا۔ انھی خوش قسمت اور عالی ہمت افراد میں حضرت مولانا عبد الغفور عباسی مجددی مدنی بھی تھے جنھوں نے گزشتہ ربیع الاول کے

اوائل میں اس جہانِ فانی سے کوچ فرمایا اور بقیع کی خاکِ پاک کو اپنا آخری مسکن بنایا۔
مولاناؒ علاقۂ سوات کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم صوبۂ سرحد سے حاصل کر کے دہلی آئے۔ مدرسۂ امینیہ میں تکمیل کی، پھر وہیں سالہا سال تدریس کے فرائض انجام دیے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کے تلمذ پر مولانا کو فخر تھا۔ مولانا کو زمانۂ طالب علمی ہی میں کمالاتِ باطنی اور تزکیہ و تربیت کا ذوق تھا۔ اس سلسلے میں آپ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت فضل علی شاہ صاحبؒ قریشی سے بیعت ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ اپنی فطری استعداد اور مناسبتِ خداداد سے بہت جلد ایسا امتیاز پیدا کر لیا کہ ان کی اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ پھر بعض اشارات و مبشرات کی بنا پر مدینۂ طیبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں آستانۂ رسالت پناہی پر پڑ کر خلق اللہ کی خدمت اور نفوس و قلوب کی اصلاح و تربیت میں مصروف ہو گئے۔ اس عالمگیر انقلاب کی بنا پر جو سارے عالمِ اسلام پر محیط ہو اور حجازِ مقدس کے مخصوص حالات کی بنا پر خاص طور پر اصلاحِ باطن اور تعلق مع اللہ کی دعوت دینے والوں سے یہاں کی فضا روز بروز نامانوس ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ سلاسل و طرق کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو بہت سی مشکلات اور بدگمانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔
مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے اس شک و شبہ کی فضا میں اپنا کام شروع کیا اور بہت جلد ان کی ذات اور ان کی قیام گاہ طالبینِ اصلاح کا مرکز بن گئی، اور رفتہ رفتہ یہ فیض ہندوستان و پاکستان کے حجاج و زائرین سے تجاوز کر کے مصر و شام و ترکی و ترکستان تک عام ہو گیا۔ لوگ حج کے زمانے میں اور اس کے بعد آپ کے حلقے میں شریک ہوتے تھے اور اجازت سے مشرف ہو کر ان ملکوں میں خلقِ خدا کی خدمت اور طریقے کی اشاعت میں مصروف ہیں۔
آخری دور میں آپ اکثر پاکستان تشریف لے جاتے۔ آپ کی مقبولیت اور مدینۂ طیبہ کی نسبت کی وجہ سے آپ کی ذات کی طرف رجوعِ عام شروع ہوا اور کثرت سے لوگ آپ کی ذات سے مستفید ہوئے۔

آخری اسفار میں تو یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز نہیں سنی جا سکتی تھی۔ معتقدین اور ارادتمندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ تھا۔ آپ اصلاح باطن کے ساتھ اصلاح ظاہر کی طرف شدت سے متوجہ تھے۔ غیر شرعی وضع کی اصلاح اور نصاریٰ و فرنگیوں کے شعائر کے ازالے پر بہت زور دیتے تھے۔

راقم السطور سے خود فرماتے تھے کہ نکٹائیاں اس کثرت سے اتاری جاتیں کہ ٹوکرے بھر بھر کر پھینکنے کی نوبت آتی۔ صدہا نوجوان اور تعلیم یافتہ حضرات نے اس غیر شرعی وضع اور فرنگیوں کی تقلید سے توبہ کی، داڑھیاں رکھیں اور نماز روزے کے پابند ہوئے۔

راقم سطور اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان) پر شروع سے مولانا کی عنایت اور نظر شفقت رہی۔ راقم سطور کو ۱۹۴۶ء میں پہلی حاضری کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ دن اور آخری دن مولانا کی شفقت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ جب کبھی مدینۂ طیبہ کی حاضری کے موقع پر حاضری میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو شکایت فرماتے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کرتے۔ غائبانہ بھی شفقت فرماتے رہتے تھے۔

مولانا النعمانی کی تصنیف معارف الحدیث کے سلسلے سے مولانا کو بڑی مسرت تھی کئی بار اس سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں اس کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کرتا ہوں۔ تبلیغی جماعت کے افراد کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اس کام کو بہت سراہتے تھے۔ تبلیغی جماعت کے اکابر بھی مولانا سے رابطہ رکھتے تھے اور اہتمام سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

اس مرتبہ اپریل کی آخری تاریخوں میں مدینۂ طیبہ حاضری ہوئی تو حسب عادت مولانا کی خدمت میں حاضری دی۔ معلوم ہوا کہ وہ ہی چار روز پہلے پاکستان سے سخت علیل ہو کر تشریف لائے ہیں۔ حاضر ہوئے تو خود ہی فرمایا کہ سخت علیل ہوں کوئی غذا یا دوا اندر نہیں جا رہی ہے۔ صرف گلوکوز کے انجکشن سے طاقت قائم ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا لیکن عمر و نقاہت کے پیش نظر ان کو کامیابی میں تردد تھا۔ اس لیے مدینۂ طیبہ حاضر ہو گیا کہ اگر موت مقدر ہے تو پھر یہیں کہیں نصیب ہو، اس کے بعد حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی معیت میں حاضری

(باقی صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ ہو)

درسِ قرآن (مرکز والی مسجد، لکھنؤ)

۲۹ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ م ۱۵ جون ۱۹۶۹ء

محشر میں سارے پیغمبروں سے اُن کی اُمتوں کے بارہ میں خداوندی سوال

حضرت عیسیٰؑ سے سوال وجواب کی تفصیل

حمد و صلوٰۃ　اعوذ باللہ　اور بسم اللہ کے بعد

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا وَاِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○ اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ

يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ۝

المائدہ۔ ع ۱۵۔ (آیات ۱۰۹ تا ۱۱۵)

قیامت کے اس دن کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ سارے پیغمبروں کو جمع فرمائے گا پھر ان سے پوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ (یعنی تمھاری دعوت اور تعلیم و ہدایت کے بارہ میں تمھاری اُمتوں کا طرز عمل کیا رہا؟) وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا پورا علم آپ ہی کو ہے۔

تصور کرو اس وقت کا جب اللہ تعالیٰ (اپنے پیغمبر مسیح علیہ السلام سے) فرمائے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ یاد کرو ان انعامات اور احسانات کو جو میں نے تم پر اور تمھاری والدہ (مریم) پر کیے، جب میں نے روح القدس سے تمھیں تائید اور تقویت بخشی، تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارہ میں (شیر خوارگی کے ایام میں) اور سن کہولت میں بھی (اُن سے پیغمبرانہ اور معجزانہ خطاب کرتے تھے) اور یاد کرو جب میں نے تم کو کتاب و حکمت اور خاصکر توراۃ و انجیل کا علم دیا، اور یاد کرو جب تم بنا دیتے تھے مٹی کے گوندے سے پرندہ کی سی صورت میرے حکم سے، پھر تم اسمیں پھونک مارتے تھے تو (اُس میں حیات پیدا ہو جاتی تھی اور) وہ حقیقۃً پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے، اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مردوں کو زندہ کرکے (قبروں سے نکال کے) کھڑا کر دیتے تھے میرے حکم سے۔ اور یاد کرو وہ واقعہ جب میں نے بنی اسرائیل کے شر کو روک دیا

تم سے جب تم آئے تھے ان کے پاس کھلی نشانیاں اور روشن معجزے لے کر تو ان میں سے کافروں نے کہا تھا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے (اور پھر وہ تمھیں ختم کر دینے کے درپے ہو گئے)

اور (اے عیسیٰ بن مریم) یاد کرو (وہ واقعہ بھی) کہ جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ بن مریم) پر، تو وہ بول اُٹھے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔

اور یاد کرو اُس واقعہ کو بھی جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے مریم کے فرزند عیسیٰ کیا تمھارا خداوند ایسا کر سکتا ہے کہ ہمارے لیے آسمان سے مائدہ (کھانے کا خوان) اُتار دے تو عیسیٰ نے اُن سے کہا تھا کہ اگر تم مومن ہو تو خدا سے ڈرو (اور ایسی باتیں نہ کرو جو مومنین کے لیے زیبا نہیں) ان حواریوں نے کہا کہ (اس سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ آپ کی صداقت یا خدا کی قدرت کا امتحان لیں) ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ (اللہ کے اتارے ہوئے) اس آسمانی خوان سے ہم کھائیں (اور اس پاک نورانی کھانے کی برکتیں ہمیں حاصل ہوں) اور ہمارے قلوب کو اطمینان کی دولت نصیب ہو اور ہم (اس ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے) جان لیں کہ تم نے ہم سے سچ فرمایا تھا اور پھر ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں ـــــ عیسیٰ بن مریم نے دُعا کی "اے اللہ ہمارے پروردگار! تو ہم پر آسمان سے مائدہ (کھانے کا خوان) نازل فرما جو ہمارے لیے ایک یادگار بن جائے ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک معجزہ اور نشانی ہو، اور تو ہمیں رزق عطا فرما، تو بہترین عطا فرمانے والا ہے ـــــ اللہ نے فرمایا میں یہ خوان تمھارے لیے اُتار تو دوں گا، لیکن اس کے بعد جو کوئی تم میں سے کفر کرے گا تو اُس کو میں وہ سخت سزا دوں گا جو دُنیا میں کسی کو بھی نہ دوں گا۔

سورۂ مائدہ۔ آیات ۱۰۹ تا ۱۱۵

تفسیر و تشریح :-

یہ سورۂ مائدہ کا خاتمہ یعنی اس کا بالکل آخری حصہ شروع ہوا۔ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ اس سورت کے اکثر مضامین اہلِ کتاب خاص کر یہود و نصاریٰ سے متعلق تھے۔ اس آخری حصہ کا روئے سخن بھی خصوصیت سے اہلِ کتاب ہی کی طرف ہے اور ان میں سے بھی خاص طور سے تثلیث پرست عیسائی اس کے مخاطب ہیں اور ایک غیر معمولی انداز میں ان کی مشرکانہ گمراہیوں کے انجام سے انھیں مطلع کیا گیا ہے اور ایک طرح سے آخری طور پر ان پر حجت تمام کردی گئی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے۔

"يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝"

یعنی آنے والے اس ہولناک دن کا تصور کرو جب اللہ اپنے سارے پیغمبروں کو میدانِ حشر میں جمع فرمائے گا جہاں اس دُنیا کے سارے انسان جمع ہوں گے۔ اگلی پچھلی ساری امتیں، قومیں اور سب مذہبی گروہ اور فرقے حاضر ہوں گے، تو سب کے سامنے اللہ تعالےٰ اپنے پیغمبروں کو جمع فرمائے گا اور اُن سے پوچھے گا "مَاذَا أُجِبْتُمْ" (تمھیں کیا جواب دیا گیا) یعنی ہر نبی سے پوچھا جائے گا کہ تم جن کی ہدایت و اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے اُن کا رویہ کیا رہا؟ انھوں نے کس حد تک تمھاری بات مانی اور تمھاری پیروی کی؟" تو یہ سب پیغمبر اللہ علام الغیوب کے علمِ محیط کے مقابلہ میں اپنے محدود اور صرف ظاہری علم کو کالعدم اور منفی قرار دیتے ہوئے اور ادب کے تقاضے سے عرض کریں گے " لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ" یعنی آپ علام الغیوب ہیں۔ کوئی بات آپ سے مخفی اور آپ کے علم سے باہر نہیں۔ ہماری دعوت و تعلیم کے بارے میں اُمتوں کا جو رویہ رہا اس کا پورا اور صحیح علم آپ ہی کو ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں جو آپ کے حضور میں عرض کرسکیں۔

میدانِ حشر میں پیغمبروں سے اس بارہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو پوچھا جائے گا اور وہ اس کا جو جواب دیں گے یہ اُس کا نہایت اجمالی بیان ہے۔ آگے صرف اس سوال و

جواب کو کسی قدر تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی اُمت کے بارے میں کیا جائے گا اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نبی کے بارے میں اس کی اُمت نے اتنا مشرکانہ غلو نہیں کیا جتنا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا، اور کسی نبی کی اُمت نے اپنے پیغمبر کی تعلیم کو اتنا مسخ نہیں کیا جتنا کہ عیسائی اُمت نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو مسخ کیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت میں سب کے سامنے ان کا بیان تفصیل سے دلوائے گا، اور قرآن مجید میں اس کو تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ نبی آخر الزماں اور اللہ کی آخری کتاب کے ذریعہ عیسائی اُمت پر آخری حد تک حجت تمام ہو جائے اور انھیں معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام ان کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے کس طرح اپنی برأت ظاہر کریں گے، اور پھر جن کے دلوں میں آخرت کی فکر اور خدا کے خوف کی کوئی رمق باقی ہو وہ مشرکانہ عقائد سے توبہ کر کے اس توحید کو اختیار کریں جس کی عیسیٰ علیہ السلام نے حقیقتاً تعلیم دی تھی اور جس کی دعوت اللہ کے آخری نبی اور آخری کتاب کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔ آگے ختم سورت تک تفصیل سے یہی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ اس بارہ میں کیا فرمائے گا، کیا پوچھے گا اور وہ اس کے جواب میں کیا عرض کریں گے۔

آگے کی آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے وہ انعامات و احسانات یاد دلائے گا جو اس کی طرف سے ان پر اور ان کی والدہ مریم صدیقہ پر کیے گئے اور جن کی وجہ سے ان کو دنیا میں عظمت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان انعامات کے تذکرہ سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے گی کہ حضرت عیسیٰ میں جو بھی کمال تھا وہ خدا کا عطیہ تھا اور اُن سے جو معجزات ظاہر ہوئے وہ ان کی اپنی ذاتی روحانی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت سے ظاہر ہوئے۔ یہاں تک کہ جو حواری ایمان لاکے ان کے پیروکار اور ان کی دعوت کے علمبردار بن گئے ان کو بھی خدا ہی نے ایسا بنایا اور اس کی توفیق دی ــــــ ارشاد فرمایا گیا ہے ــــــ

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۔

یعنی اُس وقت کا تصور کرو جب اللہ تعالےٰ میدانِ حشر میں اولین و آخرین کے پورے مجمع کے سامنے اپنے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمائے گا ـــــ کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میرے ان انعامات و احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمھاری والدہ پر کیے۔ میں نے رُوح القدس سے تمھیں تائید دی۔ جس کا پہلا ظہور یہ تھا کہ تم لوگوں سے گہوارہ میں یعنی شیر خوارگی کے زمانہ میں معجزانہ اور حکیمانہ باتیں کرتے تھے اور پھر ادھیڑ عمر میں جب ایک پیغمبر کی حیثیت سے تم لوگوں کو خطاب کرتے تھے تو وہ بھی رُوح القدس کی تائید کا ظہور تھا۔

رُوح القدس کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کا ذکر ان کی ایک امتیازی فضیلت اور اُن پر اللہ تعالےٰ کے ایک خاص انعام کی حیثیت سے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔ تیسرے پارہ "تِلْكَ الرُّسُلُ" کے بالکل شروع میں خاص خاص پیغمبروں کی امتیازی فضیلتیں بیان فرماتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا۔ "وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ"۔

اکثر مفسرین نے رُوح القدس سے حضرت جبرئیل امین کو مراد لیا ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جبرئیل امین کی خصوصی تائید و رفاقت حاصل تھی ـــــ اور بعض حضرات نے روح القدس سے ایک خاص رُوحانی قوت مُراد لی ہے اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص رُوحانی قوت حاصل تھی اور وہ ان پر اللہ تعالیٰ کا مخصوص انعام تھا ـــــ بہرحال میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو سب سے پہلے اپنا یہ احسان یاد دلائے گا کہ میرے ہی حکم سے تم کو رُوح القدس کی قوت اور تائید حاصل تھی۔ اور تم نے گہوارہ میں شیر خوارگی کے زمانہ میں جو معجزانہ باتیں کیں، اور اسی طرح اپنی نبوت کے زمانہ میں جو پیغمبرانہ باتیں لوگوں سے کیں وہ میرے اس انعام و احسان کا طفیل تھا کہ میں نے رُوح القدس کی تائید تم کو دی تھی تمھارا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا ـــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے ـــــ

وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ۔

یعنی اے عیسیٰ بن مریم! میرے اس انعام و احسان کو بھی یاد کرو کہ تم کو میں نے

کتاب و حکمت کا علم عطا فرمایا اور خاص کر تورات و انجیل کا علم دیا ـــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا علمی کمال یہی تھا کہ انھیں کتاب و حکمت اور بالخصوص اللہ کی مقدس کتابوں تورات و انجیل کا علم حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو یاد دلائے گا کہ یہ بھی میرا فضل و احسان تھا۔ تمھارا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا ـــــ آگے ارشاد ہوا ہے۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ ـــــ

اور اس کو بھی یاد کرو کہ میں نے تمھارے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے ظاہر کرائے۔ تم مٹی کے گوندے سے بالکل پرندہ کی سی صورت بنا دیتے تھے۔ یہ تمھارے ہاتھ سے میں ہی کراتا تھا۔ پھر تم اس پر پھونک مارتے تھے تو اس میں حیات آجاتی تھی اور وہ حقیقۃً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا تھا۔ یہ سب میرے ہی حکم سے اور میری ہی قدرت سے ہوتا تھا۔ تمھارا کوئی ہنر اور کمال نہیں تھا ـــــ آگے فرمایا گیا ہے۔

وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ۔

تم مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو ہاتھ پھیر کے اچھا کر دیتے تھے۔ اور زمین میں دفن شدہ مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکال کے کھڑا کر دیتے تھے۔ یہ سب میرے ہی حکم سے ہوتا تھا۔ تمھارا اپنا کوئی کمال نہیں تھا ـــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اور میرے اس انعام و احسان کو بھی یاد کرو جب تم بنی اسرائیل کے پاس یہ کھلے معجزے اور روشن نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے تمھیں جادوگر قرار دیا اور تمھارے قتل کرانے اور سولی پر چڑھوا دینے کی سازش کی اور اپنی جدوجہد سے تمھاری گرفتاری اور اس کے بعد سولی پر لٹکوا دینے کا آخری حکم بھی حکومت وقت سے حاصل کر لیا تو میں نے ہی اپنی قدرت سے تم کو بچا لیا۔ وہ تمھارا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ یہ میرا ہی فضل و احسان تھا کہ تمھارے دشمنوں کی ساری اسکیم ناکام ہو گئی۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بر سرِ محشر حضرت عیسیٰ کو اپنے یہ سب انعامات و احسانات یاد دلائے گا۔ اور انھیں عیسیٰ ابن مریم کہہ کے مخاطب فرمائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان گمراہ عیسائیوں کی تردید ہوگی جنھوں نے ان معجزات کو حضرت عیسیٰ کی ذاتی روحانیت کا کرشمہ قرار دے کر ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدائی میں شریک بنایا اور نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے قرآن کی توثیق ہوگی جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا برگزیدہ بندہ اور اس کا رسول بتایا۔ اور اُن کے معجزات کو خدا کی قدرت کا کرشمہ اور اس کا فعل قرار دیا۔ اور کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ سارے معجزے باذن اللہ تھے ۔۔۔۔ قرآن پاک میں جا بجا فرمایا گیا ہے کہ معجزے جو پیغمبروں کے ہاتھوں پہ ظاہر ہوتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتے ہیں، پیغمبر ان کا صرف مظہر ہوتے ہیں۔۔۔ عقائد اور کلام کی کتابوں میں معجزہ کی حقیقت یہی بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح کرامت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ دراصل خدا کا فعل ہوتا ہے اور ولی اس کا صرف مظہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ معجزہ نبی کا اور کرامت ولی کا اپنا فعل ہوتا ہے اور اُن کا ظہور نبی اور ولی کے اختیار میں ہوتا ہے تو وہ سخت گمراہ ہے اور ایک درجہ کے شرک میں گرفتار ہے، عیسائیوں کی گمراہیوں کی بنیاد یہی تھی کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو ان کا اپنا فعل اور ان کی روحانیت کا کرشمہ سمجھا۔ قرآن مجید نے ان کے معجزوں کی تصدیق کی لیکن بتایا کہ ان میں سے ہر معجزہ باذن اللہ تھا۔۔۔

آگے اسی سلسلۂ کلام میں فرمایا گیا ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ۝

یعنی اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے اپنے انعامات کی یاد دہانی کے سلسلہ میں یہ بھی فرمائے گا کہ میرے اس فضل و احسان کو بھی یاد کرو کہ میں نے حوارین کے دل میں یہ بات ڈالی اور اسکی توفیق دی کہ وہ تم پہ ایمان لائیں۔ چنانچہ میری ہی اس توفیق کے نتیجہ میں وہ تم پر ایمان لائے اور

انھوں نے کہا "آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ" (خداوندا ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم نے اسلام یعنی تیری فرمانبرداری کے طریقہ کو اپنا مذہب و مسلک بنالیا)

عیسائیوں نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا اور اُن کو خدا، خدا کا بیٹا اور خدا کا شریک "ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ" ٹھیرایا، اسی طرح انھوں نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے بارے میں بھی سخت غلو اور افترا کیا اور اپنے مشرکانہ عقائد و خیالات کو انہی کی طرف منسوب کیا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں عیسائیوں کی اس افترا پردازی کا پردہ بھی چاک کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ برسر محشر حضرت عیسیٰؑ سے فرمائے گا کہ حواری جو تم پر ایمان لائے تو یہ بھی تمھارا کارنامہ اور تمھارے کسی روحانی تصرف کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ میں نے اُن کے دل میں ڈالا تھا کہ وہ ایمان لائیں چنانچہ وہ ایمان لائے اور انھوں نے خدا کو گواہ بنا کے کہا تھا کہ اے اللہ گواہ رہ کہ ہم تیرے مسلم بندے ہیں۔ (وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ) اس میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ حواریوں کا دین اسلام تھا۔ وہی اسلام جس کی دعوت اللہ کے سارے پیغمبروں نے دی۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اسی کے داعی تھے۔ انھوں نے حواریوں کو اسی کی دعوت دی تھی۔ اور اللہ کی توفیق سے حواریوں نے اسے قبول کر کے اللہ تعالےٰ کے حضور میں عرض کیا تھا "وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ"۔

یہاں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں حواریوں کی طرف اللہ کے وحی کرنے کا جو ذکر ہے (وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ) تو اس سے وہ اصطلاحی وحی مراد نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کی طرف ہوتی ہے بلکہ یہاں یہ لفظ عام لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کی والدہ کے بارے میں بھی یہ لفظ ان ہی معنوں میں کسی جگہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ "وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوْسَى" (ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اپنے نومولود بچہ کو اس طرح دریا میں ڈال دے) بلکہ ایک جگہ قرآن مجید میں یہی لفظ شہد کی مکھی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ "وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ" یعنی شہد کی مکھی جس طرح اور جیسا ہنر مندی سے پھولوں سے شہد چوستی ہے اور

پھر جس طرح چھتہ بنا کر اس میں شہد محفوظ کرتی ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی سمجھ شہد کی مکھی کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ (وَاَوْحیٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ) بہر حال حواریوں کی طرف وحی کرنے کا اس آیت میں جو ذکر فرمایا گیا ہے اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ایمانی دعوت کو قبول کریں اور اسی نے ان کو اس کی توفیق دی۔

اس کے بعد وہ آیت ہے جس میں ذکر ہے کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے درخواست کی کہ وہ اپنے رب سے "مائدہ" (یعنی عالمِ غیب کے کھانوں کا خوان) نازل کرنے کی التجا کریں۔

اس میں چند باتیں خاص طور سے قابلِ لحاظ ہیں ــ ایک یہ کہ ان حواریوں نے یہ درخواست پیش کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ کو "یَا عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ" ہی کے لفظوں سے مخاطب کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حواری جو حضرت عیسیٰؑ کے براہِ راست شاگرد اور خلفاء اور عیسائی اُمّت کے سابقین اوّلین اور حضرت مسیحؑ کے بعد پہلے مرشد و معلّم تھے۔ وہ ان کو ابن اللہ نہیں بلکہ ابنِ مریم ہی جانتے اور کہتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان کا عقیدہ تھا کہ خود حضرت عیسیٰؑ میں یہ قدرت اور طاقت نہیں ہے کہ وہ آسمان سے "مائدہ" اتار سکیں۔ بلکہ ان کا مقام و منصب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو ان کا رب ہے اس کی دُعا کریں ــ آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یَا عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔

(اور اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمھارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہمارے واسطے آسمان سے کھانے کا خوان نازل کرے)

یہاں "یَسْتَطِیْعُ" کا لفظ جس کا میں نے ترجمہ کیا کہ "کر سکتا ہے" قدرت کے لحاظ سے نہیں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ کسی ادنیٰ درجہ کے مومن کو بھی اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ آسمان سے "مائدہ" نازل فرمادے، ہاں کوئی بندہ بطورِ خود یہ نہیں جان سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا فیصلہ اس کے بارے میں کیا ہوگا ــ بہر حال اس آیت میں

"یَسْتَطِیْعُ" قدرت کے لحاظ سے نہیں، بلکہ حکمت اور مصلحت کے لحاظ سے استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور اس کو بالکل اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح میں آپ میں سے کسی سے کہوں کہ کیا آپ میرے فلاں کام کے لیے اس وقت بازار جا سکتے ہیں۔ تو جس طرح اس کہنے سے میرا مطلب یہ ہوگا کہ کیا آپ اس وقت بازار جانا مناسب سمجھیں گے۔ اسی طرح اس آیت میں "هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ" کا مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لیے مائدہ نازل کرنا بہتر سمجھے گا ـــــ حواریوں کی اس گزارش کا مقصد یہی تھا کہ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مقررہ سنت کے خلاف نہ ہو، تو آپ اللہ تعالیٰ سے اس کی استدعا کیجئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کی اس درخواست کو ناپسند کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی خارقِ عادت چیزوں کے لیے استدعا کرنا اور وہ بھی کھانے پینے کی چیزوں کے لیے مومنین صادقین کے لیے زیبا نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

"اِتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اگر تم ایمان لا چکے ہو تو خدا سے ڈرو اور ایسی بات نہ کرو جس سے یہ شبہ ہو کہ تم میری مقبولیت یا خدا کی قدرت کا امتحان کرنا چاہتے ہو) حواریوں نے عرض کیا۔

"نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝"

مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ آپ کی مقبولیت کا یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا امتحان کریں۔ ہم تو ایمان لا چکے۔ اس استدعا سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ عالم غیب کا وہ مقدس نورانی کھانا کھائیں جو اس دُنیا کی آلائشوں سے بالکل ہی پاک صاف ہو اور ہمیں اس کے انوار و برکات نصیب ہوں اور اس معجزہ کے مشاہدہ سے ہمیں مزید اطمینانِ قلب نصیب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور دُعاؤں کی قبولیت کے بارے میں آپ جو کچھ فرمایا کرتے ہیں، ہم ایک دفعہ اپنی آنکھوں سے بھی اس کا ظہور دیکھ لیں اور جب دین کی دعوت و منادی کے لیے لوگوں کے پاس جائیں تو ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ہم لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے اس خارق عادت انعام اور معجزہ کی شہادت دے سکیں۔

اس آیت میں حواریوں نے جو یہ کہا کہ ہم نزولِ مائدہ کی استدعا اس واسطے کر رہے ہیں کہ ہمیں مزید اطمینانِ قلب حاصل ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے میری آنکھوں سے دکھا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا (رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی) اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَوَلَمْ تُؤْمِنْ" کیا اس پر ایمان و یقین نہیں ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا "بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ" (ایمان تو ہے لیکن اطمینانِ قلب کے لیے اس کا منظر آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں) ـــــ ایمان کے بعد اطمینانِ قلب کی حقیقت کو آپ اس مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک صالح اور متقی باپ اپنے محبوب اور صالح کلوتے بیٹے کو اپنے آخری وقت میں بتائے کہ دیکھو میں نے اور تمھاری ماں نے گھر میں فلاں جگہ تمھارے لیے ایک بڑی رقم دفن کر دی ہے۔ جب ضرورت ہو اسے نکال کے کام میں لے آنا۔ پھر یہی بات بیٹے کو رازداری کے ساتھ ماں بھی بتائے تو ظاہر ہے کہ اسے ماں باپ کی اس اطلاع میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوگا اور وہ اس کو یقین کے ساتھ صحیح سمجھے گا، لیکن اس کے بعد اگر وہ جگہ کھود کر اس دفن شدہ رقم کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو یقیناً اُسے مزید اطمینان حاصل ہوگا ـــــ تو حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے جو یہ عرض کیا تھا کہ "وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا" تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی دعا سے ہمارے لیے آسمان سے مائدہ نازل فرما دے تو ایمان کے بعد ہمیں مزید اطمینانِ قلبی حاصل ہو جائے گا ـــــ حواریوں کے یہ عرض کرنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنْکَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ؁

یعنی اے میرے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے "مائدہ" یعنی کھانے کا خوان نازل فرما جو ہمارے اوّلین و آخرین کے لیے سامانِ جشن و مسرت اور نیز ایک یادگار انعام ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور تو ہم کو اپنے اس خاص رزق سے نواز۔ تو خیر الرازقین ہے۔
آگے قرآن مجید میں ہے ـــ

قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ؀

یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کی استدعا کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری استدعا کے مطابق میں مائدہ نازل تو کردوں گا لیکن اس کے بعد جو لوگ تم میں سے کفر کریں گے تو میں ان کو وہ سخت ترین عذاب دوں گا جو دنیا میں کسی اور کو نہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اس پرجلال جواب سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ دستدعا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تھی ــــ آگے قرآن پاک میں اس کا کوئی ذکر بلکہ اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ مائدہ نازل کیا گیا یا اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے بعد حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں نے اپنی درخواست خود واپس لے لی۔ کسی صحیح حدیث سے بھی یہ بات معلوم نہیں ہوتی۔ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ "مائدہ" نازل ہوا تھا۔ اور غیر مستند قسم کی روایتوں میں اس کی تفصیلات بھی ہیں۔ تابعین میں سے حضرت حسن بصری اور مجاہد سے سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے بعد حضرت عیسیٰ نے اپنی استدعا واپس لے لی اس لیے مائدہ نازل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی ــــ مفسر ابن کثیرؒ نے بھی اسی کو راجح سمجھا ہے اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انجیلوں میں اور مسیحی روایات میں اس مائدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر آسمان سے یہ مائدہ نازل ہوا ہوتا تو انجیلوں میں اور مسیحی روایات میں اس کا ذکر ضرور ہوتا بلکہ مبالغوں کے ساتھ ہوتا ــــ بہرحال مائدہ کے نزول یا عدم نزول کے بارے میں یقین اور وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہاں تک یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے یہ انعامات و احسانات یاد دلائے گا۔ یہ سب دراصل اس پرجلال سوال کی تمہید ہوگی جو اس دن برسر محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے امتیوں کی گمراہی کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ اپنے امتیوں کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے اپنی بیزاری ظاہر فرمائیں گے اور کہیں گے کہ میں نے تو انھیں توحید ہی کی تعلیم دی تھی یہ اپنی گمراہی کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ آگے کی آیتوں میں یہی بیان فرمایا گیا ہے اور اس کا انداز بڑا غیر معمولی ہے۔

* * *

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

وصایا اور نصائح کے آئینے میں

ترجمہ و تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اس آخری قسط میں ترجمۂ وصایا میں سے متعدد تحریرات سے چند نصائح، ملفوظات اور کلمات طیبات کو بطور اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ حضرت شیخ سہروردیؒ نے اپنے مرید و خلیفہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو جو اجازت نامہ تحریر فرمایا ہے اس کا ترجمہ سب سے آخر میں درج کر کے وصایا اور نصائح کے اس مبارک سلسلے کو پایۂ اختتام تک پہونچا دوں گا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور توفیق عمل نصیب فرمائے (آمین)

---

(۱) عزت ایک ایسا راستہ ہے جو تکبر کی آگ کی پشت پر پھیلا ہوا ہے جو شخص عزت کی صراطِ مستقیم سے ذرہ برابر بھی انحراف کرے گا وہ تکبر کی آگ میں جا گرے گا اور جل جائے گا۔ اسی طرح تواضع بھی ایک راستہ ہے جو ذلت کی پشت پر واقع ہے (جو تواضع کی صراطِ مستقیم سے تھوڑا سا بھی ہٹے گا ذلت کے گڑھے میں جا گرے گا۔) مداراۃ (رفق و رعایت اور صلح جوئی) بھی اسی طرح ایک ایسا راستہ ہے جو مداہنت (سستی و چشم پوشی) کی پشت پر ہے۔ پس جو شخص بھی صراطِ مداراۃ سے ادھر اُدھر ہوگا وہ مداہنت میں گر پڑے گا ——— ان نازک فروق سے سوائے علماء راسخین کے کوئی واقف نہیں۔ اگر کوئی شخص علوم ظاہرہ کے

دفتر کے دفتر پڑھ لے تب بھی وہ اس قسم کی اشیا میں تمیز نہیں کر سکتا جن کو ہم نے بیان کیا ہے۔ ـــــــ ہاں اگر کسی نے مکتبِ تقویٰ میں تعلیم پائی ہے تو وہ اس طرح کے باریک فرق سمجھ لے گا ـــــ اس لیے کہ (اکثر) علوم ظاہرہ تقویٰ سے بالکل الگ چیز ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے ـــــــ

(۲) عُزلت (خلوت) اصل ہے اور اختلاط (میل جول) فرع ہے۔ پس اصل کو اختیار کرو اور (بلاضرورت) مخالطت نہ کرو۔ اور اگر مخالطت اختیار کرتے ہو تو برہان و دلیل کے ساتھ کرو۔ پھر مخالطت کی صورت میں یہ بات بھی واضح رہے کہ خاموشی اصل ہے اور نطق و گویائی فرع ہے پس اصل کا التزام کرو اور بغیر برہان و دلیل کے گفتگو نہ کرو ـــــ اللہ تائید کرنے والا ہے ـــــــ

(۳) فضل اللہ اور انعاماتِ الٰہیہ کے نفائس سے پورا حصہ ملنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک تو کتاب اللہ کے موافق عمل کرنے کی توفیق مل جائے ـــــ وہ کتاب اللہ جس کے سامنے اور پیچھے سے (غرض کسی جانب سے) باطل نہیں آسکتا اور جو لائق حمد حکمت والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ـــــ دوسرے اُن پسندیدہ (آثار اور) آدار کا تتبع نصیب ہو جائے جن کے ذریعے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر صحیح طور پر چلنا میسر ہو سکے ـــــ جب یہ اصل، مضبوط و محکم ہو گئی تو طریقِ قویم اور صراطِ مستقیم پر قدم آجائے گا ـــــ تقویٰ متحقق ہوگا، اعضاء، مناہی (ممنوعات) سے بچیں گے اور امر کو بجالائیں گے۔

(۴) جب کسی بندے کا قلب لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کو (بکثرت) پڑھنے سے صاف ہو جاتا ہے تو کائنات کے تمام ذرات کا اُس کے قلب سے اس طرح اتصال ہو جاتا ہے جس طرح جسموں کا رگوں سے۔

(۵) "احوال" مغز اور گری کی مانند ہیں۔ یہ احوال اُس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتے جب تک (نیک) اعمال کے چھلکے اُن کی حفاظت نہ کریں۔ ـــــــ

(۶) ہر اُس قلب کے لیے جو حُبِ دُنیا میں مقید و مبتلا ہے۔ عالمِ غیوب کے

سمندروں میں غوطہ لگانا ممنوع ہے —

(۷) بندہ برابر بابِ طلب کو اپنی سعی و کوشش سے کھٹکھٹاتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ذوقلب اول والا بن جاتا ہے۔ اور جو ذوقلب ہوگیا اُس کی ولادت گویا ازسرِنو ہوئی اب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ ملکوت السماء والارض میں داخل ہوجائے (اور اس کی سیر کرے) —

(۸) وہ عقلاء جن کی عقلوں سے نورِ ہدایت قریب ہے۔ فانی پر باقی کو ترجیح دیتے ہیں اور نفوسِ انسانیہ اپنی پیدائشی خصلت کے اعتبار سے فانی اشیاء کی طرف رغبت رکھتے ہیں مگر جس نفس کو اللہ تعالیٰ توفیق دیدے۔ وہ نورِ روح کے سرایت کر جانے کے سبب نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے اور امر اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے —

(۹) اللہ تعالیٰ نے اپنی لطیف حکمت سے اولادِ آدم کے اوضاع و اطوار مختلف رکھے ہیں۔ ان میں بعض وہ ہیں جن کو بامِ علیین تک ترقی نصیب ہوتی ہے اور بعض وہ ہیں جو سجین کی پستی کی طرف جھکتے ہیں۔ جس کسی کا تقویٰ ہدایت کی طرف کھینچ لیتا ہے وہ اس فانی دنیا کی تمام اشیاء کو ہیچ سمجھتا ہے اور اپنے نفس کو (فقط) دنیا کی چیزوں کی تحصیل میں نہیں کھپاتا — اس کی ہمت "مجاورتِ ملاءِ اعلیٰ" کی جانب متوجہ ہوتی ہے وہ تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور نفس کے جوہر کو رذائل اور اخلاقِ غیر محمودہ سے صاف کرکے فضائل اور اخلاقِ محمودہ سے آراستہ کرتا ہے — اُس کی عبادت اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے۔ تلاوتِ کلام اللہ میں اُس کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ دوامِ ذکر میں اُنس حاصل ہوتا ہے۔ قیامِ لیل اور صیامِ نہار میں اُس کو لذت ملتی ہے —

(۱۰) اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملازمت وصحبتِ اقدس کی وجہ سے خلوت سے مستغنی تھے۔ اُن کا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا اور آپ کے ہمراہ جہاد کرنا خلوت سے افضل و بہتر تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مرید، صحبتِ شیخ سے، بغیر خلوت میں گئے ہوئے

(اور بغیر چلہ کشی کیے ہوئے) تربیت حاصل کرلیتا ہے۔ اُس کے دل میں باطنِ شیخ سے وہ برکات پہونچتی ہیں جو خلوت سے بے نیاز کر دیتی ہے ہیں لیکن بعض مُریدوں کے لیے خلوت ہی مناسب ہے ـــــــ

(۱۱) مُرید کے لیے مناسب نہیں ہے کہ مخلوق کو متوجہ اور راضی کرنے کے لیے (بعض) اعمال چھوڑے یا (بعض) اعمال انجام دے ـــــ جب اچھے اعمال کرے اور نفس اس بات کی طرف متوجہ ہو کہ مخلوق کی نظریں ان اعمال پر پڑیں تو استغفار کرے مگر اچھے اعمال کو اس بنا پر بالکل نہ چھوڑے بالآخر عملِ حسن کی برکت سے ریاکاری زائل ہو جائے گی۔

(۱۲) جب کسی بُرے کام کے زائل کرنے پر قادر ہو تو چاہیے کہ اخلاص کے ساتھ اُس کو زائل کرے ـــــ امر بالمعروف بھی امور بہ ہے مگر امر معروف، معروف اور معقول طریقے سے ہونا چاہیے ـــــ عاصیوں پر (ایک دم) ہتھیار اور ڈنڈے لے کر نہ چڑھ جائے بلکہ منکر کو از جانب شرع نائب بن کر حسب مقدرت اور حسب حیثیت زائل کرے اور نیت خالص رکھے نیز ریا و سمعہ سے دور رہے۔

(۱۳) جو دنیا کا اور جاہ و مرتبہ کا حریص ہے وہ شیخ بننے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا ـــــ مشیخت کا اہل وہ ہے جو اپنی خواہش کا متبع نہ ہو۔

حضرت شیخ سہروردی قدس سرہ کی جانب سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا اجازت نامہ:-

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علی نبیہ محمد وآلہ الطیبین۔

میں خوش ہوا اُن انعامات سے جو اللہ تعالیٰ نے الشیخ العارف بہاء الدین[1]

---

[1] الشیخ الامام العالم المحدث بہاء الدین زکریا ابن محمد بن علی القرشی الاسدی ـــ کوٹ کرور علاقہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نو عمری ہی میں طلب علم کے سلسلے میں بخارا کا سفر کیا اور وہاں کے اساتذہ سے اخذ علم کر کے حجاز کا سفر کیا۔ (باقی صفحہ ۴۳ پر)

زکریا (ملتانی) پر کیے ہیں ـــــ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اُن میں اور اضافہ فرمائے ـــــ
ـــــ مجھ کو وہ سب باتیں بھی معلوم ہوئیں جو اُن کی برکت صحبت کے بارے میں اُن کے
وطن (ملتان) کے چاروں طرف مشہور و معروف ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کو اُن کے حُسن
استعداد کی بنا پر حظِّ کبیر عطا فرمایا ہے ..... میں نے اللہ تعالےٰ سے اُن کے لیے مزید
اجتہاد اور علمِ نافع سے مزید حصہ طلب کیا ہے۔ ایسا علم نافع جو طریقِ استقامت پر
چلنے کے لیے مُعین و مددگار ہو ـــــ اور میں نے اُن کو اجازت دی ہے کہ وہ جس کو چاہیں
خرقہ پہنائیں۔ میں نے اُن کو اجازت دی ہے کہ وہ میری تمام مسموعات و مجموعات کی
روایت کریں اور اس کتاب کی بھی اجازت دی ہے جس کا نام عوارف المعارف ہے۔
میں نے عوارف المعارف کا ایک نسخہ اُن کو دیدیا ہے پس شیخ بہاء الدین کو مطالعہ
کرنے اور اللہ تعالےٰ سے حُسنِ فہم اور آگاہی مانگنے کے بعد اس کتاب کے درس و روایت
کی اجازت ہے۔
اللہ ہی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے ـــــ وصلّی اللہ علیٰ
خیر خلقہٖ و آلہٖ اجمعین ـــــ یہ تحریر ۲۱ ذی الحجہ کی شب کو ۶۲۶ھ میں مکہ معظمہ
میں حرم شریف کے اندر لکھی گئی۔

ایک ضروری تصحیح:۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی قسط کے پیش لفظ میں حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کے
دو شعر لکھے ہیں جو حضرت شیخ سہروردیؒ کی نصیحت سے متعلق ہیں۔ غلطی سے میں نے یہ لکھدیا ہے کہ یہ اشعار گلستان
کے ہیں۔ درحقیقت یہ بوستان میں ہیں۔ پیر دانائے فرخ شہاب کی جگہ بعض حضرات نے بتایا کہ پیر دانائے، روشن
شہاب ہے۔ بہرحال اصل سے مُراجعت کرلی جائے۔ میں نے اپنی یاد کے مطابق لکھا ہے ـــــ فریدی)

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ) حج و زیارت سے فارغ ہو کر پانچ سال مدینہ منورہ میں قیام کیا اور حدیث شیخ کمال الدین
محمد الیمانیؒ سے حاصل کی پھر قدس کا سفر کیا اور مسجد اقصیٰ نیز مشاہد انبیاءؑ کی زیارت کر کے بغداد گئے اور شیخ
شہاب الدین عمر سہروردیؒ سے طریقۂ سہروردیہ اخذ کیا اور ملتان واپس آئے۔ بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور
مخلوق کو بڑا فیض آپ سے پہونچا۔ تقریباً سو سال کی عمر میں ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔ ملتان میں مزار ہے۔ نزہۃ الخواطر جلد اول

دین میں حدیث و سنت کا مقام

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (استاذ حدیث دار العلوم
فلاح دارین، ترکیسر)

جو شخص اس اُمت کی تاریخ سے باخبر ہے اس کو اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس اُمت میں یہ عقیدہ متواتر رہا ہے کہ حدیث نبویؐ قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے، پس اگر قرآن کی تشریعی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے بیان و شرح کی بھی تشریعی حیثیت ماننی پڑے گی۔ قرآن مجید میں نہایت صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ	بے شک اللہ نے احسان کیا، ایمان
اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْ	والوں پر کہ بھیجا ان میں رسولؐ انھیں میں
اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیَاتِہٖ	سے جو پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور انکو
وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ	سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اللہ اور حکمت
وَالْحِکْمَۃَ۔ (آل عمران ع)	کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولؐ کا منصب صرف قرآن کی آیات سنانا ہی نہیں تھا، بلکہ اس کے ساتھ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی آپؐ کے فرائض رسالت میں داخل تھی۔

جمہور ائمہ لغت و علمائے قرآن کا متفقہ فیصلہ ہے، کہ حکمت سے مراد قرآن کے علاوہ شریعت کے وہ احکام اور دین کے وہ اسرار ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مطلع فرمایا تھا۔ امام شافعیؒ اپنی تصنیف "الرسالہ" میں لکھتے ہیں۔

سمعت من ارضی من اھل العلم بالقرآن الحکمۃ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۱]

میں نے قرآن کے اُن اہلِ علم سے جو میرے نزدیک قابلِ اعتماد ہیں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

قرآن کے مجملات و مشکلات کی تفصیل اور عملی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال اور آپ کے احوال کے جانے بغیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ آپ مراد الٰہی کے مبیّن اور شارح ہیں۔ قرآن مجید ہی میں اعلان فرمایا گیا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ۔ (سورۂ النحل۔ ع ۶)

اور نازل کی ہم نے تم پر یہ یادداشت تاکہ کھول کر بیان کر دو لوگوں سے اس کو جو ان کی طرف اتارا گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، دعا، درود، ذکر الٰہی، اسی طرح نکاح و طلاق، بیع و شراء، اخلاق و معاشرت، سیاست ملت اور فصلِ قضایا و خصومات غرض جملہ امورِ دین کے متعلق کلّی اور اُصولی احکام موجود ہیں۔ مگر ان احکام کی تشریح اور عملی تشکیل اور ان کے جزئیات کی تفصیل منجانب اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اسی لیے آپ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قرآنِ کریم میں صاف فرمایا گیا ہے۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (النساء ع ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ ہی کی اطاعت کی۔

آپ کی اطاعت اور آپ کے دینی احکام کی تابعداری جس طرح آپ کے دورِ سعید میں کی جاتی تھی اسی طرح آپ کے بعد بھی ضروری و لازمی ہے، قرآن و حدیث میں بکثرت اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا

میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں،

---

[۱] الرسالہ ص۲۲۔

مَا تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ [1] — جب تک ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے، گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور میری سنت۔

بہر حال یہ حقیقت آشکارا ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ حدیث وسنت کا اتباع ضروری ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں درحقیقت کتاب اللہ کی شرح وبیان ہیں۔ بلکہ کتاب وسنت پر جن علماء کی نظر وسیع وعمیق ہے، انھیں برملا معلوم ہے کہ احادیث صحیحہ تمام تر قرآن پاک کے کلی احکام کے تحت مندرج ہیں۔

امام شاطبی فرماتے ہیں۔

فکانت السنة بمنزلة التفسير والشرح لمعانی احکام الکتاب [2] — سنت کتاب اللہ کے احکام کے معانی کے لیے تفسیر وشرح کا درجہ رکھتی ہے۔

امام شافعیؒ نے "الرسالہ" میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جن کی نوعیت یہ ہے کہ وہ قرآن کے مجمل احکام کی شرح کرتی ہیں۔ تیسری وہ جن کا ذکر قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے اور نہ اجمالاً، اس کے متعلق امام شافعیؒ نے علماء کے چار نظریے پیش کیے ہیں، لیکن صحیح مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال بھی صحیفۂ ربانی سے مستنبط ہیں [3] لیکن قرآن پاک میں ان حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے اور یہ صرف ان راسخین فی العلم کا حصہ ہے جو نبوت کی زبان اور صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب اور طرز ادا کے فہم کی خاص مہارت رکھتے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں فرق

اس موقع پر اس فرق کا لحاظ اور اس کی بنیادوں کو سمجھنا بھی ضروری ہے جو قرآن وحدیث کے درمیان عہدِ نبویؐ سے چلا آرہا ہے۔

---

[1] جامع بیان العلم صفحہ ۲۲ ج ۲ بحوالہ مستدرک۔ [2] الموافقات صفحہ ۱۰ ج ۴۔ [3] الرسالہ صفحہ ۲۸ و ۲۹۔

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ عربوں کا حافظہ نہایت قوی تھا، وہ اپنے شجرہائے نسب، اہم تاریخی واقعات، جنگی کارنامے، بڑے بڑے خطبے، لمبے لمبے قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے، قرآن مجید نازل ہوا تو عرب کی عام عادت کے مطابق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے اس کو زبانی یاد رکھا، اور اس سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے جاری فرما دیا، اسی لیے ارشاد ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ [1] — بلکہ یہ قرآن کھلی کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینے میں جن کو علم دیا گیا۔

تاہم چونکہ قرآن مجید تمام تر معجزہ ہے، اور اس کا لفظ لفظ وحی الٰہی ہے، جس میں کسی ایک لفظ کے بجائے دوسرے اسی کے ہم معنیٰ اور مترادف لفظ لانے کی بھی گنجائش نہیں ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا بھی اہتمام فرمایا، چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ جس وقت کوئی آیت اُترتی آپ اسی وقت لوگوں کو یاد کرا دیتے اور کسی لکھنے والے کو بلا کر اس کو لکھوا بھی دیتے، مگر اصل توجہ اس کے حفظ و تلاوت پر مرکوز تھی، اور کتابت مزید بر آں تھی۔ برخلاف اس کے حدیث معجزہ نہ تھی۔ اس کے الفاظ کی وہ اہمیت اور نوعیت نہ تھی جو قرآن پاک کے الفاظ کی تھی۔ یعنی کہ حدیث قولی بھی جو حق تعالیٰ کی وحی یا الہام یا ارادت ہے۔ اس کے الفاظ کی بھی بعینہٖ ادائیگی ضروری نہیں، اور قرآن پاک کی نوعیت یہ ہے کہ یہاں اصل الفاظ جو منزل من اللہ ہیں تلاوت میں انھیں کی ادائیگی ضروری ہے، کیونکہ یہ الفاظ حق تعالیٰ کی طرف سے روح القدس کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر نازل ہوئے، اور آپ ہی کے ذریعہ اُمت تک پہونچے، ان میں نہ روایت بالمعنیٰ کی اجازت ہے، نہ کسی قسم کے لفظی تغیر و تبدل کا اختیار، ہاں ترجمہ و تفسیر کی اجازت ہے، لیکن اس کو کلام الٰہی نہیں کہا جائے گا۔

[illegible] متن ہے، اور حدیثیں اس کی شرح و بیان، اس

---

[1] سورۂ عنکبوت ع ۵

اعتبار سے بھی ان دونوں کے درمیان فرق قائم کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں، علم کے مختلف طبقات ہیں، طبقۂ اولیٰ میں کتاب اللہ، اور طبقۂ ثانیہ میں سنتِ رسولؐ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک مکتوب میں جسے قاضی شریح کے نام تحریر فرمایا ہے، لکھتے ہیں۔

"اِقض بما فی کتاب اللہ فان لم یکن فی کتاب اللہ فبما فی سنۃ رسول اللہ فان لم یکن فی سنۃ رسول اللہ فبما قضی بہ الصالحون" [۱]

جو معاملہ تمھارے سامنے آئے اس کے بارہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو، اگر اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ مل سکے تو سنتِ رسولؐ کے مطابق فیصلہ کرو، اور اگر سنتِ رسولؐ میں بھی حکم نہ ملے تو صالحین (صحابۂ کرامؓ) کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کرو۔

بہرحال سنتِ رسولؐ کا مقام کتاب اللہ کے بعد ہے۔

احادیثِ متواترہ کی خصوصیت

البتہ جو حدیثیں تواتر و تعامل و توارث کی راہ سے اُمت میں منتقل ہو کر آئی ہیں جنھیں اصطلاح میں خبرِ متواتر کہا جاتا ہے، وہ بلحاظ ثبوت احکام کتاب اللہ کی طرح قطعی ہوں گی، کیونکہ جس راہ سے قرآن مجید اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہو کر چلا آرہا ہے، اس راہ سے جو علم بھی آئے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں،

فخر الاسلام بزدوی اس حصے کے بارہ میں جو تواتر کی راہ سے منتقل ہو کر چلا آرہا ہے، یہ الفاظ لکھتے ہیں،

حتیٰ صار کالمعائن المسموع [۲] — یقینی اور ناقابلِ شک ہونے میں ان کی حالت ایسی ہے جیسے خود معائنہ کی ہوئی یا براہ راست سنی ہوئی کسی چیز کی ہوسکتی ہے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ بہت سی چیزیں اس راہ سے منتقل ہو کر

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۵۵ [۲] کشف الاسرار صفحہ ۶۸

چلی آرہی ہیں، فرماتے ہیں۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد الرکعات ومقادیر الزکوٰۃ وما اشبہ ذلک ؎	جیسے قرآن کے منتقل ہونے کا حال ہوا اور یہی حال پانچ وقتوں کی نمازوں، ان کی رکعتوں، زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں اور ان تمام چیزوں کا ہے، جو اس راہ سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

مولانا عبد العلی بحر العلوم نے تحریر فرمایا ہے،

بل المتواتر کالمشافہۃ فی افادۃ العلم (فواتح الرحموت ج۲ ص۱۱۹)	متواتر یقین آفرینی میں مشاہدہ اور مشافہ کی طرح ہے۔

اخبار احاد کا مرتبہ

البتہ جو حدیثیں صرف روایت و کتابت کی راہ سے اُمت میں منتقل ہو کر آئی ہیں اور ان کو تواتر کا مقام حاصل نہیں ہوا ہے جنھیں اصطلاح میں "اخبار احاد" کہا جاتا ہے، ان میں قطعیت کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکی۔ پھر ان کے بھی مختلف درجات ہیں، جن میں باہم اعتماد کے لحاظ سے تفاوت ہے، اسی اعتبار سے ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں فرق مراتب قائم کیا گیا ہے۔

اصطلاح میں خبر واحد اُس خبر کو کہتے ہیں جو متواتر نہ ہو، اگر تواتر کا عدد کسی طبقے میں پورا نہ ہو تو اس کو خبر واحد کہا جائے گا، خواہ وہ کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو، یہ بھی بلاشبہ قابل عمل اور مثبت احکام ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابۂ کرام نے اس کو قابلِ اعتماد سمجھا ہے اور ہر زمانے کے علماء و فقہاء نے اس پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے، امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف "الرسالہ" میں بہت سی آیات و احادیث سے ثابت

؎ کشف الاسرار ج۲ ص۶۸۱　؎۲ منکرین حدیث نے نادانی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ احادیث متواترہ بہت محدود و قلیل ہیں، حالانکہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، دین کا بڑا حصہ توارث و تواتر کی راہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (ذیل الفرقدین از مولانا انور شاہ کشمیری)

کیا ہے، کہ اخبار احاد قابل اعتماد و واجب العمل ہیں۔ محدثین نے اخبار احاد کے متعلق جو یہ کہا ہے، کہ اس کے ساتھ قرائن نہ ہوں تو "ظن" کا فائدہ دیتی ہے۔ تو اس "ظن" سے ان کی مراد وہ اصطلاحی ظن ہے جو یقین سے نیچے مگر اس سے قریب ہوتا ہے اس سے عام بول چال والا وہ ظن سمجھ لینا جو بے اعتباری کے لیے بولا جاتا ہے۔ انتہائی جہالت ہے اور یہ ایسی ہی جاہلانہ غلطی ہے جیسے کہ کوئی قیاس کو محض اٹکل کے معنیٰ میں لے کر قیاسِ منطقی کی جو استدلال کی مستقل شکل ہے، ہنسی اڑانے لگے، یہ تمسخر فنِ منطق پر نہ ہوگا، بلکہ اپنی بے علمی پر ہوگا، اگر خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے تو بہت سے دنیاوی معاملات بھی معطل ہو کر رہ جائیں گے اسی لیے معتزلہ وغیرہ جو خبر واحد کی افادیتِ علم کے منکر ہیں، ان کے بارے میں شیخ الاسلام علامہ بزدوی فرماتے ہیں۔

من انکر الخبر الواحد فانه	جس نے خبر واحد کا انکار کیا، وہ در اصل
رجل سفیه لا یعرف نفسه	ایک بے عقل آدمی ہے جو اپنے آپ کو بھی نہیں
ولا دینه ولا دنیاه ولا امه	پہچانتا، نہ اپنے دین کو، نہ اپنی ماں کو،
ولا اباه [1]	نہ اپنے باپ کو

اور چونکہ خبر متواتر اور اخبار احاد میں ثبوت کے لحاظ سے بھی اور ان سے پیدا ہونے والے احکام ونتائج کے اعتبار سے بھی فرق ہے (جس کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے) اس لیے دونوں کو ہم پلہ سمجھنا بھی جہالت ہے۔ شیخ الاسلام بزدوی فرماتے ہیں۔

ومن سواہ بالکتاب و	جس کسی نے خبر واحد کو کتاب اللہ
السنة المتواترة فقد	اور سنتِ متواترہ کے ہم پلہ سمجھا اس
اخطأ فی رفعه عن منزلته	نے بڑی غلطی کی کہ خبر واحد کو اس کے
و وضع الاعلیٰ عن منزلته [2]	واقعی درجہ سے بہت اونچا اٹھا دیا اور
	کتاب اللہ اور سنت متواترہ کو اپنے مقام
	سے بہت نیچے گرا دیا۔

(جباری)

---

[1] ظفر الامانی ص۲۲　[2] کشف الاسرار ص ۲۰۴/۲۷۰

اسلامی تحقیق

اس کے معنی و مدعا اور دائرہ کار

(از ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم، اے، پی، ایچ ڈی لٹ)

(۲)

وحی اور عقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہی کیا ہے کہ عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے اسلام کی کوئی تشریح کی جائے اور بار بار کی جائے۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں مل کر انسانی افراد کے اعتقاد و عمل کی راہ نمائی کرنے کے لیے پوری طرح کافی ہیں۔ کیا قرآن اور حدیث نے پہلے ہی ضروری حد تک اپنے مطالب کی وضاحت نہیں کر دی۔ کیا ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خدا کی وحی کے فرامین اور خدا کے رسولؐ کے ارشادات میں ایک حرّ اپنی طرف سے بھی لگائیں اور ان میں اپنی انسانی سمجھ بوجھ اور انسانی عقل و فراست کی بنا پر بھی کچھ باتوں کا اضافہ کریں تاکہ وہ زیادہ قابل فہم اور زیادہ مفید بن جائیں۔ بالخصوص اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ انسان کی ہدایت کے ایک ذریعہ کے طور پر انسانی عقل خدا کی وحی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ خدا کی وحی کے مقابلہ میں عقل انسانی کا ہرگز کوئی مقام نہیں کہ وہ انسان کو یہ بتا سکے کہ انسان اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں انسانی فرد اور جماعت کو اپنی عملی زندگی کی تشکیل کس طرح سے کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود خدا کی

وحی اور انسانی عقل کے درمیان ایک ایسا قدرتی رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور جس کی بنا پر ذیل کے حقائق بالکل درست اور ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہیں۔

اول یہ کہ ہم خدا کی وحی کو اس وقت تک قبول نہیں کر سکتے جب تک کہ ہماری عقل اس وجدان یا یقین کی طرف راہ نمائی نہ کرے کہ وہ درحقیقت خدا کی وحی ہے اور حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو عقل سے کام لینے کی بار بار ہدایت کی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ہر مدعی نبوت کو نبی نہیں مانتے اور جھوٹے سچے نبی میں اپنی عقل کو کام میں لا کر فرق کرتے ہیں؟

دوم یہ کہ خدا کی وحی ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے جو آخر کار ضبط تحریر میں آجاتے ہیں اور ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پڑھنے والا یا سننے والا ان الفاظ پر ایمان لائے اور اُن کے مطابق عمل کرے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ذہن کے اندر کسی مطلب یا معنی یا مدعا میں تبدیل ہوں۔ جب تک کہ وہ ایک خارجی حقیقت سے ایک داخلی احساس میں تبدیل کرنے والے اس عمل میں سے نہیں گزرتے (اور یاد رہے کہ تبدیلی کا یہ عمل سراسر ذہنی اور انسانی ہے۔ خدائی یا آسمانی نہیں) دوسرے لفظوں میں جب تک کہ وہ ایک علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس نہیں پہن لیتے۔ اس وقت تک نہ تو وہ ایمان پیدا کر سکتے ہیں نہ عمل۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وحی کا اتباع کرنے والے لوگوں کے اعتقادات اور اعمال مختلف ہیں اور اسلام جو ایک ہی ہے مذہبی فرقوں اور مذہبی تحریکوں میں اس قدر بٹا ہوا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم قرآن حکیم کے مطالب سمجھتے اور سمجھاتے اور سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ہمارے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو اُس علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس پہنانا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق اُن کی اپنی صحیح توجیہہ ہے۔

سوم یہ کہ خدا کی وحی ہمیں انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ عطا فرماتی ہے، اور فلسفہ کی صورت میں انسان کی عقل بھی انسان اور کائنات کا صحیح نظریہ بہم پہونچانے کی کوشش کرتی ہے۔ عقل انسانی کا یہ وظیفہ جو اس نے خود

بخود اپنے لیے تجویز کر لیا ہے۔ بیک وقت خدا کی وحی کا وظیفہ بھی ہے۔ لہٰذا عقل انسانی خدا کی وحی کے بیانات کو قبول کر لینے کے بعد بھی ان کو زیر غور لانے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ جن سوالات کا قطعی جواب خدا کی وحی پہلے ہی دے چکی ہے یہ ان سوالات کا کوئی ایسا جواب بھی ڈھونڈ نکالے جو اس کے اپنے لیے بھی مکمل طور پر تسلی بخش ہو۔ مثلاً ایک سوال ہے کیا خدا فی الواقع موجود ہے۔ ایک آدمی اس سوال کے اُس جواب پر جو خدا کی وحی نے دیا ہے، مکمل یقین اور ایمان رکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ایک انسان کی حیثیت سے یعنی ایک دارائے عقل و فہم وجود کی حیثیت سے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سوال کا وہ جواب بھی اپنے پاس موجود رکھے جو اُس کی عقل اُس کے لیے مہیا کرتی ہے۔ لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو وہ مجبور ہوگا کہ دونوں کے جوابات کے اندر مطابقت پیدا کرے اور اسے قائم رکھے۔ ورنہ وہ دونوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے گا۔

علمی ترقی کے ہر نئے دور میں اسلام کی نئی عقلی توجیہہ کی ضرورت

نوع انسانی کا ذہنی علم ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور نئے حکیمانہ افکار کے اُس مجموعہ کے اندر جو کسی دور میں رونما ہوتا ہے حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا ہر دور میں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اصلی اسلامی تحقیق کی طرف رجوع کر کے حق کو باطل سے الگ کیا جائے اور غلط اور مخالفِ اسلام حکیمانہ تصورات کی تردید کی جائے اور صحیح اور موافقِ اسلام حکیمانہ تصورات کو کام میں لا کر اسلام کی تائید مزید اور حمایت اور مدافعت کی جائے۔ ہر دور میں اصلی اسلامی تحقیق کے ماہرین کے لیے یہ اہم کام موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نئے علمی افکار کے دانہ کو کاہ سے الگ کریں، دانہ کو کام میں لائیں اور کاہ کو پھینک دیں کہ ہوائیں اسکو اڑا کر لے جائیں۔

دورِ حاضر میں اسلام کو حکیمانہ افکار کا چیلنج

تاہم علمی ترقی کے کسی دور میں بھی اسلام کو حکیمانہ افکار کی طرف سے ایسا زور دار اور خطرناک چیلنج کبھی نہیں دیا گیا جیسا کہ اب دورِ حاضر کے حکیمانہ افکار نے دیا ہے۔ اس وقت فلسفی، ماہر تاریخ، ماہر اقتصادیات، ماہر معاشیات اور ماہر نفسیات سب مل کر اسلام کی جڑوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ میکانکی ارتقا، تحلیل نفسی، حکمیاتی سوشلزم، تاریخی مادیت، منطقی اثباتیت،

کر داریت اور موجودیت کے نظریات جن کی مقبولیت اس زمانہ میں بہ روز بڑھتی جا رہی ہے اور جو نوع انسانی کے اعمال و افعال کو نہایت تیزی سے متاثر کر رہے ہیں ہمارے مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اگر ہم ان نظریات کے علمی چیلنج کا موثر جواب نہ دیں اور ان کی یقین افروز تردید نہ کریں تو ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان نظریات کا جواب دیتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اگر ہمارا جواب دور حاضر کے علمی معیاروں پر پورا نہ اتر سکے۔ اور اپنے استدلال کے حقائق اور تکنیک اور طریقے دنیا بھر میں یورپی کے علماء اور حکماء کو مطمئن نہ کر سکے تو وہ ہرگز کوئی جواب نہ ہوگا۔ اس قسم کا جواب ہم نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو مسلمانوں کی علمی قیادت اور رہبری کے مدعی ہیں جنھوں نے منبروں کو سنبھال رکھا ہے اور جنھوں نے اسلام پر لکھ لکھ کر تفسیروں، اسلامی کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ افسوس کہ علماء دین جو کل تک اسلام اور کفر کی جنگ میں ہر محاذ پر اسلام کی مدافعت کے لیے پیش پیش رہتے تھے آج سو گئے ہیں اور اسلام کو جو نیا خطرہ درپیش ہے، مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اس کے مقابلہ کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرنا تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں کرتے۔ گویا اس کی موجودگی سے ہی ناآشنا ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم مفکرین بھی جو ہمارے مخالف ہیں اس خطرہ سے ہماری غفلت اور اس کے مقابلے میں ہماری عافیت کوشی اور سہل انگاری پر ہمیں طعنہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر ڈبلیو ڈی سمتھ اپنی کتاب موڈرن اسلام ان انڈیا (MODERN ISLAM IN INDIA) میں لکھتا ہے:-

"یہاں دس یا بیس سال پہلے بازاروں کے موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تعلیم یافتہ مسلمان افکار جدید کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا سر کھپاتے تھے۔ آج مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بے خبر اور بے پرواہ ہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کو پیش آتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً مکمل جواب دیا جو عیسائیوں نے اسلام پر وارد کیے تھے۔ آج تجدد پسند مسلمان اس جواب کو کافی سمجھتا ہے۔

اور کوئی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو درکنار ان اعتراضات کا فقط ذکر ہی کرے جو اس زمانہ میں فلسفی، مورخ، ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے اسلام پر اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔ جس طرح انیسویں صدی کے کٹر مسلمان جو عیسائیوں اور آزاد خیال مغربیوں کے اعتراضات کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اور سرسید احمد اور امیر علی کو ان کا جواب دینے کی وجہ سے برا سمجھتے تھے۔ معاشرتی قدامت پسندی کا سہارا تھے اسی طرح سے وہ مسلمان بھی جو ان جدید اعتراضات کا جواب دینے سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ان جماعتوں کی ہی اعانت کر سکتے ہیں جو معاشرتی اعتبار سے قدامت پسند ہیں"۔

مسلمانوں سے عصر جدید کے انسان کا مطالبہ

اسلام نے دور جدید کے انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کر دیے ہیں اور وہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ ان کا ایک ایسا جواب مہیا کریں جو مدلل اور حکیمانہ ہو اور اس قابل ہو کہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی کو قائل کر سکے۔ ان میں سے بعض سوالات یہ ہیں:-

(۱) کیا یہ بات درست نہیں کہ حقیقت کائنات مادی ہے اور روح مادہ کی ایک خاصیت ہے جو اس وقت رونما ہوتی ہے جب مادہ اپنی ترقی اور ترکیب کی ایک خاص حالت پر پہونچ جاتا ہے۔

(۲) کیا یہ بات درست نہیں کہ مذہب محض معاشی حالات کی پیداوار ہے اور خود اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

(۳) کیا انسان کی زندگی کا معاشی پہلو عملی تاریخ کا محرک نہیں اور کیا مذہب اس عملی تاریخ کی ایک عارضی حالت اور ضمنی یا اخلاقی پیداوار نہیں۔

(۴) کیا مذہب دبی ہوئی جبلتِ جنس، یار کی ہوئی حب تفوق یا اٹکی ہوئی غلبہ اور قوت کی خواہش کا غیر فطری اور بے محل اظہار نہیں۔

(۵) کیا مذہب ایک ظالم سوسائٹی کا مصنوعی دباؤ نہیں جو اپنی سلامتی کی خاطر فرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کچھ غیر فطری پابندیوں اور رکاوٹوں کو جنھیں وہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا

نام دیتی ہے اپنے آپ پر عائد کرے۔

(۶) کیا یہ درست نہیں کہ عمدگی اخلاق ایک نسبتی اصطلاح ہو جسکے معنی مختلف قوموں کے لیے اور مختلف حالات کے اندر مختلف ہوتے ہیں۔

(۷) کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی انسان پر وحی نازل کرے یا کوئی انسان سچ مچ نبی بن جائے۔

(۸) کیا نبوت (اگر وہ درحقیقت ممکن ہے) ایک ایسا عارضی واقعہ نہیں جو نوعِ انسانی کی تاقیامت ترقی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

(۹) کیا انسان کی عقل اسے اپنا نیک و بد سمجھانے کے لیے کافی نہیں کہ کسی بیرونی راہنمائی کی ضرورت ہو۔ جب انسان کو عقل دی گئی ہے تو اس نبوت کی خاص ضرورت کیا ہے۔

(۱۰) اگر نبوت کوئی ضروری چیز ہے تو یہ ختم کیوں ہو جاتی ہے اور تاقیامت انسان کی راہ نمائی کے لیے نئے نئے انبیاء کیوں آتے نہیں رہتے۔ وغیرہ

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان سوالات کا ایک ایسا جواب تلاش کریں جو نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق ہو بلکہ پوری طرح سے مدلل اور معقول اور حکمیاتی (SCIENTIFIC) ہو۔ کم ازکم ان تمام جوابات سے زیادہ معقول اور قابلِ قبول ہو جو دوسرے مذاہب یا نظریات کے ماننے والے ان ہی سوالات کے لیے پیش کر رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اُمتِ مسلمہ کے ضمیر نے غیر واضح طور پر ہی سہی لیکن اس بات کو محسوس کرلیا ہو کہ اگر ہم اس قسم کا جواب جو درحقیقت اسلام کی مکمل اور منظم حکیاتی تشریح سے کم نہیں ہوگا فی الفور مہیا نہ کریں تو ایک نظریاتی جماعت کی حیثیت سے ہماری زندگی خطرہ میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تحقیق کی ضرورت کا ایک عام احساس پیدا ہو گیا ہے۔

موجودہ دور کی ایک خصوصیت

اس زمانہ میں انسان کے نظریات بدنی اور جبلّتی ضروریات کی سطح سے بالاتر ہو کر علمی اور اخلاقی سطح پر آگئے ہیں اور لہذا نظریات کی حیثیت سے ان کی موجودگی پوری طرح سے نمایاں ہوگئی ہے۔ یہ زمانہ علمی نظریات کا زمانہ ہے۔ اس دور میں اسلام کے سوائے باقی تمام نظریات

کے قائلین اپنے اپنے نظریات کی علمی اور عقلی توجیہہ اور مدافعت بہم پہونچانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی سیاسی زندگی بلکہ ہر قسم کی زندگی خطرہ میں رہے گی۔ نظریہ جو دراصل انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک مشاہدہ یا وجدان یا ایمان کا نام ہے۔ تنہا وہ قوت ہے جو فرد اور جماعت اور ریاست کے تمام اعمال و افعال پر حکمراں ہے، اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ نظریۂ حیات جس پر کسی ریاست کی بنیاد رکھی گئی ہے علمی طور پر صحیح اور عقلی طور پر اعتراضات سے بالا ہے تو اس سے دو اہم نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس سے ریاست کے ساتھ فرد کی کشش یا محبت بڑھ جائے گی اور ریاست کا اندرونی اتحاد ترقی پائے گا اور اس کی استعداد عمل میں اضافہ ہوگا اور اس کی قوت فروغ پاکر انتہا تک پہونچ جائے گی۔ اس کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کی حدود کے باہر ریاست کے حامیوں اور مددگاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی۔ اور اس طرح سے اس کے سیاسی اثر و نفوذ کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جائے گا۔ جس قدر کوئی نظریۂ حیات زیادہ معقول اور مدلل ہوگا، اور جس قدر زیادہ دلکش اور دل نشین ہوگا اسی قدر زیادہ امکان اس بات کا ہوگا کہ وہ ترقی پاکر زمین کے کناروں تک پھیل جائے اور وہاں ہمیشہ کے لیے موجود رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کے ماننے والے اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی ایک بلند پایہ علمی اور عقلی تشریح پیدا کریں۔ اشتراکیت پہلے ہی ایک سائنسی نظریۂ حیات ہونے کی مدعی ہے۔ ہٹلر کا نظریہ نیشنل سوشلزم اس کی کتاب "میری جدوجہد" میں ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہیگل کے اس نظریہ کی ایک تشکیل جدید تھی کہ ریاست ایک خدا ہے جو غیر محدود حقوق اور اختیارات رکھتی ہے اور اطاعت مطلقہ کی حق دار ہے۔ مسولینی کا کا نظریہ فسطائیت بھی اطالوی فلسفی کروچے کے فلسفیانہ نظام سے عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا تھا۔ امریکہ کے لوگ اب جمہوریت کو محض ایک طرز حکومت نہیں سمجھتے بلکہ ایک فلسفۂ زندگی سمجھتے ہیں اور بعض امریکی مصنفین نے اسے ایک فلسفۂ زندگی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بھارت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ریاست گاندھی کے فلسفۂ زندگی پر مبنی ہے۔ ایک نظریۂ حیات غلط ہو یا صحیح لیکن وہ لوگ جو اس سے محبت رکھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ

اگر کوئی نظریۂ حیات دنیا میں حق ہے یا حق ثابت کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے۔ جب وہ اس کی عقلی اور علمی توجیہہ یا مدافعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام حکمت کو آشکار کریں جو عقلی لحاظ سے دُنیا کے تمام فلسفوں میں یکتا اور یگانہ ہو۔ جو صرف ان کے نظریۂ حیات کے اندر مخفی ہے اور دُنیا بھر میں اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ ہر نظریۂ حیات کا ماننے والا اپنے نظریۂ حیات کے متعلق ایسا ہی خیال رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ حق صرف ایک ہو اس لیے ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی فلسفہ ایسا ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح اور معقول ہو۔ دو یا دو سے زیادہ فلسفے ایسے نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ اپنی اپنی سائنسی توجیہہ اور تشریح کرنے کے لیے نظریات کی دوڑ میں صرف ایک نظریۂ حیات کامیاب ہوگا اور وہی نظریۂ حیات زندہ رہے گا اور پوری دُنیا پر چھا جائے گا۔ اور باقی نظریات مٹ جائیں گے اور زندہ رہنے والے اس نظریۂ حیات کے متعلق یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جائے گی کہ یہی انسان اور کائنات کا وہ آخری صحیح فلسفہ ہے جو عقلِ انسانی کی صبح کے طلوع سے لے کر آج تک تمام فلسفیوں اور سائنس دانوں کا سہانا خواب اور ان کی جستجو کا گوہرِ مقصود بنا رہا ہے۔ یہ باور کرنے کے لیے ہر دلیل موجود ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جو اس قابل ہے کہ انسان اور کائنات کی ایک عقلی علمی اور سائنسی تشریح کی صورت اختیار کر سکے۔ لیکن اب تک ہم نے کون سا کام کیا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارا یہ عقیدہ فی الحقیقت درست ہے۔ اس معاملہ میں ہماری غفلت کو اس حقیقت نے اور زیادہ سنگین اور خطرناک بنا دیا ہے کہ دوسرے نظریات کو ماننے والے لوگ اس وقت بھی دنیا کے اوپر یہ ثابت کرنے کے لیے بہت سا کام کر چکے ہیں کہ صرف ان کے نظریات ہی معقول اور مدلّل ہیں اور دُنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ یعنی نوعِ انسانی کا وہ حصہ جو درحقیقت کوئی اہمیّت رکھتا ہے اور جس میں تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل ہیں ہر روز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ہمرنگ زمیں دام میں گرفتار ہوتا جا رہا ہے۔

ہم اپنے آپ کو غلط نظریات کا معتقد بننے سے کیونکر بچا سکتے ہیں

اس دور میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت

کو پہونچ چکی ہے کہ افکار اور تصورات قوموں کو مفتوح اور مغلوب کرنے والی ایک قوت کی حیثیت سے افواج اور اسلحہ کی تمام قسموں سے زیادہ مؤثر ہیں۔ چونکہ وہ لاسلکی پر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ وہ افواج اور اسلحہ سے بہت زیادہ سریع الحرکت ہیں اور پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں اور صحراؤں کی جغرافیائی رکاوٹیں، بین الاقوامی سیاسی سرحدیں سیگفریڈ اور میجینو ایسی فوجی مدافعتی قلعہ بندیاں ان کی یلغار کو روک نہیں سکتیں۔ ہر ریاست ایک منظم نظریاتی جماعت ہوتی ہے جو اپنے پریس، پلیٹ فارم، ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنی مطبوعات اور دوسرے ملکوں میں قائم کیے ہوئے اطلاعاتی مرکزوں اور کتب خانوں کی مدد سے اپنے نظریہ کی معقولیت اور دلکشی کو ثابت کرنے والے تصورات کی اشاعت کرتی رہتی ہے تاکہ دوسری قوموں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مفتوح اور مغلوب کرے، وہ نظریاتی جماعت جو دوسری نظریاتی جماعتوں کو اپنے تصورات سے مفتوح اور مغلوب کرنے کی کوشش نہیں کرتی اس بات کا خطرہ مول لیتی ہے کہ زود یا بدیر دوسری نظریاتی جماعتیں اسے مفتوح اور مغلوب کر کے ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ نظریات کی اس جنگ کے میدان کے عین وسط میں موجود ہونے کے باوجود ہم عرصہ دراز سے نہ دوسروں کو اپنے تصورات سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہ دوسروں کے تصورات کے بالمقابل اپنی مدافعت اور حفاظت کر رہے ہیں، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس بات کے بہت قریب پہونچ گئے ہیں کہ ہم دوسری قوموں کے تصورات سے ذہنی طور پر مفتوح اور مغلوب ہو کر مسلمان قوم کی حیثیت سے نیست و نابود ہو جائیں۔ ظاہری طور پر ہم مسلمان ہیں لیکن ہم میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے دلوں میں اسلام کے بجائے دوسرے نظریات کی محبت متمکن ہے۔

جس نسبت سے ہم دوسرے تصورات اور نظریات کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اسی قدر اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بد اخلاقی، فریب کاری، بے حیائی، رشوت ستانی خود پرستی، جنبہ داری، خاندان پرستی، صوبہ پرستی، چور بازاری، نفع اندوزی اور دوسری بری خصلتیں جو ہمارے معاشرہ میں روز افزوں ترقی پر ہیں اور جن پر ہم میں سے بعض اچھے لوگ اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں سب اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام پر ہمارا ایمان

مضمحل ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام پر ہمارے یقین و ایمان کے انحطاط کی ایک اور علامت یہ ہے کہ اسلام کے متعلق ہمارے افہام پراگندہ اور ہمارے خیالات پریشان ہیں اور ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے۔ کس قسم کی عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے اور کیوں۔ غلط نظریات اور تصورات کی دھند اس طرح سے چھائی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنا راستہ صاف طور پر نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں کئی خود ساختہ رہبران قوم جو غیر اسلامی نظریات کے دام میں دوسروں سے کم گرفتار نہیں۔ اسلام کی نئی تشریح کرنے کے لیے سامنے آ گئے ہیں۔ گویا وہ اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت اور قابلیت سے اسلام کو اس کی موجودہ مشکلات سے نجات دینے کی زحمت گوارا کر کے مسلمانوں پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی کئی متضاد قسم کی توجیہات وجود میں آ گئی ہیں جن سے ہماری پراگندہ خیالی اور بڑھ رہی ہے اور اس اسلام پر ہمارا ایمان اور کمزور ہوتا جا رہا ہے جس پر تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے عمل کیا تھا۔ اس صورت حال نے بعض مخلص مسلمانوں کو بڑا پریشان کر دیا ہے۔ اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام سے بھٹکنے والے مسلمانوں کو خدا اور رسول اور قرآن کا واسطہ دے کر اسلام کی طرف واپس لایا جائے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود یہ مسلمان اسلام سے روز بروز دور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کوششیں جو درحقیقت بے یقین مسلمانوں کی مشکلات سے بے خبری پر مبنی ہیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ہمیں اس بات کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مسلمان جو اسلام پر اپنا یقین کھو بیٹھتا ہے وہ ایسے افکار و تصورات غیر اسلامی نظریات سے عقل اور علم و دانش اور سائنس اور فلسفہ کے دلفریب ناموں کے ساتھ مستعار لیتا ہے۔ لہٰذا جب تک ہم اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے ایسا علمی اور عقلی ذخیرہ پیدا نہ کریں جو اس کے غیر مسلم استاد کو اسلام کے حق میں پوری طرح سے متاثر کر سکے۔ ناممکن ہے کہ ہم اس کو اسلام کی طرف واپس لا سکیں۔

غیر مسلم کو اسلام کو معتقد بنانے کا طریقہ لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اسلام پیش کرنے کا طریق اس سے بہت مختلف ہے جو ایک مسلمان فرد کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معلم یا مبلغ کی

حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مخاطب کے معلوم سے آغاز کر کے اس کے نامعلوم کی طرف آئیں اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کا معلوم ایک غیر مسلم کے معلوم سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً ایک مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم خدا کی نازل کی ہوئی سچی کتاب ہے۔ ایک غیر مسلم یہ نہیں جانتا۔ وہ صرف قدرت کے ان حقائق اور قوانین کو ہی جانتا ہے جو وہ مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے معلوم کر سکتا ہے اور ہم اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فقط ان ہی حقائق اور قوانین کو بطور دلائل کے پیش کر سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کا یہ طریق نیا نہیں بلکہ یہ طریق بعینہٖ وہی ہے جو خود قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم منکرین کو بار بار اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لیے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ جہاں ان کو خدا کی ہستی اور صفات کے واضح نشانات نظر آئیں گے اور ایسے حقائق کی بنا پر خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہونے کا مدعی ہے۔ جو قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ قرآن حکیم اس بات کی پیش گوئی کرتا ہے کہ خدا مستقبل میں خارجی دنیا اور نفس انسانی سے تعلق رکھنے والے ایسے حقائق کو آشکار کرے گا جن کی روشنی میں منکرین یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ[1] ... اب یہ بات مسلم ہے کہ سائنس اور سائنسی طریق تحقیق یعنی مظاہر قدرت کا علم اور اس کے حصول کے طریق کے موجد مسلمان تھے۔ ظہور اسلام کے بعد مسلمان سائنس دانوں کے ذریعے سے مشاہدۂ قدرت کی ضرورت کے بارے میں قرآن کی راہنمائی سے مستفید ہو کر اب ایک عرصے سے مغرب کے لوگ مظاہر قدرت کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اب ایسے حقائق کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے جو مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان حقائق کو انھوں نے کسی منظم علم کی صورت میں مرتب کیا ہے جس کے مجموعہ کو سائنس کہا جاتا ہے۔ قدرت کے جو حقائق مادہ، حیوان اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بالترتیب طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کا نام دیا گیا ہے۔

---

[1] ہم ان لوگوں کو آفاق عالم میں اور خود ان کے نفوس میں اپنے دلائل اور نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کے لیے یہ بات بالکل ظاہر ہو جائے گی کہ یہ بالکل حق ہے ۱۲۔ (ترجمہ الفرقان)

غیر مسلموں کی کوتاہی

مغرب کے غیر مسلموں نے بے شک مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے بہت سے حقائق کو بڑی احتیاط اور محنت سے دریافت کر کے مختلف علوم کی صورت میں مرتب کر لیا ہے، لیکن بدقسمتی سے وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ان حقائق کا حقیقت کائنات کے ساتھ اور لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ حقائق کسی عقلی اور علمی ربط کے بغیر ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے اہل مغرب اور مظاہر قدرت کے علم کے متعلق ان کے نقطۂ نظر سے متاثر ہونے والی قوموں کے نصب العینوں یا نظریات حیات یا نظام ہائے حکمت کے اندر اس قدر اختلاف موجود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے کہ مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے حقائق جن کو عام فہم زبان میں سائنسی حقائق کہا جاتا ہے عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے حقیقت کائنات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اور ہر نظام حکمت اس کوشش سے عبارت ہوتا ہے کہ حقیقت کائنات کے ساتھ ان کے اس تعلق کو جو نظام حکمت کے موجد کی سمجھ میں آتا ہے واضح کیا جائے اور استدلال کی قوت سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہر نظام حکمت اس کوشش سے صورت پذیر ہوتا ہے کہ سائنسی حقائق کو ان کے علمی اور عقلی ربط و ضبط کے ساتھ منظم کیا جائے۔ ایک نصب العین حقیقت کائنات اور اس کے اوصاف و خواص کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ایک نظریۂ حیات ایک مجموعۂ تصورات ہوتا ہے جو کسی نصب العین سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عقلی اور علمی لحاظ سے منظم ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک نظام حکمت یا فلسفہ ایسے تصورات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو کسی نصب العین کے ماتحت عقلی اور علمی لحاظ سے مربوط اور منظم کیے گئے ہوں۔

فلسفی کا طریق کار

فلسفی کو سب سے پہلے حقیقت کائنات کے متعلق ایک وجدان یا ایقان یا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جو اس کے معلوم حقائق پر اس کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے خیال میں ان حقائق سے مطابقت رکھتا ہے، پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ حقیقت کائنات کے اس وجدانی تصور کے ساتھ معلوم حقائق کے علمی اور عقلی تعلق یا ربط کی وضاحت کرے۔ اس کوشش کے ذریعہ سے وہ دراصل اپنے وجدانی تصو

حقیقت کی عقلی توجیہ کرتا ہے اور یہی توجیہ ان کا فلسفہ کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا وجدانی تصورِ حقیقت غلط ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہ بھی غلط ہوگی اور اس کے افکار و تصورات کی عقلی ترتیب اور منطقی تنظیم کے اندر جا بجا ناہمواریاں اور نادرستیاں ابھر آئیں گی اور رخنے اور جھول پیدا ہو جائیں گے جن کو وہ یا تو نظر انداز کرے گا یا اپنے دلائل کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے گا۔ اس قسم کے رخنوں اور جھولوں کا ظہور انسانی اور اجتماعی علوم میں مثلاً نفسیاتِ فرد و جماعت میں اور سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تعلیمات، فن، قانون اور تاریخ کے فلسفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علوم براہ راست فلسفی کے نظریۂ حقیقت پر جس میں نظریہ انسانی بھی شامل ہو مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ حکمائے مغرب خود تسلیم کرتے ہیں) مغرب میں نشو ونما پانے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں ایک شدید قسم کا منطقی اور عقلی انتشار پایا جاتا ہے اور جب صورتِ حالی یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان کی حقیقت روحانی توجیہ کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری طرف سے انسانی اعمال و افعال کے مغربی حکمار انسان کی میکانکی اور مادی توجیہ پر مصر ہوں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مغرب میں پروان چڑھنے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں انتشار موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر فلسفی کا وجدانی تصورِ حقیقت درست ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہ کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام علمی حقائق آسانی کے ساتھ ایک دلکش تنظیم اختیار کرلیں گے اور ایک مکمل نظامِ حکمت کے اندر ایک ایسی مکمل منطقی ترتیب کے ساتھ آراستہ ہو جائیں گے جس میں کوئی رخنہ یا جھول موجود نہیں ہوگا۔ ——— (باقی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۶)

ہوئی۔ حضرت شیخ سے بہت تعلق کا اظہار کرتے رہے اور بہت بلند کلمات فرمائے۔ حضرت شیخ پر بھی بڑا تاثر تھا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن اچانک فجر کی نماز کے لیے مسجد نبوی جاتے ہوئے راستے میں ایک دوست نے اطلاع دی کہ رات نصف شب کے قریب مولانا نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

بعد نماز فجر متصلاً نماز جنازہ ہوئی۔ ارادتمندوں اور اہلِ تعلق کو اطلاع دینے کا نہ وقت تھا اور نہ وہ ذرائع جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن مولانا کی مقبولیت تھی کہ جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا غیر معمولی مجمع تھا۔ حضرت شیخ اپنی معذوری کے باوجود اخیر تک شریک رہے۔ سیدنا عثمان غنیؓ کی قبر مبارک سے کچھ فاصلے پر تدفین عمل میں آئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ [illegible] طور پر جو سلسلہ ان کی ذات سے قائم تھا اس کا باقی رہنا موجودہ حالات کے پیش نظر بہت مشکوک نظر آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مرحوم کے درجات زیادہ سے زیادہ بلند ہوں اور جو سلسلۂ رشد و ہدایت ان کی ذات سے قائم تھا وہ باقی رہے۔ ادارۂ الفرقان حضرت مرحوم کے تمام متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہے اور وہ مخلصانہ تعزیت پیش کرتا ہے۔

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL. 37 NO. 5 AUGUST 1969

مرتّب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

تذکرہ مجدد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے امت نے ان کو کسی ایک صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزارے (از سنہ ۱۰۰۰ تا سنہ ۲۰۰۰) کا مجدد مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں خاص کر اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور ان کے دینی تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں مجدد الف ثانی کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۳۵۲ ، سائز متوسط ، قیمت ۴/
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

فی کاپی ... ... ۷۰ پیسے

جلد ۳۷	بابت ماہ جمادی الآخر سنہ ۱۳۸۹ھ مطابق ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء	شمارہ (۶) ۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

دار العلوم دیوبند میں گزشتہ مہینے جو شورش برپا ہوئی اور شرپسند طلبہ نے جس طرح پورے دار العلوم پر قبضہ کر کے اس کے سارے نظام کو دس دن تک معطل رکھا اور اس سلسلہ میں جو افسوسناک اور پوری دار العلومی برادری کے لیے جو رُسوا کن حرکتیں اُن سے سرزد ہوئیں اور پھر جس طرح اُن کے مطالبہ پر ارجنٹ تاروں کے ذریعہ مجلسِ شوریٰ کے جلسہ کے لیے اس کے ارکان کو طلب کیا گیا پھر اس نے جو فیصلے کیے اور اس کے نتیجہ میں جس طرح دار العلوم کو کچھ دنوں کے لیے بند کر دینے کا اعلان کرنا پڑا اور پھر جس طرح دار العلوم کا تخلیہ کرایا گیا ــــ ان سب باتوں کا ذکر گزشتہ شمارہ کے انہی صفحات میں خاصی تفصیل سے کیا جا چکا ہے ــــ اس کے بعد آپ حضرات کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ ۲۰ دن بند رہنے کے بعد ۱۱ اگست کو دار العلوم کھل گیا اور تعلیم شروع ہو گئی۔

ہم مسلمانوں کی شامتِ اعمال کے نتیجہ میں جو بدبختی ملّتِ اسلامیہ پر عذابِ الٰہی کے طور پر مسلط ہے اُس کا ایک ظہور یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں ــــ خواہ وہ کیسا ہی ناقابلِ اختلاف ہو ــــ گروہ بندی اور پارٹی فیلنگ کی بنیاد پر، اختلاف و افتراق اور معرکہ آرائی ہماری تقدیر بن گئی ہے۔ دار العلوم کی حالیہ اسٹرائک میں شرپسند طلبہ نے جو انتہائی مذموم اور جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا اور اپنے حدیث و تفسیر کے اساتذہ کی شان میں گستاخیاں کر کے جس شرمناک تسفل اور نالائقی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی بنا پر خیال تھا کہ مسلمانوں کے کسی عنصر کی حمایت بھی ان کو حاصل نہ ہو سکے گی ــــ لیکن

غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

بڑے دکھ کے ساتھ یہ دیکھا گیا اور دیکھا جا رہا ہے کہ ہم ہی میں کا ایک طبقہ ان کی حمایت و وکالت کے لیے اس طرح کھڑا ہو گیا ہو جس کی کوئی اچھی توجیہ کرنے سے کم از کم راقم سطور دل کی پوری خواہش کے باوجود عاجز رہا۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ دار العلوم ایک دینی تعلیمی تربیتی درسگاہ ہے، اس کا موضوع اصلاً قرآن و حدیث اور دوسرے علوم دین کی تعلیم اور اس کے ذریعہ ایسے لوگوں کو تیار کرنا ہے جو میراث نبوی (علم کتاب و سنت) کے امین بن کر دین کی علمی ذمہ داریاں سنبھال سکیں ——— اور بار بار کے تجربے سے معلوم ہو چکا کہ ایسی کسی بھی دینی درسگاہ میں اسٹرائک کی تحریک اور کوشش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حدیث، تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم دین کے پڑھنے والوں کو پڑھنے سے روکا جائے۔ اور سارے تعلیمی نظام کو معطل کیا جائے ——— مزید برآں اُن طلبہ کو جنھیں وارث انبیاء اور اُمت کا راہنما بننا چاہیے، اساتذہ اور منتظمین کا حریف بنا کر اس طرح کھڑا کر دیا جائے جس طرح کارخانوں اور ملوں کے مزدور ان کے مالکوں کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں، اور پھر ان کی ذہنیت کو مسموم اور سیرت کو برباد کر دیا جائے۔

اس کھلی حقیقت اور بار بار کے تجربے کے پیش نظر دار العلوم کی مجلس شوریٰ اب سے بہت پہلے اُصولی طور پر یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ دار العلوم میں اسٹرائک کا نعرہ اور اس کی کوشش قابلِ اخراج جرم ہے ——— مجلس کے اس فیصلہ کے علم کے باوجود طالب علموں کے ایک شر پسند طبقہ نے ۱۱ جولائی سے دار العلوم میں اسٹرائک کرائی اور اس سلسلہ میں وہ ناکردنی اور ناگفتہ بہ حرکتیں کیں جن کا ذکر الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں بھی کیا جا چکا ہے ——— اس عاجز راقم سطور کی پوری دیانت داری کے ساتھ رائے ہے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان مجرم ہوتے اور دار العلوم کے ساتھ خیانت کرتے اگر وہ ایسے شر پسندوں کے اخراج کا فیصلہ نہ کرتے ——— پھر یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ اس اسٹرائک کی تحریک میں جو خاص الخاص لیڈر اور سرغنے تھے ان میں زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے اس سے پہلے بعض دوسرے دینی مدارس میں بھی اسی قسم کی حرکتیں کی تھیں اور وہاں سے بھی وہ خارج کیے گئے تھے اور انھوں نے اپنی اس مجرمانہ حیثیت کو چھپا کے اور بعضوں نے اپنے نام تبدیل کر کے دار العلوم میں داخلہ لیا تھا۔

اب جو حضرات طلبہ کے اس عنصر کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لیے حقائق کو صریح طور پر توڑ مروڑ رہے ہیں بلکہ اُن میں سے بعض اُس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی تاویل تاویل غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں کر رہے ہیں جو صرف ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں ذرہ برابر خدا کا خوف نہ ہو ــــ خدارا کوئی بتائے کہ ان لوگوں کو کیسے دارالعلوم کا مخلص سمجھا جائے اور ان کی ناخدا ترسانہ صریح دروغ بیانیوں کی کیا تاویل کی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کے بعض ایسے بیانات اور مضامین اخبارات میں پڑھ کے جو تغفل اور ناخدا ترسی کا قابل عبرت نمونہ تھے، بہت دل دکھا ــــ صوبہ بہار کے ایک صاحب کا بیان (جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ "قاسمی" لکھ کر اپنے مولوی اور دارالعلوم دیوبند کا تعلیمیافتہ ہونے کا یقین دلایا ہے) پٹنہ کے ایک اخبار میں شائع ہوا، پھر اسی کے حوالے سے کانپور کے ایک روزنامہ نے بھی اُس کو بڑے اہتمام سے پورے مضمونی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا، ایک صاحب نے دیکھنے کے لیے راقم سطور کو بھی پہنچا یا ــــ مجھے یاد نہیں آتا کہ عمر بھر میں کبھی اس دیدہ دلیری اور ناخدا ترسی کے ساتھ غلط بیانی اور افترا پردازی کا ایسا نمونہ دیکھا ہو ــــ پھر غضب خدا کا اس بندۂ خدا نے یہ بھی لکھا کہ اسٹرائک کے ایام میں اتفاق سے میں دیوبند میں تھا اور جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ میرا چشم دید ہے، پھر غضب بالائے غضب قرآنی آیت "لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" لکھ کر بیان شروع کیا ــــ پھر جو کچھ بیان میں لکھا کاش اُس میں سے دس یا پانچ فیصدی ہی صحیح ہوتا، خدا کے بندہ نے اول سے آخر تک واقعات تصنیف کیے۔

ناظرین کی عبرت آموزی کے لیے نمونہ کے طور پر اس بیان کی صرف چند وہ باتیں ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق کھلے واقعات سے ہے اور جن کا غلط اور خلاف واقع ہونا ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا ہے۔

(۱) اسٹرائک کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بارہ[۱۲] طالبعلموں کو خارج کر دیا گیا تھا، اس پر طلبہ نے یہ اسٹرائک کی تھی (ملخصا) ــــ واقعہ یہ ہے کہ اسٹرائک سے پہلے ۱۲ طالب علموں کے اخراج کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، یہ محض بیان دینے والے صاحب کی تصنیف ہے۔

(۲) مجلس شوریٰ کے جلسہ کے بارہ میں اس بیان میں لکھا گیا ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب کی تشریف آوری میں کچھ تاخیر ہوئی، اس موقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے جلسہ کی صدارت کے لیے مولانا سنت اللہ صاحب کا نام پیش کر دیا اور اُن کو صدر

بنادیا (ملخصاً) ـــــ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۷ر جولائی کو جس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس باقاعدہ شروع ہوا ہے حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب مدظلہٗ تشریف فرما تھے اور کافی دیر پہلے تشریف لے آئے تھے اور اتفاق سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے، وہ اجلاس شروع ہوجانے کے بعد تشریف لائے۔ اور مولانا سید منت اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک خود حضرت مولانا سید فخرالدین نے پیش فرمائی تھی۔

(۳) اس بیان میں لکھا گیا ہے کہ طلبہ سے دارالعلوم کے تخلیہ کے لیے ڈیڑھ ہزار ملٹری کے جوان آئے۔ جو فلاں فلاں اسلحہ سے مسلح تھے، اور دارالعلوم کے خزانہ سے اُن پر فی کس دس روپے کے حساب سے خرچ کیا گیا (ملخصاً) ـــــ (لاحول ولاقوۃ الاباللہ)

اصل واقعہ یہ ہے شرپسند طلبہ کی شوریدہ سری اور جارحانہ روش کے پیش نظر جب مجلس شوریٰ نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کیا اور آخری چارۂ کار کے طور پر دارالعلوم کو چند روز کے لیے بند کردینے اور اُن اسٹرائکی طلبہ سے جو اس پر پورا قبضہ کیے ہوئے تھے، تخلیہ کرانے کا فیصلہ کیا تو امن وامان اور دارالعلوم کی املاک کے لیے سنگین خطرات کے پیش نظر مقامی حکام اور پولیس کو اطلاع دینا اور اُن کا تعاون حاصل کرنا ضروری سمجھا، وہ حضرات پولیس کی اتنی جمعیت کو ساتھ لے کر آگئے جس کو انھوں نے اُن حالات کے لیے کافی سمجھا، یہ سب کل تین سو کے قریب پولیس مین تھے۔ ان میں ایک بھی ملٹری کا آدمی نہیں تھا، اور دارالعلوم کا ایک پیسہ بھی ان پر صرف نہیں ہوا، ہر شخص جانتا ہے کہ ایسے خطرات کے مواقع پر تحفظ امن اور تحفظ املاک کا انتظام کرنا خود حکومت کی ذمہ داری ہے، اس لیے کسی صرفہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

بہرحال ملٹری کے ڈیڑھ ہزار مسلح جوانوں کا افسانہ اور اُن پر فی کس دس روپے یومیہ دارالعلوم کے خزانہ سے صرف کیے جانا، دارالعلوم کے ذمہ داروں پر نہایت ظالمانہ اور غلیظ قسم کا بہتان ہے۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۝

جیسا کہ عرض کیا گیا پورا بیان اسی قسم کی ناخداترسانہ دروغ بافیوں اور افترا پردازیوں کا مجموعہ ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اسٹرائکی طلبہ کے جو آٹھ مطالبات اس بیان میں ذکر کیے گئے ہیں اُن میں بھی زیادہ تر ان "قاسمی" صاحب کے تصنیف کردہ ہیں اور ان مطالبات سے بالکل مختلف ہیں جو اُن طلبہ نے مجلس شوریٰ کے سامنے ۱۸ر جولائی کو تحریری طور پر پیش کیے تھے اور بعد میں اپنے بیانوں اور

پوسٹروں، اشتہاروں میں بھی وہ ان کو شائع کرتے رہے ہیں ـــــ راقم سطور بالکل نہیں سمجھ سکا کہ مطالبات کے بارے میں یہ غلط بیانی آخر کس لیے کی گئی ہے۔

بہرحال یہ پورا بیان اخلاقی تسفل اور ناخدا ترسی کا عبرتناک نمونہ ہے، اور عرض کیا جا چکا کہ یہ ایک ایسے صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے، جنھوں اپنے نام کے ساتھ "قاسمی" لکھ کر اپنے کو دارالعلوم کا تعلیمیافتہ اور دیوبند کے دینی وعلمی حلقہ سے وابستہ ظاہر کیا ہے اور قوم کے سامنے اپنے کو دارالعلوم اور اس کی مجلس شوریٰ کے مصلح کی حیثیت سے پیش کیا۔

اسی سلسلہ میں ابھی ابھی دہلی کا چھپا ہوا ایک پمفلٹ ڈاک سے آیا، اس پر چند حضرات کے نام ہیں جنھوں نے اپنے کو "برادران قاسمی" اور "ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند" لکھا ہے، اول سے آخر تک پڑھا ـــــ کاش یہ حضرات اپنی اجتماعیت اور نسبت کی عظمت کا لحاظ فرماتے ہوئے ایسا رویہ اختیار فرماتے کہ دارالعلوم کے ذمہ دار اور مجلس شوریٰ کے ارکان اختلاف رائے کے باوجود ان کی تنقید اور مشوروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھ سکتے اور اُن سے کچھ استفادہ کر سکتے ـــــ اس وقت اس پمفلٹ پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں، اُس کی صرف ایک بات کے سلسلہ میں کچھ عرض کر دینا ضروری ہے کیونکہ اس کا خاص تعلق مجھ ہی سے ہے اور اس کو غیر معمولی اہمیت کے ساتھ مقطع کے بند کے طور پر اُس میں پیش کیا گیا ہے۔

اس پمفلٹ کے صـــــ ۱۳ پر " اہم ثبوت " کا عنوان قائم کر کے لکھا گیا ہے۔

" ہمیں ناقابل تردید طور پر معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ کے نام سے جو بیان شائع ہوا ہے وہ صاحبزادۂ محترم مولانا سالم صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔ "

اب سنیے کہ واقعہ کیا ہے ـــــ ۱۹ر جولائی کو جب مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق اسٹرائکی طلباء سے دارالعلوم کا تخلیہ ہو گیا، تو ارکان مجلس نے ضرورت محسوس کی کہ اس سلسلہ میں ایک بیان مجلس شوریٰ کی طرف سے جاری ہونا چاہیے۔ اس ناچیز نے عرض کیا کہ مولانا سید محمد میاں صاحب یا مولانا سید منت اللہ صاحب اس کو مرتب کریں، ان دونوں حضرات اور دوسرے صاحبان نے بھی اصرار فرمایا کہ یہ ناچیز ہی اس کو مرتب کرے۔ بالآخر یہ ذمہ داری مجھ پر ہی ڈالدی گئی ـــــ

۲۰ر جولائی کی صبح کو میں نے ارکان مجلس اور صدر مجلس سے اجازت لے کر تنہائی میں بیان لکھا

شروع کیا، جب اپنے نزدیک اس کو مکمل کر لیا تو دوسرے ارکان کو لاکر سنایا، ان حضرات نے بعض لفظی ترمیموں کا مشورہ دیا، ان ترمیموں کے بعد میں نے خود ہی اُس کی تبیض کی اور اُس کو مجلس میں پڑھ کر سنایا، جو ارکان اُس وقت موجود تھے اُن سب نے اُس پر دستخط کیے[1] (بیان کی وہ دستخطی کاپی حسب ضابطہ دارالعلوم میں محفوظ ہی پھر جب طباعت کے لیے اُس کی کتابت کرائی گئی تو خود اس عاجز نے اس کی کاپی اور پھر پروف کی بھی خود ہی تصحیح کی۔

الغرض لکھے جانے سے لے کر چھپنے کی منزل تک مولانا محمد سالم صاحب سے اُس بیان کا کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ مجھے یقین ہو کہ دوسرے حضرات کی طرح مولانا محمد سالم صاحب نے بھی اُس بیان کو چھپنے کے بعد یا ٹائپ کی نقلیں نکلنے کے بعد ہی دیکھا ہوگا ــــ لیکن ہمارے چند محترم "برادران قاسمی" اور "ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند" کا انکشاف ہو کہ

"ہمیں ناقابل تردید طور پر معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ کے نام سے جو بیان شائع ہوا ہو وہ صاحبزادہ محترم محمد سالم صاحب کا مرتب کیا ہوا ہو۔"

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اب للہ کوئی بتائے کہ یہ گنہگار بھی اور مجلس شوریٰ دارالعلوم کے دوسرے ارکان جو اصل حقیقت سے ذاتی طور پر واقف ہیں اپنے اِن "برادران قاسمی" کے بارے میں کیا رائے قائم کریں اور اُن سے کیا رہنمائی حاصل کریں۔

یہ عاجز اب سے ۴۵ سال پہلے دارالعلوم میں ایک طالب علم کی حیثیت سے رہا، اُس کے بعد بھی اللہ کی توفیق اور اپنے اکابر و اساتذہ کی خصوصی عنایت و شفقت کے نتیجے میں مسلسل رابطہ

---

[1] مجلس کے ارکان میں سے دو حضرات مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب اس سے پہلے دہلی تشریف لے جا چکے تھے لیکن چونکہ دونوں حضرات پوری کارروائی میں شریک تھے اور رجسٹر کارروائی پر ان کے دستخط تھے اس لیے ضابطہ کے مطابق بیان پر اُن کے بھی دستخط ثبت کیے گئے۔

نصیب ہوا اور پوری چوتھائی صدی سے اس کی مجلس شوریٰ کا رکن ہوں اس لیے اس کی تاریخ اور اُس کے سیاہ وسپید سے اچھی طرح واقف ہوں ــــــ فی الحقیقت دارالعلوم کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ خدا کے فضل سے اس کی آمدنی اور اس کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے، اس کا بجٹ جو میری طالب علمی کے زمانہ میں ایک لاکھ کے لگ بھگ تھا، اب ۱۲ لاکھ تک پہنچ چکا ہے، عمارتیں بہت بڑھ گئی ہیں، طلبہ کی تعداد اور اسی طرح اساتذہ اور دیگر ملازمین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے لیکن تعلیم اور سیرت سازی جو اصل مقصد ہے اُس میں تشویشناک انحطاط ہے، طلبہ کی بے راہ روی اور اُس کے نقطۂ آخر تک میں عبرتناک حد تک اخلاقی پستی۔ اس کے نتائج اور مظاہر ہیں (اور یقیناً اس میں کچھ داخلی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا بھی دخل ہے) دارالعلوم کے تمام ذمہ دار حضرات اور اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان (جن میں یہ عاجز بھی شامل ہے) کا فرض ہے کہ وہ اسی مسئلہ کو توجہ کا اصل مرکز اور مصرف بنائیں ــــــ اور اپنے کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھ کر وہ اقدام کریں جو صورت حال کی اصلاح کے لیے ضروری ہو ــــــ وَاللّٰہُ وَلِیُّ التَّوْفِیْق۔

درسِ قرآن (مرکز والی مسجد)

۶ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ ۲۲ جون ۱۹۶۹ء

عیسائی امت کی گمراہیوں کے بارے میں

سرِ محشر حضرت عیسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ کا پُرجلال سوال اور اُن کا جواب

حمد و صلوٰۃ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

المائدہ ع ۱۶ (آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰)

اور اُس وقت کا تصور کرو جب اللہ (اپنے پیغمبر مسیحؑ سے) پوچھے گا کہ اے مریم کے فرزند عیسیٰ کیا تو نے (اپنی اُمت کے) اِن لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا، تو وہ (جواب میں) عرض کریں گے تو پاک ہے، میرے لیے سزاوار نہ تھا کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہ تھا، اگر میں نے کہا ہوتا تو تیرے علم میں ہوتا، تجھے میرے دل کی باتوں کا بھی علم ہے اور مجھے تیرے رازوں کی بالکل خبر نہیں، بیشک تو ہی علام الغیوب ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت اور پرستش کرو جو میرا تمہارا اور سب کا پروردگار ہے، اور میں اُن کا نگراں تھا جب تک میں ان کے اندر رہا، پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا تو تو ہی ان کو دیکھنے والا تھا اور تو ہر چیز پر گواہ اور پوری طرح واقف حال ہے اگر تو ان کو عذاب دینے کا فیصلہ کرے تو یہ تیرے بندے ہیں (اور تیرا فیصلہ برحق ہوگا) اور اگر تو ان کی معافی اور درگذر کا فیصلہ کرے تو سب کچھ تیرے اختیار میں ہے اور تو حکیم بھی ہے (اس لیے تیرا فیصلہ حکیمانہ ہی ہوگا اور کوئی اسے چیلنج نہ کر سکے گا) اللہ تعالیٰ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ راست بازبندوں کو ان کی راست بازی نفع پہونچائے گی (اور وہ اس کا پھل پائیں گے) اُن کے لیے بہشتی باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ ہے عظیم کامیابی۔ آسمان و زمین اور جو کچھ اُن میں ہے سب کی بادشاہی اور فرمانروائی اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور ہر چیز اس کی قدرت کے تحت ہے۔

المائدہ آخری آیات از ۱۱۶ تا ۱۲۰

تفسیر و تشریح :-

یہ سورۂ مائدہ کی بالکل آخری آیتیں ہیں، انہی پر سورہ ختم ہے، اوپر کی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن سرِ محشر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے اپنے انعامات یاد دلائے

کہ میں نے تم کو رُوح القدس کی تائید سے نوازا اور تمہارے ہاتھ پر فلاں فلاں غیر معمولی قسم کے معجزے ظاہر کیے اور حواریوں کو تم پر ایمان لانے کی توفیق دی اور ان کو تمہارا پیرو کار اور تمہاری دعوت کا علمبردار بنا دیا، یہ سب میرے حکم اور میری قدرت سے ہوا تمہارے کسی ذاتی کمال کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا ـــــ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ پُر جلال سوال حضرت عیسیٰ سے کیا جائے گا جس کی تمہید کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد دلائی تھیں ـــــ ان آیتوں میں، اسی سوال اور اس کے جواب کا ذکر فرمایا گیا ہے ـــــ ارشاد ہوا ہے۔

"وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ط"

اُس وقت کا تصور کرو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے برسر محشر پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی اور بتایا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو بھی اللہ کے سوا معبود بنا لینا اور ہماری بھی پرستش کرنا؟ ـــــ حضرت عیسیٰ اپنے اُمتیوں کے مشرکانہ طرزِ عمل سے اپنی برأت اور بیزاری ظاہر کرتے ہوئے عرض کریں گے، اور خود خداوند علام الغیوب کو گواہ بنا کر عرض کریں گے۔

"سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ط إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ط تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ط إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ط وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○

یہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ہے، وہ عرض کریں گے ـــــ خداوندا تیری عالی ذات ہر قسم کے شرک اور شریکوں سے پاک ہے۔ میرے لیے قطعاً سزاوار اور ممکن نہیں تھا کہ ایسی بات اپنے منھ سے نکالوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں ـــــ خداوندا اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو ضرور تیرے علم میں ہوتی تجھے تو میرے دل کی باتوں اور ارادوں کی بھی خبر ہے۔

تو علام الغیوب ہے۔ تو جانتا ہے کہ میرے دل میں کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں آیا۔ اس کے برعکس میں نے لوگوں سے وہی کہا اور ان کو وہی بتایا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا اور وہ یہ کہ صرف اس اللہ کی پرستش کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اور خداوندا میں جب تک ان کے درمیان تھا ان کے حالات سے باخبر تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا، پھر جب تو نے مجھے اٹھایا تو تو ہی ان کو دیکھنے والا اور ان کا نگراں تھا ۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ خداوندا تو جانتا ہے کہ ان لوگوں نے جو مشرکانہ عقیدے میرے اور میری ماں کے بارے میں اختیار کیے وہ اس زمانے میں کیے جب میں ان کے درمیان نہیں تھا اور تو نے مجھے ان کے پاس سے اٹھا لیا تھا، یہ سب کچھ تیری نگاہ کے سامنے ہے اور تجھ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔

اس جوابی گذارش کے آخر میں حضرت عیسیٰؑ اُن عیسائیوں کے بارے میں جنھوں نے ان کو اور ان کی والدہ حضرت مریم کو معبود بنایا تھا یہ بھی عرض کریں گے۔

"إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

خداوندا اگر تو ان کو عذاب دینے کا فیصلہ فرمائے اور جہنم میں ڈالے تو یہ تیرے بندے ہیں اور انھوں نے شرک کا جرم کیا ہے اس لیے ان کے حق میں عذاب کا تیرا فیصلہ بالکل برحق ہوگا۔ اور اگر تو ان کی معافی کا فیصلہ فرمائے تو چونکہ اقتدار اعلیٰ تیرا ہی ہے اور تو حکیم بھی ہے اس لیے تیرے اس فیصلہ کے سامنے بھی کوئی دم نہ مار سکے گا اور کوئی اس کو چیلنج نہ کر سکے گا۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ سرسری نظر میں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ "إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ" کے بعد" إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" کی جگہ " إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ" ہوتا۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں " إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" ہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ اگر اللہ کے حضور میں یہ عرض کرتے کہ "إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ" تو اس میں سفارش کے معنی پیدا ہو جاتے اور مشرکین کے حق میں مغفرت کی سفارش کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

سفارش کے شبہ سے بھی دامن بچاتے ہوئے عرض کریں گے "وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝"

یہ آیت بڑی عظیم القدر ہے۔ حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلعم پوری رات کی نماز میں یہی ایک آیت پڑھتے رہے۔ "إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ"۔ اس وقت آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ یہانتک کہ رکوع اور سجدے میں بھی اس رات آپ یہی آیت پڑھتے رہے "إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ"۔

یہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ہوا۔ آگے ارشاد ہے۔

قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ ہمارے سچے بندوں کو جنھوں نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ زندگی گزاری، جو کہا وہ کر دکھایا، تو ان صادقین کو اُن کی سچائی اور راست بازی آج پورا نفع پہونچائے گی۔ وہ اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ انھیں وہ بہشتی باغات عطا ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن کی وجہ سے وہ سدا شاداب اور پُربہار رہیں گے "خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا" وہ ہمیشہ ہمیشہ ان بہشتی باغوں میں رہیں گے۔ "رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ" اور سب سے بڑی دولت ان کو یہ حاصل ہوگی کہ ان کا مالک و مولیٰ اور ان کا محبوب حقیقی ان سے راضی خوش ہوگا کیونکہ انھوں نے بندگی کا حق ادا کر دیا۔ اور وہ اُس سے راضی و خوش ہوں گے کیونکہ وہ ان کو اس دن بھرپور نعمتوں سے نوازے گا اور ان کے دل کی ہر چاہت پوری کرے گا ——— آگے فرمایا گیا ہے۔

"ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ" بندوں کے لیے یہ عظیم ترین کامیابی ہے کہ ان کو جنت اور رضائے الٰہی نصیب ہو اور وہ اپنے مالک کی عنایات سے راضی اور خوش ہوں۔

اس آیت کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی سے نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت

ایک عمومی اعلان اور منشورِ عام کی ہے اس میں اُن سب بندوں کے لیے بڑی روح پرور بشارت ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے معاملہ میں سچے ہوں۔ ایسے ہی بندوں کے لیے دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے "رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (یعنی وہ لوگ جنھوں نے اس عہد کو پورا کیا اور سچ کر دکھایا جو انھوں نے اللہ سے کیا تھا) قرآن پاک میں جا بجا ایسے صداقت شعار اور وفادار بندوں کے لیے جنت اور رضائے الٰہی کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ اور مائدہ کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حق میں یہ اعلان فرمائے گا اُس وقت اِن بندوں کو جو خوشی حاصل ہو گی وہ بجائے خود بہت بڑی نعمت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔

اس کے بعد سورت کی بالکل آخری آیت ہے۔

"لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے یعنی ساری کائنات اُس سب پر اللہ کی اور صرف اللہ کی حکومت اور فرمانروائی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اور جب اس کی یہ شان ہے تو بندوں کو اُسی کی عبادت اور اسی کی فرمانبرداری و اطاعت کرنی چاہیے۔ اور اُسی کی رضاجوئی کو اپنا نصب العین بنانا چاہیے۔

سورۂ مائدہ کی جو آخری آیتیں آج تلاوت کی گئیں تھیں، اُن کے ترجمہ اور مطلب کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کرنا تھا وہ عرض کیا جا چکا۔ ان ہی آیتوں سے متعلق ایک بات اور قابلِ ذکر ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں اور پھر سورۂ نساء میں یہ واقعہ کسی قدر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اسرائیلی سلسلہ کے آخری پیغمبر تھے جب اللہ تعالیٰ نے انھیں منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا اور ان کے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے ظاہر فرمائے تو ان کی قوم کے لوگوں نے یعنی یہودیوں نے پہلے تو ان کی تکذیب کی اور ان کو جھوٹا مدعیِ نبوت ٹھیرایا اور جادوگر بتایا اور طرح طرح سے ان کو ستایا۔ اس کے بعد ان کے خلاف حکام کے کان بھرے

اور اس کی کوشش کی کہ حکومت ان کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دے ــــ مروجہ انجیلوں میں بھی یہ واقعہ خاصی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے آگے انجیل کا بیان اور قرآن کا بیان مختلف ہے۔ انجیل کا بیان ہے کہ یہودیوں کا یہ ناپاک منصوبہ کامیاب ہو گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پکڑ کے سولی پر چڑھا دیے گئے۔ خود یہودی بھی اسی کے مدعی ہیں۔ قرآن مجید میں یہودیوں ہی کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔ "اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" (یعنی ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کروا دیا اور اسے سولی دلوا دی) لیکن قرآن پاک کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہودیوں کے اس ناپاک منصوبہ کو خاک میں ملا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام جس طرح عجیب وغریب معجزانہ طریقہ سے بن باپ کے نفخۂ ملکی سے پیدا کیے گئے تھے اور جس طرح انتہائی غیر معمولی قسم کے بہت سے معجزے اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کیے تھے ایسے ہی معجزانہ طریقے سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ٹھیک اُس وقت اٹھا لیا جب یہودی اور حکومت کے سپاہی ان کو گرفتار کرنے کے لیے پہونچے، اُن سپاہیوں نے ان کی جگہ ایک دوسرے آدمی کو جو اُن کی شکل وصورت کا تھا عیسیٰ مسیح سمجھ کر پکڑ لیا اور وہی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور یہ دراصل وہ جاسوس تھا جس نے عیسیٰ علیہ السلام سے غداری کی تھی اور رشوت لے کر ان کے دشمنوں سے سازش کر لی تھی۔ اسی کو قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"

بہرحال قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بحفاظت اُٹھا لیا اور دشمنوں کے ناپاک ہاتھ ان کو چھو بھی نہ سکے۔

سورۂ نساء میں جہاں اس واقعہ کا ذکر آیا تھا آپ حضرات کو یاد ہوگا وہاں میں نے یہ بھی تبلایا تھا کہ اس بارہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری برناباس کی انجیل[لہ] کا بیان بالکل قرآن مجید [illegible] بیان اور اُمتِ محمدیہ کے عقیدہ کے مطابق ہے۔

لہ "انجیل" دراصل اُن چھوٹے چھوٹے رسالوں کا نام ہے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور کچھ حالاتِ زندگی اور کچھ ملفوظات ومواعظ جمع کیے گئے ہیں ان کو مختلف حواریوں اور ان کے شاگردوں نے (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور ایک اہم پیشنگوئی کے طور پر احادیث میں اطلاع دی گئی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب پھر اس دنیا میں اتارے جائیں گے اور اس وقت آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر نائب کے طور پر کام کریں گے ــــ اس مضمون کی حدیثیں تواتر کی حد کو پہونچی ہوئی ہیں۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ کی حدیثوں کو حدیث کے پورے ذخیرہ سے نکال کر ایک مستقل رسالہ میں جمع کرایا تھا جو عربی زبان میں "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" کے نام سے چھپ بھی چکا ہے ــــ ان سب حدیثوں کے سامنے آجانے کے بعد قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ قریب قریب اتنا ہی یقینی اور ناقابلِ شک ہو جاتا ہے جس طرح خود قیامت کے آنے کا عقیدہ۔ اسی لیے اُمت میں ہمیشہ سے اس عقیدہ پر اجماع رہا ہے۔ لیکن ہمارے اس زمانہ میں جس طرح اور بہت سے مسلّمہ اجماعی عقائد میں دشمنان اسلام مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے تشکیک پیدا کی گئی ہے اور آوارہ مزاج قسم کے لوگ بطور فیشن کے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح نزول مسیح کے اس متواتر اجماعی عقیدہ کے بارے میں بھی وساوس پیدا کیے گئے ہیں۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی نے چونکہ اپنے سارے دعووں کی بنیاد اسی پر رکھی ہے، کہ میں ہی وہ "مسیح" ہوں جس کے آخری زمانے میں آنے کی خبر دی گئی ہے اور اسرائیلی مسیح (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) تو تقریباً دو ہزار برس پہلے انتقال فرما کر زمین میں دفن بھی ہو چکے ہیں۔ اس لیے خود انھوں نے اور ان کے پیرو کاروں نے قرآنِ مجید سے بھی عیسیٰ علیہ السلام کے انتقال فرما جانے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ــــ اس کے لیے انھوں نے قرآن مجید کی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)
جمع کیا تھا ان میں سے چار معروف اور عیسائیوں میں عام طور سے مقبول اور مروج ہیں ــ انجیل یوحنا، انجیل مرقس انجیل متی، انجیل لوقا ــ لیکن اس کے علاوہ اور بھی اس طرح کے بہت سے مجموعے تھے جن میں سے بعض بالکل ناپید ہیں اور بعض کے نسخے موجود ہیں، اگرچہ وہ عیسائیوں میں مروج نہیں۔ انھیں میں انجیل برنباس بھی ہے۔ اسکے بیانات قرآن مجید کے بیانات سے کافی مطابقت رکھتے ہیں، غالباً اسی لیے تثلیث پرست عیسائیوں میں یہ مقبول نہیں ہے۔ (نعمانی)

جن آیتوں کو تختۂ مشق بنایا ہے اُن میں سے ایک آیت یہ بھی ہے جو حضرت عیسیٰ کے جواب کے ضمن میں سورۂ مائدہ کی اِن آخری آیتوں میں ہے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ

(یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کریں گے کہ میں جب تک ان لوگوں میں رہا ان کے حالات سے باخبر اور ان پر گواہ تھا، پھر جب تو نے مجھے لے لیا تو تو ہی ان کا دیکھنے والا تھا)

قادیانی صاحبان کہتے ہیں کہ ہر معمولی پڑھا لکھا بھی جانتا ہے کہ وفات کے معنی موت آجانے اور مر جانے کے ہیں۔ اس لیے "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" کا مطلب یہ ہوا کہ جب تو نے مجھے وفات دے دی، یعنی جب تیرے حکم سے مجھے موت آگئی .... اس سے ثابت ہوا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا چکے ہیں....

بظاہر قادیانیوں کی یہ بات ایسی سیدھی سی ہے کہ بہت سے سادہ دل اس سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت دھوکا اور فریب ہے، اسی لیے اس موقع پر میں نے یہ بحث چھیڑ کر اس بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھا۔

اس سلسلہ کی علمی اور تحقیقی بحثیں تو کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ علماء نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف ہے "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" پھر اس کا گویا ایک تکملہ ہے اس کا نام ہے "تحیۃ الاسلام" یہ دونوں عربی زبان میں ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ ان میں لکھا گیا ہے وہ تحقیق کے لحاظ سے حرفِ آخر ہے ــــ میں تو اس وقت آپ حضرات کے سامنے بالکل عام فہم قسم کی ایک دو باتیں کہنا کافی سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ توفی کے معنی موت ہی کے ہیں، سراسر دھوکا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ توفی کے معنی میں وسعت ہے اور وہ موت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ انتقال اور وصال کا لفظ موت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن

یہ کہنا غلط ہوگا کہ انتقال اور وصال کے معنی موت ہی کے ہیں۔

توفّی کے اصل معنیٰ ہیں کسی چیز کو پوری طرح لے لینا[1]۔ چونکہ موت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُوح کو لے لیا جاتا ہے اس لیے اس پر بھی توفّی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور نیند میں بھی چونکہ شعور و احساس اور بیداری والی کیفیت انسان سے لے لی جاتی ہے اس لیے اس کو بھی توفّی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت میں موت اور نیند دونوں کے لیے توفی کا لفظ ایک ساتھ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا[2]	اللہ تعالیٰ لے لیتا ہے نفسوں کو ان کے مرنے کے وقت اور جو نہیں مرے ان کو لے لیتا ہے ان کی نیند کے اوقات میں۔

اور ایک دوسری آیت میں صرف نیند کے لیے بھی توفّی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ[3]	وہ اللہ ہی ہے جو تمھیں (یعنی تمھارے شعور کو) قبضہ میں لے لیتا ہے رات میں (نیند کی حالت میں) اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم عمل کرتے ہو دن میں۔

بہرحال یہ کہنا کہ توفّی ہمیشہ موت ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے یا خود کہنے والے کی جہالت ہے یا وہ جان بوجھ کر دھوکا دیتا ہے ـــ حدیث توفّی کے اصل معنی جیسا کہ میں نے بتایا کسی چیز کو پوری طرح لے لینے کے ہیں۔ اس لیے عام طور سے جس طرح رُوحیں قبض کی جاتی ہیں اس کے لیے بھی توفّی کا لفظ بولنا صحیح ہے اور نیند میں جس طرح شعور اور احساس لے لیا جاتا ہے اس کے لیے بھی توفّی کے لفظ کا استعمال صحیح ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رُوح و جسم دونوں کے ساتھ اس دنیا سے اُٹھا لے (جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوا) تو اس کے لیے بھی

---

[1] کلیات ابوالبقا میں ہے " التوفی الاماتۃ وقبض الروح وعلیہ استعمال العامۃ او الاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء ۱۲ نعمانی۔ [2] زمر ع ۵ [3] انعام ع ۷۔

توفی کا استعمال بالکل صحیح ہوگا، بلکہ یہی توفی کی کامل ترین صورت ہوگی، اور مائدہ کی اس آیت میں "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" کے لفظ سے یہی آخری صورت مراد ہے۔ خود اسی آیت میں اس کا کھلا قرینہ یہ ہے کہ یہاں "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" کا لفظ "مَادُمْتُ فِيْهِمْ" کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے "مَاكُنْتُ حَيًّا" کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا ــــ مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کریں گے کہ خداوندا جب تک میں ان لوگوں کے درمیان تھا اس وقت تک تو میں ان کی دیکھ بھال کرتا اور اُن کے حالات سے باخبر تھا۔ پھر جب تو نے مجھے ان میں سے لے لیا یعنی ان کے درمیان سے اُٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا دیکھنے والا تھا ــــ اگر بالفرض یہاں توفی سے موت مراد ہوتی تو اس کے مقابلہ میں وہ لفظ ہوتا جو حیات اور زندگی کے معنی میں ہوتا، لیکن آیت میں اس کے مقابلہ میں "مَا دُمْتُ فِيْهِمْ" فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ یہاں توفی سے موت مراد نہیں ہے بلکہ وہ صورت مراد ہے جو "مَادُمْتُ فِيْهِمْ" کے مقابل کی چیز ہے۔ اس لیے یہاں "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "پھر جب تو نے مجھے اُٹھالیا"۔

اس کے علاوہ ایک اور عام فہم بات بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا موت کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" لیکن سارے قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی اطلاع موت کے لفظ سے نہیں دی گئی۔ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اُمتِ محمدیہ بھی ان کی حیات اور رفع الی السماء کے عقیدہ کو اختیار کرلے گی تو کسی دوسرے کی موت کی بات قرآن میں کہی گئی ہوتی یا نہ کہی گئی ہوتی، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی خبر موت ہی کے لفظ کے ساتھ ضرور سنائی گئی ہوتی، لیکن سارے قرآن میں ایک جگہ بھی عیسیٰ علیہ السلام پر موت واقع ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس طرح موت کا لفظ ان کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا ــــ اگر کسی کے دل میں انصاف ہو تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ابھی موت وارد ہی نہیں ہوئی، اسی لیے قرآنِ پاک میں کہیں ان کی موت کی اطلاع نہیں دی گئی، بلکہ "توفی" اور

"رفع" کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی حقیقت وہی ہے جو جمہور اُمّت کا عقیدہ ہے اور وہی ان لفظوں کا صحیح مفہوم ہے۔

یہ اُصولی بات بھی میں آپ سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ قرآن مجید کا مطلب وہی صحیح اور قابلِ قبول ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے برابر سمجھا جا رہا ہو، اگر آج کوئی شخص قرآنِ مجید کی کسی آیت کا وہ مطلب بیان کرے جو اُس کے بالکل خلاف ہو جو اب تک سمجھا جاتا رہا ہے اور جس پر گویا اُمت کا اجماع رہا ہے تو وہ قابلِ رد ہے اور اُس کے غلط باطل ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اجماعِ اُمت کے خلاف ہے ــــ اگر یہ اصول نہ مانا جائے تو قرآن اور دین بازیچۂ اطفال بن کے رہ جائے گا۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون ۝ وسلام علی المرسلین

والحمد للہ رب العلمین ۝

ارشادات حکیم الامۃ حضرت تھانوی رح

علماء و طلباء، اصحاب درس اور ارباب مدرسہ کے لیے لمحۂ فکریہ

(تلخیص ــــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے جہاں بہت سے شعبوں کی اصلاح فرمائی وہاں تعلیم دین اور مدارس اسلامیہ کی طرف بھی آپ کی خاص توجہ تھی ـــــ آپ نے وقتاً فوقتاً اپنی مجالس میں مدرسین و طلباء اور ارباب اہتمام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اور اپنے اساتذہ اور اکابر کی جو خصوصیات بیان فرمائی ہیں تعلیمی و تبلیغی اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے آپ کے یہ ارشادات بہت ہی مفید اور اہم ہیں ـــــ آپ کی نگاہِ دقیقہ بیں کے سامنے وہ تمام اسباب و علل تھے جن کے باعث آج مدارس اسلامیہ کے نظام عمل میں کچھ نہ کچھ ابتری رُونما ہو رہی ہے ـــــ اور ان مراکز علوم سے ایسی شخصیتیں بہت کم نکل رہی ہیں جو ملت اسلامیہ کی سرسبزی و شادابی کے لیے اسی طرح جدوجہد کریں جس طرح ان مراکز کے فرزندانِ قدیم نے کی ہیں۔ پہلی فرصت میں اصحابِ اہتمام اور ارباب حل وعقد نیز تمام اہل علم حضرات کو اس طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے ـــــ طلباء دارالعلوم دیوبند کے حالیہ ہنگامے نے پورے ملک کے عربی مدارس کو چونکا دیا ہے۔ بجائے غصہ کرنے کے اس "پریشان نظری" کا سبب معلوم کر کے کچھ علاج سوچنا چاہیے ـــــ اگر اپنے بزرگوں کے ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے ذمہ دار حضرات خود بھی غائر نظر سے واقعات و کوائف کا جائزہ لیں گے تو مستقبل کے لیے یہ درسگاہیں پہلے کی طرح اسلام و ایمان کی حفاظت کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوں گی اور ہندوستان کی ان

دینی دانشگاہوں سے ایسے ایسے اشخاص پھر نمودار ہوں گے جو خلوص و للّٰہیت، غیرتِ اسلامی اور اتباعِ سنت کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں، اُستادوں، رہنماؤں اور اکابرِ ملت کی عزت اپنے دلوں میں رکھتے ہوئے ایمان و یقین، توحیدِ کامل اور اتباعِ رسولؐ کے چراغ دنیا کے گوشے گوشے میں روشن کر کے باطل کی ظلمتوں کو دور کریں گے ـــــ

میں نے یہ ارشادات، الافاضات الیومیہ کی چار جلدوں کے تقریباً ساڑھے نو سو صفحات سے بطور تلخیص اخذ کیے ہیں۔ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ کے آغاز میں خانقاہ تھانہ بھون حاضر ہوا تھا۔ مولانا ظہور الحسن صاحب ناظم کتب خانہ اشرفیہ سے ملاقات ہوئی انھوں نے از راہ کرم مجھ کو اور میرے رفیق سفر محمد فاروق صاحب عباسی کو یہ چاروں جلدیں ہدیۃً عنایت فرمائی تھیں۔

میں نے حتی الامکان اپنے موضوع کے مطابق ملفوظات کا انتخاب کیا ہے کہیں کہیں لفظوں کی تبدیلی کی ہے جس سے مفہوم میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ بعض جگہ کتابت کی غلطی سے عبارت بدل گئی تھی۔ سیاق و سباق کو دیکھ کر وہاں مفہوم کو لکھ دیا گیا ہے ـــ ارشادات کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ تین چار قسطوں میں چلے گا ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ـــــ فلاں مدرسہ میں ایک وقت میں اکابر کی ایسی جماعت تھی کہ ہر قسم کی خیر و برکات موجود تھیں۔ ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی ـــ اُس وقت تعمیر اتنی بڑی نہ تھی، کتب خانہ اتنا زبردست نہ تھا، آمدنی ایسی زائد نہ تھی جماعتِ (طلباء) کثیر نہ تھی مگر ایک چیز اتنی بڑی تھی کہ مدرسہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر چہار طرف بزرگ ہی بزرگ نظر آتے تھے ـــ در و دیوار سے اللہ اللہ کی آوازیں آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اب سب کچھ ہے اور پہلے سے ہر چیز زائد ہے مگر وہی ایک چیز نہیں جو اُس وقت تھی .... اُسی زمانۂ خیر و برکت میں ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک انجمن قائم ہوئی تھی فیض رساں اُس کا نام رکھا گیا ـــ ایک لڑکا تھا فیض محمد اُس کے نام پر انجمن کا نام رکھا گیا تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سُنا۔ فرمایا کہ نجیبو! ایک ایک آؤ سب کو ٹھیک کر دوں گا۔ میں انجمن قائم کراؤں گا اور سب نالائقوں کو نکالوں گا ـــ (پھر تو سب سہم گئے) اور اب تو اسی جگہ ایک دو کیا پچاسوں انجمنیں ہیں ...... میں نے دیوبند میں بزمانۂ طالب علمی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تک تحصیل علم سے فراغ نہ ہو اس قسم کے خیال کو شیطانی وسوسہ سمجھنا ـــ اُس وقت تک سمجھ میں نہ

آیا تھا کہ مگر اب سمجھ میں آیا کہ شیطان کا ایک کید یہ بھی ہے کہ بڑی حسنہ کو چھڑا کر چھوٹی حسنہ میں لگا دیتا ہے ـــ ذکر و شغل عبادت ہے مگر مندوب ـــ اس میں لگ کر ایک فریضہ (یعنی) علم متروک ہو گیا کتنا بڑا دینی ضرر ہے اور دین کو ضرر پہونچانا یہ عین مقصود ہے شیطان کا ـــ ہم نے تو ان حضرات کو دیکھا ہے اور اب تو نہ اساتذہ کا ادب نہ مہتمم صاحب کا ادب نہ پیر کا ادب نہ باپ کا ادب ـ آزادی کا وہ زہریلا اثر پھیلا ہے کہ سب ہی کو مسموم کر دیا؟ الا ماشاء اللہ ـــ سُن سُن کر دل کو رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ ایک دم سے کیسی کایا پلٹ ہو گئی ـــ اس وقت اساتذہ خود طلبا سے دبتے ہیں نہ معلوم کس وجہ سے اور کیا اغراض ہیں جن کی وجہ سے طلبار کا اساتذہ پر غلبہ ہو گیا۔ ضرور دال میں کالا ہے .... اب چاہے انجمن قائم کریں، کمیٹیاں قائم کریں۔ اسباق پڑھیں کون پوچھ سکتا ہے اور کون مواخذہ کر سکتا ہے ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ پرانے لوگوں میں دین کا، بزرگوں کے ادب کا پھر بہت اثر تھا۔ اُس وقت کے .... ان نئے سنورے ہوؤں سے اچھے تھے۔ مولوی شبلی صاحب (نعمانی) کا واقعہ ہے کہ کانپور میں اُن کا لیکچر ہوا تھا۔ مولوی محمد فاروق صاحبؒ (چریاکوٹی) جو اُن کے اُستاد تھے وہ اُس وقت کانپور کے ایک مدرسے میں مدرس تھے۔ اُس بیان میں شریک تھے جب بیان ختم ہو چکا تو اُستاد کے پاس آ کر بیٹھ گئے اُستاد نے محض سادگی سے پیر پھیلا دیے (اور کہا) کہ شبلی! پیر دُکھ گئے ہیں ذرا دبا دیجیو۔ بس دبانے لگے اور کوئی اثر ناگواری کا ظاہر نہیں ہوا۔ یہ

لہ اس ارشاد میں اور آگے جو صحبت نیکاں کی ضرورت کا ارشاد ہے۔ ان دونوں میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں کسی بزرگ سے بیعت ہو کر باقاعدہ سلوک طے کرنے کو منع فرمایا گیا ہے نہ کہ صحبت بزرگ کو ـــ اہل تقویٰ حضرات سے زمانۂ طالب علمی ہی سے تعلق رہنا چاہیے۔ ورنہ آٹھ آٹھ دس دس سال کی عربی مدارس کی محنتیں چند روزہ غلط ماحول سے درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہونے والے بہت سے طلبار میں اس تبدیلی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اثر تھا۔ پُرانے ہونے کا اور پہلے بزرگوں کی صحبت کا اب یہ باتیں کہاں؟ ـــــ اگر علم صحیح اور عملِ صحیح کی ضرورت ہو تو اُس کی صورت صرف ایک ہے وہ یہ کہ احیار (زندوں) میں سے کسی کو اپنا متبوع بنائے کیونکہ بدون احیار سے تعلق رکھنے اور اُس کی صحبت کے نرا کتابی علم کچھ کافی نہیں۔ اکثر اہلِ علم کو بھی ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے اور جب خود ہی حقیقت کو نہیں سمجھے تو دوسروں کی کیا رہبری کریں گے ...... ایک موقع پر ارشاد فرمایا ـــــ کہ اب تو ویسے بھی لوگ علماء سے بدظن ہیں اب تو بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں معترضین کو اور اعتراضات کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں ہزاروں روپیہ صرف کرنے پر بھی یہ بات نصیب نہ ہوتی جو یہ لوگ مفت میں کرتے ہیں گو ان کی نیت اچھی نہ ہو مگر مجھ کو تو اپنے زلات سے آگاہی ہو جاتی ہے .... اللہ کا شکر ہے کہ مخالف سے وہ کام لے رہے ہیں جو بعض اوقات اپنے نہیں کر سکتے ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ـــــ ہمارے حضرات میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ جامعِ مراتبِ اعتدال تھے۔ نہ متکبر تھے نہ تصنع کے متواضع ـــ سادگی کے ساتھ اُن میں استغنار کی شان تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ کسی دینی ضرورت سے ایک مرتبہ ریاست رام پور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب (نواب کلب علیخاں مرحوم) کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب نے مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لانے کی درخواست کی مگر مولانا تشریف نہیں لے گئے اور یہ عذر فرمایا کہ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں آدابِ شاہی سے ناواقف ـــ نہ معلوم ہم سے کیا گڑبڑ ہو جائے جو آدابِ شاہی کے خلاف ہو اس لیے مناسب نہیں ـــ نواب صاحب نے جواب میں کہلا کر بھیجا آپ تشریف لائیں۔ آپ سے آداب کون چاہتا ہے ہم خود آپ کا ادب کریں گے، ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ مولانا نے پہلے تو انکار کا جواب دیا تھا جب اُس پر اصرار ہوا پھر ضابطے کا جواب کہلا کر بھیجا کہ "عجیب بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو اور آؤں میں" ـــ غرضیکہ مولانا تشریف نہیں لے گئے ـــــ اور باوجود اس فطری آزادی اور استغنار کے رُڑکی میں دوسرا رنگ ظاہر ہوا ـــ مجسٹریٹ کے بُلانے پر ملنے سے انکار نہیں کیا اُس کا قصہ یہ ہے کہ رُڑکی میں (پنڈت) دیانند نے حضرت سے مناظرے کا اعلان کیا۔ حضرت مولانا

کو اطلاع ہوئی۔ آپ اُس زمانے میں ضیق النفس سے سخت علیل تھے مگر باوجود اس کے رُڑکی تشریف لے گئے اور بھی چند خدام ہمراہی میں تھے۔ آپ نے سب سے فرمایا کہ کھانا سب بازار میں کھائیں کسی پر بار نہ ڈالیں وہاں کے مجسٹریٹ کو تشریف آوری کی خبر پہونچی سنتے ہی اوّل یہ کہا کہ ایسے ہی روٹیاں کھانے والے مولوی ہوں گے ـــــ لوگوں نے واقعہ بازار سے کھانا کھانے کا بیان کیا تب اُس کے دل میں قدر ہوئی اُس نے مولانا سے تشریف آوری کی درخواست کی۔ یہ مولانا کی عادت کے بالکل خلاف تھی۔ مولانا دُنیا کے بڑے لوگوں سے ملتے نہ تھے حتیٰ کہ نواب صاحب (رام پور) سے مُلاقات نہیں کی مگر مجسٹریٹ سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ یہاں مصلحت دین کو اپنی فطری عادت پر مقدّم فرمایا اور وہ مصلحت مکالمے سے معلوم ہوگی۔ اُس نے رُڑکی آنے کی وجہ دریافت کی مولانا نے فرمایا کہ (پنڈت) دیانند دعوتِ مناظرہ دیتے پھرتے تھے ـــــ اُن سے مناظرے کے لیے آیا ہوں اور جب میں آگیا تو وہ انکار کرتے ہیں۔ مجسٹریٹ نے کہا ہم اُن کو بُلائیں گے۔ غرضکہ (پنڈت) دیانند کو بلایا اور دریافت کیا کہ مناظرہ کیوں نہیں کرتے۔ (پنڈت) دیانند نے کہا کہ فساد کا خوف ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کا تو خوف مت کرو۔ فساد کے ہم ذمہ دار ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر مجمع میں فساد کا اندیشہ ہے تو اس وقت مجمع نہیں اب یہی ـــــ (پنڈت) دیانند نے کہا اس وقت تو میں اس ارادے سے نہیں آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ارادہ تو فعلِ اختیاری ہے۔ اب ارادہ کر لو۔ مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے ـــــ یہ شان ہے ہمارے بزرگوں کی۔ نہ یکبر کہ باوجود مصلحت کے مجسٹریٹ سے نہ ملیں اور نہ تذلّل کہ خواہ مخواہ نواب صاحب کی ملاقات کو سبب عزت اور فخر کا سمجھیں ـــــ ان حضرات کی نظر میں مقصود اصلی دین ہی تھا دین کی وجہ سے تو مجسٹریٹ سے مل لیے اور دنیا کی وجہ سے بڑے سے بڑے نواب کو بھی منھ نہ لگایا ـــــ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بڑے بڑے لوگ ٹوٹے اور غبار بھرے بوریوں پر آکر بیٹھتے تھے اور اُن میں جو دین کے لیے آتے اُن کی رعایت بھی ہوتی تھی۔

میں جب حیدرآباد دکن گیا تھا ـــــ ایک دوست نے مدعو کیا تھا ـــــ (اس وقت) دیوبند میں بعض احباب اہلِ علم سے میں نے مشورہ کیا تھا کہ کوئی ایسی تدبیر تبلائیے کہ نواب صاحب (نواب عثمان علیخاں مرحوم نظام دکن) سے ملنا نہ ہو مگر کوئی تدبیر کارگر معلوم نہیں ہوئی بھر

حیدر آباد پہونچ کر بعض اُمراء نے اِس کا اہتمام کرنا چاہا کہ نواب صاحب سے ملاقات ہو میں نے انکار کر دیا کہ اُن کو تو کچھ نفع نہیں (ہو گا) اس لیے کہ میں کھُل کر ان کو خطاب نہیں کر سکتا اور دب کر خطاب کرنے سے اثر نہیں ہوتا اور عوام کو مضرت ہی مضرت ہے اُن کو (اُمراء سے ملاقات کرنے کی وجہ سے علماء سے) بدگمانی ہو جاتی ہے۔ غرض اِن اُمراء سے مل کر دین کا نقصان ہی ہوتا ہے ہاں اگر وہ تواضع اور خلوص کے ساتھ طالب ہوں تو پھر نفع بھی ہو سکتا ہے اور جب اُن کی طلب نہ ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ جو چیز ہمارے پاس ہے یہ اُس کے طالب ہیں تو پھر اگر وہ تحقیر کا برتاؤ کریں تو اُن کی شکایت نہیں۔ اس لیے کہ طالبِ دنیا کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہی جاتا ہے ——

ہمارے بزرگوں کا بحمد اللہ یہی طرز رہا ہے کہ بے غرضی کی وجہ سے بات صاف، معاملہ صاف، کوئی چھوٹا ہو یا بڑا دین کی وجہ سے سب یکساں تعلق اور دنیا کی وجہ سے کسی کی طرف نظر بھی اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے ——

ایک موقع پر فرمایا —— میں تو جب کسی کو بناؤ سنوار سے رہتا ہوا دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ یہ شخص کمال سے کورا ہے۔ اس لیے فضول میں مبتلا ہے نیز صاحبِ کمال کو ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت بھی نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بنا شد اہلِ باطن در پئے آرائش ظاہر
بنقاش احتیاجے نیست دیوارِ گلستاں را

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ماشاء اللہ ہماری طرف کے علماء میں بناوٹ نہیں اور طرف کے علماء اور مشائخ تو سلاطین کی طرح رہتے ہیں —— یہاں پر بے حد سادگی ہے —— حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک مرتبہ حدیث کا درس فرما رہے تھے صحن میں —— بارش آگئی تمام طلباء کتابیں لے کر مکان کی طرف کو بھاگے۔ حضرت مولاناؒ سب کی جوتیاں جمع کر رہے تھے اور اُٹھا کر چلنے کا ارادہ تھا جو لوگوں نے دیکھ لیا —— سبحان اللہ ان حضرات میں نفس کا تو شائبہ نہیں تھا۔ نہایت سادگی اور بے نفسی تھی —— حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لوہار نے دعوت کی۔ اتفاق سے کھانے کے وقت تک زور کی بارش ہوتی رہی وہ سمجھا کہ ایسے میں کیا تشریف لائیں گے اسلیے نہ (مولانا کے لیے) کھانا پکوایا نہ وہ بُلانے آیا۔ مولانا شام

کو خود ہی کمبل اوڑھ کر اُس کے مکان پر پہونچ گئے۔ وہ بڑا شرمندہ ہوا اور عرض کیا کہ میں نے تو بارش کی وجہ سے کچھ سامان بھی نہیں کیا۔ فرمایا آخر گھر کے لیے تو کچھ پکایا ہوگا ۔۔۔ گھر کے لیے ساگ روٹی تھی وہی بیٹھ کر کھالی۔

ان حضرات کی کوئی بات امتیازی نہ ہوتی تھی ۔۔۔ یہ سب اتباعِ سنّت کی برکت اور اسی کا غلبہ تھا ۔۔۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی موضع املیا متصل دیوبند میں ایک شخص نے آموں کی دعوت کی اور چلتے وقت کچھ آم ساتھ کر دیے۔ لوگوں نے مولانا کو اس حال میں دیکھا کہ سر پر آموں کی پوٹلی رکھے ہوئے سر بازار آرہے ہیں۔ لوگ لینے کے لیے دوڑے فرمایا کہ یہ میرا ہی سامان ہے اس کو مجھے ہی لے جانے دو۔ یہ بے نفسی کی باتیں ہیں ان حضرات کی ۔۔۔ ۔۔۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ (کاندھلوی) کو میں نے دیکھا نہیں سُنا ہے کہ ایک مرتبہ کسی گاؤں کے قریب سفر کر رہے تھے۔ ایک ضعیف العمر شخص کو کوئی بوجھ سر پر لادے ہوئے دیکھ کر اُس سے کہہ سُن کر خود اپنے سر پر لے کر گاؤں تک پہونچایا ۔۔۔ انتہائی بے نفسی ہے ۔۔۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ حضرات باوجود اس فضل و کمال کے اپنے کو مٹائے ہوئے تھے ...... اپنے بزرگوں میں ایسے ایسے باکمال لوگ گذرے ہیں مگر یہ القاب نہ تھے۔ (الحمد سے زائد مولانا ورنہ مولوی صاحب) مگر آج کل ہر چیز میں نئی تعلیم کا اثر اور اُس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مجھ کو تو ان چیزوں سے طبعی نفرت ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ۔۔۔ افسوس جتنی ضروری چیزیں ہیں آج کل اُن سب سے ذہول اور غفلت ہے چنانچہ آج کل بڑی ضرورت کی چیز صحبت ہے۔ اہل اللہ اور خاصانِ حق کی یہ صحبت میرے نزدیک اس زمانے میں فرضِ عین ہے۔ بڑے ہی خطرے کا وقت ہے جو چیز مشاہدے سے ایمان کی حفاظت کا سبب ہو اُس کے فرضِ عین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ ایسی چیز کا اہتمام تو ابتدا ہی سے ہونا چاہیے مگر لوگوں کو اُس کی طرف سے بڑی غفلت ہے ۔۔۔ پھر صحبتِ نیک کے نہ ہونے کے ثمرات نمونے کے طور پر بیان فرمائے ۔۔۔ (اور یہ بھی فرمایا) چنانچہ ایک ثمرہ یہ ہے کہ اس وقت یہ حالت ہو گئی ہے کہ اُستادوں کے ساتھ استہزاء ہے ...... اس وقت منتہائے کمال یہ ہو گیا ہے کہ تقریر اور تحریر ہو اور اپنے کو اپنے اُستادوں اور بزرگوں کی برابر خیال کرنے لگے اور گو ابھی تک یہ بات زبان سے تو نہیں کہی مگر آئندہ کہنے بھی

لگیں گے ــــــ

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ درس و تدریسِ متعارف، مقصود کا مقدمہ ہیں اور اصل مقصود تبلیغ ہے۔ آج کل بڑی کوتاہی ہو رہی ہے کہ درس و تدریس کو اصل سمجھ لیا اور اس کوتاہی اور غلطی کی بدولت اکثر علماء کو جو تبلیغ نہیں کرتے ایک بہت بڑی فضیلت سے محرومی ہو گئی ــــــ حضرات انبیاءؑ کا درس یہی تبلیغ تھا ــــــ بعدِ فراغ (و تحصیلِ علوم) تدریسِ علوم اور تبلیغ دونوں کے حقوق ادا کرنا چاہئیں ــــــ

کی طرف متوجہ ہو کر دوسرے سے غفلت کرنا یہ عظیم کوتاہی ہے۔ علماء کو اس طرف ضرور توجہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنا وقت تبلیغ میں بھی صرف کیا کریں ..... ایک سہل اور بہتر صورت یہ (بھی) ہے کہ مدارس کی طرف سے کچھ مبلغ (مستقل طور پر) مقرر کر دیے جائیں۔ آج کل مدارس میں اس کی بڑی کمی ہے۔ پڑھانے میں جس قدر مشغولی ہے۔ تبلیغ کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے۔ جس قدر وقت اس (پڑھانے) میں صرف کرتے ہیں۔ تبلیغ میں اُس کا نصف حصہ بھی خرچ نہیں کرتے ــــــ

ایک مجلس میں فرمایا ــــــ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طالبعلم نے دعوت کی۔ فرمایا اس شرط سے قبول کرتا ہوں کہ جو کھانا تمہارے نکلنے میں تمہارا مقرر ہے اسی میں سے کھلاؤ بکھیڑا نہ کرو ــــــ

قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتویؒ کے سفرِ رڑکی کا تذکرہ اجمالی طور پر ایک مجلس میں ان الفاظ میں فرمایا ــــــ ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ رڑکی دیانند سرستی سے مناظرے کے لیے تشریف لے گئے اور بھی چند لوگ ہمراہ تھے۔ مولانا نے سب سے کہہ دیا کہ اپنے بھروسے پر چلنا دعوتوں کے بھروسے نہ چلنا سب کو کھانا بازار سے کھانا ہوگا۔ رڑکی پہونچ کر نہ خود کسی کی دعوت کھائی نہ دوسروں کو کھانے دی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہاں پر (تھانہ بھون) کثرت سے لوگ آتے ہیں اور ہر شخص کی مختلف طبیعت (ہوتی ہے) مثلاً پچاس آئے اب میں پچاس کا کیسے اتباع کر سکتا ہوں۔ ہاں وہ پچاس میرا اتباع کر سکتے ہیں اور میں تو اپنا اتباع بھی نہیں چاہتا۔ اصولِ صحیحہ کا اتباع چاہتا ہوں۔ ان اصولِ صحیحہ کا تم بھی اتباع کرو میں بھی اتباع کروں ــــــ نہ تم میرا اتباع کرو۔

نہ میں تمہارا اتباع کروں ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذہن تو دیلے سے رخصت ہو چکا مگر کچھ حافظہ باقی ہے اور وہ بھی نابیناؤں میں ــــــ

ایک موقع پر فرمایا ــــ دو چار کتابیں اصل یا ترجمہ پڑھ کر تبحّر کا دعویٰ بھی ایک معمولی بات رہ گئی ہے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا' میرے ایک دوست مولوی صاحب کہتے تھے کہ متبحر کی دو قسمیں ہیں' ایک گدو متبحر ایک مچھلی متبحر ــــ گدو تو سمندر کی سطح کے اوپر اوپر تیرتا ہے مگر اس کو اندر (کا یعنی) عمق کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا اور مچھلی عمق میں ہوتی ہے۔ تو آج کل کے "متبحر" گدو متبحر ہیں اوپر اوپر پھرتے ہیں آگے کچھ خبر نہیں ــــــ

فرمایا کہ ــــ ہمارے بزرگ حالانکہ جامع کمالات تھے مگر سادگی اس قدر تھی کہ ان تکلفات کا نام تک نہ تھا اور آج کل نہ کوئی ہنر ہے نہ کوئی کمال مگر القاب دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہی اپنے زمانے کے سب کچھ ہیں ــــــ

فرمایا ــــ حضرت اُستاذی مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جو مجسّم اخلاق تھے "آخر میں اُن کی یہ رائے ہو گئی تھی کہ ایسے متکبروں کو تھانہ بھون بھیجنا چاہیے وہیں اُن کے دماغ درست ہوں گے ــــ

ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ــــ علماء و مشائخ کو چاہیے کہ وہ ایسا طرز نہ اختیار کریں کہ جس سے اہل دین اور دین کی بے وقعتی لوگوں کی نظروں میں پیدا ہو .... اہل مدارس (اپنے مدرسوں کی وجہ سے (لوگوں کی) زیادہ چاپلوسی کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اگر اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کیا تو یہ چندہ نہ دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ چندہ نہ دیں گے ــ دیں گے ضرور دیں گے اس لیے کہ یہ تو حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے ــــ اگر خلوص ہے پھر فلوس تو تمہاری جوتیوں سے لپٹتے پھریں گے اور اگر دے ہی دیا مگر تم کو اور دین کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھا تو ایسے چندوں کو لے کر کرو گے کیا؟ کیونکہ جو مقصود تھا مدارس کا کہ دین اور اہل دین کی قلوب میں عظمت ہو' تبلیغ کا اثر ہو جب وہ حاصل نہ ہوا تو مدارس کو لے کر کیا چاٹو گے؟ ــــ مجھ کو تو ہمیشہ اس کا خیال رہتا ہے کہ دین اور اہل دین کی بے عظمتی اور بے وقعتی نہ ہو اور یہ کہ ہمیشہ مصالحِ دنیوی پر مصالحِ دینی مقدم رہیں ــــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک مرتبہ میں اور حافظ احمد صاحبؒ (صاحبزادۂ حضرت قاسم العلوم مولانا نانوتویؒ) سفر میں ہمراہ تھے۔ لاہور کے اسٹیشن پر ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ـــ ملازموں نے میز کرسی لگادی اُس سے تشبہ کا خیال ہوا۔ میں نے حافظ صاحبؒ سے کہا کیا مشورہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ تشبہ کے خلاف صورت اختیار کرو ـــ کرسی پر پیر لٹکا کر مت بیٹھو اور ہاتھ میں کھانا لیکر کھاؤ، میز پر رکھ کر مت کھاؤ۔ اسی طرح کیا اور بھی متکبرین کا مجمع تھا وہ دیکھ رہے تھے ...... اگر آدمی کو خیال اور فکر ہو تو حق تعالےٰ راہ نکال ہی دیتے ہیں ـــ یہ اُس وقت ہے جبکہ ننگ وعار کو بالائے طاق رکھدے اور لایخافون لومۃ لائم (نہیں ڈرتے ہیں وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے) پر عمل پیرا ہو اور جب تک یہ بات نہ ہوگی ہرگز نہیں بچ سکتا ضرور مبتلا ہوگا ـــ ننگ وعار کے باب میں تو مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیے ؎

ما ہیچ نداریم غم ہیچ نداریم
دستار نداریم غم پیچ نداریم

اور یہ سب کچھ انسان محبت کے ساتھ کر سکتا ہے۔ بدون محبت کے ان قصوں سے نجات اور چھٹکارا دشوار ہے۔ جب محبت ہوتی ہے تو محبوب کے خلاف محب کوئی حرکت نہیں کر سکتا بس ضرورت اس کی ہے کہ خدا (اور خدا کے رسول) کے ساتھ محبت پیدا کی جائے اور اُس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اہل محبت کی صحبت میں رہے اور اُن کی تعلیم کا اتباع کرے انشاء اللہ تعالےٰ چند روز میں کچھ سے کچھ ہو جائے گا ـــ اور حقیقت تو یہی ہے کہ اُن سے صحیح تعلق اور محبت پیدا ہو جانے کے بعد پھر کوئی دوسرا رنگ دل میں جم نہیں سکتا ـــ

ایک موقع پر فرمایا ـــ میں نے فلاں مدرسے والوں کو مشورہ دیا تھا کہ ایک دم سب کے سب مدرسہ چھوڑ دیں یعنی مدرسہ کا کام چھوڑ دیں جس کا جی چاہے کام کرے اگر اُس وقت مدرسہ والے اس مشورے پر عمل کر لیتے اور مدرسہ چھوڑ دیتے تو یہ سارے فتنے دب جاتے۔ ایک دم شور و شغب بند ہو جاتا اور یہی مخالف لوگ مدرسہ والوں کی خوشامد کرتے کہ تم سب کچھ ہو اور تم ہی مدرسہ اپنے انتظام میں رکھو ...... جب انسان ضد اور ہٹ پر اُتر آتا ہے تو پھر حق ناحق کچھ نظر میں نہیں رہتا اور میں اسی واسطے ہمیشہ اپنے دوستوں

کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ تم کسی اُلجھن میں مت پڑو۔ جہاں اُلجھن دیکھو ایک دم اُس کام کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ انسان ہے نفس ہے نفسانیت آہی جاتی ہے ــــ اصل مقصود تو دین کی خدمت ہے یہاں پر نہیں کہیں اور سہی۔ یہ کام نہ سہی اور کوئی دین کا کام سہی۔ ایک کام کو کیوں مقصود سمجھا جائے؟ مقصود تو دین کے ہر کام سے رضائے حق اور قُربِ حق ہے وہ جس سے بھی حاصل ہو جائے۔ نہ سہی مدرسہ گھر پر بیٹھ کر ایک دو طالب علم ہی کو سبق پڑھادیا یہ بھی تو دہی کام ہے مدرسہ نہ سہی مدرسی (چھوٹا سا مدرسہ) ہی سہی ــــ رہا کثرتِ درس سو نیّت بہت سے اسباق پڑھانے کی رکھو لیجئے مدرسہ ہی کا ثواب نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ کام کم اور ثواب زیادہ ــ نقصان کیا ہوا۔ خواہ مخواہ قصے جھگڑے کرتے پھرتے ہو اور ان قصوں اور جھگڑوں سے ایک بہت بڑی چیز برباد ہوتی ہے جس کی ہمیشہ اہل اللہ اور خاصانِ حق سلفِ صالحین نے حفاظت کی ہے۔ وہ یکسوئی ہے اگر یک سوئی اپنے پاس ہے تو پھر چاہے ایک "سوئی" بھی نہ ہو ...... اور اگر مدرسہ چھوڑنے کی ہمت نہ ہو تو ایک اور تدبیر بھی ہے وہ یہ ہے کہ اگر مجھ کو بالکلیہ مدرسہ پر اختیارات ہوتے تو میں یہ کرتا کہ سب کو ایک دم نکال کر باہر کرتا۔ مخالف اور موافق کی اسمیں قید نہ ہوتی۔ اور ایک دم مدرسہ پر تالے ڈال دیتا اور کہتا چلو لمبے بنو۔ ہم مدرسہ کو بند کرتے ہیں جب جی میں آئے گا کھولیں گے پھر آکر داخل ہونا اور معترضین جو اپنے کو مصلحین کہتے ہیں مدرسہ کی اصلاح کے لیے چلے تھے مگر طریق کار وہ اختیار کیا کہ مدرسہ بیخ و بنیاد ہی سے اکھڑ جائے میں مدرسہ والوں کو فرشتہ نہیں سمجھتا میں نے مولوی حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے صاف کہدیا تھا کہ میں آپ کو فرشتہ نہیں سمجھتا کہ آپ سے کسی غلطی کا امکان نہیں بعض چیزوں میں مجھ کو آپ سے اختلاف ہے اور وہ چیزیں قابلِ اصلاح ہیں ــــ ان لوگوں نے جو اصلاح کے نام سے طریق کار اختیار کیا یہ بھی بُرا ہے۔ میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا کہ کام کرنے والوں کو ادب سے محبت سے رائے دیتا کیونکہ مجھ کو مدرسہ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مدرسہ کی ذات سے خیر خواہی ہے اس لیے کہ میرے بزرگوں کی بنیاد ڈالی ہوئی ہے اس لیے جس کی ذات سے بھی مدرسہ کو نقصان پہونچے گا اُس سے ضرور قلب میں رنج ہوگا اور ضرور اس سے شکایت پیدا ہوگی ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل اُستادوں کا ادب اور احترام بالکل ہی جاتا رہا

—— تو ویسی ہی عالم میں خیر و برکت رہ گئی —— عادۃ اللہ یہ ہے کہ اُستاد خوش اور راضی نہ ہو تو علم نہیں آسکتا اور اُستاد ہی کی کیا تخصیص ہے اب وہ تو زمانہ ہے کہ نہ باپ کا ادب نہ پیر کا ادب ہے اور اگر ہے بھی تو رسمی ادب ہے۔ باقی حقیقی ادب کا نام و نشان نہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ تعظیم کا نام ادب نہیں۔ ادب نام ہے راحت رسانی کا —— (باقی)

یحییٰ ابن آدم القرشی

(از حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ)

نام و نسب یحییٰ نام اور ابو زکریا کنیت تھی[1]۔ والد کا نام آدم اور جد امجد کا سلیمان تھا، بنو قریش سے نسبت ولاء رکھنے کی وجہ سے قرشی کہلاتے ہیں۔ ان کے والد آدم خالد بن خالد بن عمارۃ بن الولید بن عقبہ بن ابی معیط کے غلام تھے۔ آدم بن سلیمان ممتاز اتباع تابعین اور ثقات راویوں میں شمار کیے جاتے ہیں[2]۔

ولادت یحییٰ بن آدم کے سنہ پیدائش کی تعیین مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں تذکرہ نویس بھی خاموش ہیں۔ لیکن بعض آثار و قیاسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کم و بیش ۱۴۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے جن شیوخ سے سماع حاصل کیا وہ مسعر بن کدام (متوفی ۱۵۳ھ) اور فطر بن خلیفہ (متوفی ۱۵۵ھ) ہیں۔ اور خود یحییٰ کا ۲۰۳ھ میں انتقال ہوا۔ اور اغلب ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق کم از کم ۱۶ سال کی عمر میں مذکورہ علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا۔ اس طرح وفات کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال قرار پاتی ہے۔ اس کی تائید یعقوب بن شیبہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ لم یکن لہ سن متقدم[3]۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۸۱ [2] المعارف لابن قتیبہ ص ۲۲۵

[3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۷۵

فضل و کمال علمی اعتبار سے وہ ممتاز اتباع تابعین میں شمار ہوتے تھے، جماعت تابعین میں انھیں صرف عیسیٰ بن طہمان سے فیض صحبت کا موقع نصیب ہوا تھا جنھوں نے مشہور صحابی رسول حضرت انس بن مالک کے دیدار سے اپنی دید شوق کو ٹھنڈا کیا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ انھوں نے وقت کے مشاہیر شیوخ سے بھی اکتساب علم کیا تھا۔ اس کے بعد پھر خود بھی علم و عمل کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ حدیث، فقہ اور قرأت میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں:۔

وکان اماماً علامۃ من المصنفین حافظاً ثقۃ فقیھاً من المتقنین[۱]	وہ اہل تصنیف علماء اور ائمہ میں ممتاز تھے اور صاحب اتقان حفاظ ثقات اور فقہاء میں تھے۔

حافظ ذہبی انھیں الامام الحبر اور علامہ خزرجی احد الاعلام لکھتے ہیں۔[۲]

علی بن المدینی کا قول ہے۔

یرحم اللہ یحیی بن آدم ای علم کان عندہ[۳]!	خدا یحییٰ بن آدم پر رحمت فرمائے۔ کتنا زیادہ ان کے پاس علم تھا!

عہد جس عہد میں یحییٰ بن آدم نے اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا اس وقت تابعین کرام کی لائی ہوئی بہاریں ختم ہو رہی تھیں اور ان کی جگہ اتباع تابعین کی تازہ دم جماعت درس و افادہ کی مجلسیں گرم کر رہی تھی۔

انھوں نے اپنی ۶۵ سالہ زندگی میں عہد عباسی کے پانچ انقلابات کا مشاہدہ کیا۔ ابو جعفر منصور، مہدی، ہادی، ہارون، امین اور مامون نے ان ہی کے سامنے یکے بعد دیگرے داد حکمرانی دی لیکن یحییٰ نے اپنے کو حکومت اور اس کے مناصب سے ہمیشہ دور رکھا۔ عمر بھر صرف درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کا مشغلہ رہا۔ عہد مامونی کا شہرۂ آفاق فتنہ

---

[۱] شذرات الذہب ج ۲ ص ۸ [۲] العبر فی خبر من غبر۔ ج ۱ ص ۳۴۳ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۴۲۰ [۳] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص ۳۳۰

"خلق قرآن" ان کی وفات سے کئی سال بعد پیش آیا اور خدا نے انھیں اس کی آزمائش میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔

اس عہد میں عیسیٰ بن طہمان تابعی کے علاوہ کبار علماء کی ایک بڑی جماعت علم و ارشاد کی بساط بچھائے موجود تھی۔ ان کے معاصرین میں امام شافعی، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابن القاسم فقیہ مصر، امام ابوداؤد۔ طیالسی، واقدی، ہشام بن محمد الصائب الکلبی اور وہب بن جریر جیسے مایۂ صد فخر اساتذہ دنیائے علم و فضل میں چراغاں کیے ہوئے تھے۔

قرآن یحییٰ بن آدم کو قرأت قرآن میں بھی دسترس تھی، اس فن کی تحصیل انھوں نے اسماعیل بن عیاش اور حمزہ بن حبیب الزیات سے کی تھی جو اپنے زمانہ میں علم قرأت کے ماہرین تسلیم کیے جاتے تھے، بالخصوص مؤخر الذکر کا شمار قراء سبعہ میں ہوتا ہے اور وہ یحییٰ کے بنیادی اساتذہ میں تھے۔

حدیث ان کا حقیقی جولانگاہ حدیث تھی۔ اس فن میں ان کا اتقان مسلم تھا۔ ائمہ محققین اور علمائے جرح و تعدیل نے حدیث میں بالاتفاق ان کی ثقاہت و عدالت کی شہادت دی ہے۔ اس فن میں ان کو منتخب روزگار شیوخ سے تلمذ حاصل تھا۔ وہ چونکہ وقت کی سیاست اور اعلیٰ مناصب سے کنارہ کش رہ کر تاحیات فنا فی العلم رہے۔ اس بنا پر ان کے شیوخ و اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے بیشتر آسمان علم کے تابندہ ستارے تھے۔ اس کا اندازہ ذیل میں مندرج چند ہی ممتاز ناموں سے ہو سکتا ہے۔

فطر بن خلیفہ، مسعر بن کدام، اسرائیل بن یونس، سفیان ثوری، یونس بن ابی اسحاق، جریر بن حازم، عیسیٰ بن طہمان، حسن بن صالح، زہیر بن معاویہ، فضیل بن مرزوق، وہیب بن خالد، ابی بکر بن عیاش، جعفر بن زیاد الاحمر، حماد بن سلمہ، ابوالاحوص عمار بن ازریق، محمد بن طلحہ، مفضل بن مہلہل، مندل بن علی العنزی، یزید بن ابراہیم التستری، یونس بن یزید، حمزہ بن حبیب الزیات، قطبہ بن عبدالعزیز، مالک بن مغول، فضیل بن عیاض، وکیع بن الجراح [1]

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۷۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۰ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۱۵۰

اسی طرح ان سے مستفیذ ہونے والے تشنگان علم کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے چونکہ عہد بامونی میں تعلیم وتعلم کا ایک عام ذوق اور ہر طرف چرچا تھا۔ اس لیے ملک کا ہر قریہ اور ہر قصبہ شیوخ وتلامذہ سے معمور تھا۔ چناں چہ جس طرح یحیٰ بن آدم نے کثیر التعداد علماء سے اپنی دنیائے علم کو آباد کیا تھا۔ اسی طرح خود ان کی شمع علم کے گرد پروانوں کا ہجوم رہا کرتا تھا۔

نامور تلامذہ میں یحییٰ بن معین۔ عبید بن یعیش، احمد بن ابی رجاء الہروی، احمد بن عمر الوکیعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، حسن بن علی الخلال۔ ابوبکر بن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد المسندی، محمود بن غیلان المروزی، ابوکریب محمد بن العلاء ہمدانی، عثمان بن ابی شیبہ، عبدۃ بن عبد اللہ الصفار، عباس بن حسین القنطری، محمد بن رافع، اور ہارون بن عبد الحمال لائق ذکر ہیں۔[۵]

مسلک اس عہد سعید تک تقلید شخصی کا رواج نہیں ہو سکا تھا، بلکہ حفاظ حدیث اور ائمہ رائے اپنے اجتہاد کے مطابق مسلک اختیار کرتے تھے، یعنی اپنی ژرف نگاہی سے وہ کتاب وسنت میں غور وفکر کرتے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوتے۔ اسی بنا پر علمائے سلف میں اختلاف فکر ونظر کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ استاذ وشاگرد بھی ایک ہی مسئلہ میں مختلف الرائے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یحییٰ بن آدم صاحب ابی حنیفہ امام محمد بن حسن شیبانی سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یحییٰ کے استاذ حسن بن صالح انھیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عہد کے عام شیوخ کی طرح ابن آدم بھی مجتہد تھے۔

اعتراف علماء ان کی جامعیت، ثقاہت وعدالت اور علم وفضل کا اعتراف کثرت علما اور ماہرین فن نے کیا ہے۔ ابن سعد رقمطراز ہیں کان ثقة[۲]
امام ابوداؤد کا قول ہے "یحیی بن آدم واحد الناس"[۳] عجلی فرماتے ہیں۔

کان ثقة جامعا للعلم عاقلاً — وہ ثقہ اور جامع العلم، صاحب فہم اور

---

[۱] مقدمہ کتاب الخراج یحیٰ بن آدم ص۱۴ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص۴۲ وتذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۳۳۰ وتہذیب الاسماء للنووی ج ۲ ص ۱۵۰ [۲] الطبقات الکبیرات لابن سعد ج۶ ص ۲۸۱ [۳] شذرات الذہب ج ۲ ص ۵

ثبتاً فی الحدیث [۱] حدیث میں ثبت رکھتے تھے۔

علی بن المدینی فرمایا کرتے تھے۔

یرحم اللہ یحیی بن آدم ای خدا یحیی بن آدم پر رحمت نازل فرمائے۔ وہ
علم کان عندہ [۲]! کتنا علم رکھتے تھے!

ابو اسامہ کا قول ہے کہ میں نے جب کبھی یحیی بن آدم کو دیکھا تو بے ساختہ مجھے امام شعبہ کی معیت یاد آگئی۔ علاوہ ازیں ابن حبان، یحیی بن معین اور نسائی نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔

تصنیفات وہ مسند نشین درس افادہ ہونے کے ساتھ صاحب لوح و قلم بھی تھے۔ محققین نے ان کے اہل تصنیف ہونے کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں۔
وھو من العلماء المصنفین [۳] علامہ ذہبی رقمطراز ہیں کان صاحب التصانیف [۴]۔
ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک سے زائد متعدد کتابیں تصنیف کیں، ابن ندیم نے ان کی تین کتابوں کے نام شمار کرائے ہیں۔

۱۔ کتاب الفرائض
۲۔ کتاب الخراج
۳۔ کتاب الزوال [۵]

لیکن ان میں سے کتاب الخراج کے علاوہ آج کسی کتاب کا بھی وجود نہیں، حتی کہ حافظ ذہبی اور صاحب المعجم جیسے باخبر محققین نے بھی صرف اسی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الخراج خراج کے موضوع پر گذشتہ زمانہ میں بکثرت کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، حاجی خلیفہ اور ابن ندیم نے متفرق طور پر بیس سے زائد کتابوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے بیشتر آج ناپید ہیں۔ صرف امام ابو یوسف، یحیی بن آدم اور قدامہ بن جعفر ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس موضوع پر ان کی مصنفہ کتابیں حیات جاوداں سے ہمکنار ہوئیں

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۷۵ [۲] ایضاً [۳] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۱۵۰۔
[۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۰ [۵] الفہرست لابن ندیم صاحب

بلاشبہ یہ تینوں ہی کتابیں اپنے اپنے طرز پر بے نظیر ہیں گو کہ کتاب الخراج لابی یوسف بعض امتیازات کی بنا پر خصوصی اہمیت و عظمت کا حامل ہے تاہم ابن آدم کی کتاب الخراج بھی اپنے طرز پر منفرد اور اہم

اس کتاب میں انھوں نے ۳۷ عنوانات کے تحت خراج کے مختلف مسائل سے متعلق احادیث و آثار کو اپنی سند کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ مزید برآں ان آثار پر فقیہانہ غور و فکر کے بعد استنباط مسائل اور اجتہاد سے کام لیا ہے، یہ کتاب امام ابو یوسف کی کتاب الخراج سے مختصر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن آدم کی کتاب صرف ایک علمی تصنیف ہے۔ اس لیے انھوں نے عشر و زکوٰۃ، جزیہ و خراج، غنیمت و فئے، اور زمین کے متعلق ہی مسائل بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن قاضی ابو یوسف نے اپنی کتاب ایک اسلامی فرمانروا کے حکم کی تعمیل میں اور ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہو کر لکھی تھی، اس لیے اس میں مذکورہ بالا امور کے علاوہ بہت سے دوسرے مالی اور انتظامی امور کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ اور اس میں خلیفۃ المسلمین کے سامنے بعض عملی تجاویز اور قانونی مشورے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر قاضی ابو یوسف کی کتاب نسبتۃً ضخیم ہو گئی ہے۔

یہ کتاب سب سے پہلے جوینبول (Juynboll .Th.W) کی تحقیق و تحشیہ کے ساتھ لیڈن سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی[۱] اس کے بعد مطبعہ سلفیہ قاہرہ نے احمد محمد شاکر مرحوم کی تصحیح و تنقیح کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں اسے شائع کیا۔ یہ اڈیشن بعض بہت ہی مفید حواشی، اور آخر میں متعدد انڈکس (اشاریے) پر مشتمل ہے۔ اور اب یہی نسخہ عام ہے۔

وفات مامون الرشید کے عہد حکومت میں ۱۵ ربیع الاول ۲۰۳ھ کو بمقام فم الصلح رحلت فرمائی[۲] مامون کے وزیر حسن بن سہل نے نماز جنازہ پڑھائی۔[۳]

---

[۱] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۲۶　[۲] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۰۱　[۳] المعارف لابن قتیبہ ص ۲۲۵

دین میں حدیث و سنّت کا مقام

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری استاذ حدیث
فلاح دارین (ترکیسر)

(۲)

کتابت حدیث حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار کرنے والے ایک دلیل یہ لاتے ہیں کہ حدیثیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قلم بند نہیں کی گئی تھیں، بلکہ ایسا کرنے کی خود آپؐ نے ممانعت فرمائی تھی، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔

لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار[1]	میرے اقوال لکھا نہ کرو۔ اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے، ہاں مجھ سے حدیثیں بیان کرو، اس میں کچھ حرج نہیں، لیکن جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بولا اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے

اس روایت کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ امام بخاری وغیرہ، متعدد ائمہ حدیث کو اس میں کلام ہے، ان کی تحقیق میں یہ حدیث مرفوع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

[1] صحیح مسلم باب التثبت فی الحدیث جلد اول

نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ صحابیٔ رسول ابو سعید خدریؓ کا قول تھا جس کو نیچے کے کسی راوی نے وہم اور سہو سے بطور حدیث مرفوع ابو سعید خدری کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر دیا اور آگے اس کی روایت اس طرح چل پڑی ؎۱ لیکن اس کو حدیث مرفوع مان لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس میں کتابت کی ممانعت سے جو یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آپؐ کا منشا مبارک اس سے یہ تھا کہ مسلمان اپنی دینی زندگی میں آپؐ کی حدیثوں سے مستفید نہ ہوں بلکہ صرف کلام اللہ پر انحصار کریں، اس کی تردید خود اسی حدیث کے الفاظ میں موجود ہے کہ

وحدثوا عنی ولا حرج	ہاں میری حدیثیں زبانی بیان کرو، اس میں
ومن کذب علی متعمدا	کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور جس نے قصداً
فلیتبوأ مقعدہ من النار	میری طرف جھوٹی بات کو منسوب کیا اس کا
	ٹھکانا جہنم ہے۔

حدیث کے اس آخری جز سے صاف معلوم ہوا کہ صرف لکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، زبانی بیان کرنے کی اجازت تھی اور اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب و تاکید بھی فرمائی گئی تھی حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ کے میدان میں ایک لاکھ سے زائد آپؐ پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

نضّر اللہ عبدا سمع	شاداب رکھے اللہ اپنے اس بندے کو جس
مقالتی فوعاھا ثمّ اداھا	نے میری بات سنی، پھر اُسے یاد رکھا اور
الیٰ من لم یسمعھا ؎۲	جس نے نہیں سنا ہے، اس تک پہنچا دیا۔

اور پھر مزید تاکید فرمائی جاتی ہے کہ "الا فلیبلغ الشاھد الغائب ؎۳" یعنی ہر حاضر کا فرض ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے غائب تک پہنچا دے۔

حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کی ممانعت وقتی اور عارضی تھی اور اس میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ شروع شروع میں جب کہ لوگ قرآن کے اسلوب بیان سے اچھی

؎۱ فتح الباری ج ۱، ص ۱۸۵ ؎۲ بخاری کتاب العلم ؎۳ صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۳۵

طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ کتابت حدیث کی صورت میں اس امر کا اندیشہ تھا کہ دونوں کو خلط ملط نہ کردیں۔ دوسرے یہ کہ دین کے ان دونوں سرچشموں (کتاب اور سنت) کے مرتبہ میں اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و مطالبات میں جو قابل لحاظ فرق تھا، حضورؐ اس طرز عمل سے اس کو امت کے ذہن نشین کرا دینا چاہتے تھے۔

قرآن مجید جو دین کی تمام بنیادی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا حامل ہے، اس کا لفظ لفظ لوگوں نے زبانی یاد کیا، مزید احتیاط کے لیے معتبر کاتبوں سے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لکھوایا۔ "حدیث شریف" جو شرع اسلامی کی تمام اعتقادی و عملی تفصیلات پر حاوی ہے، اس کا قولی حصہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی قومی عادات اور رواج کے مطابق اسے اس سے بھی زیادہ اہتمام و احتیاط کے ساتھ اپنے حافظے میں محفوظ کیا، جس اہتمام سے وہ اپنے خطیبوں کے خطبے یا شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے، اور اس کے عملی حصہ پر فوراً عمل شروع کر دیا گیا اور تعامل کے ذریعہ بھی محفوظ ہوگیا۔ عملی چیزیں لکھوانے کی بہ نسبت عملی طور پر کرکے دکھلانے اور اس کے مطابق لوگوں کو عمل کروانے سے زیادہ ذہن نشین ہوتی ہیں، اس لیے آپ نے ان کے بارے میں یہی طریقہ اختیار فرمایا، خصوصاً جن چیزوں کو آپ تعامل اور توارث کی راہ سے امت میں منتقل کرنا چاہتے تھے اُن کے بارہ میں خصوصیت سے اس کا اہتمام فرمایا۔ مثلاً نماز کے بارے میں آپؐ نے ہدایت فرمائی۔

صلوا کما رأیتمونی اصلی (صحیحین) جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھو، اسی طرح تم بھی نماز پڑھو، اور حجۃ الوداع میں رمی جمار کرتے ہوئے فرمایا:

لتاخذوا عنی مناسککم فانی	مجھ سے تم اپنے حج کے طریقے سیکھ لو، کیونکہ
لا ادری لعلی لا احج بعد حجتی	پتہ نہیں شاید میں اس حج کے بعد دوسرا حج
(صحیح مسلم)	نہ کرسکوں۔

لیکن بعد کو جب قرآن مجید کا کافی حصہ نازل ہو چکا، اور عام طور پر لوگ قرآن کے ذوق آشنا ہوگئے، اور اس بات کا اندیشہ جاتا رہا کہ "کلام الٰہی" کے ساتھ حدیث کے الفاظ

مل جائیں گے تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دے دی گئی۔

(۱) جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے، آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے، مگر یاد نہ رکھ پاتے، آخر انھوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی کہ یا رسول اللہ میں آپ سے حدیث سنتا ہوں، مگر میں اسے یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "إستعن بيمينك" اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو، اور اپنے دست مبارک سے لکھنے کا اشارہ فرمایا۔" واومأ للخط "[1]

(۲) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں نے ایک دن بارگاہ نبوی میں عرض کی" انا نسمع منك اشياء فنكتبها يا رسول الله " ہم آپ کی زبانی بہت سی باتیں سنتے ہیں، اور اس کو لکھ لیتے ہیں، تو اس کی نسبت کیا حکم ہے؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں[2]

(۳) حاکم صاحب مستدرک نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ " قيدوا العلم بالكتاب" علم کو قید کتابت میں لے آؤ[3]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ کتابت حدیث کی اجازت دی تھی، بلکہ بہت سے مواقع پر آپ کا لکھوانا اور املا کرانا بھی ثابت ہے۔ مختلف قبائل و افراد کے نام خطوط و تحریری احکام اور صلحنامے و دعوت نامے وغیرہ جو آپ نے وقتاً فوقتاً لکھوائے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، اس پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ مسلّم ہے، کہ قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت میں زیادہ اہتمام و عمومیت کا رنگ نہیں دیا گیا، بلکہ انفرادی و شخصی طور پر لکھنے کی اجازت تھی، اسی

---

[1] جامع ترمذی ج ۲ ص ۹۱ [2] مجمع الزوائد جلد اول ص ۱۵۱ بحوالہ طبرانی
[3] منتخب کنز العمال جلد ۴ ص ۶۹

کے مطابق بہت سے حضرات نے لکھا، یہ سلسلہ عمومیت اور اہتمام کے ساتھ عہد صحابہ کے آخر دور اور پھر تابعین و تبع تابعین کے دور میں چلا۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا ارشاد قرآن اور حدیث کے معاملہ میں جو فرق دور رسالت میں رکھا گیا، شاہ صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"إنَّ جمع الحديث في عهد النبي صلى الله عليه وسلم و إن كان احسن في بادي الرأي إلا أن المرضي عند ذلك أن لا تدون الأحاديث مثل تدوين القرآن ولا يحفظ حفظه"[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اگرچہ حدیثیں جمع ہو جاتیں، تو گو بظاہر یہ زیادہ اچھی بات نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت مناسب یہی تھا کہ حدیثوں کی تدوین اس وقت قرآن کی طرح نہ ہو اور اُن کی حفاظت کا قرآن جیسا بند و بست نہ کیا جائے اور جو اہتمام قرآن کے بارے میں کیا گیا اُس پایہ کا اہتمام حدیث کے بارے میں نہ کیا جائے

اس کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عام حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی جو ثانوی حیثیت ہے، اس کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا، کہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے، بلکہ شروع ہی سے اس کا ارادہ کیا گیا تھا کہ

لا تنتهي في الحتم نهايته، ولا تبلغ في الاهتمام بألفاظها مبلغها بل تبقى في مرتبة ثانية يمشي فيها الاجتهاد و تفحص العلماء وغور الفقهاء وبحث المحدثين۔

حدیث کا یہ سرمایہ قطعی اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے، اور نہ اسکے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے جو قرآن کی تدوین میں دکھائی گئی، بلکہ قصداً و ارادۃً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا (کہ قرآن کے مقابلہ میں،

---

[1] فیض الباری ج ۱ ص ۲۸

ان کا درجہ دوسرا ہو گیا۔ ایسا دوسرا درجہ جس کی
وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد اور تحقیق
و تدقیق کی، فقہاء کی فکر و نظر اور محدثین کی
تلاش و جستجو کی ان میں گنجائش پیدا ہو گئی۔

اور یہ کس لیے کیا گیا، شاہ صاحبؒ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

لینفسح علیھم امر الدین و
یتوسع علیھم من کل جانب

تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو،
اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں انکو میسر آجائیں۔

انفرادی و شخصی طور پر کتابتِ حدیث کا راز

جن حدیثوں کی تواتر، تعامل و توارث کے راستے سے اشاعت کی گئی، ان کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب یہ حدیثیں قطعی ہیں، تو کم از کم انھیں کی کتابت کا عمومی طور پر انتظام کیا گیا ہوتا، مگر جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ان کے الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے معانی اور مطالب کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ انور پر القاء ہوا ہے، اگر ان کی کتابت میں بھی عمومی رنگ اختیار کیا جاتا تو مذہب کے ساتھ جو ایک جذباتی اور نظری تعلق ہوتا ہے، اس کی بنا پر اندیشہ تھا کہ قرآن مجید جس کے الفاظ بھی وحی الٰہی ہیں، ان سے التباس و اشتباہ پیدا ہو جائے، اسی لیے ان کی کتابت میں بھی وہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا جو اخبار آحاد کے لیے کیا گیا تھا، البتہ ان کی نشر و اشاعت میں عمومی طرزِ عمل اختیار کیا گیا،

قاضی ابوبکر جصاص لکھتے ہیں،

"غیر جائز علیھا ترک النقل والاقتصار علی ما ینقلہ الواحد بعد الواحد لانھم مامورون بنقلہ۔[1]

اس قسم کی خبر کے متعلق جائز نہ ہوگا کہ اس کی (عمومی) نقل و اشاعت ترک کر دی جائے اور ایک سے ایک ہی اس کی روایت کرے کیونکہ ان لوگوں کو اسکی نقل کا حکم دیا گیا ہے۔

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۲۳

چنانچہ کتابت کے بارے میں کل حدیثوں کے ساتھ یکساں طرز عمل کے باوجود اشاعت و تبلیغ کے سلسلہ میں ان میں فرق مراتب قائم کیا گیا، اور اس رویہ کی داغ بیل خلفاء راشدین کے عہد مبارک ہی سے پڑ گئی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ فاروق اعظمؓ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں،

باستقراء تام معلوم شد کہ فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع وتکمیل افراد بشر تعلق دارد وغیر آنہا مصروف می ساخت[1]	تلاش وتحقیق سے یہ بات بہت صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ فاروق اعظمؓ نے برابر اس بات پر گہری نظر رکھی کہ حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز رہے، یعنی وہ حصہ جس کا شرائع کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے تعلق تھا، اس میں دوسرے حصے کی بنسبت زیادہ اہتمام اختیار کیا جائے۔

بہر حال جب فرق مراتب قائم ہو گیا، اور التباس اور اشتباہ کا اندیشہ جاتا رہا تو خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز (المتوفی ۱۰۱ھ) کے ذریعہ حق تعالیٰ نے حکومت کی طرف سے عمومی طور پر باقاعدہ تدوین حدیث کا کام لیا[2]

عہد نبوی کا تحریری سرمایہ

ایک مغالطہ یہ بھی دیا جاتا ہے، کہ چند جزئی واقعات کے سوا کتابت حدیث کا وجود عہد نبویؐ میں بہت کم پایا جاتا ہے، اور بیان حدیث کا زیادہ تر اعتماد صرف زبانی یاد کرنے پر رہا ہے، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ محدثین اپنے طویل تجربوں کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کتابت کی بنسبت زبانی یاد رکھنے میں صحت کی توقع زیادہ ہے، نقد رجال کے مشہور امام علی بن مدینی فرماتے ہیں۔

حافظ متقن احب الی من اصل غیر متقن[3]	حدیثوں کو زبانی یاد کرنے والا جس نے اتقان وبیدار مغزی سے یاد کیا ہو مجھے حدیث کے ایسے نسخے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جس

[1] ازالۃ الخفا ص ۱۴۱ ج ۲۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "محدثین عظام اور اُن کے علمی کارنامے"

[3] الکفایہ ص ۲۳۱

کے لکھنے میں زیادہ اتقان سے کام نہ لیا گیا ہو۔

لیکن راویانِ حدیث نے عہد نبوی اور اس کے بعد کی صدیوں میں ان دونوں ہی ذرائع کو اختیار کیا ہے، تاکہ ایک کے نقص کی تلافی دوسرے ذریعہ سے ہو سکے۔

عہد نبوی و دور صحابہؓ کے نوشتوں کی تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مقدمہ جو انھوں نے "صحیفہ ہمام ابن منبہ" پر لکھا ہے۔

سردست مجھے یہ عرض کرنا ہے، کہ حدیث نبوی کی اشاعت جس طرح تواتر عملی و روایت دونوں ذریعوں سے مسلسل ہوتی رہی ہے، اسی طرح آج ہمارے پاس جو حدیث کا سرمایہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس کا غالب ترین حصہ دور نبوت میں قلمبند ہو چکا تھا، حاکم صاحب مستدرک جو نقد روایت میں متساہل قرار دیے گئے ہیں، وہ اپنی تلاش و جستجو کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"والاحادیث التی فی الدرجة الاولیٰ لا تبلغ عشرة آلاف[1]" (اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچ پاتی)

اور ہر طرح کی روایات جو مسانید و جوامع، سنن و معاجم اور فوائد و رسائل میں موجود ہیں، ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے بھی کم ہے ([2]) ان تمام کتابوں سے چھان بین کر جو تعداد حاکم نے اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی پیش کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کے اس بیان کو بھی سامنے رکھئے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کو مجھ سے زیادہ حدیثیں اس لیے یاد تھیں کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا، محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے، اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کی تعداد یقیناً پانچ ہزار تین سو چوہتر سے زائد ہونی چاہیے جو قید تحریر میں آ چکی تھیں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے علاوہ دیگر صحابہؓ کرام کے نوشتے اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکڑوں احکامات و ہدایات جو آپؐ نے املا کرائے، ان سب کی مجموعی تعداد اگر

---

[1] توجیہ النظر ص ۹۳ [2] توجیہ النظر ص ۹۳

جوڑی جائے تو اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ دس ہزار سے زیادہ حدیثیں دورِ نبوی اور عہد صحابہؓ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں، البتہ ایک شبہ یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جہاں حفاظ حدیث کی روایات کی تعداد ذکر کی جاتی ہو وہاں ان کی تعداد بہت زائد بتائی گئی ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو سات لاکھ سے زائد قابل اعتماد حدیثوں کا حصہ محفوظ تھا۔ حافظ ابو زرعہ رازی کی حدیثوں کی تعداد سات لاکھ بتائی گئی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، امام مسلم کا دعویٰ ہے کہ میں نے اپنی جامع صحیح کو تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔

حافظ ابن جوزی ان سب چیزوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ان المراد بھذا العدد الطرق لا المتون[۱] یعنی ان اعداد سے مراد حدیثوں کے متون نہیں بلکہ طرق و اسانید مراد ہیں، مثلاً ایک ہی حدیث کو کسی شخص نے ایک شیخ کے دس شاگردوں سے روایت کیا تو محدثین کی اصطلاح میں اس کے دس طرق ہو گئے اور یہ دس روایتیں ہو گئیں جیسے "انما الاعمال بالنیات" کی حدیث سات سو طرق سے روایت کی گئی ہے اس لیے اس ایک حدیث کی روایات کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے، یہی حال اکثر و بیشتر حدیثوں کا ہے۔ صحیح بخاری کی غیر مکرر روایات کی تعداد دو ہزار چھ سو دو اور صحیح مسلم کی چار ہزار ہے، ان دونوں کتابوں کی اکثر روایات میں اشتراک بھی ہے پھر محدث جوزقی نے ان دونوں کتابوں کی احادیث کا استخراج دوسری کتبِ حدیث سے کیا تو ان کی اسانید اور روایات کی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ہو گئی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ صحابہؓ کرام کے اقوال و فتاویٰ بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کے فتاویٰ کو لوگوں نے حدیث کے تحت درج کر دیا ہے، اسلئے احادیث و روایات کی تعداد قدرتی طور پر لاکھوں تک پہونچ جاتی ہے[۲]

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اعلیٰ درجے کی احادیث عہد نبویؐ میں قید تحریر میں آ چکی تھیں، البتہ انکی نوعیت انفرادی رہی، عہد صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور میں اس سلسلے کو بہت ترقی ہوئی جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیئے یہ کہنا کہ اکا دکا چند واقعات کے سوا کتابتِ حدیث کا تذکرہ اور کہیں نہیں ملتا صرف ناواقفیت کی بنیاد پر ہے۔

---

[۱] تلقیح فہوم اہل الاثر ص۱۰　　[۲] توجیہ النظر ص ۹۳

اسلامی تحقیق

اس کے معنی، مدعا اور دائرہ کار

(از ڈاکٹر رفیع الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لٹ)

(۳)

ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا کام | یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ صرف حقیقتِ کائنات کا صحیح تصور ہی کسی صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور ایک فلسفی کے لیے اس کا ہونا یہاں تک ضروری ہے کہ اسکے بغیر اس کا سارا کام ناقص اور لغو اور بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفی حقیقتِ کائنات کا یہ صحیح تصور کہاں سے لائے اور کیسے حاصل کرے۔ خدا نے فلسفی کی اس شدید ضرورت کا سامان کارخانۂ قدرت کے اندر بلا کسی قیمت اور ایک گراں قدر عطیہ کے طور پر خود بخود مرحمت فرمایا ہے اور وہ نبیٔ کامل صاحبِ قرآن جناب محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلم کا تصورِ حقیقت ہے جسے آپ کا ہر مخلص پیرو آپ کی محبت و اطاعت کے ذریعہ سے اپنا بنا سکتا ہے۔ ہمارے تمام اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا اہم کام یہ ہے کہ وہ دُنیا کے سامنے یہ ثابت کریں کہ کائنات کے طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے تمام سائنسی حقائق صرف اس وجدانی تصورِ حقیقت کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن حکیم پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غلط نظام ہائے حکمت یا فلسفے جو غیر مسلم کو اسلام

کی طرف آنے سے روکتے رہتے ہیں اور مسلمان معتقد کے اعتقاد کو خاموشی سے سلب کرتے رہتے ہیں، شکستہ ہو جائیں گے۔ سائنسی حقائق کی حمایت وتائید ان سے ہٹ کر اسلام کے لیے مہیا ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ فلسفے یقین افروز نہیں رہیں گے اور بے اثر اور بے کار ہو جائیں گے اور اُن کے بجائے ایک نیا صاف ستھرا صحیح، معقول اور مدلّل فلسفہ جو کلیتہً اسلام کا موید ہو گا بلکہ جو اسلام ہی کی ایک حکیمانہ اور سائنسی تشریح اور تفسیر ہو گا وجود میں آئے گا۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ہم دورِ حاضر کے علم کو قرآن کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر سکتے ہیں اور دنیا کے سامنے قطعی طور پر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ صرف قرآن ہی کا عطا کیا ہوا تصورِ حقیقت صحیح ہے۔ اور یہی ہے وہ طریق جس سے ہم غیر مسلم کو اس کی معلوم اور مسلم صداقتوں یعنی سائنسی حقیقتوں سے استدلال کر کے اس کے نامعلوم حقائق یعنی قرآنِ حکیم کی صداقت کے یقین کی طرف لا سکتے ہیں۔ اور شک کرنے والے مسلمان کو کفر والحاد سے بچا سکتے ہیں۔ اور پھر یہی ہے وہ طریق جس سے ہم اسلام کی وہ حکیمانہ اور سائنسی توجیہ وجود میں لا سکتے ہیں جس کے وجود میں آنے پر اس زمانے میں ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔

جب اسلام کی سائنسی توجیہ جو بیک وقت انسان اور کائنات کی سائنسی توجیہ بھی ہو گی، فی الواقع وجود میں آجائے گی تو وہی ہمارے لیے انسانی اور اجتماعی علوم کی تشکیل جدید کی صحیح اساس بھی ہو گی۔ وہ ہمیں اس قابل بنائے گی کہ ہم مغربی حکماء کی اس کوشش میں کہ نام نہاد انسانی اور اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم بنایا جائے، ان کی رہنمائی کر سکیں۔ اس رہنمائی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کوشش اب تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تک ہمارے تحقیق اسلامی کے ادارے نفسیاتِ فرد اور نفسیاتِ جماعت اور سیاست۔ اخلاق۔ تعلیم۔ فن۔ اقتصادیات۔ قانون اور تاریخ کے فلسفوں کو از سرِ نو اسلام کے تصورِ حقیقت کی بنا پر اور اسلام کی ایک ہی ممکن سائنسی توجیہ کے اجزا اور عناصر کے طور پر مدون اور مرتب نہ کر لیں۔ یہ کہنا ہرگز ممکن نہ ہو گا کہ ان کا کام ابتدائی مرحلوں سے کچھ بھی آگے بڑھ سکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ ایک درجن حکماء کو کئی سالوں تک مصروف رکھ سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے

تحقیق اسلامی کے اداروں کو جو کام درپیش ہے وہ کتنا وسیع و عریض ہے

ایک حیاتیاتی ضرورت

میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت ادا کرکے ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے اسلام کی مدافعت کے لیے دوسرے نظریات کے خلاف علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریۂ حیات کی مدافعت کے لیے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لیے ہمیں کل تک باہر نکلنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریق پر جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ پیدا نہ کریں۔ ہم اس دور میں علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہیے تاکہ یہ جلد از جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرلے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر پائی جو میسر آسکتی ہے اس کام پر لگا دیں۔ اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تندہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیۃً بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن ہمیں یقیناً مشرقی تحقیق کے کام کو، خواہ ہم آئندہ اس کو کسی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں، یونیورسٹیوں تک محدود کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اسلامی تحقیق کے غلط اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ جو درحقیقت حیلہ ساز عیسائیت نواز مستشرقی ذہنوں کی پیداوار ہے۔ وہ ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کا مقام

باقی رہا میکانکی اسلامی تحقیق کا کام سو اسے کلیۃً اصلی اسلامی تحقیق کے کام کی ضرورتوں کے ماتحت

رہنا چاہیے اور فقط ان فضلا اور حکماء کی درخواست پر ہی انجام دینا چاہیے جو اصلی اسلامی تحقیق کے کام میں لگے ہوئے ہوں تاکہ ان کی ضروریات کو جو ان کے کام کے دوران میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں پورا کر سکے۔ البتہ ہم کو میکانکی اسلامی تحقیق کے کام کی طرف اس وقت بھی رجوع کرنا پڑے گا جب ہم اپنی مقدس کتابوں یعنی قرآن اور حدیث کا یا ان کتابوں کا جو ان مقدس کتابوں کی حکیمانہ یا سائنسی توجیہہ پر مشتمل ہوں گی اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لیے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے لگیں گے۔ لیکن یہ بات ہماری انتہائی کوتاہ نظری اور ذوق تقابل سے تہی دستی کا ثبوت ہوگی کہ ہم ایسے موقع پر بلا ضرورت میکانکی اسلامی تحقیق پر اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں جب کہ مقدس کتابوں پر خود ہمارا یقین ہی ختم ہو رہا ہو۔ اس کی مثال ویسی ہے جیسے کہ کوئی شخص ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کے آخری بحرانی لمحوں میں کشتی کو بچانے کے بجائے کشتی کی آنے والی تباہی سے بے پروا ہو کر اس کے مسافروں کی صحیح تعداد اور ان کے کپڑوں کی رنگت اور ساخت کی جزئیات اور تفصیلات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے بڑی کاوش کرتا رہے یہاں تک کہ کشتی ڈوب جائے۔ قرآن حکیم کا ایک نہایت ہی عمدہ اشاریہ یا میکانکی اسلامی تحقیق کا کوئی ایسا ہی اور نتیجہ اس مسلمان کے لیے کسی کام کا نہیں جو اسلام پر اپنا یقین کھو چکا ہو اگرچہ اسے وجود میں لانے کے لیے سالہا سال کی محنت شاقہ بروئے کار لائی گئی ہو۔

مسلمانوں کی فوری ضرورت

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں، اس وقت ٹھیٹھ اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جارہی ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے۔ جب اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے موجود ہو جائے گی تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے تمام غلط نظریات اور فلسفوں کی مکمل اور ایمان پرور تردید کرے گی بلکہ اسلام کی ان غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو ان مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ، کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینوں کو مطمئن کرنے کے لیے

اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں لہٰذا اسلام کی حکیمانی اور سائنسی توجیہہ فقط ایک ہی بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ احکام اسلامی کی علتوں اور حکمتوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا!

ایک بے وقت کی کوشش مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر جب اسلام پر ان کا یقین گر رہا ہے اسلام کے قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں بلکہ بدتر ہو جائیں گے، مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر راہنمائی کرتی ہے وہ علوم قدیمہ و جدیدہ کا علم ہی نہیں، بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور ہے۔ انحطاطِ دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں تو صعب الحصول ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن نہ ہو۔ نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ وائمہ اور صلحا کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے اخلاقی اور مذہبی ضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اس وقت تک ہم ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح سے بدلنا چاہیئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے معاشرتی قوانین کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے رہتے ہیں۔

سچا اجتہاد سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشو و نما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے ہمارے لیے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لیے ہماری

موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لیے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس "حکمت" اور "دانائی" سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے "حسن و جمال" سے اور ایک نئی شان و شوکت سے جن کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں "مزین" کیا کیا جائے۔ یہ سچا اجتہاد نہیں۔ کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشو و نما کی صورت اختیار کرتا ہے۔ بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو جنھیں ہم پسند کرتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا بس چل سکتا ہے اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچا اجتہاد اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی اور ہم اس شریعت کو جس پر حضورؐ اور صحابہ کا عمل تھا پھر اس محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ آیا ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لیے نئے قوانین وضع کریں۔ اگر حضرت عمرؓ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے۔

ہمارے معاشرہ کے موجودہ حالات درحقیقت کس چیز کے مقتضی ہیں

جس چیز کو ہم معاشرہ کا ایک ناگزیر ارتقائی تغیر سمجھ رہے ہیں جو ہمارے خیال میں اجتہاد اور نئے قوانین کا تقاضا کرتا ہے وہ درحقیقت مغرب کی تقلید میں ہماری عام اخلاقی گراوٹ، غیر اسلامی نظریات سے ہماری محبت اور اسلام کے اخلاقی اور دینی ضبط اور نظم سے ہماری نفرت اور بغاوت کے عوامل ہیں جو ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کر رہے ہیں۔

یہ تمام حالات اسلام پر ہمارے یقین کے انحطاط کی علامت کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ موجودہ صورت میں ہمارا اجتہاد جو باطل ہوگا ان افسوس ناک حالات کو بہتر نہیں بلکہ بدتر بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتہاد شریعت کے وقار کو اور اس کے ساتھ پورے اسلام کے وقار کو اور کم کرے گا جس سے ہمارا یقین اور مضمحل ہو جائے گا اور ہم میں سے بعض لوگ جن کا ایمان پہلے ہی کمزور ہے ناحق اور ناروا طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ اسلام ایک وقتی نظریۂ حیات ہے جو حالات کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ ایسے اجتہاد کو سچے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کے باوجود سچا اسلام ہمیشہ زندہ اور باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ یقین و ایمان کے انحطاط کے اس دور میں متقدمین کے نقش قدم پر چلنا اس سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تر ہے کہ ایسے لوگوں کا اجتہاد قبول کیا جائے جو نور ایمان سے محروم ہو چکے ہوں۔ ان حالات کا صحیح علاج یہ نہیں کہ ہم نئے قوانین وضع کریں جو ہمارے اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور سطحی طور پر بدل سکتے ہیں۔ بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اسلام کے جدید نظام تعلیم کو نافذ کریں جس میں خدا کا تصور تمام طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی اور اجتماعی علوم کو منظم کرنے والا محوری اور مرکزی تصور ہو۔ صرف ایسا نظام تعلیم ہی فرد کو ذہنی طور پر پوری طرح سے بدل کر درست کر سکتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیانتداری ہو اور نہ انصاف کہ ہم پہلے خود ہی ایک ایسا تعلیمی اور ثقافتی ماحول پیدا کریں جس میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت صرف اس طرح سے ہو سکے کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ اور پھر یہ شکایت کریں کہ اس طرح کے اعمال و افکار درست نہیں۔ اور ایسے قوانین وضع کریں جو اس کے نادرست اعمال میں ایک بیرونی مصنوعی دباؤ کی صورت میں رکاوٹ پیدا کریں۔ قوانین صرف وہاں کام کرنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں جہاں تعلیم ناکام ہو گئی ہو۔ ہمارے لیے اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ہم تعلیم کی اصلی دلوں کو بدلنے والی قوت کو آزمانے کے بغیر قوانین کی مصنوعی قوت سے کام لیں۔ جو ہمارے ظاہری اعمال کو بھی بدل نہیں سکتی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم معاشرہ کو جدید اسلامی نظام تعلیم کے ذریعہ سے حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر بدلنے کے بجائے اسے مصنوعی اور سطحی طور پر بدلنے کے لیے موجودہ اسلامی قوانین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب قوانین پر عمل کرنے کی نیت موجود نہ ہو تو اُن کی زد سے بچ کر نہایت آسانی کے ساتھ ان کی خلاف ورزیاں کی

جا سکتی ہیں۔

لیکن جدید اسلامی نظامِ تعلیم جو نہ صرف اسلامی ہونا چاہیئے بلکہ علمی اور عقلی لحاظ سے بھی محکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہونا چاہیئے اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ہم تعلیم کا کوئی معقول اور صحیح فلسفہ جو لازماً اسلامی ہوگا پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اور تعلیم کا ایسا فلسفہ انسان اور کائنات کی صحیح علمی اور عقلی توجیہہ دوسرے لفظوں میں اسلام کی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ کے ایک جزو کے طور پر ہی وجود میں آ سکتا ہے ورنہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی یہی سائنسی حکمیاتی توجیہہ ہے جو اسلامی نظامِ قوانین کی ایک ہی ممکن بنیاد بھی ہے۔ غرض ہم جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں ہماری فوری ضرورت یہ نہیں کہ ہم اسلام کے قوانین کو بدل دیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ پیدا کر کے اسلام پر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور اسلام کی صحیح علمی اور عقلی واقفیت سے آپ اپنے کو مسلح کریں۔ تاکہ محض عالمِ انسانی کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے جس نظریاتی جنگ میں ہم مجبوراً شریک ہیں اس میں فتح پائیں۔ اور شکست کھا کر مٹنے سے محفوظ رہیں۔ (باقی)

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 37 NO. 6 SEPTEMBER 1969

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

Price Rs. 5-00

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

فی کاپی ......۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/۰
پاکستان سے ۴/۰

جلد ۳۷	بابت ماہ رجب المرجب ۱۳۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۹ء	شمارہ ۷

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی	۵
۳	ارشادات حکیم الامت حضرت تھانویؒ	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۱۷
۴	اسلامی تحقیق	ڈاکٹر رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ	۲۹
۵	قرآن اور اس کی تعلیمات	V. GORDON CHILDE	۳۸
۶	درس قرآن	مولانا محمد منظور نعمانی	۴۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

دُنیا میں کم سے کم ۵۴ کروڑ مسلمان بتائے جاتے ہیں۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو اسرائیل کے زیرِ قبضہ مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگائے جانے کا واقعہ پیش آیا، تو اس کی خبروں کے ساتھ اخبارات نے بھی یہ تاثر دیا کہ اس سے پوری دنیائے اسلام میں آگ لگ گئی ہے لیکن خدا جانے یہ کروڑہا کروڑ دلوں کی کیسی آگ تھی کہ صرف ۲۵ لاکھ یہودیوں کی ریاست اسرائیل کا ایک بال بھی اس میں نہ جل سکا۔

جب قوموں میں عمل اور اقدام کی قوت سرد ہو جاتی ہے تو شاید الفاظ کا بازار اسی نسبت سے گرم ہو جاتا ہے۔ اور یہ شاید ضمیر اور ذمہ داری کے ان تقاضوں کو دھوکہ دینے کی سب سے آسان شکل ہے جو ایسے موقعوں پر پیدا ہوتے ہیں ورنہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ مسجدِ اقصیٰ جیسی مقدس عبادت گاہ نے نہیں ایک بے کس عورت نے اپنے اوپر ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی تھی کہ وامعتصماہ! تو اس عباسی فرمانروا (معتصم) نے کوئی تقریر نہیں جھاڑی، بلکہ وہ کیا جو اس فریاد کا تقاضہ تھا۔

ہم نے مسجدِ اقصیٰ میں آتش زنی کے اس اندوہناک واقعہ پر اردن اور بیت المقدس میں کیے جانے والے مظاہروں کی خبروں میں پڑھا کہ عرب نعرے لگا رہے تھے ——— ناصر! ناصر!! لیکن جناب ناصر نے ایک تقریر ارشاد فرمادی کہ اب اسرائیل سے ہماری جنگ صرف تحریر (آزادی) کی جنگ نہ ہوگی بلکہ یہ تطہیر کی بھی جنگ ہوگی اور ہمارے سپاہی صرف عرب قوم ہی کے سپاہی نہیں بلکہ اللہ کے بھی سپاہی ہوں گے!۔

یہ جنگ کب ہوگی؟ اللہ ہی جانے! البتہ یہ دیکھ لینے کی چیز ہے کہ اسلامی چوٹی کانفرنس جو اس موقع پر ناصر صاحب کی منظوری ہی سے نہیں بلکہ ایک درجہ میں انہی "تحریک" سے ہوئی تھی، اُسمیں بھی وہ بذاتِ خود شرکت نہیں فرما سکے جبکہ کتنے ہی غیر عرب ملکوں کے سربراہ دور دراز سے اس میں شرکت کے لیے پہونچے ——— کہا گیا ہے کہ ان کی طبیعت ناساز تھی۔ حالانکہ اسی "ناسازی" کے زیادہ "سخت" دنوں میں انھوں نے اپنے خلاف ایک سازش کا

قلع قمع کرتے ہوئے ملک کے محکمہ جاسوسی کے سربراہ کا گرانبار عہدہ بھی خود سنبھالنے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کی۔

یہ ناصر صاحب کا معاملہ تھا، عراق اور شام نے اس کانفرنس کا بالکل ہی بائیکاٹ کیا، حالانکہ شام تو مصر ہی کی طرح اسرائیل کا براہِ راست متحارب بھی ہے اور جنگجوئی کی باتوں میں تو شاید کوئی عرب ملک اس کے پائے کو نہیں پہونچا۔ اور عراق اگرچہ براہِ راست متحارب نہیں، مگر گھن گرج میں شام ہی کا ہم مشرب ہے۔ اسرائیل کے لیے جاسوسی کے نام پر پھانسیوں کا جیسا بازار عراق میں گرم ہے کسی دوسرے عرب ملک میں نہیں۔

تو یہ مسجد اقصیٰ کے مسئلہ پر اسلامی چوٹی کانفرنس تھی، جس میں اسرائیل سے براہِ راست ٹکراؤ رکھنے والے تین ملکوں (مصر، اردن، شام) میں سے شام تو سرے ہی سے غائب تھا۔ اور مصر بے "چوٹی" کے شریک ہوا تھا! یہ اُس آگ کا منظر تھا جو عالم اسلام کے قلب و جگر کو برما رہی تھی ___ ایسی کانفرنس سے کیا نتیجہ نکلنا تھا؟ چند فرسودہ قسم کی تجویزیں پاس کر دی گئیں۔ اور وہ نعرۂ جہاد جس کے شور میں یہ کانفرنس منعقد ہونے چلی تھی، کانفرنس کی کسی تجویز پر اس کا سایہ بھی نہ پڑتے پایا۔

خدا کے بندو! جب تم جہاد کے قایل نہیں ہو، تو کیوں آئے دن کا نعرہ بنا کر رسوا کرتے ہو؟ جب تم اس کے قایل ہو اور واقعی ارادہ بھی ہو تو اپنے بل پر اُٹھو اور جو ساتھ آتا ہو اسے لے کر فداکاری کی یہ رسم کہن تازہ کر دو۔ اور اس کا دم نہیں ہے تو اپنے ساتھ ساتھ اس مقدس لفظ کو رسوا نہ کرو جس کی آبرو میں اُمت کے لاکھوں شہیدوں اور غازیوں کا خون صرف ہوا ہے! عربوں میں اگر واقعی جہاد کا جذبہ ہو تو انھیں اسرائیل سے نپٹنے کے لیے کسی لمبی چوڑی اسلامی کانفرنس کی ضرورت نہیں۔ اس جذبہ کی (جب بھی نہیں) چند عرب ملکوں ہی کی آگ اسرائیل کو بھسم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب یہ آگ واقعی میں موجود نہیں ہے تو پوری دنیائے اسلام کو جمع کر لینے والی کانفرنسیں بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے نہیں جا سکتیں۔ اور اسرائیل کی نظر میں اُن کی پرِکاہ بھی وقعت نہیں ہو سکتی۔

ہم مسلمانانِ ہند ابھی مسجد اقصیٰ کو رونے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ احمد آباد کے مسلمانوں پر بجلی گری اور چشم زدن میں ان کی آبادیوں کو خاکستر بنا کر رکھ گئی۔ شاباش ہے ہماری حکومت کو کہ اُس نے

مین انہی دنوں میں مسلمانانِ ہند کے نام پر اپنا ایک وفد بھی اس اسلامی کانفرنس مین بھیجنے کی ہمت کر ڈالی جو مسجد اقصیٰ کے عنوان پر رباط میں منعقد ہو رہی تھی، اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا، کاش اس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو وہ سوچتی کہ یہ وقت کسی مسلم کانفرنس میں جا کر بیٹھنے کا نہیں ہے یہ مسلمانوں کے نام پر ایک ایسی کانفرنس میں نمائندگی حاصل کی جائے اور ایک پوری ریاست میں ان مسلمانوں پر آگ اور خون کی کم و بیش بارش ہو رہی ہو! ــــــ احمد آباد میں تو خیر مکمل محشرستان بنا ہی، بڑودہ، آنند، مہسانہ اور کتنے ہی دوسرے شہر اور قصبات اس آگ کی لپیٹ میں آئے۔ اور ریاستی حکومت اس ناقابلِ بیان بربریت کے مقابلہ میں ایسی مجہولیت یا لاپروائی کی تصویر بنی رہی جس کے بعد اسے حکومت کہنا اس لفظ کی وہ توہین ہے جسے شاید ہندوستان ہی میں برداشت کیا جا سکتا ہو۔

ہمیں حیرت ہے، ان گاندھی وادیوں کے ضمیر پر جنھیں برت رکھنے کی اگر سوجھی تو صرف امن و امان کیلئے جو بہر حال ہو ہی جائے گا، نہ کہ ایسی حکومت کے مستعفی ہونے کے لیے جو خاص راجدھانی میں گنڈوں کے ہاتھوں ہزاروں بے گناہوں کا خون بہہ جانے اور بستیاں کی بستیاں اُجڑ جانے کو روکنے کی ذمہ داری کا احساس یا کم از کم اس کی اہلیت نہیں دکھا سکی۔

گجرات کے گورنر شرمین نرائن جو گاندھی جی کے خاص بھگت مانے جاتے ہیں انھوں نے ۲۸ ستمبر کو احمد آباد میں تقریباً امن بحال ہو جانے کے بعد ایک جلسہ میں فرمایا کہ "حکومت فرقہ وارانہ عناصر کو کچلنے اور انھیں ختم کرنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے"۔ یہ اس حکومت کے لیے فرمایا جا رہا ہو جسے احمد آباد کی اس بربادی کے بعد، جسے متفقہ طور پر آزادی کے بعد سب سے بڑی قتل و غارت گری کہا جا رہا ہے، حکومت کہنا ہی ایک ذمہ دار گورنر کو زیب نہیں دیتا۔ لیکن کیا کیا جائے یہاں آزادی کے بعد یہی ہوتا آ رہا ہو مسلم اخبارات و رسائل ان واقعات پر آہ کرتے ہیں یا مسلمانوں کو اپنے مردانہ دفاع کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کے مدیران کو صحافیوں اور اخبار نویسوں کی صف سے اُٹھا کر مفسدہ پردازوں کے زمرہ میں عدالتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے، ایک ایک آدمی پر پانچ پانچ چھ چھ مقدمات لاد دیے جاتے ہیں، کہ اپنی بے گناہی ثابت کرے یا جیل کی ہوا کھائے، چاہے ان کی تحریر سے کسی ایک شخص کی نکسیر بھی نہ پھوٹی ہو۔ کیونکہ یہ یکجہتی کونسل کا مرکزی وزارت داخلہ کو دیا ہوا مشورہ ہو۔ لیکن اسی کونسل نے حکام کے خلاف کارروائی کا جو مشورہ حکومت کو دیا تھا اور حکومت نے اس کو قبول کر کے کا اعلان بھی کیا تھا، اُن کی فرض ناشناسی

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا یہ امتیاز ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام ہی شعبوں کے متعلق واضح ہدایات دی گئی ہیں ـــــ اس سلسلۂ معارف الحدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث اور آپ کے جو ارشادات الفرقان کے صفحات پر (یا کتابی صورت میں) مرتب کر کے اب تک پیش کیے جا چکے ہیں اُن کا تعلق یا عقائد و ایمانیات سے تھا یا اخلاق و جذبات اور قلب و رُوح کی کیفیات سے یا طہارت اور نماز روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادات اور اذکار و دعوات سے! ـــــ اب اُن احادیث کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جن کا تعلق معاشرتی حقوق و آداب اور معاشی معاملات سے ہے، اور جن سے معلوم ہوگا کہ ہم اپنے ابناء جنس اور عزیزوں قریبوں، چھوٹوں اور بڑوں، اپنوں اور پرایوں کے ساتھ، جن سے زندگی میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے کس طرح پیش آئیں، کیا برتاؤ کریں اور کس کے کس پر کیا حقوق ہیں۔ ـــــ اور لین دین، خرید و فروخت، قرض و امانت، تجارت و زراعت، مزدوری و دستکاری، کارخانہ داری و کرایہ داری، اور اسی طرح دوسرے معاشی مشغلوں کے بارے میں اللہ و رسول کے کیا احکام ہیں اور اُن کی کون سی شکلیں جائز اور کون ناجائز ہیں۔

معاشرت و معاملات کی خصوصی اہمیت :-

یہ دونوں باب (معاشرت و معاملات) اس لحاظ سے شریعت کے نہایت اہم ابواب ہیں کہ ان میں ہدایتِ ربانی اور خواہشاتِ نفسانی، اور احکامِ شریعت اور دُنیوی مصلحت و منفعت کی کشمکش عبادات وغیرہ دوسرے تمام ابواب سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے اللہ کی بندگی و فرمانبرداری اور اس کے رسول اور اس کی شریعت کی تابعداری کا جیسا امتحان ان میدانوں میں ہوتا ہے دوسرے کسی میدان میں نہیں ہوتا ــــــ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے بنی آدم کو فرشتوں پر نوعی فضیلت حاصل ہوئی ورنہ ظاہر ہے کہ ایمان و یقین اور ہمہ وقتی ذکر و عبادت اور رُوح کی لطافت و طہارت میں انسان فرشتوں کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔

معاشرت سے متعلق احکام و ہدایات :-

اس تمہید کے بعد ہم پہلے معاشرت کے سلسلے کی حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ نکاح و طلاق اور عدّت و نفقہ وغیرہ سے متعلق احادیث بھی اس ضمن میں درج ہوں گی۔

معاشرتی احکام و ہدایات کا سلسلہ بچہ کی پیدائش ہی سے شروع ہو جاتا ہے ــــ اسلیے ہم انہی حدیثوں سے اس سلسلہ کا آغاز کر رہے ہیں جن میں پیدائش ہی کے سلسلہ میں ہدایات دی گئی ہیں۔

نومولود بچہ کے کان میں اذان :-

عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَذَّنَ فِیْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ حِیْنَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلٰوةِ ــــــ رواہ الترمذی و ابوداؤد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے نواسے) حسن بن
علی کے کان میں نماز والی اذان پڑھتے ہوئے دیکھا جب (آپ کی صاحبزادی)
فاطمہ کے ہاں ان کی ولادت ہوئی۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) حضرت ابو رافع کی اس حدیث میں حضرت حسن کے کان میں صرف اذان پڑھنے کا ذکر ہے۔ لیکن ایک دوسری حدیث سے جو کنز العمال میں مسند ابویعلی موصلی کی تخریج سے حضرت حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) سے روایت کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نومولود بچہ کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھنے کی تعلیم و ترغیب دی اور اس کی برکت اور تاثیر کا بھی ذکر فرمایا کہ اس کی وجہ سے بچہ ام الصبیان کے ضرر سے محفوظ رہے گا (جو شیطانی اثرات سے بھی ہوتا ہے)۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نومولود بچہ کا پہلا حق گھر والوں پر یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے کانوں کو اور کانوں کے ذریعہ اس کے دل و دماغ کو اللہ کے نام اور اس کی توحید اور ایمان و نماز کی دعوت و پکار سے آشنا کریں۔ اس کا بہتر سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کانوں میں اذان و اقامت پڑھی جائے ـــــ اذان و اقامت میں دینِ حق کی بنیادی تعلیم اور دعوت نہایت مؤثر طریقہ سے دی گئی ہے، نیز ان دونوں کی یہ تاثیر اور خاصیت بہت سی احادیث میں بیان کی گئی ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے اس لیے شیطانی اثرات سے بچہ کی حفاظت کی بھی یہ ایک تدبیر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدائش کے وقت نومولود مسلمان بچہ کے کان میں اذان و اقامت پڑھنے کی تعلیم دی اور جب عمر پوری کرنے کے بعد اس کو موت آجائے تو غسل دے کر اور کفنا کر اُس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اس طرح یہ تبلادیا اور جتلادیا کہ مومن کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان کی زندگی ہے اور وہ بس اس طرح گزرنی چاہیے، جس طرح اذان کے بعد نماز کے انتظار اور اُس کی تیاری میں گزرتی ہے۔
ـــــ نیز یہ کہ مسلمان بچے کا پہلا حق یہ ہے کہ پیدائش کے ساتھ ہی اس کے کان میں اذان دی جائے اور آخری حق یہ ہے کہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔

تحنیک اور دعائے برکت :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اور صحبت کے نتیجہ میں صحابہ کرام کو آپ کے ساتھ عقیدت کا جو تعلق تھا اُس کا ایک ظہور یہ بھی تھا کہ نومولود بچے آپ کی خدمت میں لائے جاتے تھے تاکہ آپ ان کے لیے خیر و برکت کی دعا فرما دیں اور کھجور یا ایسی ہی کوئی چیز چبا کر بچہ کے تالوے پر مل دیں اور اپنا لعاب دہن اس کے منھ میں ڈال دیں جو خیر و برکت کا باعث ہو ـــــ اس عمل کو تحنیک کہتے ہیں ـ

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُؤْتٰى بِالصِّبْيَانِ فَيُبَرِّكُ عَلَيْهِمْ وَيُحَنِّكُهُمْ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا کرتے تھے تو آپ اُن کے لیے خیر و برکت کی دُعا فرماتے تھے اور تحنیک فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِىْ بَكْرٍ اَنَّهَا حَمَلَتْ بِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ بِمَكَّةَ قَالَتْ فَوَلَدْتُ بِقُبَاءٍ ثُمَّ اَتَيْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعْتُهٗ فِىْ حَجْرِهٖ ثُمَّ دَعَا بِتَمْرَةٍ فَمَضَغَهَا ثُمَّ تَفَلَ فِىْ فِيْهِ ثُمَّ حَنَّكَهٗ ثُمَّ دَعَا لَهٗ وَبَرَّكَ عَلَيْهِ وَكَانَ اَوَّلَ مَوْلُوْدٍ وُلِدَ فِى الْاِسْلَامِ ـــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں حمل سے تھیں، جب ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قباء میں اُن کے ولادت ہوئی اور عبد اللہ بن زبیر پیدا ہوئے، کہتی ہیں کہ میں بچہ کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے اس کو آپ کی گود میں رکھ دیا۔ آپ نے چھوارہ منگوایا اور اس کو چبایا پھر اپنا لعاب دہن اُس کے

منہ میں ڈالا اور پھر اس کے تالوے پر ملا، پھر اس کے لیے دعا کی اور برکت سے نوازا، اور یہ اسلام میں پہلا بچہ تھا جو ہجرت کے بعد ایک مہاجر کے گھر پیدا ہوا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) صحیح بخاری کی اس حدیث کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ عبداللہ بن زبیر کے پیدا ہونے سے مسلمانوں کو خاصکر اس لیے بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ یہودیوں نے مسلمانوں پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ ان کے بچے پیدا ہی نہ ہوں گے ـــــ عبداللہ بن زبیر کی پیدائش نے اس کو غلط ثابت کر دیا اور مسلمانوں کے جو دشمن یہ جادو والی بات مشہور کر رہے تھے وہ ذلیل ہوئے۔

کتب حدیث میں "تحنیک" کے بہت سے واقعات مروی ہیں ـــــ ان سے معلوم ہوا کہ جب کسی گھرانے میں بچہ پیدا ہو تو چاہیئے کہ اللہ کے کسی مقبول اور صالح بندہ کے پاس اس کو لے جائیں، اس کے لیے خیر و برکت کی دعا بھی کرائیں اور تحنیک بھی کرائیں۔ یہ ان سنتوں میں سے ہے جن کا رواج بہت ہی کم رہ گیا ہے۔

عقیقہ:-

دنیا کی قریب قریب سب ہی قوموں اور ملتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بچہ پیدا ہونے کو ایک نعمت اور خوشی کی بات سمجھا جاتا ہے اور کسی تقریب کے ذریعہ اس خوشی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، یہ انسانی فطرت کا تقاضہ بھی ہے اور اس میں ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس سے نہایت لطیف اور خوبصورت طریقہ پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ باپ اس بچہ کو اپنا ہی بچہ سمجھتا ہے اور اس بارہ میں اس کو اپنی بیوی پر کوئی شک و شبہ نہیں ہے، اس سے بہت سے فتنوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے ـــــ عربوں میں اس کے لیے جاہلیت میں بھی عقیقہ کا رواج تھا، دستور یہ تھا کہ پیدائش کے چند روز بعد نومولود بچہ کے سر کے وہ بال جو وہ ماں کے پیٹ سے لے کے پیدا ہوا ہے صاف کرا دیے جاتے اور اس دن خوشی میں کسی جانور کی قربانی کی جاتی جو ملت ابراہیمی کی نشانیوں میں سے ہے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اصولی طور پر اس کو باقی رکھتے ہوئے بلکہ اس کی ترغیب دیتے ہوئے اس کے بارہ میں مناسب ہدایات دیں اور خود عقیقے کر کے عملی نمونہ بھی پیش فرمایا۔

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا وُلِدَ لِأَحَدِنَا غُلَامٌ ذَبَحَ شَاةً وَلَطَخَ رَاسَهُ بِدَمِهَا فَلَمَّا جَاءَ الْإِسْلَامُ كُنَّا نَذْبَحُ شَاةً يَوْمَ السَّابِعِ وَنَحْلِقُ رَاسَهُ وَنَلْطَخُهُ بِزَعْفَرَانٍ۔

—— رواہ ابو داؤد

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہم لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کے لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچہ کے سر کو رنگ دیتا، پھر جب اسلام آیا تو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے مطابق) ہمارا طریقہ یہ ہو گیا کہ ہم ساتویں دن عقیقہ کی بکری کی قربانی کرتے ہیں اور بچہ کا سر صاف کرا کے اس کے سر پر زعفران لگا دیتے ہیں۔

(سنن ابی داؤد)

(اور اسی حدیث کی رزین کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کے ساتھ ہم بچہ کا نام بھی رکھتے ہیں)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانُوا فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا عَقُّوا عَنِ الصَّبِيِّ خَضَبُوا قُطْنَةً بِدَمِ الْعَقِيقَةِ فَإِذَا حَلَقُوا رَاسَ الصَّبِيِّ وَضَعُوهَا عَلَى رَأْسِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْعَلُوا مَكَانَ الدَّمِ خَلُوقًا — رواہ ابن حبان فی صحیحہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ بچہ کا عقیقہ کرتے تو روئی کے ایک پھوئے میں عقیقہ کے جانور کا خون بھر لیتے، پھر جب بچہ کا سر منڈا دیتے تو وہ خون بھرا پھویا اس کے سر پہ رکھ دیتے (اور اس کے سر کو عقیقہ کے خون سے رنگین کر دیتے، یہ ایک جاہلانہ رسم تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ کے سر پر

خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق لگایا کرو۔ (صحیح بن حبان)

(تشریح) خلوق ایک مرکب خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہو۔ حضرت بریدہ اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج عربوں میں زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا۔ چونکہ اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اور یہ بنیادی طور پر شریعتِ اسلامی کے مزاج کے مطابق تھا اور غالباً مناسکِ حج کی طرح ملتِ ابراہیمی کے بقایا میں سے تھا اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصل کو باقی رکھا اور جاہلانہ رسوم کی اصلاح فرمائی۔

اسی طرح بیہقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کا رواج یہود میں بھی تھا لیکن وہ صرف لڑکوں کی طرف سے عقیقہ کی قربانی کرتے تھے لڑکیوں کی طرف سے نہیں کرتے تھے، جس کی وجہ غالباً لڑکیوں کی ناقدری تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی اصلاح فرمائی اور حکم دیا کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی طرف سے بھی عقیقہ کیا جائے[۵]۔ البتہ دونوں صنفوں میں جو قدرتی اور فطری فرق ہے (جس کا لحاظ میراث اور قانونِ شہادت وغیرہ میں بھی کیا گیا ہے) اس کی بنا پر آپ نے فرمایا کہ لڑکی کے عقیقہ میں ایک بکری اور لڑکے کے عقیقہ میں (اگر استطاعت اور وسعت ہو) تو دو بکریوں کی قربانی کی جائے۔

عَنْ اُمِّ كُرْزٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ وَلَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ اَوْ اُنَاثًا ـــــــ رواہ الترمذی والنسائی

اُم کرز رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ (عقیقہ کے بارہ میں) فرما رہے تھے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عقیقہ کے جانور نر

---

[۵] ان الیہود تعق عن الغلام ولا تعق عن الجاریۃ فعقوا عن الغلام شاتین وعن الجاریۃ شاۃ ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن ابی ہریرۃ مرفوعاً۔ کنز العمال ص۲۶۲ ج۸

ہوں یا مادہ۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وُلِدَ لَهٗ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً۔

رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے بچہ پیدا ہوا اور وہ اس کی طرف سے عقیقہ کی قربانی کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرے۔

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عقیقہ فرائض و واجبات کی طرح کوئی لازمی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا درجہ استحباب کا ہے جیسا کہ حدیث کے خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح لڑکے کے عقیقہ میں دو بکریاں کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر وسعت ہو تو دو کی قربانی بہتر ہے ورنہ ایک بھی کافی ہے۔ آگے درج ہونے والی ایک حدیث سے معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حضرت حسین کے عقیقہ میں ایک ہی ایک بکری کی قربانی کی تھی۔

عَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ غُلَامٍ رَهِيْنَةٌ بِعَقِيْقَتِهٖ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهٖ وَيُحْلَقُ وَيُسَمّٰى — رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی

حضرت حسن بصری نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بچہ اپنے عقیقہ کے جانور کے عوض رہن ہوتا ہے جو ساتویں دن اس کی طرف سے قربانی کیا جائے اور اس کا سر منڈوا دیا جائے اور نام رکھا جائے۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) عقیقہ کے جانور کے عوض بچہ کے رہن ہونے کے شارحین نے کئی مطلب

بیان کیے ہیں، اس عاجز کے نزدیک دل کو زیادہ لگنے والی بات یہ ہے کہ بچہ اللہ تعالےٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اور صاحبِ استطاعت کے لیے عقیقہ کی قربانی اس کا شکرانہ اور گویا اس کا فدیہ ہے، جب تک یہ شکریہ پیش نہ کیا جائے اور فدیہ ادا نہ کر دیا جائے وہ بار باقی رہے گا اور گویا بچہ اس کے عوض رہن رہے گا۔

پیدائش ہی کے دن عقیقہ کرنے کا حکم غالباً اس لیے نہیں دیا گیا کہ اس وقت گھر والوں کو زچہ کی دیکھ بھال کی فکر ہوتی ہے، علاوہ ازیں اسی دن بچہ کا سر صاف کرا دینے میں طبی اصول پر ضرر کا بھی خطرہ ہے، ایک ہفتہ کی مدت ایسی ہے کہ اس میں زچہ بھی عموماً ٹھیک ہو جاتی ہو اور بچہ بھی سات دن تک اس دنیا کی ہوا کھا کے ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا سر صاف کرا دینے میں ضرر کا خطرہ نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے اور بعض دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کے ساتھ ساتویں دن بچہ کا نام بھی رکھا جائے ——— لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بچوں کا نام پیدائش کے دن ہی رکھ دیا تھا، اس لیے ساتویں دن سے پہلے نام رکھ دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہاں اگر پہلے نام نہ رکھا گیا ہو تو ساتویں دن عقیقہ کے ساتھ نام بھی رکھ دیا جائے، جن حدیثوں میں ساتویں دن عقیقہ کے ساتھ نام رکھنے کا ذکر ہے ان کا مطلب یہی سمجھنا چاہیے۔

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرِ الضَّبِّيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَاهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَّاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى ——— رواہ البخاری

حضرت سلمان بن عامر الضبی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بچہ کے ساتھ عقیقہ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ جس کو بچہ عطا فرمائے وہ عقیقہ کرے) لہذا بچہ کی طرف سے قربانی کرو اور اس کا سر صاف کرا دو۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) عقیقہ میں جیسا کہ ان حدیثوں سے ظاہر ہے دو ہی کام ہوتے ہیں۔ ایک بچہ کا

سر منڈوا دینا اور دوسرا اُس کی طرف سے شکرانہ اور فدیہ کے طور پر جانور قربان کر دینا۔ ان دونوں عملوں میں ایک خاص ربط اور مناسبت ہے اور یہ ملّت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہیں۔ حج میں بھی ان دونوں کا اسی طرح جوڑ ہے اور حاجی قربانی کرنے کے بعد سر صاف کراتا ہے۔ اس لحاظ سے عقیقہ عملی طور پر اس کا بھی اعلان ہے کہ ہمارا رابطہ اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے اور یہ بچہ بھی ملّتِ ابراہیمی ہی کا ایک فرد ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ كَبْشًا كَبْشًا ــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے نواسوں) حسن اور حسین کا عقیقہ کیا اور ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) حضرت حسن اور حضرت حسین کے عقیقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ایک مینڈھے کی قربانی غالباً اس لیے کی کہ اُس وقت اتنی ہی وسعت تھی، اور اس طرح ان لوگوں کے لیے جن کو زیادہ وسعت حاصل نہ ہو ایک نظیر بھی قائم ہو گئی ــــ اس حدیث کی بعض روایات میں بجائے ایک ایک مینڈھے کے دو دو مینڈھوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن محدثین کے نزدیک سنن ابی داؤد کی یہی روایت قابلِ ترجیح ہے جس میں ایک ایک مینڈھے کا ذکر کیا گیا ہے۔

عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَّقَالَ يَا فَاطِمَةُ اِحْلِقِيْ رَأْسَهٗ وَتَصَدَّقِيْ بِزِنَةِ شَعْرِهٖ فِضَّةً فَوَزَنَّاهُ فَكَانَ وَزْنُهٗ دِرْهَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْهَمٍ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپ نے (اپنی صاحبزادی سیدہ) فاطمہ سے فرمایا کہ اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ

کردو (ہم نے وزن کیا) تو وہ ایک درہم برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں عقیقہ کے سلسلہ میں قربانی کے علاوہ بچہ کے بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کرنے کا بھی ذکر ہے، یہ بھی مستحب ہے۔

اس حدیث کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادہ حسن کے بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کرنے کا حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو حکم دیا تھا بعض حضرات نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ حضرت حسن کی پیدائش کے دنوں میں ان کے ماں باپ (حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما) کے ہاں اتنی وسعت نہیں تھی کہ وہ عقیقہ کی قربانی کرسکتے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کی قربانی تو اپنی طرف سے کردی، لیکن حضرت فاطمہ سے فرمادیا کہ بچہ کے بالوں کے وزن بھر چاندی وہ صدقہ کردیں تاکہ ان کی طرف سے بھی کچھ شکرانہ صدقہ کی شکل میں اللہ کے حضور میں گزر جائے۔

تسمیہ (نام رکھنا):-

بچہ کا اچھا نام رکھنا بھی ایک حق ہے، احادیث نبوی میں اس بارہ میں بھی واضح ہدایات وارد ہوئی ہیں۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْوَلَدِ عَلَى الْوَالِدِ اَنْ يُّحْسِنَ اِسْمَهٗ وَيُحْسِنَ اَدَبَهٗ۔

———— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا باپ پر بچہ کا یہ بھی حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو حسن ادب سے آراستہ کرے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ مَا يَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ اِسْمَهٗ فَلْيُحْسِنْ اِسْمَهٗ۔

———— رواہ ابوالشیخ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے بچہ کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہو اس لیے چاہیے کہ اس کا نام اچھا رکھے۔ (ابوالشیخ)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِاَسْمَائِكُمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَاَحْسِنُوْا اَسْمَاءَكُمْ ـــــ رواہ احمد وابوداؤد

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے آباء کے ناموں کے ساتھ پکارے جاؤ گے (یعنی پکارا جائے گا فلاں بن فلاں) لہذا تم اچھے نام رکھا کرو۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ اَسْمَائِكُمْ اِلَی اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے ناموں میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔ (رواہ مسلم)

(تشریح) عبداللہ اور عبدالرحمن کے زیادہ پسندیدہ ہونے کی وجہ ظاہر ہے، اس میں بندہ کی عبدیت کا اعلان ہے اور یہ چیز اللہ کو پسند ہے ـــــ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے نام بھی پسندیدہ ناموں میں سے ہیں، وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نسبت کو ظاہر کرتے ہیں، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا تھا، اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں آپ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے "سَمُّوْا بِاَسْمَاءِ الْاَنْبِیَاءِ" (یعنی پیغمبروں کے ناموں پہ نام رکھو) ـــ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بچوں کے نام ایسے بھی رکھے جو معنوی لحاظ سے اچھے ہیں اگرچہ وہ پیغمبروں کے معروف ناموں میں سے بھی نہیں ہیں، مثلاً اپنے نواسوں کا نام حسن اور حسین رکھا اور ایک انصاری صحابی کے بچہ کا نام منذر رکھا ـــ الغرض اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اور آپ کے ارشادات سے یہی رہنمائی ملتی ہے کہ باپ کی ذمہ داری ہے کہ بچہ کا اچھا نام رکھے یا اپنے کسی بزرگ سے رکھوائے۔

ارشاداتِ حکیم الامت حضرت تھانوی

علماء و طلباء، اصحابِ درس اور اربابِ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

قسط (۲)

تلخیص ـــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

فرمایا ـــــ فلاں مولانا میرے ابتدائی کتابوں کے اُستاد تھے، ایک دفعہ (انھوں نے) مجھ کو زیادہ مارا اس پر خاندان اور قصبہ (تھانہ بھون) میں بہت کچھ قصہ ہوا ـــــ مگر (میرے) انقیاد اور (میری اطاعت) کا یہ اثر ہوا کہ بعد فراغ درسیات ایک روز مولانا نے مجھ سے بایں عنوان معافی چاہی کہ ہم تم ایک مدت تک ساتھ رہے ہیں ایسی حالت میں کچھ حقوق (کی ادائیگی) میں کوتاہی بھی ہو جاتی ہے مجھ سے بھی ہو گئی ہو تو معاف کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں سمجھ گیا جس چیز کی آپ معافی چاہتے ہیں ـــــ مگر کیا وہ معافی (طلب کرنے) کی چیز ہے، وہ تو ایک دولت تھی اور رحمت تھی اس کی بدولت تو آج دو حرف نصیب ہو گئے ـــــ (انھوں نے) فرمایا کہ اس سے تسلی نہیں ہوئی، میں نے عرض کیا کہ حضرت حکم فرماتے ہیں اس وجہ سے عرض کرتا ہوں کہ معافی ہے ـــــ اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبْ ـــــ مولانا کی یہ حالت تھی انکسار اور سادگی کی ـــــ یہ ہے شان، عبدیت کی ـــــ پہلے اُستادوں کا شاگردوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اب شاگردوں کا بھی استادوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں، پھر کہاں علم اور کہاں برکت ..... بڑی دولت اُمتی کے واسطے یہ ہے کہ قلب میں دین کی محبت ہو،

عظمت ہو، چاہے عمل میں (کچھ) کوتاہی ہو۔ سو یہ دولت مجھ کو مولانا کی صحبت کی برکت سے نصیب ہوئی اس لیے کہ بچپن میں شروع تعلیم انھیں سے ہوئی۔ شروع ہی میں اس کی ضرورت ہے کہ استاد بھی (دین کے معاملے میں) صاحبِ محبت ہوں تاکہ شاگردوں کے جذبات وخیالات پر اُن کا اثر ہو اور شروع ہی سے صحیح تربیت اور اصلاح ہو ـــــ پھر فرمایا کہ دین کی محبت اور اپنے بزرگوں کی محبت کے علاوہ اور میرے پاس ہو ہی کیا۔ فرمایا کہ ـــ میں علماء سے چاہتا ہوں کہ یہ ایسا طرز اختیار کریں جس سے عوام کے قلوب میں دین اور اہل دین کی بے وقعتی نہ ہو۔ یہ علماء کو نظرِ تحقیر سے نہ دیکھیں ـــــ مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ تکبر نہ ہو..... اور یہ اعتدال پیدا ہو سکتا ہے کسی کامل کی صحبت سے اُس کی جوتیاں سیدھی کرنے سے بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جوتیاں کھانے سے اور یہ بھی تبلائے دیتا ہوں کہ وہ جوتیاں مارے گا نہیں۔ مگر تم کو اس کے لیے طیار ہو کر آنا چاہیے تب اصلاح ہو سکتی ہے ـــــ فرمایا ـــــ الحمد للہ یہ بات اپنے بزرگوں میں دیکھی کہ سب کچھ تھے اور کچھ بھی نہ تھے۔ دیکھنے والا سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ یہ صاحبِ کمال ہیں۔ ظاہر میں کوئی امتیازی شان نہ رکھتے تھے نہ لباس میں نہ القاب میں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ تقویٰ اور طہارت بڑی چیز ہے مگر آج کل قریب قریب ہر طبقے میں اس کی کمی ہے۔ بالخصوص علماء اور مشائخ میں اس کی کمی ہونا نہایت ہی مذموم ہے اس لیے کہ یہ پیشوا اور مقتدیٰ کہلائے جاتے ہیں ـــــ اور خدا تعالےٰ کا فضل ہوتا ہے تو غیر علماء کو یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ مدرسہ دیوبند میں خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن مجذوب) کا قیام ہوا ـــــ شب کا وقت ہوا، مہتمم صاحب نے مہمان خانے میں خادم مدرسہ کو روشنی کرنے کے لیے حکم فرمایا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر لالٹین اور تیل آپ کا نجی ہے تب تو کوئی حرج نہیں اور اگر مدرسہ کا ہے تو میں خود انتظام کر لوں گا۔ امیر شاہ خاں صاحبؒ بھی اُس وقت مدرسہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، سُن کر میرا نام لے کر کہا کہ یہ تو اُس کے ملنے والوں میں (معلوم ہوتا) ہے۔

ایک مرتبہ مولاناؒ (میاں) اصغر حسین صاحب (محدث دیوبندیؒ) جونپور میں بہ حیثیت مدرسی مقیم تھے ـــــ (وہاں) ایک نووارد طالبعلم مسجد کے چراغ میں مطالعہ کرنے بیٹھے اور جس وقت چراغ گل کرنے کا معمول تھا اس وقت چراغ خود گل کر دیا اور اسکی روشنی میں پھر کتاب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اپنا چراغ روشن کر لیا۔ مولانا اصغر حسین صاحب نے کہا یہ شخص

فلاں شخص کا (میرا نام لے کر کہا) دیکھنے والا معلوم ہوتا ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ـــــ صرف نوافل اور تہجد پڑھ لینا گردن جھکا کر بیٹھ جانا۔ بڑے بڑے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لے لینا۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ، گھٹنوں سے نیچا کرتا پہن لینا اور سینے تک داڑھی کا بڑھا لینا بس یہ علامات رہ گئیں ولایت اور بزرگی کی۔ باطن کی کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے ـــــ اسی کو مولانا رومیؒ یا اور کوئی حکیم فرماتے ہیں

از بروں چوں گورِ کافر پُر حُلَل
واندروں قہرِ خدائے عزّ و جل

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بڑے بڑے کام اور بڑی بڑی جگہوں میں ہو رہے ہیں میں نے تو چھوٹے چھوٹے کام لے لیے ہیں۔ یہی ہو جایا کریں (تو) غنیمت ہے ـــ اور یہ وہ کام ہیں جن کو کوئی اور نہیں کر رہا ـــــ میں نے یہاں درس و تدریس کو بڑھایا نہیں اس لیے کہ مدرسہ دیوبند اور مدرسۂ سہارنپور موجود ہیں اور وہاں یہ کام (درس و تدریس) بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اسی لیے میں نے یہاں کا (خانقاہ کا) نصاب محدود کر دیا ہے۔ وہ چھاپ بھی دیا گیا ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل حبِّ دنیا ... مشائخ اور علماء تک میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ چیز بحمد اللہ اپنے بزرگوں میں نہ تھی ـــــ مکّۂ معظمہ میں ایک ترکی شیخ تھے خلیل پاشاؒ ـــــ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے سب جگہ کے علماء کو دیکھا مگر جیسے ہندوستان کے علماء ہیں ایسے اور کہیں کے علماء نہیں ـــــ میں نے پوچھا کہ آپ نے ان میں کیا بات دیکھی؟ انھوں نے ایک عجیب بات کہی کہ ہندوستان کے علماء میں حُبِّ دنیا نہیں دیکھی اور یہ بات الحمد اللہ ہے بھی کہ اُن کے اکثر میں حُبِّ دنیا نہیں ـــــ اللہ کا شکر ہے ـــــ پھر میں نے یہ بھی پوچھا خلیل پاشاؒ سے ـــــ کہ آپ ہندوستان کے کن علماء سے ملے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ـــــ میں نے دل میں کہا کہ یہی وجہ ہو کہ ہندوستان کے علماء کے مُعتقد ہوئے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ سب کچھ تھے مگر اپنے کو مٹائے ہوئے فنا کیے ہوئے تھے ـــــ اسی لیے آج کل کے اکثر علماء اور مشائخ نظروں میں نہیں سماتے

نہ پسند آتے ہیں۔ اُن حضرات میں ایک عجیب شان تھی جو بیان میں بھی نہیں آتی اور کسی کے دریافت کرنے پر بھی تبلائی نہیں جاسکتی بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے۔

نورِ حق ظاہر بود اندر دلی نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی
مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہو پیشِ ذی شعور

وہاں نہ خاص لباس تھا نہ خدم نہ حشم...... نہ چوغہ نہ ٹپکا نہ اُگالدان نہ پاندان نہ خاصدان لیکن صورت دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا تھا ۔

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند دلبرِ ماست کہ با حُسنِ خدا داد آمد

فرمایا کہ ــــ ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ کبھی تکبر بشکل تواضع ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی ریا (کاری) بشکل اخلاص ہوتی ہے۔ سو ان چیزوں میں فرق کرنے پہچاننے کے لیے شیخ کامل کی ضرورت ہو اور ان سب میں زیادہ باریک اور نازک چیز اخلاص ہے۔ بزرگوں نے تصریح کی ہے کہ بعض اوقات اس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہیں اخلاص میں کمی تو نہیں ہوگئی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بصیرت فی العلم کے لیے کسی بزرگ کی صحبت کی ضرورت ہو یعنی پہلے (کسی بزرگ کی) صحبت ہو اُس کے بعد علوم حاصل کرے تو بیحد نافع ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے معدہ اگر اپنی اصلی حالت پر نہ ہو تو وہ لطیف سے لطیف غذا اور دوسری چیزوں کو باہر پھینک دیتا ہو اس لیے ضرورت ہو کہ پہلے طبیب سے معدے کی اصلاح کرلے، تب غذا کھائے تو نافع ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ــــ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی ہر مجلس میں شاگردوں کا ایسا افادہ فرماتے تھے کہ جیسے شیخ اپنے مُریدوں کا افادہ کیا کرتا ہو ــــ اکثر باتیں اُسی وقت کی دل میں بیٹھی ہوئی ہیں ــــ مولانا کی عجیب شان تھی ــــ بڑا جامع علم تھا

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ــــ اکثر ملّاؤں کے ذلیل سمجھنے کی وجہ نہ پوچھو۔ یہ خود بھی ذلیل ہوئے۔ انھوں نے دنیاداروں کی چاپلوسی اور خوشامد میں بھی حد ہی کردی ــــ

ان لوگوں سے اپنی اغراض کو وابستہ سمجھ کر یہ طرز تملق کا اختیار کیا اس لیے ذلیل ہوئے اب تو ذلیل سے ذلیل آدمی بھی ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ تمام تر خرابی حُبّ دنیا کی ہے۔

فرمایا ــــ دیکھیے یہ حُبّ جاہ ہی کے تو کرشمے ہیں کہ مخلوق الکشنوں اور ممبریوں کے لیے ہزاروں، لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہے ــــ زکوٰۃ کا ایک پیسہ دیتے ہوئے دم نکلتا ہے بیز علاوہ روپے کے وقت بھی صرف کرتے ہیں، راتوں اور دنوں کا آرام اور چین جاتا رہتا ہے۔ دربدر ذلیل وخوار ہوتے پھرتے ہیں۔ سو یہ مرض واقعی بڑا ہی سخت مرض ہے ــــ ایک مرتبہ میرے پاس قصبے کی سرپنچی (چیرمینی) کے متعلق کلکٹر کا خط آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں اُس (سرپنچی) کے لیے ہندو مسلمانوں میں اختلاف تھا۔ ایک ہندو ڈپٹی کلکٹر نے کلکٹر کو یہ رائے دی کہ اس کو (یعنی مجھ کو یہ عہدہ) تجویز کر دو کسی کو اختلاف ہوگا۔ اُس (کلکٹر) نے فریقین (ہندو مسلم) کی رضا (مندی) لے کر (مجھے) خط بھیجا میں نے لکھ دیا ــــ میں آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں لیکن میرا نشو ونما مذہبی فضا میں ہوا ہے ایسی چیزوں سے مناسبت نہیں اس لیے معذور ہوں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ علم بھی خداداد عطا ہے اور اس علم سے مُراد تحقیقی (علم) ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو بھی یہ تحقیقی علم عطا فرما دیں بڑی دولت ہے بڑی نعمت ہے ــــ ....

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ علم ظاہر کیا کچھ نعمت ہے ــــ یہ بھی بڑی نعمت ہے، ظاہر ہے کہ تمام احکامِ شرعیہ اسی پر موقوف ہیں اور یہ آج کل کے علومِ معاش جن کو علوم کہا جاتا ہے یہ تو صنعتیں ہیں علوم نہیں نہ ان کو علوم کہنا جائز ہے..... ایک صاحب نے عرض کیا کہ زمانۂ قریب میں ہندوستان میں جیسے علماء گزرے ہیں خیال یہ ہے کہ ممالک اسلامیہ میں بھی (اُس وقت) ایسے علماء نہ گزرے ہوں۔ فرمایا کہ تم تو پہلا ذکر کر رہے ہو میں اب کا واقعہ بیان کرتا ہوں ــــ ایک مولوی صاحب بردوانی[1] حج کو گئے تھے (اُن کی) بعض علماءِ نجد سے ملاقات ہوئی تو کسی حدیث کا ذکر آیا نجدی عالم نے پوچھا کہ یہ حدیث بُخاری میں کتنی جگہ آئی ہے تو ان بردوانی مولوی صاحب نے فوراً کہا کہ سات جگہ آئی ہے ــــ ظاہر ہے کہ اُن کو پہلے سے کیا معلوم تھا کہ کس حدیث کا ذکر آئے گا۔ تاکہ احتمال ہو کہ پہلے سے تلاش کر رکھا ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ یہ بُخاری کے حافظ تھے ــــ نجدی عالم کو حیرت ہوگئی کہ ہندوستان میں ایسے ایسے علماء موجود ہیں ــــ ایک سلسلے میں ان ہی بردوانی مولوی

[1] بردوان۔ صوبہ بنگال۔

صاحب کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے مجھ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مجھ کو سب سے زیادہ محدثین سے محبت ہے پھر فقہاء سے پھر صوفیاء سے ـــــ اس کے بعد حج کو گئے وہاں اہل نجد کی سختی کو دیکھ کر مجھ کو لکھا .... میں نے لکھا کہ اُن میں جس چیز کی کمی سے سختی ہے، یہ وہی ہے جس کو آپ نے تیسرے درجے میں رکھا ہے یعنی صوفیت ـــــ اور میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ میرا مذاق (ذوق) بالکل اس کے برعکس ہے۔ مجھ کو سب سے زیادہ محبت، صوفیاء سے ہے۔ دوسرے درجے میں فقہاء سے تیسرے درجے میں محدثین سے .....

فرمایا کہ بھوپال میں میرا وعظ ہوا تھا اس میں وہاں کے کالج کا پرنسپل جو ہندو مرہٹہ تھا اور ولایت سے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر چکا تھا ـــــ شریک ہوا ـــ وعظ کو سُن کر (اُس پرنسپل نے) اپنی رائے ظاہر کی کہ (ایک تو) بیان کے وقت کوئی نوٹ ہاتھ میں نہ تھا سب بیان زبر تھا جیسے کوئی کتاب سامنے رکھی ہو۔ دوسرے تمام مضمون مرتبط تھا اور کوئی دعویٰ ایسا نہ تھا جس پر دلیل نہ قائم کی ہو۔ پھر اتنے گھنٹے تک بیان کرنا میں نے ولایت میں بڑے بڑے فلاسفروں اور لیکچراروں کی تقریریں سُنیں۔ بڑے بڑے ارکانِ سلطنت کو بیان کرتے دیکھا مگر نوٹ سب کے ہاتھ میں دیکھے۔ اُن کو دیکھ کر بیان کرتے تھے۔ یہ بات میں نے کسی میں نہیں دیکھی ـــــ میں نے سُن کر کہا کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے اور اپنے بزرگوں کی دُعا کی برکت ہے۔ ہم کیا اور ہمارا وجود اور ہستی کیا ..... اور میں تو محض ایک ناقص الاستعداد طالب علم ہوں۔ اگر یہ کسی عالم کو دیکھے تو معلوم ہو ـــــ

پھر اپنے بزرگوں کے برکات کے متعلق فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہم چند طلباء سے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ تم لوگ جہاں جاؤ گے انشاء اللہ تم ہی تم ہو گے ـــــ میدان خالی ہے ـــــ وہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ تو یہ سب کچھ ان ہی بزرگوں کی دُعاؤں کی برکت ہے ـــــ ایک جگہ میں آرام کرنے کے لیے گیا تھا۔ لوگوں نے وعظ کی درخواست کی میں نے کسل کا عذر کیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ بے چارہ وعظ کہنا کیا جانے اس کے جو وعظ چھپے ہیں، خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن مجذوب) لکھ کر دے دیتے ہیں اور یہ چھپوا دیتے ہیں۔ مگر دوسرے خاص دوستوں کے اصرار سے بیان ہوا اور یہ بات وعظ کے بعد مجھ کو معلوم ہوئی۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو وعظ ہی نہ کہتا تاکہ لوگ اپنے اسی خیال میں رہیں ....

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ فنِ تصوف محض تحقیقات سے نہ

آج تک کسی نے حاصل کیا اور نہ یہ قاعدہ ہے ـــــ یہ آتا ہے کام کرنے سے ـــــ محض زبانی جمع خرچ سے اور کہنے سننانے سے نہیں آیا کرتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے ـــــ ہاں اُصول و قواعد کے حاصل کرنے کے بعد پھر تحقیقات اور سُننا سُنانا مناسبت میں مُعین ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ کام میں لگو۔ کام کرو۔ سب ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی ـــــ ہر کام کا ایک طریقہ ہے۔ قاعدہ ہے۔ اُصول ہیں۔ شرائط ہیں۔ آخر دوسرے علوم بھی تو طریقے ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ....

ایک صاحب یورپ کی تحقیقات اور ترقی اور اس میں (تحقیقات میں) تغیر و تبدل کا ذکر کر رہے تھے، اس پر فرمایا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ کُن چیز صرف وحی ہے ورنہ اور چیزیں تو اس رنگ کی ہیں کہ آج کچھ کل کچھ ـــــ ظُلمات ہی ظُلمات ہیں جن میں حقیقت مستور رہتی ہے ـــــ دیکھئے اتنا زمانہ گزر گیا وحی میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو فیض زیادہ ہوا وہ حضرت کی شفقت کی وجہ سے ہوا ـــــ ...... حضرتؒ کی ذات کچھ عجیب و غریب تھی۔ وہ بات کسی میں بھی نہ دیکھی جو حضرتؒ میں تھی۔ مایوسی اور پریشانی تو وہاں تھی ہی نہیں۔ ہر پریشانی کی وہاں تسلی ہی تسلی تھی اور ہر بُرے سے بُرے شخص کے ساتھ حُسنِ ظن رکھتے تھے جس کی وجہ غایتِ تواضع تھی ـــــ مشکل سے کسی کے ساتھ حضرتؒ کو بدظنی ہوتی تھی جتی الامکان سب کے افعال میں توجیہ اور تاویل ہی فرمادیا کرتے تھے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے بزرگوں کو دیکھا کیسی کیسی ہستیاں تھیں۔ اس قدر بے نفسی اللہ اکبر ـــــ اپنے کو بالکل مٹائے ہوئے اور فنا کیے ہوئے تھے کسی فعل اور کسی قول سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ ہیں یا کچھ جانتے ہیں۔ ان حضرات کو اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ وہ حضرات سب کچھ تھے اور اپنے کو کچھ نہ سمجھتے تھے اور آج کل یہ حالت ہے کہ کچھ نہیں اور اپنے کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں اور اس کے متمنی ہیں کہ دوسرے بھی ہم کو کچھ سمجھیں ـــــ .....

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ جو آج کل مدارس میں اساتذہ نے ایک طرز اختیار کیا ہے کہ طلباء کی مرضی پر اسباق رکھے جاتے ہیں یہ بالکل غلط طرز ہے۔ اس طرز

میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طالب علم کی استعداد اور قوت کو دیکھ کر کتاب کا انتخاب کریں تاکہ آئندہ کے لیے محنت کار آمد ہو۔ دوسرے طلبار کے دماغ اور اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ وہ ایسے برتاؤ سے اساتذہ کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔ ایسی ہی باتوں کی بدولت مدارس میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض سیاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسلام کی جو شان ہندوستان میں ہے وہ ممالک اسلامیہ میں بھی نہیں اور اپنے بزرگوں سے ایسا ہی سُنا جنھوں نے دوسرے ممالک دیکھے ہیں ــــ شاید یہ وجہ ہو کہ وہاں پر تو مسلمان بے فکر ہیں کہ حکومت، اسلامی ہے وہ ہر بات کی ذمہ دار ہے اس ہی لیے وہاں کے علماء بھی بے فکر اور عوام مسلمان بھی بے فکر اور ہندوستان میں حکومت، اسلامی تو ہے نہیں عوام ہوں یا علماء سب دین کی ذمہ داری اپنے اوپر سمجھتے ہیں واللہ اعلم۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے کبھی کوئی کام بدون اپنے بزرگوں کی اجازت کے نہیں کیا حتیٰ کہ نوکری چھوڑی وہ بھی اپنے بزرگوں کے ارشاد سے ــــ یہی میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ جو کام کرنا ہو ہمیشہ اپنے بزرگوں سے اُس میں پوچھ لیا کرو۔ یہ بڑی برکت کا سبب ہوتا ہے یہ جو آج کل خود رائی پیدا ہو گئی ہے اس کی بدولت لوگ زیادہ تباہ اور برباد ہیں۔ اس نے تو بڑوں بڑوں کو خراب اور برباد کر دیا اس سے سخت اجتناب کی ضرورت ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل یہ مرض بھی عام ہوگیا ہے کہ لوگ باتیں زیادہ بناتے ہیں۔ زبانی جمع خرچ چاہے جتنا کرا لو اور جب کام کرنے کا وقت آتا ہے یا کرنا پڑتا ہے اُس وقت بغلیں جھانکتے نظر آتے ہیں اور جو لوگ کام کرنے والے ہیں اُن پر اعتراضات کی بھرمار رہتی ہے کہ یوں کیا ہے یہ نہ کیا وہ کر دیا گو ان لوگوں کے نام کی شرم بھی نہ رہی۔ خود تو کچھ نہ کرنا نہ دھرنا اوروں پر اعتراض۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دین کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ارادہ کرتا بھی ہے تو یہ آفت ہے۔ میں تو اس موقع پر یہ شعر پڑھا کرتا ہوں خوب ہی کہا ہے ......

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

فرمایا ___ اہلِ علم کو استغنا، کی سخت ضرورت ہے۔ خصوصاً اُمراء کے دروازوں سے تو اُن کو بالکل اجتناب چاہیے۔ اس میں دین، علمِ دین، اہل دین سب کی ذلت ہے۔ سُبکی ہے ___ مجھ کو تو اس سے بڑی نفرت ہے اور میں جب کوئی واقعہ اہل علم کا اُمراء کے ساتھ تملق ___ (چاپلوسی) کا سُنتا ہوں، سخت افسوس ہوتا ہے۔ میں (اُمراء سے) تعلق کو منع نہیں کرتا البتہ یہ (تملق) اہلِ علم کی شان سے بہت ہی بعید ہے۔ مگر کس طرح (یہ بات) دل میں ڈالدوں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہندوستان میں بدعت کا قلع قمع حضرت سید صاحبؒ (سید احمد شہیدؒ) اور مولانا (محمد اسمٰعیل) شہیدؒ کی بدولت زیادہ ہوا۔ مولانا تو شمشیر برہنہ تھے اور حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بھی بڑی برکت والی تھی جہاں جہاں کو تشریف لے گئے وہاں اب تک برکات موجود ہیں۔ تھانہ بھون بھی تشریف لائے ہیں۔ باقی حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مستقل اور ممتاز شان تھی۔ آپ کی بڑی حکیمانہ باتیں ہوتی تھیں۔ ہر بزرگ کا رنگ جُدا ہوتا ہے۔ جیسے باغ میں ہر قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ رنگ جُدا۔ خوشبو جُدا۔ پتّی جُدا ایسے ہی یہ حضرات ہوتے ہیں۔ خود حضرات انبیاء علیہم السلام جس قدر ہوئے ہیں۔ سب مختلف الاحوال ہوئے ہیں۔ ایسے ہی اُن کے غلام بھی مختلف الاحوال ہوتے ہیں۔ مگر باوجود احوال کے اختلاف کے ایک چیز ان سب میں مشترک ہے وہ طلب رضاء حق ہے یہ سب کے اندر ہوتی ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ..... چھوٹے تو یہ سمجھیں کہ ہم چھوٹے ہیں اور بڑے سمجھیں کہ یہ چھوٹے نہیں کیسے لطف کی بات ہے۔ اگر سب ایسا کریں تو بہت ہی راحت رہے اب جو بے لطفی اور بے مزگی ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ چھوٹے تو اپنے کو چھوٹا نہیں سمجھتے اور بڑے اُن کو چھوٹا سمجھتے ہیں... ... پھر لطف کہاں، بے لطفی ہی ہوگی۔

فرمایا کہ ___ آج کل اعتدال بہت کم ہے۔ افراط و تفریط بہت زیادہ ہے۔ اگر خیال نہیں ہوتا تو بڑی بڑی معصیتوں اور بدعتوں کا نہیں ہوتا۔ اور خیال ہوتا ہے تو مباح تک پر ہاتھ صاف کرنے کو اور اُس کو معصیت میں داخل کرنے کو طیار ہیں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ (زمانۂ گزشتہ میں) اکثر اہل علم کی پانچ دس روپے ماہوار تنخواہ ہوتی تھی علاوہ ارزانی کے پہلے کچھ تھی بھی متوکلانہ شان، اہل علم کی ــــ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی رح کے مدرسہ مکہ معظمہ (مدرسہ صولتیہ) میں سلطان عبدالحمید خاںؒ نے کچھ مقرر کرنا چاہا منظور نہیں کیا اور لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا "نہ بھائی پھر کام نہ ہوگا اب تو کارگزاری دکھلانے پر چندہ ملتا ہے اس لیے سب کوشش سے کام کرتے ہیں ــــ پھر وہاں سے آتا مستقل طور پر ــــ چاہے کام ہوتا یا نہ ہوتا۔ اب تو مدرسہ میں سرمایہ نہیں لیکن کام ہے۔ اور جب یہ سب کچھ ہوتا اگر کام نہ ہوتا بے فکری ہو جاتی۔" اب ہی دیکھ لیجیے اس وقت جو علماء ریاستوں سے وظائف پا رہے ہیں وہ بے فکر پڑے ہوئے ہیں..... پھر کام کہاں؟

میں تو کہا کرتا ہوں کہ جس قوم کے مذہبی راہبر امیر ہوں گے (یعنی مالدار بن جائیں گے) تو وہ قوم گمراہ ہو جائے گی اس لیے کہ اُن کو تو ضرورت قوم سے واسطہ رکھنے کی رہے گی نہیں اور جب واسطہ نہ رہا تو گمراہ ہونا قریب ہے ہی.... امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا (مساکین سے دُور کرنے کا)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میرے دل میں اللہ کا شکر ہے کہ باوجود بہت لوگوں کے ستانے اور بدنام کرنے کے نہ کسی کی طرف سے کینہ ہے نہ کپٹ نہ بغض نہ عداوت ــــ یہ تو غیر معتقدین کے ساتھ معاملہ ہے اور معتقدین کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ میں نے یہاں کے رہنے والوں تک کو اپنے معاملات میں ایسا دخل (اور موقع) کبھی نہیں دیا کہ (انھوں نے) جس سے چاہا (مجھے) راضی کر دیا اور جس سے چاہا ناراض کر دیا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات بڑی ہی کریم ذات تھی۔ ایک مرتبہ تھانہ بھون کا ایک مجمع حج کو گیا۔ جب حضرتؒ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ حضرتؒ سب سے بغلگیر ہو کر ملے۔ اور فرمایا "اپنے باپ دادوں کے نام بتلاتے رہو۔ میں نوجوانوں میں سے کسی کو نہیں پہچانتا۔" ــــ ایک تھانہ بھون کے رہنے والے کہتے تھے کہ میں جب مکہ معظمہ حاضر ہوا ــــ حضرتؒ کے پاس مجمع زیادہ تھا۔ میں خاموش ایک گوشہ میں بیٹھ گیا کہ جب حضرتؒ فارغ ہوں گے اُس وقت ملوں گا۔ حضرتؒ نے خود فرمایا کہ "اس مجلس میں سے بوئے وطن آ رہی ہے۔" تب انھوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ حضرت میں تھانہ

بھون کا رہنے والا ہوں۔ فرمایا کہ میاں غیروں کی طرح دور جا بیٹھے۔ یہاں آؤ۔ سینے سے لگایا۔ پیار کیا۔
کیا ٹھکانا تھا حضرت کی شفقت کا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ جو مشہور ہے کہ جائے بزرگاں بجائے بزرگان ــــ اس سے
برکت مراد ہے۔ ایسی جگہ میں برکت ضرور ہوتی ہے۔ مولانا شیخ محمد صاحب (محدث تھانوی) رحمۃ اللہ
علیہ کی روایت مجھ کو پہونچی ہے۔ ایک صاحب بیان کرتے تھے کہ مولانا شیخ محمد صاحبؒ نے فرمایا کہ
جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج کو تشریف لے گئے تو میں نے اُس جگہ بیٹھ کر ذکر کیا
جس جگہ حضرتؒ ذکر کیا کرتے تھے۔ تو انوار معلوم ہوئے ــــ اب آنکھیں اُن بزرگوں کو ڈھونڈتی ہیں۔
اُن ہی بزرگوں کو دیکھا۔ اب طبیعت بھی، دل بھی، مکان بھی اُن ہی چیزوں کے خوگر ہو گئے۔ اُس کے
خلاف پر وحشت ہوتی ہے اب طبیعت کو کیسے بدل دیا جائے غیر اختیاری ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل ایسی طبیعت کے بھی لوگ موجود ہیں جن کو امامت کا شوق ہے
لیکن اہل، امامت کے نہیں۔ لمبے لمبے رکوع اور (لمبے) خُطب (خطبے) پڑھنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔
ہمارے حضرات بہت ہی مختصر خطبہ پڑھتے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اکثر حضرت شہید صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ وہ بہت ہی مختصر اور جامع ہے مگر اُس میں سے بھی ایک
حصہ حذف کر دیتے تھے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ ہم اپنی وضع پر نہیں رہے۔ ہم
اپنے بزرگانِ سلف کی سوانح میں دیکھتے ہیں کہ اُن کا برتاؤ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے تھے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل یہ مرض عوام اور خواص سب میں نظر آتا ہے
کہ دوسروں کی تو اصلاح کی فکر ہے اپنی فکر نہیں ــــ.... اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر میں
لگ جائے تو بہت جلد اصلاح ہو جائے۔

پچنول

لیجیے

پچنول پیٹ کے درد، کھٹی ڈکاریں، اپھارا، جلن، متلی، بھوک کی کمی اور کھانے کے بعد طبیعت کی سُستی وغیرہ جیسی شکایتوں میں نہایت مفید ہے۔

PACHNOL

ہمدرد

HTA-HDP-344A-U

ماہنامہ تجلّی دیوبند کا خاص نمبر ۱۹۶۹ء

تین سو سے زائد صفحات کا یہ دلکش دلچسپ اور افادیت سے لبریز نمبر وسط ستمبر میں آرہا ہے۔ یہ اپنے مواد اور علمی و تحقیقی مباحث کی بنا پر اتنا وقیع ہوگا کہ اسے آپ مجلد کرا کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیں گے۔

اس نمبر کو اگر آپ مُفت حاصل کرنا چاہیں تو تجلّی کا سالانہ چندہ بھیج دیں جو دس روپے ہے۔ نمبر کو بحفاظت حاصل کرنے کے لئے مزید ایک روپیہ رجسٹری خرچ بھی شامل کردیں تو نورٌ علیٰ نور۔

اور اگر صرف یہی نمبر خریدنا چاہیں تو ڈاک خرچ سمیت پانچ روپے ارسال فرمائیں یا اپنے شہر کے نیوز پیپر ایجنٹ سے چار روپے ۲۵ پیسے میں خریدلیں

مکمل پتہ: مینیجر تجلّی۔ دفتر تجلّی۔ دیوبند

اسلامی تحقیق

اس کے معنی، مدعا اور دائرۂ کار

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

(۴)

میکانکی تحقیق کی ایک نئی قسم

جو لوگ اسلام کی محبت سے بے نصیب ہو کر دل ہی دل میں غیر اسلامی نظریات کی طرف مائل ہو چکے ہیں اُن کی اس خواہش نے کہ اسلامی قوانین کو بدل دینا چاہیئے، پاکستان میں ایک نئی قسم کی میکانکی تحقیق کو جنم دیا ہے جسے بہت سے مسلمان غلطی سے اسلامی تحقیق سمجھتے ہیں۔ پہلے اس بات کی خواہش کرنا کہ اسلامی قوانین کو غیر اسلامی نظریات کی سمت میں بدل دیا جائے اور پھر اس خواہش کی تکمیل کے لیے موافق حالات پیدا کرنے کی غرض سے ایسی صحافتی قسم کی کتابیں تیار کرنا جن میں ہمارے علماءِ متقدمین و متاخرین کے موجودہ علمی ذخیروں کو بلکہ قرآن اور حدیث کے ترجموں کو بھی ایک نئی ترتیب، نئی زبان اور نئے مفہوم کا ایسا جامہ پہنایا گیا ہو جو اس خواہش سے مطابقت رکھتا ہو، ایک ایسا عمل ہے جسے ہم ایک خاص مقصد سے انجام دی ہوئی میکانکی قسم کی کتاب سازی تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسلامی تحقیق کا نام نہیں دے سکتے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ اصلی اور حقیقی اسلام کی علمی، عقلی اور حکمیاتی بنیادوں کو دریافت کیا جائے اور واضح کیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس اسلام کو بدل دیا جائے اور جس

حدتک بھی ممکن ہو غیر اسلامی نظریات اور اُن کے تصورات سے قریب تر لایا جائے تاکہ ان نظریات کے چاہنے والوں کو اسلام سے مطمئن کیا جا سکے۔ لیکن اس قسم کی میکانکی تحقیق کا شوق رکھنے والے اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ جن نظریات سے توافق کی آرزو رکھتے ہیں وہ خود ناپائدار ہیں اور اپنا کوئی مستقبل نہیں رکھتے، اور صرف ایک ہی نظریہ حیات یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ تاقیامت زندہ اور قائم رہے اور وہ وہی اسلام ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں چھوڑا تھا اور جس پر صحابہؓ نے عمل کیا تھا۔
اس قسم کی میکانکی تحقیق کے مقصد اور طریق کار سے آشکار ہے کہ اُسے انجام دینے کے لیے کسی بڑی علمی قابلیت کی ضرورت نہیں۔ چونکہ غیر اسلامی نظریات کے تصورات کی طرف جھکنا اور اسلام کے بجائے اُن کی حمایت خود کرنا اور دوسروں کو اُن کی حمایت پر آمادہ کرنا ایک لاشعوری عمل ہوتا ہو۔ جو لوگ اس عمل کا شکار ہوتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ذہانت سے اسلام کی ایک نہایت ہی حیرت انگیز اچھوتی اور دلکش تشریح دریافت کر لی ہو اور وہ اُسے پیش کر کے اسلام کو بچانے اور ہر دلعزیز بنانے کی ایک نہایت ہی بے نظیر خدمت بجا لائے ہیں جو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

علمائے متقدمین کی اسلامی تحقیق ہمارے زمانہ کے چیلنج کا جواب نہیں بن سکتی

بعض مسلمانوں کا خیال یہ ہو کہ اسلام کی سائنسی اور حکیمانہ تشریح جس کی ہمیں اس زمانے میں ضرورت ہو، شاہ ولی اللہ، امام غزالی اور دوسرے مقتدر ائمہ دین کی اسلامی تحقیق کے اندر پہلے سے ہی موجود ہے اور اب ہمیں اسلام کی مزید کسی علمی تشریح کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ ان بڑے بڑے ائمہ اور فضلا کی اسلامی تحقیق خواہ اُن کے اپنے زمانہ کے علمی چیلنج کے جواب کے طور پر کیسی ہی گراں قدر اور کارآمد کیوں نہ ثابت ہوئی ہو تاہم وہ جس صورت میں اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے ہماری اس کوشش میں کہ ہم اسلام کی طرف سے اس زمانہ کے علمی چیلنج کا کافی اور شافی جواب مہیا کریں۔ ہماری ذرا بھی مدد نہیں کر سکتی۔ اس زمانہ کے حکیمانہ تصورات اور نظریات جو اسلام سے ٹکراتے ہیں اور جن کی تردید پیش کرنا ہمارا فرض ہو۔ مثلاً مارکسزم، ڈارونزم، فرائڈزم، ایڈلرزم، میکڈوگلزم، بی ہیویرزم، لاجیکل پازیٹوزم، شپنگلرزم، ٹائنبزم وغیرہا جو عصر حاضر کی مخصوص علمی فضا کی پیداوار ہیں، اپنی نوعیت اور اپنے طرز استدلال کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور ہمارے بڑے

بڑے متقدمین علماء اور فضلاء ان سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ وہ اپنی کتابوں میں انکی تردید مہیا کر چکے ہیں حد درجہ کی سادگی ہے چونکہ ہم ہی ان سے واقف ہوئے ہیں لہٰذا اسلام کی مدافعت کرنے اور اُس کے علمی اور عقلی مقام کو بلند رکھنے کے لیے اُن کی تردید بہم پہنچانا ہمارا ہی کام ہے ہر دور کا علمی چیلنج مختلف ہوتا ہے اور اس کا جواب ان ہی مسلمانوں کو دینا ہوتا ہے جو اس دور میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس چیلنج کا سامنا کر رہے ہوں۔

اس بات کے علاوہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے اسلامی تحقیق کے فاضل کا کام نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید کرے اور اُن کو غلط ثابت کرے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے صحیح فلسفیانہ تصورات کی مدد سے جو صحیح ہونے کی وجہ سے لازماً اس کی تائید کریں گے، اسلام کو عقلی اور علمی لحاظ سے زیادہ دلکش، زیادہ مضبوط اور زیادہ یقین پرور بنائے۔ جس طرح سے اس دور کے غلط فلسفیانہ تصورات صرف اُسی سے مخصوص ہیں۔ اسی طرح سے وہ صحیح فلسفیانہ تصورات بھی جو اس زمانہ میں آشکار ہوئے ہیں اس کا طغرائے امتیاز ہیں۔ یہ ثانی الذکر تصورات اول الذکر تصورات میں اس طرح دبے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں جواہرات۔ جب تک ہم نے کوڑے کرکٹ کو برباد نہ کریں۔ ہم نئے جواہرات تک نہیں پہنچ سکتے۔ غرض ہمیں اس زمانہ میں اصلی اسلامی تحقیق کے کام کو نہ صرف اس لیے انجام دینا پڑے گا کہ ہم نئے علمی کوڑے کرکٹ کو برباد کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نئے علمی جواہرات کو جو اس میں پڑے ہیں، اپنے قبضہ میں لینا چاہتے ہیں۔

غلط فلسفیانہ تصورات کی اُن تردیدوں کے نقائص جو اب تک پیش کی گئی ہیں

پھر شاید یہ کہا جائے کہ اس زمانہ میں بھی کئی علماء اسلام عصر حاضر کے غلط فلسفیانہ نظریات کی تردیدیں مہیا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن ان تمام تردیدوں کا مشترک نقص یہ ہے کہ وہ ان نظریات کے ایسے مطالعہ پر مبنی نہیں جو مخالفت کے جذبہ سے الگ ہو کر منصفانہ اور ہمدردانہ طور پر کیا گیا ہو لہٰذا وہ اُن کی صحیح اور مکمل واقفیت پر قائم نہیں۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے سوالات پیدا کرتی ہیں جن کا جواب نہیں دیتیں اور حقیقت انسان وکائنات کے بہت سے مسلّمہ اور درست

حقائق کو اپنے پیش کیے ہوئے قرآنی نظریہ کائنات کے ساتھ تعلق نہیں کرتیں اور ایک بگڑی ہوئی صورت میں بدستور غیر اسلامی نظریات کے ساتھ متعلق رہنے دیتی ہیں۔ لہٰذا وہ تشنہ اور نامکمل اور ناتمام رہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن علمی اور عقلی معیار دورِ حاضر کے مسلّمہ علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق نہیں اور وہ فلسفیانہ استدلال اور حکیمانہ تشریح اور تفسیر کے رائج الوقت طریق اور تکنیک کی پیروی نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان نظریات کے غیر مسلم ماننے والوں اور مسلمان ہمدردوں کو قائل نہیں کر سکتیں اور لہٰذا بالکل بے اثر اور بے کار ہیں۔ ان کا مقصد زیادہ تر یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو خوش کیا جائے جو زمانہ کے علمی چیلنج سے بے خبر ہونے کی وجہ سے صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کو کام میں لا کر اس چیلنج کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور حکمتِ اسلام کے اُس علم سے مطمئن ہیں جو اس وقت تک میسر ہے اور غیر مسلموں کے سامنے پوری طرح سے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے بغیر اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ماضی اور مستقبل کے تمام فلسفوں سے زیادہ معقول اور مدلل ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے ایسے مکمل نظامِ حکمت کے بغیر جو کائنات کے تمام معلوم اور مسلّم اور درست حقائق کو تسلیم کرتا اور واضح کرتا ہو کوئی چیز بھی ان حکیمانہ تصورات کا مکمل مستقل اور یقینی پیر جواب نہیں بن سکتی جو اس وقت ہمارے دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

اسلامی تحقیق کے فن کی تعلیم اور تربیت ضروری ہے

شاید یہ بھی کہا جائے کہ شاہ ولی اللہ اور امام غزالی ایسے ائمہ دین جنھوں نے اسلام پر قیمتی تحقیقی اور تخلیقی کام کیا ہے نادر شخصیتیں تھیں جن میں اس قسم کے کام کی غیر معمولی خداداد صلاحیتیں تھیں اور ہمارے لیے یہ مشکل ہوگا کہ ہم اسلام پر اعلیٰ معیار کا اصلی تحقیقی کام جس کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے ایسے عالموں کی خدمات کے ذریعہ سے حاصل کر سکیں جو ہمارے بہترین دماغ ہونے کے باوجود قدرت کی عطا کی ہوئی تخلیقی قابلیتوں سے بہرہ ور نہیں، اس اعتراض کے جواب میں میرا مؤدبانہ التماس یہ ہے کہ ہر قوم میں ایسے افراد کافی تعداد میں ہوتے ہیں جن کو قدرت نے ہر قسم کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کیا ہوتا ہے لیکن اُن کی صلاحیتیں بالعموم مخفی رہتی ہیں خواہ قوم کو اُن کی صلاحیتوں کی کیسی ہی شدید ضرورت کیوں نہ ہو۔ لیکن جب تک کوئی صلاحیتوں کا مالک اتفاقاً ایسے حالات میں مدد دینے کا موقع نہ پائے جو اُس کے مکمل اظہار اور نشو و ارتقا کے لیے

خاص طور پر سازگار ہوں اس وقت تک وہ آشکار نہیں ہوتیں، سینکڑوں شاہ ولی اللہ اور غزالی ایسے ہو
گئے جو سازگار حالات نہ پانے کی وجہ سے شاہ ولی اللہ اور غزالی نہیں بن سکے۔ اگر ہم بہت سے ذہین
اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اسلام دوست نوجوانوں کو ایسے حالات مہیا کریں، جو اسلامی تحقیق کی قابلیتوں
کی نشو ونما کے لیے موافق ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے چند نہایت عمدگی اور کامیابی کیساتھ
اسلامی تحقیق کا وہ کام انجام نہ دے سکیں جس کے بغیر ہماری بقا خطرہ میں ہو۔

اسلامی تحقیق کے فاضل کی ضروری علمی قابلیتیں

چوں کہ اسلامی تحقیق کا مقصد یہ ہو کہ دور حاضر کے غلط
فلسفیانہ نظریات اور تصورات نے اسلام کو جو چیلنج دے رکھا ہو اس کا تسلّی بخش جواب مہیا کیا
جائے۔ لہٰذا جدید فلسفیانہ تصورات کا علم اور فہم اور جدید فلسفیانہ طرز استدلال کی واقفیت اور
مہارت، اسلامی تحقیق کے فاضل کی ضروری قابلیتیں شمار ہوں گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہو
کہ وہ سائنسی علوم مثلاً طبعیات، حیاتیات اور نفسیات سے ایک عام واقفیت رکھتا ہو ــــ
بالخصوص ان علوم کی اُن ترقیوں سے جو اس بیسویں صدی میں رونما ہوئی ہیں یہاں تک آشنا
ہو کہ اُن کے فلسفیانہ مضمرات اور نتائج کو سمجھ کر کام میں لاسکے۔ سائنس کی واقفیت سے اُسے
ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ وہ سائنسی طریق تحقیق اور طریق بیان کو سمجھنے کی وجہ سے اپنی طرز
تحریر کو معقولیت اور برجستگی کے سانچوں میں ڈھال سکے گا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اُسے کم از کم تحریری
عربی زبان کی درجہ اوّل کی واقفیت حاصل ہونا چاہیے کیونکہ یہ اس کی بنیادی ضرورت ہو کہ اس کے بغیر وہ
قرآن اور حدیث اور فقہ کی کتابوں کے مطالب اور مضامین تک براہ راست دسترس نہیں پا سکتا۔ ایک
اور خصوصیت جو اُس کے لیے ضروری ہو وہ یہ ہو کہ وہ اسلام سے محبت رکھتا ہو اور اُس کی عائد کی ہوئی
اخلاقی اور دینی پابندیوں کو بطیب خاطر قبول کرتا ہو۔

وہ شخص جو ایک فلسفی کی تمامیت، مہارت اور بصیرت سے بے بہرہ ہو اور آج تک کے تمام
فلسفیانہ تصورات اور سائنس کے تازہ انکشافات کے فلسفیانہ مضمرات کی پوری واقفیت نہ رکھتا
ہو۔ خواہ اُسے قرآن اور حدیث اور فقہ اور علما متقدمین کی تمام کتابیں از بر ہوں وہ اصلی اسلامی تحقیق
کے کام کو مطلقاً انجام نہیں دے سکتا۔

ظاہر ہے کہ ایسی قابلیتوں کے افراد پوری تعداد میں اور بآسانی میسر نہیں آسکتے۔ لہٰذا ضروری ہے ہمارے ملک کا کوئی اسلامی تحقیق کا ادارہ کسی ایک فاضل کی راہ نمائی میں جو دوسروں سے زیادہ ان قابلیتوں کا مالک ہو، ہر سال چند موزوں تعلیم یافتہ افراد میں خاص تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ان قابلیتوں کو پیدا کرے تاکہ اسلامی تحقیق کا کام خاطر خواہ طریق سے جاری رہ سکے۔ ان افراد کو معقول تنخواہیں دی جائیں اور تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد ماہر تحقیق اسلامی کی معتبر سندیں دیجائیں۔

تحقیق اسلامی کی تعلیم و تربیت کے ضروری نقاط

اسلامی تحقیق کے راہ نما فاضل کو چاہیے کہ ہر فاضل پر جو اُس کے زیر تربیت ہے، دوران تربیت میں اچھی طرح سے واضح کردے کہ اس کے لیے ضروری ہو کہ وہ :-

(۱) قرآن حکیم کی روح سے پوری طرح واقفیت پیدا کرے۔ اگر وہ قرآن کی روح سے واقف نہیں ہوگا تو اُس کے لیے ناممکن ہوگا کہ وہ غلط فلسفیانہ تصورات کو صحیح فلسفیانہ تصورات سے میز کر سکے۔ ایسے کے سارے تحقیقی اور تخلیقی کام کی اہمیت کا دار و مدار اس بات پر ہو کہ آیا وہ غلط تصورات کو صحیح تصورات سے تمیز کر سکتا ہو یا نہیں۔ لہٰذا اُسے اپنے وقت کا بہت سا حصہ قرآن اور حدیث اور سیرت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وصحابہ اور اُمّت کے صلحاء صوفیا کی سوانح حیات کے مطالعہ میں صرف کرنا ہوگا۔

(۲) ان فلسفیانہ نظریات اور تصورات سے پوری پوری واقفیت پیدا کرے جو اسلامی نظریہ انسان و کائنات سے مغائرت رکھتے ہیں اور جن کو اُسے غلط اور بے بنیاد ثابت کرنا ہو۔

اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان نظریات اور تصورات کے اصلی ماخذ کا براہ راست اور ہمدردانہ مطالعہ کرے۔ جب تک ہم کسی کامیاب اور بڑے فلسفی کے افکار کا مطالعہ ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے نہ کریں ہم اس کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتے اور جب تک ہم اُسے ٹھیک طرح سے نہ سمجھیں ہم اس کی غلطیوں کو آشکار نہیں کر سکتے۔

(۳) دور حاضر کے فلسفیانہ نظریات اور جدید سائنسی انکشافات کے فلسفیانہ مضمرات اور نتائج سے مکمل واقفیت پیدا کرے۔

(۴) اپنی تحقیق کے نتائج کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھے کہ دنیا بھر میں چوٹی کے غیر مسلم علماء اور حکما اُس کے مخاطب ہیں کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ زیر تحقیق علمی

مسائل پر ایسے خالصتہ سائنسی اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے بحث کر سکے گا جو غیر مسلم اور مسلمان دونوں کے لیے یقین افروز ہو۔

(۵) اس بات کی کوشش کرے کہ جس غلط تصوّر کو وہ غلط ثابت کر رہا ہے اس کی جگہ صحیح تصور کو رکھے۔ اور یہ صحیح تصور جس قدر سوالات پیدا کر رہا ہو اُن سب کا تسلی بخش جواب دے۔ فلسفیانہ مسائل میں ایک منفی نقطۂ نظر یقین پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن جب کسی صحیح تصوّر کے پیدا کیے ہوئے تمام سوالات کا جواب دیا جائے تو ایک مکمل فلسفہ کائنات وجود میں آجاتا ہے۔ اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ غلط تصور جس کی جگہ یہ صحیح تصوّر لے رہا ہو کسی اور غلط فلسفہ کائنات کا جزو ہو۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ جب تک وہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل صحیح فلسفہ پیدا نہ کرے وہ کسی غلط فلسفیانہ تصوّر کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔

مثال کے طور پر جب تک کہ وہ ایک ایسا اسلامی فلسفۂ تاریخ پیدا نہ کرے جو عقلی اور علمی لحاظ سے مکمل طور پر قابل قبول ہو وہ بے خدا اشتراکی فلسفہ تاریخ کا ابطال نہیں کر سکے گا۔ پھر اس کا یہ اسلامی فلسفہ تاریخ بہت سے سوالات پیدا کرے گا جو اس کو فلسفہ کے اور مسائل میں کھینچ لائیں گے اور اگر وہ ان سوالات کا بھی جواب دے گا جیسا کہ اُسے ضرور دینا چاہیے تو پھر اس کا فلسفہ تاریخ محض ایک فلسفہ تاریخ نہیں رہے گا بلکہ کائنات کا ایک مکمل فلسفہ بن جائے گا۔ اسی طرح سے جب تک کہ وہ عمل ارتقا کے سبب کا کوئی ایسا فلسفہ مہیّا نہ کرے جو قرآن کے نظریۂ انسان و کائنات کے ساتھ مطابقت بھی رکھتا ہو اور علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے مکمل طور پر تسلی بخش بھی ہو اس وقت تک وہ ڈارون کے بے خدا میکانکی نظریۂ کائنات کی کامیاب تردید نہیں کر سکے گا۔ پھر اس کے قرآنی نظریۂ تاریخ کی طرح اس کا قرآنی نظریۂ ارتقا بھی بہت سے سوالات پیدا کرے گا جن کا جواب ایک مکمل فلسفہ کائنات کی صورت اختیار کرے گا۔

(۶) جب وہ کسی غلط نظریہ کو غلط ثابت کرتے ہوئے بعض تصوّرات کو درست قرار دیکھ اُن کی مدد لے تو کسی دوسرے نظریہ کو غلط ثابت کرتے ہوئے اُن کو غلط قرار نہ دے۔ اسی طرح سے جب وہ کسی صحیح قرآنی تصور کو درست ثابت کرتے ہوئے بعض تصوّرات کو غلط قرار دے تو پھر کسی دوسرے صحیح قرآنی تصور کو درست ثابت کرتے ہوئے اُن کو صحیح قرار نہ دے اور پھر جب وہ کسی غلط تصور

کو غلط ثابت کرتے ہوئے بعض تصورات کو غلط قرار دے لے تو کسی اور تصور کو غلط ثابت کرتے ہوئے اُن کو درست قرار نہ دے۔ اس کے برعکس اس کے لیے ضروری ہو کہ ہر تصور کے بارہ میں ایک ہی مؤقف پر قائم رہے۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ کسی تصور کے درست یا نادرست ہونے کے بارہ میں وہ ایک ایسا مؤقف اختیار کرے جس سے وہ ہر حالت میں وابستہ رہ سکتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لے کہ مختلف غلط نظریات اور تصورات کو غلط ثابت کرنے کی جو کوشش وہ کرے گا وہ اسی صورت میں بے خطا اور کامیاب ہوگی جب وہ اُن سب کے تردید کے لیے صرف ایک ہی نظریہ کائنات کو جو ظاہر ہو کہ صحیح اور قرآنی نظریہ کائنات ہی ہوگا کام میں لائے گا۔ اس صورت میں اس کے اسلامی نظریہ تاریخ کو مکمل کرنے والا فلسفہ کائنات اور اس کے نظریہ ارتقا کو مکمل کرنے والا فلسفہ کائنات جن کا ذکر اوپر الگ الگ کیا ہو دونوں ایک دوسرے سے ذرہ بھر بھی مختلف نہیں ہوں گے بلکہ دونوں ایک ہی ہوں گے۔

صحیح فلسفہ کائنات صرف ایک ہے اور وہ اسلام کا فلسفہ کائنات ہے

اسلام کے ضمن میں جب فلسفہ کا ذکر آتا ہو تو بعض مسلمان یہ کہا کرتے ہیں کہ اسلام کا فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال بہت بڑی غلطی ہو۔ حکمت اور فلسفہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ قرآن مجید حکمت کی کتاب ہو اور حکیم خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہو۔ فلسفی صداقت کی تلاش کرتا ہو کیونکہ صداقت کے اندر ہی یہ صلاحیت ہو کہ وہ علمی اور عقلی لحاظ سے درست ہو اور درست ثابت کی جا سکے۔ فلسفی صداقت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہو اور اُسے صداقت نہیں ملتی۔ لیکن خدا تو بات ہی وہ کہتا ہو جو از سرتا صداقت اور حق ہوتی ہے (قوله الحق) لہٰذا اگر خدا کی بات حکمت نہیں تو اور کس بات کی حکمت ہو۔ پھر فلسفی کائنات کے بھید کو تلاش کرتا ہو اور اُسے نہیں ملتا یہی سبب ہو کہ وہ اپنے فکر اور استدلال میں غلطیاں کرتا ہو۔ لیکن خدا وہ ہو جو کائنات کے بھید کو جانتا ہو۔ وہ دوسرے فلسفیوں کی طرح سر کائنات سے ناآشنا نہیں کہ اس کی بات سچی اور بے خطا حکمت نہ ہو۔ اسی بنا پر وہ دعویٰ کرتا ہو کہ اس کی بات سچی ہو۔ (قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِىْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) قرآن حکیم مجمل حکمت کائنات ہو اور اس کی تفصیل اور تشریح بھی جو تاقیامت ہوتی رہے گی

حکمت کائنات ہے۔ یہی تشریح اور تفسیر کتاب یا حکمت ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سکھایا (یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ) اور جسے خدا کے وہ بندے بھی جنہیں خیر کثیر عطا ہوگی تا قیامت سکھاتے رہیں گے (وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا) اور جسے تبلیغ دین کے لیے کام میں لانے کا حکم دیا گیا ہے (اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ) ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک فلسفہ صحیح ہے اور باقی سب فلسفے غلط ہیں اور صحیح فلسفہ وہ ہے جو قرآن حکیم پر مبنی ہو اور جو خدا کے عقیدہ سے آغاز کرے اور خدا کے عقیدہ پر ختم ہو۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کا فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اسلام ایک فلسفہ نہیں تو دور حاضر کے غلط فلسفوں کا جواب نہیں دے سکتا اور مسلمان ان غلط فلسفوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے اور اس کو ساتھ لے کر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت نہیں کر سکتے اور باطل فلسفہ کے پرستاروں کو مشرف بہ اسلام نہیں بنا سکتے۔ لیکن قرآن تو نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں اُن کا فیصلہ کرے۔ جب ہم ایک معمولی آدمی سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں جو علم اور عقل کے معیاروں پر درست ہو تو کیا خدا جو بات کرتا ہے اُس سے یہ توقع نہیں کر سکتے۔ اگر خدا کی بات اُن علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق ہے جو انسان کے دل میں رکھے گئے ہیں تو پھر ان معیاروں کے مطابق خدا کی بات کھول کر بیان کرنا اسلام کا فلسفہ ہے جو اس زمانے کے باطل نظریات کا جواب ہے اور ہمارے ایمان کا محافظ اور ہمارے ظن و شک کا علاج ہے

حکمت دنیا فزاید ظن و شک
حکمت دینی برد فوق فلک

(رومی)

قرآن کی تعلیمات
ایک انگریز کی نظر میں

حال ہی میں ایک کتاب "تاریخ کے حوادث" What Happend in History انگلستان سے شائع ہوئی ہے جس میں ان اقوام کے مذہبی خیالات، رسوم، علم الاصنام، خرافات، ادہام پرستی اور ایک ان دیکھی ہستی کے تصورات پر بحث کی گئی ہے جو زمانۂ تاریخ اور اس سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کے حالات کا سراغ کتبوں، قدیم اوزاروں اور برتنوں اور قبروں اور دوسری چیزوں سے معلوم ہوتا ہے۔

مصنف نے اپنے دائرہ تحقیق کو مصر اور مشرق وسطیٰ تک محدود رکھا ہے لیکن اس میں مشرق کے تقریباً تمام مذاہب اور ممالک کا ذکر آگیا ہے اور ضمناً ان حقائق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن کا ماخذ تاریخ ہے۔

مذاہب اور عقائد کے تذکرہ میں جہاں یہودیت اور عیسائیت پر اشارات کیے گئے ہیں وہاں اس کتاب میں اسلام اور اس کی تحریکات کا بھی ذکر آگیا ہے۔

آغاز میں مصنف نے ضرورت سمجھی ہے کہ لوگوں سے اسلام کا تعارف کرائے اور اس "عجیب و غریب مگر پرتاثیر" مذہب کی تعلیم کو بے نقاب کرے، چنانچہ مضمون کے تعارفی حصہ میں اپنے خیالات کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔

"بہت سے لوگ اسلام کو مذہب Religion کی حیثیت سے جانتے ہیں. لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے "تحریک" کے نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا ہے. مختصر سے مختصر الفاظ

میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام دنیا کے تمام مذاہب میں نرالا ہے، وہ ایک تاریخ بھی ہے اور ایک زبردست تحریک بھی، وہ سیاست بھی ہے اور اجتماعیت بھی، وہ نفسیات کی پہلی کتاب بھی ہے اور روحانیت کی آخری کتاب بھی، وہ دین اور دنیا کا ایسا مرکب ہے جو در حقیقت دنیا کے تمام مذاہب سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس کا "مصنف" خواہ کوئی ہو اپنے زمانہ ہی کا نہیں بلکہ بہت سے زمانوں کا ایک زبردست معلم ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کا مصنف ایک برہانی اور عقلی دماغ کا "انسان" ہے وہ اپنے ہر مضمون میں اس بات کی بڑی احتیاط کرتا ہے کہ کوئی دعویٰ بلا دلیل نہ ہو، وہ بار بار عقل کے اعتماد پر زور دیتا ہے۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو حیوان ٹھہراتا ہے اور عقل ہی کو حقائق کی کسوٹی ٹھہراتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ وہم پرستیوں سے دور رہے اور خرافات کا کوئی شائبہ اپنے خیالات میں نہ آنے دے۔ اس کا انداز فکر اس حکیم سے ملتا ہے جو صرف کائنات پر غور کرتا ہے قرآن کی یہ خوبی پہلے تو انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے، پھر اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور آخر میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔"

آگے چل کر مصنف لکھتا ہے:۔

"مورخین کو یہ بات سمجھنے میں بہت زیادہ تکلف سے کام لینا پڑا ہے کہ عرب کے وحشی انسانوں نے بغداد اور قرطبہ (اسپین) میں علوم و فنون کی بنیاد کس طرح ڈالی ہے؟ وہ عربوں کے علمی ذوق کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن یہ بات نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس ذوق کے محرکات کیا تھے۔ کسی نے کوئی وجہ بیان کی، کسی نے اُسے اتفاق کے سر منڈھ دیا، حالانکہ یونانی علوم کی طرف رغبت بھی وہی قوم کر سکتی ہے جسے پہلے سے عقلی علوم کا چسکہ ہو، لیکن اگر یہ مورخ قرآن سے بھی واقف ہوتے تو انھیں اس قدر دور از کار باتیں بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وجہ صاف ہے کہ قرآن عقل کا زبردست موید ہے، اب بات بالکل صاف ہے کہ جس قوم کا مذہب عقلی اور برہانی ہو وہ سائنس اور علوم کی مخالف نہیں ہو گی بلکہ مذہبی حیثیت سے سائنس کی سرپرستی کرنا اس کا فرض ہو گا۔ اگر قرآن عقل کی افادیت کا قائل نہ ہوتا تو مسلمان بھی علوم کی سرپرستی قبول نہ کرتے اور اسپین کی راہ سے سائنس کی شمع یورپ میں کبھی روشن نہ ہوتی۔

اس کے بعد کتاب کے مصنف (V. Gordon childe) نے اسلام کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتا ہے۔

"ہماری مہذب دنیا میں آرٹ (Art) (فنون لطیفہ) کو اہمیت حاصل ہے وہ ہمارے کیرکٹر کا جز بن چکا ہے۔ مگر دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قرآن میں آرٹ کے لیے کوئی جگہ نہیں جن لوگوں نے جمالیات میں زندگی گزاری ہے، اور جنھیں اسے ترقی دینے پر فخر ہے وہ یقیناً اسلام سے مایوس ہوں گے کہ اس میں ان کے ذوق کی یہ چیز نہیں، لیکن داد دینی پڑتی ہے قرآن کے "مصنف" کو اس نے سیرت کی ان تمام برائیوں کو چیلنج کیا جو آرٹ کے نام سے ہماری سوسائٹی کو گمراہ کر رہی ہیں اور اسکی قدر اس وقت معلوم ہوگی جب ایک طویل زمانہ کے بعد آرٹ کی برائیاں زندگی کی سطح پر آجائیں گی اور ہماری نئی نسلوں کو گھن لگا دیں گی۔

ہمارا آرٹ کیا ہے؟ ذہن کی بے راہ روی اخلاق کی کجی، ذوق کی شوریدگی، جنسی انارکی، عیش و عشرت کی بے لگامی اور پرانی برائیوں کو چھپانے کی ایک ترکیب!

قرآن نے بت پرستی کی تردید اور مذمت کر کے آرٹ کی آدھی عمارت کو مسمار کر دیا کیونکہ آرٹ کا بہت بڑا حصہ قدیم زمانہ کے بتوں اور تصویروں کی ایک شرمناک یادگار ہے اور ان جنسی تعلقات کی یاد دہانی جن پر جمالیات کا خول چڑھا ہے قرآن حسن ایزدی کا آئینہ تو ہے فحش کاری کا معلم نہیں ہے۔

آج کل فنون لطیفہ کی بڑی قدر ہے لیکن وقت آئے گا کہ آرٹ کی برائیاں ظاہر ہوں گی اور اس کی پیش بینی ایک حقیقت بن کر سامنے آئے گی۔"

مصنف نے اسلامی ارکان پر جس انداز میں تبصرہ کیا ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

"قرآن نے جن فرائض پر روشنی ڈالی ہے انھیں پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے "مصنف" نے دین اور دنیا کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نماز پانچ وقت پڑھی جاتی ہے جو زندگی کی ایک دوامی حرکت ہے، ایک ان دیکھی ہستی سے تعلق پیدا کرنا اور اس کے ذریعہ دنیا کے ساتھ اس کے مناسب حال سلوک کرنا، نماز کا سب سے بڑا مقصد ہے اور خیال میں نہیں آسکتا کہ اس سے بہتر بھی عبادت کا کوئی طریقہ اور ہو سکتا ہے۔ جب ایک شخص مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا ہے تو وہ صرف خدا ہی کا تصور نہیں کرتا بلکہ خدا کی ساری مخلوق سے

اپنے رشتہ کی تجدید کرتا ہے حج کے آئینہ میں بھی دین اور دنیا کا عکس پڑتا ہے اور اس فریضہ میں وہ سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے جو ایک جامع تصور کی غایت ہے۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں زمانہ حال کی پیداوار ہیں۔ مجالس امداد باہمی کی تحریک بالکل جدید ہے۔ لیکن قرآن کے "مصنف" نے زکوٰۃ کی مد قائم کر کے وہ تمام اغراض حاصل کر لیے جو آج کل کی سوسائٹیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ میں اخلاص اور ایثار ہے، غمخواری اور ہمدردی ہے۔ لیکن امداد باہمی کی تحریکات اس روح سے خالی ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کو تجارت سے بالاتر رکھا ہے، وہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا مفہوم زمانۂ حال کی کسی تحریک میں نہیں پایا جاتا۔

اسلامی روزہ کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں انسانی کمزوریوں کی پوری رعایت رکھی گئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ روزہ کی دوسری شکلیں اس شکل کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔"

قرآن کی سیاست پر مصنف نے پورے دو[2] صفحوں پر بحث کی ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔

"قرآن کو دوسری مذہبی کتب پر یہ تفوق حاصل ہے کہ اس میں سیاست اور اصول حکمرانی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قرآن نے سیاست میں ذرا بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ سیاست کے ہر جز و میں وہی زور اور تاثیر ہے جو اس کا فطری تقاضا ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن نے اخلاق، خوفِ خدا، خدمتِ خلق اور تصور آخرت سے سیاست کو بیگانہ نہیں رکھا اور یہی وہ چیز ہے جس سے موجودہ عہد کی سیاست محروم ہے اور اس محرومی نے دو بڑی جنگوں کا تماشہ دکھایا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ یورپ کے معاہدے، یورپ کی دفاعی تدابیر، یورپ کا سیاسی اتحاد اور بین الاقوامی پارلیمنٹ یا حکومت کی تجویز اور دوسری تمام تدابیر ناکام اور بے سود رہیں گی، اگر اس کی بنیادوں میں خدا کے تصور اور اخلاقی قدروں کو جگہ نہ دی گئی۔ جہاں عالمی امن کے لیے بہت سے نسخے آزمائے گئے ہیں، وہاں مذہب کا یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لینا چاہیے۔ اگر اس کے لیے کوئی تیار ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ وہ اس سلسلہ میں قرآن کو ہرگز نظر انداز نہ کرے کیونکہ اس کی رہنمائی اس کتاب سے بہتر اور کوئی کتاب انجام نہیں دے سکتی۔"

مصنف کا یہ فیصلہ بھی سننے کے قابل ہے کہ :-

"افسوس کہ اسلام کی مثالی اسٹیٹ کے قیام کے لیے اب تک کسی نے کوشش نہیں کی، مصر، ترکی، ایران، افغانستان وغیرہ مسلم حکومتوں کو اس اسٹیٹ سے کوئی تعلق نہیں جس کا نمونہ تیرہ صدی پہلے عمرؓ نے قائم کیا تھا، قرآنی اسٹیٹ اور مسلم اسٹیٹ میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک کہ سیاسی طاقت کا سوال ہے وہ خود یورپ کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ ایسی طاقت سے وہ کمزوری اچھی جو ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی پر ماتم سرا ہو اور جو طاقت پر دو آنسو بہائے۔" (ماخوذ)

درسِ قرآن — مرکزوالی مسجد
۷ ستمبر ۶۹ء (یکشنبہ)

● دین کو لہو و لعب بنانے والے.....
● مشرکین کا کیشِ مذہب اور خداوندی ہدایت
● آخرت صفاتِ الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ عٰلِمُ

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝

الانعام رکوع ۹ ۔ آیات ۷۰ تا ۷۳

اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو (اُن کی فکر میں نہ گھلو) جنھوں نے اپنے دین کو لہو ولعب بنا رکھا ہے اور دُنیوی زندگی نے اُن کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، اور اس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو کہ آدمی اپنے کرتوتوں میں ایسا گرفتار نہ ہو جائے کہ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی مددگار وحمایتی ہو اور نہ سفارشی اور اگر وہ دُنیا بھر کا معاوضہ بھی دے تو اس سے نہ قبول کیا جائے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کرتوتوں کی پاداش میں گرفتار ہوئے ان کے واسطے کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے ہوگا اور (اس کے علاوہ طرح طرح کا) دردناک عذاب ہوگا۔

(ان مشرکوں سے) کہدو کیا ہم (بھی تمھاری طرح) اللہ کے سوا ایسی (بے حقیقت) چیزوں کو (اپنی حاجتوں کے لیے) پکارنے لگیں (اور اپنے مقاصد کے لیے ان سے دُعا مانگنے لگیں) جو نہ ہمیں نفع پہونچا سکتی ہیں نہ نقصان، اور (دینِ حق تک پہونچ کر) اُلٹے پاؤں (شرک وکفر کی طرف) پھر جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہے، اُس (بدبخت) آدمی کی طرح جسے شیاطین نے کسی جنگل بیابان میں لے جا کر بھٹکتا چھوڑ دیا ہو (اور اس کے عقل وحواس کھوئے گئے ہوں) اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں جو اس کو سیدھے راستہ کی طرف بلاتے ہوں (اور پکار پکار کے کہتے ہوں) کہ ہمارے پاس آجا۔
——— (ان سے) کہہ دو کہ اللہ کا بتلایا ہوا راستہ ہی راہِ حق ہے (جس پر چل کر نجات اور کامیابی حاصل ہو سکتی ہے) اور (اُس کی طرف سے) ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم اللہ رب العلمین کی پوری فرمانبرداری کریں، اور (یہ) حکم ہوا ہے کہ نماز قائم کرو اور اُس سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤگے۔

اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو بالحق (یعنی عبث اور فضول نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کے لیے) اور جس دن وہ کہے گا کہ (حشر) ہو جا تو وہ برپا ہو جائے گا، اُس کا فرمان اٹل ہے اور اسی کی حکومت اور فرمانروائی

ہو گی جس دن کہ (حشر کے لیے) صور پھونکا جائے گا، وہ غیب وشہادۃ (یعنی غائب و
حاضر اور پوشیدہ وظاہر) سب کا جاننے والا ہے اور وہ بڑی حکمت والا اور ہر
چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔

سورۃ الانعام۔ آیات ۷۰ تا ۷۳

(تفسیر و تشریح)

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور آج پھر یاد دلا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ سورہ "الانعام" مکی ہے یعنی یہ اُس زمانہ میں نازل ہوئی تھی جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ ہی میں مقیم تھے، اور ابھی آپ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت نہیں فرمائی تھی، اس کے مضامین اور پیغام کا رُخ زیادہ تر مکہ کے کفار اور مشرکین کی طرف ہے ــــــ ان کا یہ حال میں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ خدا کے تو قائل تھے لیکن کچھ ہستیوں کے بارہ میں اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ اُس کی مقرب ہیں اور اُس نے اُن کو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں، اور یہ ہمارے بہت سے کام بنا سکتے ہیں اور خدا کے ہاں ہماری سفارش بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہ اُن کی بھی عبادت کرتے تھے، اُن سے بھی دُعائیں کرتے اور مرادیں مانگتے تھے، یہی اُن کا شرک تھا ــــــ دوسری بڑی گمراہی اُن کی یہ تھی کہ وہ آخرت کے اور وہاں کی جزا سزا کے قائل نہیں تھے ــــــ اسی سورۃ میں ۳۔۴ رکوع پہلے اُن کا یہ قول گزر چکا ہے۔ "اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ" (یعنی زندگی بس اسی دُنیا کی زندگی ہے۔ اور یہاں مرنے کے بعد پھر کوئی دوسری زندگی نہیں ہے) ــــــ اور ان دونوں گمراہیوں کے نتیجہ میں اُن کی تیسری بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب اور اُس کا ہدایت نامہ نہیں مانتے تھے ــــــ اس سورت (الانعام) میں زیادہ تر ان ہی تین باتوں پر زور دیا گیا ہے اور یہی اس کے مرکزی مضامین ہیں۔

آج جو آیتیں زیر درس ہیں جن کی میں نے اِس وقت تلاوت کی ہے، ان کا مطلب اور ان کی روح کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ دنیا کے اور

لوگوں کی طرح ان مشرکینِ مکہ میں بھی مختلف طبیعتوں اور مزاجوں کے لوگ تھے۔ کچھ لوگ ان میں ایسے خبیث طینت اور فاسد المزاج تھے کہ انھیں دنیوی عیش و لذت اور تفریح دل لگی کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی اور کسی بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ جب ان کے سامنے خدا اور آخرت کا ذکر کیا جاتا اور ان کو دین کی دعوت دی جاتی تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے اور اس کو بھی تفریح اور دل لگی کا سامان بنالیتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بالکل حیوانیت کی سطح پر گر گئے تھے اُن میں قبول حق کی استعداد بالکل باقی نہیں رہی تھی ـــ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ آپ ان کی فکر میں بھی گھلے جاتے تھے، آپ کی دلی آرزو تھی کہ یہ بھی کفر و شرک کی گندگی سے نکل آئیں اور اللہ کی ہدایت کو قبول کر لیں، پھر آپ دیکھتے تھے کہ ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا تو آپ کو قدرتی طور پر رنج اور دکھ ہوتا تھا ـــ اسی طبقہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو بالکل چھوڑ دو اُن کی فکر میں اپنا خون ہرگز خشک نہ کرو جن کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کو سنجیدگی اور حق بینی کی صلاحیت سے یکسر محروم کر لیا ہے، وہ دین کے ساتھ بھی تمسخر کرتے ہیں (یا یوں کہیے کہ بس لہو و لعب اور ہنسی مذاق کو انھوں نے اپنا دین بنالیا ہے) اور دنیوی زندگی اور یہاں کی دلچسپیوں میں وہ ایسے مست و مگن ہیں کہ اس کے سوا انھیں کسی بات کا ہوش نہیں (وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا) ـــ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کی زیادہ فکر نہ کرو، اُن کو بس دین کی اور توحید کی دعوت پہنچا دو اور انجام سے باخبر کر دو۔ ـــ چنانچہ آگے ارشاد ہے

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

اور اس قرآن کے ذریعہ اُن کو نصیحت کرو کہ وہ اُس آنے والے وقت سے ڈریں اور اُس کی فکر کریں جب مجرم اور بدکار آدمی اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں اس طرح گرفتار ہوگا کہ کوئی اُس کا حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر بالفرض وہ اپنے فدیہ میں سب کچھ دے کر بھی رہائی چاہے

گا تو وہ بھی اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ سورۂ معارج میں فرمایا گیا ہے "یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ ۝ وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُـْٔوِیْهِ ۝ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِ ۝ كَلَّا" یعنی قیامت کے دن مجرموں کا یہ حال ہوگا کہ وہ دل سے چاہیں گے کہ اُس دن کے عذاب سے اپنے کو بچانے کے لیے اپنی پیاری اولاد اور اپنی چہیتی بیوی کو اور اپنے عزیز بھائیوں کو اور رہنے کے گھر کو اور دنیا میں جو کوئی ان کا ہے ان سب کو فدیہ میں دے کر اپنی جان عذاب سے چھڑا لیں ـــــ لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا اور فدیہ میں یہ سب بھی قبول نہیں کیا جائے گا" ـــــ یہاں اس سب ہی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا ہے "وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا" یعنی اگر وہ سب کچھ بھی فدیہ میں دے گا تو قبول نہ ہوگا۔ الغرض وہ کسی طرح بھی خلاصی نہ پا سکے گا ـــــ آگے فرمایا گیا ہے "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا الخ" ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ جو آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی لذتوں اور یہاں کے کھیل تماشوں میں کھو گئے ہیں اور جنھوں نے دین کو بھی لہو و لعب بنا لیا ہے اور دین کی دعوت کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، اُن کا انجام یہی ہے کہ یہ اپنے کرتوتوں کے سبب پکڑے جائیں گے اور دوزخ کے قید خانہ میں ڈالے جائیں گے جہاں اُن کے پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا اور طرح طرح کے دردناک عذاب ہوں گے جن کا یہاں صحیح طور پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور یہ اُن کے ساتھ کوئی بھی زیادتی نہ ہوگی بلکہ اُن کے کفر کی واجبی سزا ہوگی (لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝)

بعض مفسرین نے "اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا" کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ مشرک دین اور خدا پرستی کے نام سے جو اعمال کرتے تھے اُن کو بھی انھوں نے لہو و لعب اور تفریح و دل لگی کا سامان بنا لیا تھا، قرآن پاک ہی میں فرمایا گیا ہے "وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِیَةً" (یعنی ان کی نماز اور عبادت بیت اللہ کے پاس بس یہی تھی کہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے کے معاملہ میں وہ اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ خاص بیت اللہ کے پاس عبادت اور نماز کے نام سے وہ جو کچھ کرتے تھے وہ یہی تھا کہ وہ منھ سے سیٹیاں بجاتے اور ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے تھے بس یہی ان کی عبادت اور نماز تھی، اسی طرح حج کو انھوں نے ایک میلا اور خرافات کا مجموعہ بنا رکھا تھا ـــــ اُن کا یہ حال سن کر

آج ہمیں اور آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ ان کی عقلیں کیسی ماری گئی تھیں کہ انھوں نے لہو و لعب اور کھیل تماشے اور گانے بجانے کو دین بنا لیا تھا اور اُس کو عبادت اور قرب الٰہی کا وسیلہ سمجھتے تھے، لیکن وہ بے چارے تو زمانہ جاہلیت کے کافر و مشرک تھے، اس سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مسلمان کہلانے والے بعض طبقوں کی گمراہی بھی آج اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انھوں نے بھی بالکل زمانہ جاہلیت کے ان مشرکوں کی طرح دین کو لہو و لعب اور خرافات کا مجموعہ بنا لیا ہے۔ آخر یہ تعزیہ داری اور علموں کے جلوس اور اجمیر شریف اور کلیر شریف وغیرہ میں بزرگانِ دین کے مزاروں پر عرسوں کے نام سے جو میلے لگتے ہیں جن میں گانا بجانا اور ہر طرح کی خرافات ہوتی ہیں، یہ سب دین کو لہو و لعب بنانا نہیں تو کیا ہے، بلاشبہ یہ سب وہی ہے جس کو قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے (اِتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا)

پھر یہ بھی واقعہ اور مشاہدہ و تجربہ ہے کہ جن لوگوں کی گمراہی اور بدبختی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ خرافات اور لہو و لعب کو دین بنا لیتے ہیں اُن کے قلوب میں ایسا زیغ پیدا ہو جاتا ہے کہ حق اور ہدایت ربانی کا قبول کرنا اُن کے لیے بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان آیتوں میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کے زیادہ پیچھے نہ پڑیں اور ان کی فکر میں اپنا خون خشک نہ کریں بس قرآن کے ذریعہ اُن کو نصیحت کر دیں کہ وہ انجام کے بارہ میں سوچیں اور آخرت کے عذاب سے ڈریں جس سے خدا کے مجرموں کو کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ پھر وہاں سب سے پہلے اُن کو کھولتا ہوا پانی ملے گا اور اس کے علاوہ انواع و اقسام کے بڑے دردناک عذاب ہوں گے۔ (لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ) ـــــــ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا! اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا!!

اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے "قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ" اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اس صورتِ حال اور پس منظر کو سامنے رکھنا چاہیے جس سے ان آیتوں کا تعلق ہے ـــــ صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو کر جیسا کہ معلوم ہے کہ مکہ کے اُن

لوگوں نے جن میں عقل حق کی خاص صلاحیت تھی توحید کا اور دین حق کو اختیار کر لیا تھا اور پہلے سے اور بت پرستی سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا اور دوسروں کو بھی برابر اس کی دعوت دی جارہی تھی ـــــ مشرکین کی طرف سے اس کی سخت مخالفت اور مزاحمت کی جارہی تھی اور ایمان لانے والوں میں سے جن پر بس چلتا تھا اُن کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے پرانے طریقہ کی طرف لوٹ جائیں اور پھر بت پرستی کا طریقہ اختیار کر لیں ـــــ اس کے بارہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت فرمائی گئی ؛

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ـ

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے کہیے کہ ذرا کچھ تو عقل سے سوچو کیا ہمارے لیے یا کسی کے لیے بھی یہ ٹھیک ہوگا کہ خدا کی طرف سے ہدایت پا جانے کے بعد اور گندگی اور تاریکی سے نکل کر پاکیزہ فضا اور روشنی میں آجانے کے بعد اُلٹے پاؤں پھر اُسی گمراہی اور تاریکی اور گندگی کی طرف لوٹ جائیں اور اُن فرضی معبودوں اور دیوتاؤں کی پرستش اور اپنے مقاصد کے لیے اُن سے دُعائیں کرنے لگیں جن کے بارہ میں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ اُن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے ـ وہ ہم کو نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان ـ اگر ہم ایسا کریں تو ہماری مثال اُس بدنصیب شخص کی سی ہوگی جس کو شیاطین اور بھوتوں نے بہکا کر کسی جنگل بیابان میں بھٹکتا چھوڑ دیا ہو اور اس کی عقل اور اُس کے حواس گم ہوں اور اس کے کچھ ساتھی اُسے پکارتے ہوں کہ یہاں ہمارے پاس راستہ پر آجا، لیکن وہ مخبوط الحواس ہونے کی وجہ سے کچھ نہ سنتا ہو اور جنگل میں بھٹکتا پھرے ـ ظاہر ہے کہ اُس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا ـ

یہ بظاہر تو مشرکین کی دعوتِ شرک کا جواب اور اپنے اس موقف کی وضاحت اور معذرت ہے کہ ہم دینِ حق کو قبول کرنے کے بعد شرک اور بت پرستی کی طرف کیوں نہیں لوٹ سکتے لیکن فی الحقیقت یہ توحید اور دین حق کی طرف نہایت لطیف اور مؤثر دعوت بھی ہے ـ اس میں مشرکین کو اشارہ دیا گیا ہے کہ تم اپنے حال پر غور کرو، تمہاری مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جس کو شیاطین نے مخبوط الحواس کر کے کسی جنگل بیابان میں بھٹکتا چھوڑ دیا ہو، اُس کے

مخلص ساتھی دل سوزی سے اُسے بلاتے ہوں لیکن وہ اُن کی پکار بھی نہ سُن سکتا ہو اور جنگل میں بھٹکتا پھرے ــــ اس لیے تم ہماری فکر کرنے کے بجائے اپنی فکر کرو۔ آگے ارشاد فرمایا گیا

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہو کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی صحیح راستہ ہے اور ہم نے اسی راستہ کو پکڑ لیا ہے۔ اور اُس کی بنیادی ہدایت اور تعلیم ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم اپنے کو رب العالمین کے سپرد کر دیں اور اس کی پوری پوری فرمانبرداری کریں (وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) اور ہمیں اُس کا حکم ہے کہ اپنی روحوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے پورے اہتمام سے نماز ادا کرو اور اللہ سے ڈرو اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کی پوری پابندی کرو اور تم سب مرنے کے بعد اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤگے اور اُسی کے سامنے تمہاری پیشی ہوگی (وَهُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝)

اس آیت کے مختصر الفاظ میں دین کی پوری بنیادی تعلیم کو سمیٹ کر پیش کر دیا گیا ہے اور گویا مخاطبین سے لطیف انداز میں کہا جا رہا ہے کہ یہ ہے وہ دین جو ہم نے قبول کیا ہے کیا انسانوں کے لیے اس سے بہتر بھی زندگی کا کوئی دستور ہو سکتا ہے اور کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہوگا کہ آدمی اس کو چھوڑ کر بت پرستی کا طریقہ اور جاہلیت کا راستہ اختیار کرے، حالاں کہ اُس کو اور سب کو خدا کے سامنے ضرور پیش ہونا ہے (وَهُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ)

یہاں سلسلۂ کلام میں حشر کا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں سب کی پیشی کا ذکر آ گیا تو آگے کی آیت میں اور کھول کے بیان کیا گیا کہ حشر اور آخرت میں جزا سزا کا ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات عدل و حکمت اور علم محیط کا تقاضا ہے اور قیامت اور حشر کا برپا کرنا اُس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، اس کی شان یہ ہے کہ اُس کے صرف ارادہ اور مشیت کے اشارہ سے سب کچھ ہو سکتا ہے ــــ ارشاد فرمایا گیا ہے

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

یعنی اس اللہ نے زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کو عبث اور بے مقصد نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد اور بڑی غایت کے لیے پیدا کیا ہے (اور وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں عالم آخرت کا ظہور ہو) ـــــ "بالحق" کا یہی مطلب ہے ـــــ شاید آپ حضرات کو یاد ہو کہ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیت "ربَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً" کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس دنیا کے بعد وہ آخرت نہ ہو جس کی خبر انبیاء علیہم السلام نے اور اللہ کی کتابوں نے دی ہے تو اس دنیا کا پیدا کرنا بالکل عبث اور بے معنی اور اسی طرح کھیل ہوگا جس طرح چھوٹے بچے کھیل کھیل میں مٹی کا گھروندا بناتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد خود ہی اس کو بسان کے برابر کر دیتے ہیں، اور کسی درخت کی ٹوٹی شاخیں بالو میں گاڑ گاڑ کے جھوٹ موٹ کا باغیچہ لگاتے ہیں اور کچھ دیر بعد اسے خود ہی اجاڑ دیتے ہیں ـــــ تو اگر یہ مان لیا جائے کہ زندگی بس یہی دنیوی زندگی ہے اور ہر انسان کی موت پر اُس کا اسی طرح خاتمہ ہو جاتا ہے جس طرح زمین کے کیڑے مکوڑے مرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں تو اس دنیا کی پیدائش اور اس کائنات کی تخلیق کی کوئی حکیمانہ توجیہ نہیں کی جا سکتی بلکہ میرا حال تو یہ ہے کہ اگر آخرت نہ ہو تو مجھے خود اپنی پیدائش پر اعتراض ہوگا اور میں احتجاج کروں گا کہ مجھے کیوں اس جنجال میں مبتلا کیا گیا۔

اور پھر چونکہ اس دنیا میں یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بہت سے بڑے بڑے ظالموں اور اپنے وقت کے فرعونوں کو یہاں کوئی سزا اُن کے ظلموں اور بدکرداریوں کی نہیں مل رہی ہے، بلکہ وہ ہزاروں نیکوکاروں سے بہت اچھے حال میں زندگی گزار رہے ہیں، ہر طرح کی بدمعاشیاں کر رہے ہیں اور خوب عیش اور کبر و فخر کے ساتھ دندناتے پھر رہے ہیں اور اس کے برعکس اللہ کے بہت سے نیکوکار اور پاکباز بندے انتہائی تنگیوں اور تکلیفوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی نیکوکاری اور پاکبازی کا کوئی صلہ ان کو یہاں نہیں مل رہا ہے تو اگر اس سب کے باوجود آخرت کو اور وہاں کی جزا سزا کو نہ مانا جائے تو معاذ اللہ خدا پر یہ بھی الزام آئے گا کہ اس نے اس دنیا کو "اندھیر نگری" بنایا ہے، اور اس میں اُتنا بھی عدل و انصاف نہیں ہے جتنا دنیا کے معمولی حاکموں کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے، یا معاذ اللہ اُس کو اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے ـــــ الغرض اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل اور صفت علم کا بھی تقاضا ہے کہ

اس دنیا کے بعد آخرت کا عالم برپا ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا پورا پورا ظہور ہو اور ہر ظالم اور مجرم کو اس کے ظلم اور جرم کی اور ہر نیکوکار کو اس کی نیکوکاری کی وہ سزا اور جزا ملے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہو۔

قرآن مجید میں "آخرت" کی اس دلیل کو مختلف الفاظ و عبارات میں پیش کیا گیا ہے انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اور اس زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے یعنی ٹھیک آئین حکمت کے مطابق اور بامقصد و بامعنی بنایا ہے اور اُس کی ایک بڑی غایت ہے یعنی اُس عالم آخرت کا ظہور جو کبھی فنا نہیں ہوگا اور وہاں بندوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ رابطہ ہوگا اور اُن پر اُس کریم رب کے وہ انعامات ہوں گے جن کا اس عالم میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا بالحق کا مطلب یہی ہے کہ اللہ نے اس دنیا کو عبث نہیں پیدا کیا بلکہ اُس کی ایک بڑی غایت ہے اور وہ آخرت کا بپا ہونا ہے اور دنیوی زندگی کا یہ مرحلہ اُس کیلئے اسی طرح تمہید ہے جس طرح ماں کے پیٹ میں بچہ کی چند مہینے کی زندگی کا مرحلہ اُس کے لیے دنیوی زندگی کی تمہید ہوتی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے کہ آخرت کا برپا کرنے اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، ارشاد ہے کہ "وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ" یعنی وہ جس دن اور جس دم حکم دے گا کہ حشر برپا ہو جائے اور آخرت قائم ہو جائے اسی دم سب ہو جائے گا اور اس کے لیے اُس کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑے گا ——— آگے ارشاد ہے "قَوْلُهُ الْحَقُّ" یعنی اُس کا فرمان اٹل ہے جو فرما دیتا ہے اسی طرح ہو جاتا ہے "وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ" اور صرف اُس کی حکومت اور فرمانروائی ہوگی جس دن کہ صور پھونکا جائے گا "عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ" وہ عالم غیب اور عالم شہادت دونوں کا پورا علم رکھتا ہے، یعنی جو حقائق اور کائنات کے بھید از بندوں کی نظروں سے غائب اور اُن کی دریافت کی حدود سے باہر ہیں وہ ان کو بھی پوری طرح جانتا ہے اور جو کچھ بندوں کے سامنے اور ان کی دریافت کی حد میں ہے وہ بھی سب اُس کے علم میں ہے، اور اس سب کے ساتھ وہ "الحکیم" ہے اس کا ہر کام اور ہر فیصلہ اور ہر بات حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہے

اور وہ "الخبیر" بھی ہے یعنی ہر چیز سے اور ہر انسان کے ہر عمل سے اور اُس کے ماضی، حال اور مستقبل سے پوری طرح باخبر ہے ـــــ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت سے کسی لمحہ بھی غافل نہ ہو کہ اُس کا مالک جس کے سامنے آخرت میں اس کی پیشی ہونے والی ہے وہ اس کے ہر عمل اور ہر بات اور ہر راز سے باخبر ہے (عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ٥)

نگاہ اوّلیں (صفحہ ۴ کا بقیہ)

کی پچاسوں مثالوں میں اب تک ایک جگہ بھی کوئی ایسی کارروائی دیکھنے میں نہیں آسکی ہو پھر بھلا کسی ریاست کے وزیر اعلیٰ اور وزیر داخلہ کو تو چھونے والا کون ہے؟ چاہے ان کے راج میں کسی اقلیت پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے۔

پچھلے مہینے (اگست میں) صدارتی انتخاب کی جنگ کو مسلمانوں نے عام طور پر ترقی پسندی و روشن خیالی اور رجعت پسندی و تنگ نظری کی جنگ سمجھتے ہوئے وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پسندیدہ امیدوار مسٹر وی وی گری کی کامیابی سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں کہ اس سے ملک کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اس نئے دور کے لیے آزمائش کی گھڑی بہت ہی جلد آئی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ مسز گاندھی اس آزمائش میں کس حد تک مسلمانوں کی توقعات پر پوری اُترتی ہیں۔ اور آیا واقعی کوئی ایسا جرأت مندانہ اقدام وہ اس فرقہ وارانہ مسئلہ میں بھی کر سکتی ہیں جیسی جرأت نمائی کی داد وہ بینکوں کو قومیانے اور بے دھڑک مسٹر مرار جی ڈیسائی کو وزارت مالیات سے الگ کر دینے پر حاصل کر رہی ہیں؟

درس قرآن

گھر بیٹھے قرآن سمجھئے اور سمجھائیے

نہایت سادہ انداز میں قرآن کی تعلیم کو پیش کرنے والا ایک قابل قدر سلسلہ، اسکے ذریعہ ہر گھر میں درس قرآن جاری کیا جاسکتا ہے۔ ہر صفحہ پر ایک سبق، ہر منزل الگ الگ جلد۔ قیمت مکمل سٹ مجلد -/۶۰

تفسیر ماجدی

(از مولانا عبدالماجد دریابادی)

مشتمل بر سورۂ فاتحہ و بقرہ و آل عمران۔ نیا اڈیشن، مکمل نظر ثانی و بکثرت اضافوں کے ساتھ۔ قیمت -/۱۸

قصص القرآن

(مکمل چار جلدوں میں)

اُمم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہو قیمت کامل -/۲۶

لغات القرآن

تمام قرآنی الفاظ کی نہایت جامع اور معقول ڈکشنری، خاص طور پر اہل علم کے لیے بڑے کام آنے والی ہے۔

قیمت مکمل .... -/۳۳

الفوز الکبیر (اردو)

(از شاہ ولی اللہؒ)

فن تفسیر کے اُصول و مبادی پر حضرت شاہ صاحبؒ کا بے نظیر رسالہ جس سے قرآن فہمی کا دروازہ کھل جاتا ہو۔ قیمت -/۱

فہم قرآن

۔ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم اور کن شرائط پر موقوف ہے۔

قیمت .... -/۴

بائبل سے قرآن تک

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "اظہار الحق" کا اردو ترجمہ اور تشریح و تحقیق، عیسائیت کے رد میں بےنظیر کتاب ہے۔ قیمت مجلد -/۱۰

بخاری شریف

کامل (اردو)

تین جلدوں میں، اعلیٰ کاغذ مجلد، قیمت -/۴۵

کتاب الزہد والرقائق

(عربی) امت کے جلیل القدر امام عبداللہ بن المبارک کی تالیف (عربی) -/۳۰

حجۃ اللہ البالغہ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اس کتاب کا موضوع اگرچہ اسرار شریعت کا بیان ہو۔ لیکن اس کے مطالعہ سے احادیث نبوی کی رُوح کو سمجھنے کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ مترجم قیمت کل دو جلد -/۳۴

ہر اُمتی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

خاص الخاص تحفہ

وہ اذکار، وہ دعائیں اور توبہ و استغفار اور صلوٰۃ و سلام کے وہ کلمات جو خود آپؐ کے معمولات میں تھے اور جو آپؐ نے صحابہ کرام کو خاص طور سے تلقین فرمائے۔ اُن سے متعلق حدیثوں کو حدیث کی کتابوں سے چھانٹ کر مولانا نعمانی نے اپنی تازہ تالیف

معارف الحدیث جلد پنجم

میں جمع کردیا ہو اور ہر حدیث کی اس طرح تشریح کی ہو کہ قلب و رُوح بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ مؤلف نے اسکے مقدمہ میں اسکی امید کی ہو کہ انشاء اللہ یہ کتاب میرے لیے اور اللہ کے بہت سے بندوں کے لیے رحمت و مغفرت کا وسیلہ بنے گی۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت، نفیس کاغذ بڑا کتابی سائز، چار سو سے زیادہ صفحات۔ قیمت مجلد ریگزین -/۷، غیر مجلد ۶/۵۰

عجالۂ نافعہ شرح فوائد جامعہ

یہ کتاب فن حدیث پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بے نظیر تصنیف ہے۔ اس کی شرح نے اس کی افادیت میں بےحد اضافہ کردیا ہے۔ قیمت -/۱۵

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

ندوۃ المصنفین دہلی کی مطبوعات

- لغات القرآن مکمل چھ جلدوں میں ۳۲/-
- تدوین قرآن ۱/۵۰
- رہنمائے قرآن ۱/-
- قرآن اور تعمیر سیرت ۶/-
- اسلام کا اقتصادی نظام ۹/-
- اسلام کا نظام عفت و عصمت ۵/-
- اسلام کا زرعی نظام ۵/-
- اسلام کا نظام مساجد ۵/-
- اسلام کا نظام حکومت ۸/-
- اسلام میں غلامی کی حقیقت ۵/-
- غلامانِ اسلام ۸/-
- تاریخ ادبیات ایران ۸/-
- تاریخ گجرات ۸/-
- تاریخ علم فقہ ۶/-
- لا مذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۴/-
- سیرۃ النعمان ۳/-
- عروج و زوال کا الٰہی نظام ۳/-
- مسلمانوں کا عروج و زوال ۴/-
- مسلمانوں کا نظم مملکت ۶/-
- مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت حصہ اول ۹/-
- نیل سے فرات تک ۳/-
- العلم والعلماء ۵/-
- اخلاق اور فلسفۂ اخلاق ۱۰/-

دار المصنفین اعظم گڑھ کی مطبوعات

- سیرت النبی از جلد اول تا ششم قیمت کامل ۷۱/۵۰
- خلفاء راشدین .. .. .. قیمت ۴/-
- مہاجرین۔ اول ۳/- .. .. دوم ۴/-
- سیر الانصار۔ اول ۳/- .. .. دوم ۵/-
- سیر الصحابہ ششم ۳/- .. .. ہفتم ۳/۵۰
- اسوۂ صحابہ۔ اول ۶/- .. .. دوم ۹/-
- سیر الصحابیات ۳/- تابعین .. ۱۰/۵۰
- اہل کتاب صحابہ و تابعین ۳/-
- تاریخ اسلام۔ (مکمل چار جلدوں میں) ۲۴/-
- تاریخ صقلیہ کامل (دو جلدوں میں) ۱۸/-
- تاریخ دولت عثمانیہ ۱۹/-
- اسلام کا سیاسی نظام ۶/-
- ہماری بادشاہی ۴/-
- تاریخ اندلس ۸/۵۰
- گجرات کی تمدنی تاریخ ۴/-
- الغزالی ۴/-
- المامون ۵/-
- سیرت عمر بن عبد العزیز ۵/-
- سیرت حضرت عائشہ رض
- تذکرۃ المحدثین
- حیات شبلی ۹/-
- محمد علی کی ڈائری ۱۹/-
- صاحب المثنوی ۱۰/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلا شبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے.
لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے، یہاں تک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے.
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے.
جسمیں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے.
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے.
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5-00

Regd. No. L-353
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 37 NO. 7 OCTOBER 1969

الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ...... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۷ | بابت ماہ شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق نومبر ۱۹۶۹ء | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پرنٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

از محمد منظور نعمانی

ہم اور آپ اگر صرف نام کے نہیں بلکہ واقعۃً مسلمان ہیں تو اس قرآنی حقیقت پر تو یقیناً ہمارا ایمان ہوگا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور کسی شخص یا کسی قوم پر جو اچھے برے حالات آتے ہیں وہ سب اللہ کے فیصلہ اور اللہ کے حکم سے آتے ہیں ـــــ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی شخص یا کسی قوم کو اچھے حال میں رکھنا اور عزت دینا چاہے اور پھر کوئی دوسرا اُس کو بدحال اور بے عزت کر سکے، یا وہ کسی کو نعمت و عزت دینا نہ چاہے اور کوئی دوسرا اُس کو نعمت و عزت دے سکے۔ سورۂ یونس میں ہے:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (یونس ع ۱۱)

اور اگر اللہ تم کو کسی دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرے تو کوئی اُسکو ہٹا سکنے والا نہیں اور اگر وہ تمھاری بہتری کا ارادہ کرے تو کوئی اُسکے فضل و کرم کو روک سکنے والا نہیں۔

اور سورۂ فاطر میں ہے:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (فاطر ع ۱)

اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں کے لیے کھولے تو پھر کوئی اسکو روکنے والا نہیں اور وہ جس نعمت کو روک لے تو پھر کوئی اسکو بھیجنے والا نہیں، اور وہ بڑے زور اور حکمت والا ہے۔

الغرض اس دنیا میں افراد و اقوام پر جو اچھے برے حالات آتے ہیں وہ سب اللہ ہی کے فیصلہ اور اسی کے حکم سے آتے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے اُسی کے ایک اشارہ "کن" سے ہوتا ہے۔ سورۂ یٰسین کی آخری آیت ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ

اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ فَسُبْحَانَ	کو کرنا چاہتا ہو تو اسکو کہتا ہو کہ ہو جا، پس وہ
الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ	ہو جاتی ہو۔ پس پاک ہو وہ ذات جسکے قبضہ میں
شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞	ہر چیز کی بادشاہی اور فرمانروائی ہو اور تم سب
(سورۂ یٰسین ع ۵)	(مرنے کے بعد) اسی کی طرف لوٹو گے۔

اسی لیے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اُن کے توسط سے ہم کو بھی یہ حکم دیا گیا ہے ــــــ کہ

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	کہو اے اللہ ملک و بادشاہت کے حقیقی
الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	مالک! تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے
مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَ	چاہے ملک لے، جسے چاہے عزت دے
تُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ	اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی قبضہ
اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	میں ہو ہر بھلائی، تو بیشک ہر چیز پر پوری
(آل عمران ع ۳)	قدرت رکھتا ہے۔

جب ان قرآنی آیات پر ہمارا ایمان ہے اور ہم واقعۃً یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہو اور کسی کو حکومت و سلطنت دینا اور کسی سے چھین لینا اور کسی کو عزت دے کر بلند کر دینا اور کسی کو ذلت کے گڑھے میں گرا دینا، یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اس وقت جن مصائب و مشکلات میں ہم مسلمان گھرے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کیوں ہم کو ان میں مبتلا کیا ہے اور صدیوں سے یہ ذلت و پستی ہم پر کیوں مسلط کر دی گئی ہے اور اقوام عالم میں کیوں ہمارا پلہ اتنا کمزور ہے؟ ــــــ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تو کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا، اُس کی مقدس کتاب قرآن مجید نے ہمیں صاف صاف بتلایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔـا وَّ	اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود
لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ۞	ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا	یہ سب اس سبب سے ہو کہ اللہ تعالیٰ نہیں ہو بدلنے

نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا — دالاکسی نعمت کا جو بخشی ہو اُس نے کسی قوم کو جب
بِاَنْفُسِهِمْ. (انفال ع ۶) — تک نہ بدلے وہ اپنے ذاتی اعمال.

پس ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ ہم جن حالات و آفات میں مبتلا ہیں، اور جو ذلت و پستی ہم پر مسلط ہو، اور نہ صرف ہم مسلمانان ہند بلکہ زمین کے کسی خطہ میں جہاں کہیں بھی مسلمان قومیں دیگر اقوام کے زیر اقتدار ہیں یا مسلمانوں کی حکومتیں دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں جو عاجز و کمزور ہیں تو یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے وجہ اور اور بلا قصور نہیں ہو، اور علیٰ ہذا یہ صرف ظاہری و مادی اسباب کی کمی بیشی اور تاریخ کی ایک خاص رفتار کا نتیجہ بھی نہیں ہو. بلکہ اس میں سب سے بڑا دخل اللہ تعالیٰ کے قانون "جزاء اعمال" کا ہو، اور مادی اسباب کی کمی بیشی اور تاریخ کی جس رفتار کو ہم اس کا اصلی سبب سمجھ رہے ہیں دراصل وہ خود اللہ کے اسی قانون کا نتیجہ ہے۔

اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کیجیے

احمد آباد میں وہ غریب پردیسی مزدور بھی خاص طور سے فساد اور تباہ کاری کا نشانہ بنے ہیں جو ملک کے مختلف علاقوں سے جا کر وہاں ملوں میں کام کرتے ہیں اور وہیں کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ان کے بعض لٹے پٹے قافلوں سے ہم نے حال ہی میں ملاقات کی۔ یہ سخت تباہی و بربادی کا شکار ہو کر، ان میں سے بہت سے اپنے جسموں پر زخم لے کر اس حالت میں اپنے وطنوں میں آئے ہیں کہ بدن پر پورے کپڑے بھی نہیں ہیں اور ہاتھ پائی پیسے سے بالکل خالی ہیں۔ جن خاندانوں اور گھرانوں سے ان کا تعلق ہو اُن کی بھی گزر بسر انھیں کی کمائی پر تھی۔ وہ اپنی محنت سے اپنا بھی گزارا کرتے تھے اور گھروں پر بوڑھے ماں باپ اور بال بچوں کو بھی کچھ بھیج دیتے تھے جس سے کسی طرح ان کی زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ ان کے گھروں پر اتنا بھی نہیں ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ تک گزارا ہو سکے۔

جن مقامات پر فساد زدہ افراد آرہے ہیں وہاں کے لوگوں کے لیے ان مصیبت زدہ بھائیوں کی خدمت و اعانت کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ

خود براہِ راست اُن سے رابطہ پیدا کر کے ان کی ضروریات کی فکر برادرانہ اور شریفانہ طریقہ سے کی جائے۔

ہر شخص سوچے کہ خدا نہ کردہ یہ وقت ہم پر بھی آسکتا...!

محمد منظور نعمانی

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

اولاد کے بارہ میں باپ کی ذمہ داریاں

حسنِ ادب اور دینی تربیت:۔

اللہ کے سارے پیغمبروں نے اور ان سب کے آخر میں اُن کے خاتم سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے، اس چند روزہ دُنیوی زندگی کے بارہ میں یہی بتایا ہے کہ یہ دراصل آنے والی اس اُخروی زندگی کی تمہید اور اُس کی تیاری کے لیے ہے جو اصلی اور حقیقی زندگی ہے، اور جو کبھی ختم نہ ہوگی —— اس نقطۂ نظر کا قدرتی اور لازمی تقاضا ہے کہ دُنیا کے سارے مسئلوں سے زیادہ آخرت کو بنانے اور وہاں فوز و فلاح حاصل کرنے کی فکر کی جائے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر صاحبِ اولاد پر اس کی اولاد کا یہ حق بتایا ہے کہ وہ بالکل شروع ہی سے اس کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر کرے، اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو قصوروار ہوگا —— اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِفْتَحُوْا عَلٰى صِبْيَانِكُمْ اَوَّلَ كَلِمَةٍ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلَقِّنُوْهُمْ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ —— (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہلواؤ، اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تلقین کرو۔ (شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) انسانی ذہن کی صلاحیتوں کے بارے میں جدید تجربات اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور اب گویا تسلیم کر لی گئی ہے کہ پیدائش کے وقت ہی سے بچہ کے ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جو آوازیں وہ کان سے سُنے اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھے اُس سے اثر لے، اور وہ اثر لیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہونے کے بعد ہی بچہ کے کان میں (خاص کان میں) اذان و اقامت پڑھنے کی جو ہدایت فرمائی ہے، (جیسا کہ حضرت ابو رافع اور حضرت حسین بن علی کی مندرجہ بالا روایات سے معلوم ہو چکا ہے) اس سے بھی یہ صاف اشارہ ملتا ہے ــــ حضرت عبداللہ بن عباس کی اس حدیث میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ بچہ کی زبان جب بولنے کے لیے کھلنے لگے تو سب سے پہلے اس کو کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تلقین کی جائے اور اسی سے زبانی تعلیم و تلقین کا افتتاح ہو ــــ آگے یہ بھی ہدایت فرمائی گئی کہ جب آدمی کا وقت آخر آئے تو اس وقت بھی اس کو اسی کلمہ کی تلقین کی جائے ــــ بڑا خوش نصیب ہے اللہ کا وہ بندہ جس کی زبان سے دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے یہی کلمہ نکلے اور دُنیا سے جاتے وقت یہی اس کا آخری کلمہ ہو ــــ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ۔

ــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ اور تحفہ حسنِ ادب اور اچھی سیرت سے بہتر نہیں دیا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) یعنی باپ کی طرف سے اولاد کے لیے سب سے اعلیٰ اور بیش بہا تحفہ یہی ہے کہ اُن کی ایسی تربیت کرے کہ وہ شائستگی اور اچھے اخلاق و سیرت کے حامل ہوں۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَ اَحْسِنُوْا آدَابَھُمْ ——— رواہ ابن ماجہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد کا اکرام کرو اور (اچھی تربیت کے ذریعہ) ان کو حسن ادب سے آراستہ کرو۔ (سنن ابن ماجہ)

تشریح) اولاد کا اکرام یہ ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور اُس کی امانت سمجھ کر اُن کی قدر اور اُن کا لحاظ کیا جائے، حسب استطاعت ان کی ضروریاتِ حیات کا بندوبست کیا جائے، اُن کو بوجھ اور مصیبت نہ سمجھا جائے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِیْنَ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ ——— رواہ ابوداؤد و رواہ فی شرح السنۃ عن سبرۃ بن معبد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمھارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو، اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی کرنے پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ الگ کر دو۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) عام طور سے بچے سات سال کی عمر میں سمجھ دار اور باشعور ہو جاتے ہیں، اس وقت سے ان کو خدا پرستی کے راستہ پر ڈالنا چاہیے اور اس کے لیے اُن سے نماز کی پابندی کرانی چاہیئے، دس سال کی عمر میں ان کا شعور کافی ترقی کر جاتا ہے اور بلوغ کا زمانہ قریب آجاتا ہے، اُس وقت نماز کے بارہ میں ان پر سختی کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ کوتاہی کریں تو مناسب طور پر ان کو سرزنش بھی کرنی چاہیے۔ نیز اس عمر کو پہونچ جانے پر ان کو الگ الگ سُلانا چاہیئے۔ ایک ساتھ اور ایک بستر پر نہ سلانا چاہیئے۔ (دس سال سے

پہلے اس کی گنجائش ہے)

حدیث کا مدعا یہ ہے کہ ماں باپ پر یہ سب اولاد کے حقوق ہیں، لڑکوں کے بھی اور لڑکیوں کے بھی، اور قیامت کے دن ان سب کے بارہ میں بازپرس ہوگی۔

خاصکر لڑکیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت :-

آج تک بھی بہت سے علاقوں اور طبقوں میں لڑکی کو ایک بوجھ اور مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے پیدا ہونے پر گھر میں بجائے خوشی کے افسردگی اور غمی کی فضا ہو جاتی ہے۔ یہ حالت تو آج ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے عربوں میں تو بیچاری لڑکی کو باعثِ ننگ و عار تصور کیا جاتا تھا اور اس کا یہ حق بھی نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کو زندہ ہی رہنے دیا جائے، بہت سے قسی القلب خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی کا گلا گھونٹ کر اس کا خاتمہ کر دیتے تھے یا اس کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے ۔۔۔ ان کا یہ حال قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ أَيُمْسِكُهٗ عَلَىٰ هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ (النحل ع ۷)	جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی ہے تو وہ دل مسوس کے رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے ان کو منہ نہیں دکھانا چاہتا، اس برائی کی وجہ سے جس کی اسے خبر ملی ہو۔ سوچتا ہے کیا اس نومولود بچی کو ذلت کے ساتھ باقی رکھے یا اس کو کہیں لے جا کے مٹی میں دبا دے۔

یہ تھا لڑکیوں کے بارہ میں اُن عربوں کا ظالمانہ رویہ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس فضا اور اس پس منظر کو پیش نظر رکھ کے اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجۂ ذیل ارشادات پڑھیے!

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَنْ وُلِدَتْ لَهُ ابْنَةٌ فَلَمْ يُؤْذِهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا
يَعْنِي الذُّكُورَ — اَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهَا الْجَنَّةَ —

——— رواہ احمد والحاکم فی المستدرک

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہو، پھر وہ نہ تو اُسے کوئی ایذا پہونچائے اور نہ اُس کی توہین اور ناقدری کرے اور نہ محبت اور برتاؤ میں لڑکوں کو اُس پر ترجیح دے (یعنی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا کہ لڑکوں کے ساتھ کرتا ہو) تو اللہ تعالیٰ لڑکی کے ساتھ اس حسنِ سلوک کے صلہ میں اس کو جنت عطا فرمائے گا۔

(مسند احمد، مستدرک حاکم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس بندہ یا بندی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی (اور اُس نے اس ذمہ داری کو ادا کیا) اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اُس کے لیے دوزخ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اسی روایت میں وہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جس کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی — اور وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک نہایت غریب عورت کچھ مانگنے کے لیے آئی، اس کے ساتھ اُس کی دو بچیاں بھی تھیں، اتفاق سے اُن کے پاس اُس وقت صرف ایک کھجور تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے وہی کھجور اُس بیچاری کو دے دی۔ اُس نے اسی ایک کھجور کے دو ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں میں تقسیم کر دیا۔

اور خود اس میں سے کچھ بھی نہیں لیا اور چلی گئی، کچھ دیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو میں نے آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ جس بندہ یا بندی پر بیٹیوں کی ذمہ داری پڑے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو یہ بیٹیاں آخرت میں اس کی نجات کا سامان بنیں گی" ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی اگر بالفرض اپنے کچھ گناہوں کی وجہ سے سزا اور عذاب کے قابل ہوگا تو لڑکیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے صلہ میں اس کی مغفرت فرما دی جائے گی اور وہ دوزخ سے بچا دیا جائے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک بیچاری مسکین عورت اپنی دو بچیوں کو گود میں لیے ان کے پاس آئی اور اس نے سوال کیا تو حضرت عائشہ رضؓ نے اس کو تین کھجوریں دیں، اس نے ایک ایک دونوں بچیوں کو دے دی اور ایک خود کھانے کے لیے منھ میں دابنے لگی۔ بچیوں نے اس تیسری کھجور کو بھی مانگا تو اس نے خود نہیں کھائی بلکہ وہ بھی آدھی آدھی کر کے دونوں بچیوں کو دے دی ـــــ حضرت عائشہ رضؓ اس کے اس طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوئیں اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس عورت کے اسی عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت کا اور دوزخ سے رہائی کا فیصلہ فرما دیا" ـــــ ہو سکتا ہے کہ حضرت صدیقہ رضؓ کے ساتھ یہ دونوں واقعے الگ الگ پیش آئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ ایک ہی ہوا اور راویوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا ہو۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِیَتَیْنِ حَتّٰی تَبْلُغَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَنَا وَھُوَ ھٰکَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَہٗ ـــــ رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ دو لڑکیوں کا بار اٹھائے اور اس کی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہونچ جائیں تو وہ اور میں قیامت کے دن اس طرح ساتھ ہوں گے۔ ـــــ راوی حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو بالکل ملا کر

دکھایا (یعنی یہ کہ جس طرح یہ انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اسی طرح میں اور وہ شخص بالکل ساتھ ہوں گے۔　　　(صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْ ثَلٰثَ اَخَوَاتٍ اَوْ اُخْتَیْنِ اَوْ بِنْتَیْنِ فَاَدَّبَهُنَّ وَاَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ وَزَوَّجَهُنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ۔

——— رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس بندہ نے تین بیٹیوں یا تین بہنوں یا دو ہی بیٹیوں یا بہنوں کا بار اٹھایا اور ان کی اچھی تربیت کی اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور پھر اُن کا نکاح بھی کر دیا ——— تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس بندہ کے لیے جنت کا فیصلہ ہے۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

(تشریح) ان حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، حُسنِ سلوک کو لڑکیوں کا صرف حق ہی نہیں بتلایا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر داخلہ جنت اور عذاب دوزخ سے نجات کا آپ نے اعلان فرمایا اور یہ انتہائی خوشخبری سنائی کہ لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے اہل ایمان قیامت میں اس طرح میرے قریب اور بالکل میرے ساتھ ہوں گے جس طرح ایک ہاتھ کی باہم ملی ہوئی اُنگلیاں ساتھ ہوتی ہیں۔

داد و دہش میں مساوات و برابری بھی اولاد کا حق ہے:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے بارے میں یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ خاص کر داد و دہش میں سب کے ساتھ انصاف اور برابری کا برتاؤ کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ کسی کو زیادہ نوازا جائے اور کسی کو محروم رکھا جائے یا کم دیا جائے ——— یہ چیز بذاتِ خود بھی مطلوب ہے اور اس عدل و انصاف کا بھی تقاضا ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت ہے کہ اگر اولاد میں سے کسی کو زیادہ نوازا جائے اور کسی کو کم، تو اُن میں

باہم تحاسد اور تباغض پیدا ہوگا جو دین اور تقویٰ کے لیے تباہ کن اور ہزار فتنوں کی جڑ ہے نیز اولاد میں جس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اُس کے دل میں باپ کی طرف سے میل آئے گا اور شکایت وکدورت پیدا ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اس کا انجام کتنا خراب ہوگا۔ ان سب وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں سخت تاکیدیں فرمائی ہیں اور اس رویہ کو ایک طرح کا ظلم قرار دیا ہے۔ اس باب میں مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھیے!

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ اَنَّ اَبَاهُ اَتٰى بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّىْ نَحَلْتُ اِبْنِىْ هٰذَا غُلَامًا فَقَالَ اَكُلَّ وُلْدِكَ نَحَلْتَ مِثْلَهٗ؟ قَالَ لَا قَالَ فَارْجِعْهُ — وَفِىْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ اَيَسُرُّكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِى الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ بَلٰى قَالَ فَلَا اِذًا وَفِىْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ اَعْطَانِىْ اَبِىْ عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّىْ اَعْطَيْتُ اِبْنِىْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمَرَتْنِىْ اَنْ اُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وُلْدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهٗ وَفِىْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ لَا اُشْهِدُ عَلٰى جَوْرٍ — رواہ البخاری ومسلم

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد مجھے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (بعض روایات میں ہے کہ گود میں لے کر حاضر ہوئے) اور عرض کیا کہ میں نے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کر دیا ہے (بعض روایات میں بجائے غلام کے باغ ہبہ کرنے کا ذکر ہے، بہرحال) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو اتنا ہی اتنا دیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں (اوروں کو تو نہیں دیا صرف اسی لڑکے نعمان کو دیا ہے) آپ نے فرمایا پھر یہ تو ٹھیک نہیں، اور فرمایا کہ اس کو واپس لے لو — اور ایک

روایت میں ہے کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری سب اولاد یکساں طور پر تمھاری فرمانبردار اور خدمت گزار بنے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت یہ تو ضرور چاہتا ہوں، تو آپ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرو (کہ ایک کو دو اور دوسروں کو محروم رکھو) ——— اور نعمان بن بشیرؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں یہی واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ میرے والد نے (میری والدہ کے اصرار پر) میرے لیے کچھ ہبہ کیا تو میری والدہ عمرہ بنت رواحہ نے کہا کہ میں جب خوش اور مطمئن ہوں گی جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ہبہ کا گواہ بنا دو گے۔ چنانچہ میرے والد نعمان حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری بیوی عمرہ بنت رواحہ سے میرا جو بچہ (نعمان) ہے میں نے اس کے لیے کچھ ہبہ کیا ہے تو اس کی ماں نے مجھ سے تاکید کی ہے کہ میں حضور کو اس کا گواہ بنا دوں (اور اس طرح حضور کی منظوری بھی حاصل کر کے ہبہ کو پکا کر دوں) آپ نے اُن سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے اور سب بچوں کے لیے بھی اتنا ہی ہبہ کیا ہے، انھوں نے عرض کیا کہ نہیں (اوروں کے لیے تو نہیں کیا) آپ نے ارشاد فرمایا فاتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم۔ یعنی خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو، حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ حضور کے اس فرمانے پر والد صاحب نے رجوع کر لیا اور ہبہ واپس لے لیا ——— اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نے یہ بھی فرمایا کہ میں بے انصافی کے معاملہ کا گواہ نہیں بن سکتا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے فقہاء کی ایک جماعت نے یہ سمجھا ہے کہ ماں باپ کے انتقال کے بعد میراث میں اگرچہ لڑکیوں کا حصہ لڑکوں سے نصف ہے، لیکن زندگی میں ان کا حصہ بھائیوں کے برابر ہے، لہذا ماں باپ کی طرف سے جو کچھ اور جتنا کچھ لڑکوں کو دیا جائے وہی اور اتنا ہی لڑکیوں کو دیا جائے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوُّوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا أَحَدًا

لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ ——— رواہ سعید بن منصور فی سننہ والطبرانی فی الکبیر

داد و دہش میں اپنی سب اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا معاملہ کرو۔ اگر میں اس معاملہ میں کسی کو ترجیح دیتا تو عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو ترجیح دیتا۔ (یعنی اگر مساوات اور برابری ضروری نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ دیا جائے۔) (سنن سعید ابن منصور، معجم کبیر للطبرانی)

تشریح) جیسا کہ ظاہر ہے اس حدیث میں اس بات سے ممانعت فرمائی گئی ہے اور اس کو جور یعنی بے انصافی قرار دیا گیا ہے کہ اولاد میں سے کسی کے ساتھ داد و دہش میں ترجیحی سلوک کیا جائے، بعض فقہاء نے اس کو حرام تک کہا ہے۔ لیکن اکثر فقہاء نے اور ائمہ اربعہ میں سے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے بعض دوسرے دلائل و قرائن کی بنا پر) اس کو حرام تو نہیں، لیکن مکروہ اور سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ حکم اسی صورت میں ہے جبکہ ترجیحی سلوک بلا کسی ایسی وجہ کے ہو جو شرعاً معتبر ہو، لیکن اگر کوئی ایسی وجہ موجود ہو تو پھر اس وجہ کے بقدر ترجیحی سلوک درست ہوگا۔ مثلاً اولاد میں سے کسی کی صحت مستقل طور پر خراب ہے اور وہ دوسرے بھائیوں کی طرح معاشی جد و جہد نہیں کر سکتا تو اس کے ساتھ خصوصی سلوک عدل و انصاف کے خلاف نہ ہوگا، بلکہ ایک درجہ میں ضروری اور باعثِ اجر ہوگا۔ اسی طرح اگر اولاد میں سے کسی نے اپنے کو دین و ملت کی خدمت میں اس طرح لگا دیا ہے کہ معاشی جد و جہد میں زیادہ حصہ نہیں لے سکتا تو اس کے ساتھ بھی مناسب حد تک خصوصی سلوک جائز بلکہ باعثِ اجر ہوگا، علیٰ ہذا اگر کسی ایک بھائی کے ساتھ خصوصی اور ترجیحی سلوک پر دوسرے بھائی رضامند ہوں تب بھی یہ جائز ہوگا۔

استدراک بسلسلہ درسِ قرآن

"وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"

درسِ قرآن کے سلسلہ کی جو قسط سورۂ مائدہ کے آخری رکوع سے متعلق الفرقان کے گزشتہ سے پیوستہ شمارہ (بابت جمادی الاخریٰ) میں شائع ہوئی تھی، اُس میں اسی رکوع کے لفظ "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" کی تقریب سے مسئلہ حیات و ممات مسیح کا بھی تذکرہ آگیا تھا اور اس کی تمہید میں سرسری طور پر یہودیوں کی اُن کوششوں کا بھی ذکر آگیا تھا جو حضرت مسیحؑ کو سزائے موت دلوانے اور سولی پر چڑھوانے کے لیے انھوں نے کی تھیں جن کا ذکر انجیلوں میں بھی کیا گیا ہے اور جن کے بارہ میں قرآنِ پاک کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کوششوں کو ناکام کردیا، اور مسیح علیہ السلام نہ قتل ہوئے، نہ صلیب پر چڑھائے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُٹھا لیے گئے ــــ اس کو ملاحظہ فرما کے جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (مدیر صدق) نے (جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس دور میں قرآنِ مجید کی بڑی خدمت لی ہے) ایک کرم نامہ کے ذریعہ توجہ دلائی کہ حضرت مسیحؑ کا یہ واقعہ زمانہ تاریخ کا ہے اور اُن کے اس مقدمہ پر جس کا ذکر انجیلوں میں کیا گیا ہے مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اُن سے بہت سی ایسی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں جن سے واقعہ کی نوعیت سمجھنے اور متعلقہ قرآنی آیات پر غور کرنے میں مدد ملتی ہے اور نئی راہیں کھلتی ہیں ــــ پھر مولانا نے میری گزارش پر کچھ تفصیلی اشارات بھی قلمبند فرما کر بھیج دیے ــــ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی تفسیر کی دوسری جلد میں (جو اس وقت لکھنؤ ہی میں چھپ رہی ہے) سورۂ نساء کی آیت "وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کے ذیل میں اس موضوع پر مفصل کلام کیا ہو۔ مولانا کے برادر زادہ جناب حکیم عبد القوی صاحب کی عنایت سے اسکے دیکھنے کا بھی مجھے موقع مل گیا — میں نے زیادہ مناسب اور مفید سمجھا کہ اسی کو بجنسہٖ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

لیکن اس سے پہلے حضرت مسیحؑ کے اس واقعہ سے متعلق کچھ تاریخی حقائق و واقعات کو مرتب طور پر پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ گویا بحث کے تمہیدی مقدمات ہیں جو مولانا ہی کے محولہ بالا مکتوب سے ماخوذ ہیں بلکہ زیادہ تر مولانا ہی کے الفاظ میں ہیں۔

(۱) حضرت مسیح فلسطین میں قوم اسرائیل میں پیدا ہوئے، یہ قوم محکوم اور رعایا تھی، حاکم اعلیٰ رومی شہنشاہ تھا، اسی کا گورنر صوبۂ فلسطین کا حاکم تھا، جس طرح انگریزی دور حکومت میں خود اپنے ملک میں ہندوستانی محکوم اور رعایا تھے اور حاکم انگلستانی تھے۔

(۲) حاکم اور محکوم قوموں میں منافرت ہر طرح کی تھی۔ دینی، نسلی، لسانی، ثقافتی معاشرتی وغیرہ۔ نہ یہ اُن کی بولی سمجھتے تھے نہ وہ اِن کی۔ وضع و لباس وغیرہ سب مختلف، وہی انگریزوں اور عام ہندوستانیوں کا سا حال تھا۔

(۳) رومیوں کو ہر اسرائیلی یکساں نظر آتا تھا اور اسی طرح اسرائیلیوں کو ہر رومی، جیسے گوروں کو ہر کالا اور کالوں کو ہر گورا، ایک ہی سا نظر آتا ہے۔

(۴) یہود کی اپنی مذہبی عدالتیں قائم تھیں، مجرم اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے لیکن فوجداری قانون تمامتر حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ پولیس، جیل، سولی گھر وغیرہ سب حکومت کے تھے۔ یہودی مذہبی عدالت کسی مجرم کے لیے اگر سزا کا فیصلہ کرتی تو اس کی توثیق اور عملدرآمد کے لیے ملکی حکومت کی عدالت میں اس کو پیش کیا جاتا اور سزا کا نفاذ وہیں سے ہوتا۔

(۵) رُومی حکومت میں، جس کے ماتحت شام و فلسطین تھے، سزائے موت سولی ہی کے ذریعہ دی جاتی تھی، جس طرح ہمارے ملک میں پھانسی کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

(۶) عدالت سے سولی گھر کا فاصلہ ڈھائی تین میل کا تھا، سولی کی شکل ریل کے سگنل سے مشابہ انگریزی حرف (T) کی ہوتی تھی۔ سولی کا لمبا والا ستون (۱) سولی گھر ہی میں گڑا رہتا تھا، لیکن عرض والی لکڑی (—) عدالت ہی میں رکھی رہتی تھی، اور دستور یہ تھا کہ

خونی مجرم (جس کے لیے سزائے موت کا حکم ہوتا) وہ سولی کی غرض والی لکڑی خود اپنے پر لاد کر عدالت سے سولی گھر تک لے جاتا تھا اور دیکھنے والوں کے لیے یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ اس آدمی کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا ہے اور یہ سولی دیے جانے کے لیے سولی گھر لے جایا جا رہا ہے۔

(۷) حضرت مسیحؑ جوان ہونے کے باوجود دبلے پتلے اور کمزور تھے۔

(۸) انجیلی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ اپنی شکل و ہیئت بدل لیتے تھے، اور آپ نے بار بار یہ کمال دکھایا، خواہ اس کو معجزہ و کرامت کہا جائے یا کمالِ فن۔

(۹) آپ کا مقدمہ ملکی عدالت میں جمعہ کے دن پیش ہوا (انگریزی میں گڈ فرائیڈے اسی کو کہتے ہیں) یہودیوں کا یوم السبت اسی شام سے شروع ہو جاتا تھا، اور اسی وقت سے سارے یہودی کاروبار بند ہو جاتے تھے۔

(۱۰) قتل کے لغوی معنی ہلاک کر دینے کے ہیں، خواہ کسی طریقہ سے ہو، ائمہ لغت اور اکابر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ اسی عام معنی میں استعمال ہوا ہے (قتل کو دھاردار آلہ کے استعمال سے مخصوص کرنا فقہی اصطلاح اور اردو کا محاورہ ہے)

اسی طرح صَلْب کے معنی صرف سولی پر چڑھا دینے کے ہیں، سولی کے ذریعہ ہلاک کر دینا اس کے اصل مفہوم میں داخل نہیں آئمہ لغت نے اس کی بھی تصریح کی ہے۔

اِن تمہیدی مقدمات کو ذہن میں رکھ کر اب تفسیر ماجدی کی وہ بحث پڑھیے جو مولانا دریابادی نے سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ (وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ۔ الآیہ) کے ذیل میں سپردِ قلم فرمائی ہے۔

اقتباس از تفسیر ماجدی (جدید) جلد دوم

"تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی۔ اور وہی ملکی عدالت نفاذِ سزا پر قادر تھی۔ لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کے لیے سزائے موت سنوانے میں ہاتھ تمام تر یہود ہی کا کام کر رہا تھا۔ اسی لیے

قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی دقیق حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، بالکل صحیح طور پر آپ کے قتل یا اقدامِ قتل کی ذمہ داری یہود ہی پر رکھی۔ انجیلیں لفظ بہ لفظ و متفق المعنیٰ (بلکہ ایک حد تک متفق اللفظ بھی) ہیں کہ رُومی عدالت کا حاکم پیلاطیس آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا۔ یہ یہودی تھے، جنھوں نے استغاثہ جھوٹا گڑھا اور گواہیاں جھوٹی فراہم کیں، اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر عدالت کو سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا۔ انجیل متیٰ کا ایک مختصر سا بیان ملاحظہ ہو:۔ (".....جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے، تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اُس نے برّابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے"

(۲۷: ۲۴: ۲۶)

اسی کی تائید دوسری انجیلیں بھی کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین تین بار کوشش کی، لیکن یہود نے ہر دفعہ ان کی بات کو رد کر دیا (۲۳: ۲۲) یہ بیانات تو مسیحیوں کے تھے۔ خود یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین تاریخ عہدِ مسیح و ماقبل و مابعد کی دُنیائے معلوم میں موجود ہے۔ یعنی یوزیفس کی اور جس کا ترجمہ انگریزی میں Antiquities of the Jews کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں اس واقعہ کو فخر کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے (اور اس سے قرآن مجید کے اس بیان کی پوری پوری توثیق ہوتی ہے "وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ۔ الآیہ"۔ الفرقان)

انجیلوں میں جو پیشین گوئیاں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اپنے ہلاک ہونے کی بابت منقول ہیں، اُن میں بھی ساری ذمہ داری سردارانِ یہود کے سر لگتی ہے اور رومیوں یا حاکموں کا ذکر نہیں آتا۔ ("اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں، سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے

بہت دُکھ اُٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں۔" متیٰ ۱۶ : ۲۱) "پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دُکھ اُٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہہ اسے رد کر دیں اور وہ قتل کیا جائے۔" (مرقس ۸ : ۳۱) "ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دُکھ اُٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہہ اسے رد کر دیں اور وہ قتل کر دیا جائے۔"

(لوقا ۹ : ۲۲)

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ

حالانکہ نہ وہ آپ کا کام تمام کر سکے اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا پائے۔

یعنی حضرت عیسیٰؑ کا کام تمام کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعۃً اتنا بھی نہ کر سکے کہ آپ کو سولی پر چڑھا ہی دیتے، رُومی حکومت میں جس کے ماتحت شام و فلسطین تھے، سزائے موت کا طریقہ سولی ہی کے ذریعہ تھا۔

وَمَا صَلَبُوْهُ ۔ صَلَبُوْا کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں۔ چڑھا کر جان لے لینے کے نہیں۔

هُوَ تَعْلِيْقُ الْاِنْسَانِ لِلْقَتْلِ (راغب)

اُردو میں یہ مفہوم تعلیق" سولی دینے" سے نہیں" سولی چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ اور شاہ عبد القادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے اُردو ترجمہ میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

بلکہ ان پر مُشتبہ ڈال دیا گیا۔

یا وہ دھوکے میں ڈال دیے گئے" یا" حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی"۔ یہ شبہ میں کون پڑ گئے یا حقیقت کن پر مشتبہ و ملتبس ہو گئی؟ ظاہر ہے کہ مراد وہی یہود یا اعدائے مسیح ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔

کانہ قیل وقع علیہم الشبہ (مدارک) التبس علیہم الامر (بیضاوی)

یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا، اور وہ دھوکے میں اس کی شخصیت

کے بارہ میں پڑ گئے۔

شُبِّہَ لھم المقتول والمصلوب۔ (جلالین)

بہرحال اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا اور وہ حضرت مسیح کے دھوکے میں کسی اور کو سولی پر چڑھا گئے۔ لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی، اس کا تصریحی جواب نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ اب سوا اسکے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کرکے لایا جائے اس وقت کے پس منظر کو سامنے لے آیا جائے اور جو صورت واقعہ نسبتہً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو اُسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔

پہلی بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے، چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ مل کر بھی اس ضرورت کے لیے کافی نہ ہوا بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق وغدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن امام رازی اس راز سے بھی واقف ہیں فرماتے ہیں۔ والناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم بانہ کان قلیل المخالطۃ للناس (کبیر)

متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے "ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے" سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لیے انھیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہونچے تو "یسوع نے ان سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں" (۱۸-۳-۸)

"حضرت مسیح" کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام اور غیر معروف

مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا، اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرتؑ کو، بہ الفاظ یہود یسوع ناصری کو تبدیل ہیئت پر خاص قدرت تھی۔ انجیلوں میں حضرتؑ کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔ "چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اُس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور اُن کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا۔" (متی ۱۷: ۱-۲) "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی، اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی۔" (لوقا ۹: ۲۹) نیز مرقس ۹ --- یہ معجزہ تھا یا نہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہرحال تبدیل ہیئت پر آپ کو نفس قدرت حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے، کہ ملک (شام و فلسطین) کی عام آبادی اس وقت اسرائیلیوں (یہود) ہی کی تھی۔ اور اسی برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے۔ لیکن ملک پر حکومت رُومیوں کی تھی، اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رُومیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے، بلکہ صورت، شکل، وضع و لباس، نسل و زبان، معیشت و معاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے، جیسے کل تک ہندوستان کے حاکم انگریز ہندوستانیوں سے نمایاں طور پر مختلف و ممتاز تھے --- اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں اور گوروں کو سب کالے یکساں معلوم ہوتے تھے، اسی طرح بدیسی حکمراں رُومیوں کی نظر میں سارے یہود یا اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلے کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رُومی عدالت تھی، وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلے پر تھا اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف (ٹی) T کے مشابہ یا اُس سے ملتی جلتی ہوتی تھی، وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی، صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا۔

باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی آڑی پڑتی تھی، اُس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امورِ ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے۔

(۱) حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شاموں شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا، اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم تہوار یعنی عید فسح بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

(۲) لاغر و ناتوان مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں، خصوصاً جبکہ یہودی بچے اور شریر قسم کے لوگ خود ہی قدم قدم پر انھیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔

اب اس ساری صورتِ حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیشِ نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ رومی سپاہی، جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے۔ ایسے موقعہ پر کیا کرتے؟ —— خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انھوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی ان حکمراں قوم کا فرد کرتا۔ انھوں نے مجمع ہی میں سے کسی بد تمیز یہودی کو پکڑ لیا۔ اور صلیب کی لکڑی اس پر لاد دی —— انگریز گارد ایسے موقعہ پر، یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؛ خصوصاً جب ہندوستانی تماشائیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ بھی اس مجرم کے ساتھ جاری رہتی۔ یہی کرتا کہ بھیڑ میں سے کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور چوبِ صلیب اُس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں، انجیلوں

میں اتنے جز کی تصریح موجود ہے۔

"انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔"
(متی ۲۷: ۳۲) "شمعون نامی ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انھوں نے اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔"
(مرقس ۱۵: ۲۱) "اور جب اس کو لیے جاتے تھے تو انھوں نے شمعون نامی ایک کرینی کو جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کے صلیب اسی پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے۔"
(لوقا ۲۳: ۲۶)

جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں تھا، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک پر پہونچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی، اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس شخصیت کا نام ہے، وہ اپنے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی —— ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجیے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کی نظر میں سب یہودی اجنبی ہی تھے۔ اور اس لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں۔ انھیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا۔ لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ اُدھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی۔ اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا، اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیحؑ قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہے۔

ہمارے اکابر نے اس شخص کا نام جس کو حضرت عیسیٰؑ کے دھوکے میں سولی پر

چڑھا دیا گیا۔ حضرت ابن عباس کے حوالہ سے یوں لکھا ہے۔ اور یہی عقیدہ بعض مسیحیوں کی جانب بھی منسوب کیا ہے (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص۹۳ مطبوعہ مصر)

ولکن شبہ لھم یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۲۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا، اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے لیکن پولوس (متوفی ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی اس کی تو بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پر ہے۔ یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر اور صلیب پر جانکنی کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس لیے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کو مانے اور فرض کیے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ اس لیے لامحالہ اسی پولسی اور کلیسائی مسیحیت نے کل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "بدعتی" اور "مبتدع" قرار دے کر کلیسا سے خارج کر دیا اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنان عیسیٰ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے یعنی یہی کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات پا گئے! گو ظاہر ہو کہ اس اشتراک عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود وفات عیسیٰؑ کو موقعہ تحقیر و اہانت میں بیان کرتے ہیں اور مسیحی بعینہ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہوا اور تاسف اور قلق کا مقام ہو کہ آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی گمرہی کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ وفات مسیحؑ کے اس خلاف تحقیق عقیدہ کو روشن خیالی کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں"۔

(نوٹ) تفسیر ماجدی کے منقولہ بالا اقتباس کا تعلق صرف "مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کی تفسیر و تشریح سے ہو۔ حضرت مسیحؑ کے رفع الی السماء کے مسئلہ پر کلام مولانا نے اسی آیت کے آخری لفظ "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" کے ذیل میں کیا ہو، اور مدلل طور سے "رفع الی السماء" اور "رفع جسمانی" ہی کے نقطۂ نظر کو راجح اور ظاہر قرآن کا مقتضیٰ قرار دیا ہے جو جمہور امت کا نقطۂ نظر ہے۔ (نعمانی)

ارشاداتِ حکیم الامت حضرت تھانویؒ

علماء و طلباء، اصحابِ درس و اصحابِ مدارس کیلئے لمحۂ فکریہ

(۳)

تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ دوسرے علماء کا خیال ہے کہ دیوبندیوں کو معقول نہیں آتی مگر دیکھا جاتا ہے کہ دوسروں کو فن نہیں آتا گو کتابیں آتی ہوں اور فن دیوبندیوں کا حصہ ہے۔ پانی پت میں ایک معقولی ملے تھے کہنے لگے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کو معقول سے مناسبت ہے (میں نے) کہا کہ الحمدللہ ہماری تمام جماعت کو معقول سے مناسبت ہے، میں کیا چیز ہوں۔ کہنے لگے کہ یہ آپ کہیں مگر میں نے تو آپ ہی کے متعلق سنا ہے ——

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جو بات ہمارے حضرات میں تھی وہ کسی میں بھی نہ دیکھی، اپنے کو مٹائے ہوئے، فنا کیے ہوئے تھے، اور جامع ہونے کی وجہ سے اس (شعر) کے مصداق تھے۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

حضرت مولانا مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ باوجود شغلِ علم اور ساری عمر پڑھنے پڑھانے کے گو علوم تو حاصل نہیں ہوئے مگر اپنے جہل کا

علم ضرور ہو گیا کہ ہم کو کچھ نہیں آتا ــــ

ایک صاحب نے ایک دوسرے نو عمر صاحب کے متعلق حضرت والا سے مشورہ لیا اور عرض کیا کہ پہلے یہ انگریزی پڑھتے تھے اب علم دین کی طرف ان کا رجحان ہے اور اسکولوں وغیرہ میں رہنے سے اندیشہ بھی ہے کہ کہیں ملحد اور دہری نہ ہو جائیں، فرمایا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ایسے نہیں کہ ان کے جذبات پر کوئی غلبہ کر سکے ــــ اگر اسکولی تعلیم ہی کی حالت میں دینی تعلیم کا کچھ شغل رکھیں تو کیا حرج ہے"؛ اس کے بعد دریافت فرمایا کہ انگریزی پڑھنے کا کیا اب بھی خیال ہے؟ ــــ (انھوں نے) عرض کیا کہ بالکل نہیں، دریافت فرمایا کہ تو پھر جو مصالح، انگریزی پڑھنے کے ساتھ خیال میں تھے مثلاً نوکری، عزت ــــ تعلیم دینی میں اُن کے عدم حصول پر کیا جواب دل میں پیدا ہوا؟ عرض کیا کہ انگریزی پڑھنے سے دُنیا میں تو عزت وغیرہ سب ہو جائے گی، مگر آخرت کا تو کوئی بھی کام نہ ہوگا ــــ فرمایا جزاکم اللہ تعالیٰ ــ اگر تمھارے دل میں یہ خیال راسخ ہے تو مبارک ہو ــ اور اللہ کے بھروسے پر علم دین کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہو جاؤ میں دل سے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو جلد سے جلد اپنے مقصد نیک میں کامیابی نصیب فرمائے ــــ جب وہ چلے گئے تو حاضرین سے فرمایا کہ (میں نے) یہ... گفتگو ان سے اس لیے کی کہ اگر خود ترغیب دی جاتی تو ان کے جواب سے اتنا مطمئن نہ ہوتا جتنا اب ہوا بلکہ اس وقت یہ نخرے کرتے تو بھی ہم کو برداشت کرنا پڑتے، اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ تم نے ہی تو (سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا اور تعلیم دین حاصل کرنے کو) کہا تھا ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں یہ بات اہل علم کے لیے بیان کرتا ہوں کہ مختلف شقوق کا حکم ایک دم سائل کو نہیں بتلانا چاہیے کہ اگر یوں ہے تو یہ حکم ہے اور یوں ہے تو یہ حکم ہے ــــ تشقیقات کے ساتھ جواب نہیں دینا چاہیے ــــ بعض اوقات سائل کو اس میں خلط ہو جاتا ہے، بلکہ اول واقعہ کی تحقیق کر لینا چاہیئے جب ایک شق کی تعیین ہو جائے اس کا حکم بتا دیا جائے ــــ پہلے مجھ کو شبہ تھا کہ علماء وعظ میں احکام کیوں نہیں بیان کرتے صرف ترغیب وترہیب پر اکتفا کرتے ہیں ــــ اور جو علماء محض واعظ ہیں صرف ان پر یہ شبہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں جو علماء ہیں اُن کے متعلق یہ شبہ تھا اور اپنے بزرگوں پر بھی

یہی شبہ تھا ـــــ لیکن خود تجربے سے معلوم ہوا کہ وعظ میں مسائل بیان کرنا ٹھیک نہیں۔ بالخصوص اس زمانے میں جبکہ بدفہمی کا بازار گرم ہے ـــــ ترغیب دینا ہی مناسب ہے، ترغیب ہی دینا چاہیئے ـــــ یہ تجربہ مجھ کو لکھنؤ کے ایک وعظ سے ہوا۔ میں نے چند مسئلے ربوٰا (سود) کے متعلق ایک دم سے بیان کر دیئے ـــــ سامعین میں بعض مسائل میں اختلاف ہوگیا، میرے پاس بکر تحقیق کے لیے آئے ـــــ معلوم ہوا کہ قلّتِ فہم یا سُوءِ حفظ (کی وجہ) سے کسی مقدمے کا مُقدّم دوسرے کی تالی سے جوڑ دیا اور بالعکس (بھی کیا) اس لیے گڑبڑ ہوگئی ـــــ

ایک طالب علم، نیک صالح، دیوبند سے ملنے آئے تھے، واپسی میں کرشتی ندی کو عبور کرنے میں غرق ہو گئے، اس غرقابی سے فوت ہو جانے پر فرمایا کہ بیچاروں کی لاش تک نہیں ملی۔ نہ معلوم کیا حشر ہوا؟ اور حشر کچھ ہی ہوا ہو مگر اجر تو کہیں گیا ہی نہیں، کیونکہ جس قدر بے کسی اور بے بسی ہوتی ہے درجات (اسی قدر) بلند ہوتے ہیں ـــــ فرمایا کہ ان طالب علم کے متعلق سُنا ہے کہ ان کی یہ حالت تھی کہ اللہ کا نام لے کر جو چاہو کام لے لو، ایک مولوی، مدرسہ کے بیان کرتے تھے کہ ان کے گھر سے خرچ آتا اور طلبہ اللہ کا واسطہ دے کر (ان کا) سب روپیہ مٹھائی کھلانے میں صرف کرا دیتے کبھی عذر نہ کرتے ـــــ اب بھی اللہ کے عاشق موجود ہیں کہ ان کو دیکھا تک نہیں اور پھر ایسا عشق! اور تعجب ہی کیا ہے؟ مقناطیس لوہے کو پہچانتا نہیں، مگر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ ذات ہی ایسی ہے کہ کسی میں ذرا قابلیت ہو تو وہ بالاضطرار ادھر کھنچتا ہے ـــــ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میں تمام مدارسِ دینیہ کو رائے دیتا ہوں کہ ہر مدرسے کی طرف سے کچھ مبلغ بھی ہونے چاہئیں، یہ سنتِ نبویہ ہے اور پڑھنا پڑھانا مقدمہ ہے اسی مقصد کا۔ اصل مقصود تبلیغ ہی ہے ـــــ اور ایک بات اور تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ مبلغین سے چندے کا تعلق نہ ہونا چاہیے، صرف احکام بیان کرنا، ترغیب (دینا) اور فضائل بیان کرنا ان کا کام ہو ـــــ اس سے لوگوں کو بہت نفع پہونچتا ہے، مگر اہلِ مدارس اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے ـــــ عرصہ ہوا..... میں نے مدرسۂ دیوبند والوں کو اس کا مشورہ دیا تھا کہ ملک کے تمام اطراف میں باقاعدہ مبلغین کی جماعت جاتی رہنا چاہیے ـــــ جن کا

کام صرف تبلیغ ہو اور ہر شہر میں اس کی آبادی کی نسبت سے مبلغ (کو مقیم رہنا) یا اس کی آمد و رفت رہنا چاہیے۔۔۔۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب ایک ہی کام میں لگ جائیں۔۔۔۔۔ اب حکومت ہی کی جماعتوں کو دیکھ لیا جائے پولیس اپنی خدمت پر ہے، فوج اپنی خدمت پر، دفتری لوگ اپنے کام پر، غرض ہر جماعت اپنے اپنے کام میں مشغول ہے۔ اگر سب سرحد ہی پر پہونچ جائیں تو اندرونِ ملک کا کیا انتظام ہو، اور اگر سرحد کے لوگ دفتروں میں آکر گھس جائیں تو بیرونِ ملک کا کیا انتظام ہو۔ سب گڈمڈ ہو جائے کوئی کام بھی نہ ہو سکے ــــ ایسے ہی ایک شخص مکان بنانا چاہتا ہے اور وہ یہ چاہے کہ سب کام کرنے والے ایک ہی کام پر لگ جائیں تو کیسے مکان تیار ہو سکتا ہے، مثلاً معمار ہے، مزدور ہے، لوہار ہے، بڑھئی ہے تو اگر سب کے سب لکڑی ہی چیرنے لگیں تو اور کام کون کرے گا ــــ علیٰ ہذا اسی طرح سب کو سمجھ لیا جائے ــــ دوسرے یہ کہ ایک کا کام دوسرا اطمینان کے ساتھ کر بھی نہیں سکتا ــــ معمار لوہار کا کام آسانی کے ساتھ کس طرح کر سکتا ہے۔ بڑھئی کا کام مزدور کیسے کر سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی کام پر اگر سب جمع ہو جائیں تب بھی کام نہیں ہو سکتا اور ایک کا کام دوسرا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ جو حجروں کے اندر ہیں اُن کو حجروں میں رہنے دو اُن سے دعا کا کام لو، جو مدارس میں ہیں اُن کو پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنے دو، تاکہ آئندہ کے لیے مسئلے مسائل بتلانے والی جماعت تیار ہو۔ جو استفتاء کا کام کر رہے ہیں اُن سے وہی کام لو، اور جو جماعت تبلیغ کرنے والی ہے اس کو تبلیغ کرنے دو۔ کام کو کام کے طریقے سے کرو، یہ گڈمڈ کیسی؟ اس طرح سے تو کوئی کام بھی نہ ہوگا۔

فرمایا کہ ایک مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ مجھ کو اول تو محدثین سے محبت ہے پھر فقہاء سے اور (پھر) صوفیاء سے۔ میں نے لکھا کہ میری محبت کی ترتیب اس کے برعکس ہے۔۔۔۔ باقی اپنی اپنی رائے ہے لیکن ہر حال میں ضرورت جامع کی ہے (یعنی ایسے شخص کی ضرورت ہو جو محدث بھی ہو، فقیہ بھی ہو صوفی بھی ہو) حضرت شاہ ولی اللہ (محدث دہلوی) رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس شخص کی صحبت اختیار کرو جو صوفی بھی ہو، فقیہ بھی ہو، محدث بھی ہو، وہ ہی

شخص صحبت کے قابل ہے۔ واقعی ٹھیک فرمایا۔ گو خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر محدّثیت کا رنگ غالب ہے مگر محقق ہونے کی شان سے یہ تحقیق فرمائی اور یہ ضروری بات ہے کہ اگر حدیث نہ جانتا ہوگا تو بدعت کی طرف مائل ہو جائے گا ـــــ

ـــــ فرمایا ـــــ الحمدللہ اس چودھویں صدی میں طریق کی حقیقت واضح ہوئی اور یہ سب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دُعا کی برکت ہے۔ یہ بزرگ اپنے زمانے کے اور اس فن کے مجدّد تھے، مجتہد تھے، محقق تھے، امام تھے ـــ دیکھنے میں تو بظاہر تھانہ بھون کے ایک (سادہ لباس) شیخ زادے معلوم ہوتے تھے، علم درسی بھی بظاہر نہ تھا۔ لیکن یہ حالت تھی۔

بینی اندر خود علومِ انبیا
بے کتاب و بے مُعید و اُوستا

اُن کے فیضِ رُوحانی و باطنی سے تمام عالم منور ہوگیا، ورنہ چار طرف سے زندقہ اور الحاد نیچریت اور دہریت نے گھیر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے پرفتن اور پرآشوب زمانے میں ایسے شخص کو پیدا فرما کر اپنی مخلوق پر بڑا ہی فضل فرمایا اور رحمت فرمائی۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے حضرتؒ ہی کی دُعاؤں کا ثمرہ ہے اور ان ہی کی دُعاؤں کی برکت ہے ـــــ ورنہ میرے اندر کوئی چیز بھی نہیں نہ علم ہے نہ فضل نہ کمال ـــ اس بیان کے وقت حضرت حکیم الامتہؒ کے اندر ایک جوش کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اہلِ مجلس پر بیحد اثر تھا اور قریب قریب سب پر گریہ طاری تھا ـــــ

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ـــــ علماء نے اپنے علم کی قدر چھوڑ دی اور اسی وجہ سے کتابیں سمجھ کر پڑھنا چھوڑ دیں ورنہ ان ہی کتابوں میں سب کچھ ہے۔ اگر ان کتابوں سے کام لیں تو آجکل کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ، ڈگری یافتہ، ولایت کے سند یافتہ ان کے سامنے گرد ہیں ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں اُمراء سے تعلق کو منع نہیں کرتا تملّق (چاپلوسی) کو منع کرتا ہوں۔ علماء کو خصوصیت کے ساتھ اس سے اجتناب کی ضرورت ہے اور یہ اس وجہ سے کہ دین اور اہلِ دین کی تحقیر نہ ہو ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولانا عبد الحیٔ صاحب لکھنوی (فرنگی محلی) نہایت ہی حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت، اور حُسنِ اخلاق کے جامع تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نواب زادے ہیں، ان کے خواص سے معلوم ہوا کہ شب کی عبادت میں روتے تھے۔ دن کو امیر رات کو فقیر۔ کثرتِ کار کی وجہ سے صرع کا مرض ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی عمر میں بڑا کام کیا، یہ سب تائیدِ غیبی ہوتی ہے ورنہ...... انسان کا وجود ہی کیا ہے۔

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا.... میری ایک بہت پرانی رائے ہے ۔ اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہو گئی اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا ـــــ وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارسِ اسلامیہ میں پڑھانے چاہئیں ـــــ ایک رائے یہ ہے کہ مدارسِ اسلامیہ کی طرف سے بالخصوص بڑے مدارس جیسے دیوبند، سہارنپور کی طرف سے ہر جگہ مبلغ رہیں، تمام ملک کے ہر حصہ میں مستقل طور پر ان کا قیام ہو۔ باضابطہ نظام ہو اور دیگر ممالک میں بھی مبلغ تیار کر کے بھیجے جائیں۔ یہ بھی پرانی (بہت پہلے سے) رائے ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ مدارسِ اسلامیہ کے ماتحت صنعت و حرفت کا شعبہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ فراغ کے بعد کسی کے محتاج نہ ہوں۔ یہ ضرب المثل ہے کہ یہ لکھ پڑھ کر اور کچھ نہیں کر سکتے سوائے چندہ مانگنے کے ـــــ اور بھی مفید رائیں ہیں، مگر جب کوئی ایک بات پر عمل کر لے تو اور بھی مشورہ دیا جائے ورنہ بیکار ہے ۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولویوں کے غریب ہونے سے بھی دل دکھتا ہے۔ مگر خیر اسی میں ہے کہ مولوی غریب ہی رہیں جو امیر مولوی ہیں ..... وہ دین کا ذرا سا بھی کام نہیں کرتے خالی پڑے رہتے ہیں کچھ بھی نہیں کرتے اس لیے ان کا غریب رہنا ہی مصلحت ہے۔

ایک خط بد خط لکھا ہوا آیا اس کے سلسلے میں فرمایا کہ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خط نہایت پاکیزہ تھا، میر پنجہ کش (دہلوی) کے (خوشخطی میں) شاگرد تھے ۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا تمام عالم بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس بڑے سے بڑے متبحر سے چاہو پوچھ کر دیکھ لو کہ تمہارے علوم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیسے ہیں؟ ہر شخص دل سے یہی کہے گا کہ ہیچ ہیں ـــــ یہاں سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر (مومن) شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کے مقابلے میں اپنے کو جاہل کہے گا ــــ اور دوسری قومیں (غیر مسلم)، تو اُمّی مسلمانوں کے سامنے بھی جاہل ہیں ــــ ایک واقعہ سنا ہے کہ پادری فنڈر اور مولانا نور الحسن صاحب کاندھلویؒ آگرہ میں اتفاقاً ایک اسکول میں جمع ہو گئے ــــ پادری فنڈر نے ایک طالب علم سے کہا کہ وہ کتاب لاؤ جو قرآن سے بھی زیادہ فصیح اور بلیغ ہے ــــ مولانا نے دریافت کیا کہ وہ کون سی کتاب ہے جو قرآن سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے؟۔ کہنے لگا کہ مقامات حریری ــــ یہ ہیں ان (پادریوں) کے علوم ــــ مولانا نے کہا اور میں کہتا ہوں کہ قرآن سے زیادہ فصیح اور بلیغ کوئی کتاب نہیں۔ اب رہا اس کا فیصلہ، اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ عربیت میں میں زیادہ ماہر ہوں یا آپ، اور اس مہارت کے معلوم کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک مضمون میں بھی عربی میں لکھوں اور آپ بھی۔ اور یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ کس کا کاتب مسلمان ہے اور کس کا عیسائی اور دونوں تحریریں بیروت اور اسکندریہ بھیجدی جائیں، اگر وہاں آپ کا مضمون فصیح مانا جائے تو جس کتاب کو آپ فصیح اور بلیغ کہہ دیں وہ تسلیم۔ اور اگر میرے مضمون کو زیادہ فصیح اور بلیغ مانا جائے تو پھر جس کتاب کو کہہ دوں آپ تسلیم کر لیں، پھر فرمایا کہ اس پادری کا علمی کمال تو اس سے ظاہر ہے کہ مقامات حریری کو قرآن سے زیادہ فصیح اور بلیغ بتایا ــــ ......

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ نجدیوں میں اگر کچھ کمی ہے تو اس کی ہے کہ محض نجدی ہیں وجدی[۱] نہیں ــــ ..... اہل نجد اگر مجھ سے مشورہ لیتے تو میں منکرات کے ازالہ کی پُرامن تدبیر اُن کو بتلاتا ــــ مُصلح کو کسی قدر حکیم ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ مُنکر کا ازالہ اگر کیا جائے تو اس کی بھی مختلف صورتیں ہیں.....

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ فنِ تربیت بھی نازک فن ہے، مشائخ نے عجیب عجیب طرح پر

---

[۱] نجدی و وجدی ہم قافیہ لفظ مثنوی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں ؎

باز گو از نجد و از یاران نجد　　تا در و دیوار را آری بوجد

اصلاح کی ہے ——— ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ حضرت کوئی کہتا ہے کہ آٹھ تراویح ہیں کوئی بارہ بتلاتا ہے کوئی بیس اس میں کیا ہونا چاہیئے؟ سائل عامی شخص تھا۔ فرمایا کہ میاں اگر کسی زمیندار سے مالگزاری کا مطالبہ کیا جائے اور اس کو تحصیل میں بلایا جائے، مگر مالگذاری کی مقدار اس کو معلوم نہ ہو، ایک شخص کہے کہ آٹھ روپئے مالگزاری کے لیے جائیں گے، دوسرا کہے بارہ لیے جائیں گے۔ تیسرا آکر کہے کہ بیس روپئے لیے جائیں گے ——— اب بتاؤ کہ اس کو کتنے روپئے لے کر تحصیل میں جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ بیس روپے لے کر جائے تاکہ جتنے روپے کی مانگ ہو دے کر چلا آئے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ اگر آٹھ لے گیا اور مانگ ہوئی بارہ کی، یا بارہ لے گیا اور مانگ ہوئی بیس کی تو پریشانی ہوگی ——— (بزرگ نے) فرمایا کہ بس تم بیس ہی پڑھو، جتنے کا مطالبہ ہو پیش کر دینا۔ بس وہ شخص سمجھ گیا۔ دیکھئے اس کے فہم کے مطابق کیسے سہل عنوان سے سمجھا دیا ——— ایک عالم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ فلاں حافظ صاحب نے یہ دریافت کیا ہو کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہوئی، کون حق پر تھا؟ عالم نے دریافت فرمایا کہ وہ حافظ صاحب کیا کام کرتے ہیں، عرض کیا کہ جوتے بیچتے ہیں، پوچھا تم کیا کام کرتے ہو، عرض کیا کپڑے رنگا کرتا ہوں۔ فرمایا کہ تم جا کر کپڑے رنگو اور حافظ صاحب سے کہو جوتے بیچیں۔ علی جانیں معاویہ جانیں (رضی اللہ عنہما) قیامت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقدمہ فیصلے کے لیے تمھارے پاس نہ آئے گا اور اگر آیا تو میں خدائے تعالیٰ سے عرض کر کے تمھارے اجلاس سے اٹھوا دوں گا ——— یہ ہے طریق اصلاح کا ——— لوگ عبث اور فضول میں مبتلا ہیں۔ عمریں گذر گئیں اور ختم ہو گئیں مقصود اور غیر مقصود ہی کا پتہ نہ چلا ———

فرمایا کہ ایک شخص نے (مجھے) لکھا کہ فلاں مسئلے میں کیا حکمت ہے؟ میں نے لکھا۔ حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے، تم تو خدائے تعالیٰ کے افعال کی حکمتیں ہم سے پوچھتے ہو، ہم خود تمھارے ہی فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں ———

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض لوگ صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ امر بالمعروف نہیں کرتے بیشک یہ (حضرات) قولاً تو (امر بالمعروف) زیادہ نہیں کرتے مگر عملاً (امر بالمعروف) کرتے ہیں ...... ان کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (زیادہ تر) عملاً ہوتا ہے قولاً کم ہوتا ہے۔ یہ لوگ حکیم

ہوتے ہیں، نبض کو پہچانتے ہیں۔ ہر شخص کی استعداد کے مناسب معاملہ کرتے ہیں ___ فرمایا کہ بڑی چیز عمل ہے اور علم اس کا مقدمہ ہے۔ تو علم پر ناز کچھ بھی نہ کرنا چاہیئے ..... حضرت جنید بغدادی کو کسی نے خواب میں دیکھا ___ دریافت کیا کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا کہ تمام معارف اور علوم اور تحقیقات کام نہ آئے صرف تہجد کی مختصر نفلیں کام آئیں ___ دیکھئے عمل ہی کام آیا، گو یہ علوم بھی غیر مفید نہیں ___ .... کام کی چیز اور مقصود کام میں لگا رہنا ہے، جو کرلے گا وہ کارآمد ہے اور باقی زبانی جمع خرچ ___ محض تحقیقات، بلا عمل کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص دار الضرب (ٹکسال) میں نوکر ہو اور تمام دن روپیہ اور نوٹ بناتا اور چھاپتا ہو، مگر شام کو تلاشی لے کر باہر نکال دیا جاتا ہے ___ جو تنخواہ ہے بس وہ کارآمد ہے اور سب بے کار ___ ایسے ہی یہاں سمجھ لو کہ (نری تحقیقات اور زبانی جمع خرچ میں) ملتا کیا ہے؟۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اللہ کا فضل ہے۔ اپنے بزرگوں کی دعا کی برکت سے مجھے دنیا پر دین کو ترجیح دینے کی توفیق نصیب فرما دی گئی ہے ___ میں دونوں نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں ترجیح دین کا بھی اور اس کا بھی کہ بقدر ضرورت بلکہ ضرورت سے زیادہ سامانِ زندگی نصیب فرمایا جو کہ بڑی نعمت اور رحمت ہے، اسی کو فرماتے ہیں ___ ؎

چوں ترا نانے و خرقانے بود ہر بنِ موئے تو سلطانے بود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (جس کا مفہوم یہ ہے) جس کسی کے پاس ایک دن کا گھر میں کھانے کو ہو اور وہ تندرست ہو اور کسی دشمن کا خوف نہ ہو تو گویا اس کو ساری دنیا مل گئی ___ اس حسی رزق کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ جس کو جس قدر حق تعالیٰ عطا فرمائیں اس کی قدر کرنا چاہیئے۔ ہرگز ہرگز کفرانِ نعمت نہ کرنا چاہیے۔ اس کے (حسی رزق کے) فقدان یا نقصان پر صبر کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ باقی خواص کا دوسرا معاملہ ہے ___

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے حضرات نک چڑھے نہ تھے، ہنستے بولتے رہتے تھے، مگر دل میں ایک آگ لگی ہوئی رہتی تھی۔ بس یہ حالت تھی۔ ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو
کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دلہا

(نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم)

میں نے اس کی ایک مثال تجویز کی ہے۔ جیسے تُوا ہنستا ہے ۔ مگر کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے....
پتہ چل جائے گا کہ (اس کے) جگر میں کیا بھرا ہے۔

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ اہل بدعت اکثر بدفہم ہوتے ہیں۔ بوجہ ظلمت بدعت کے علوم اور حقائق سے کورے ہوتے ہیں ویسے ہی لغویات ہانکتے رہتے ہیں جنکے سر نہ پیر۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ہماری جماعت سے جو بعض جماعتوں کو حسد ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے یہاں تو رات دن معتقد بنانے کی کوشش ہے اس لیے کہ جاہ پسند ہیں اور ہمارے حضرات ..... اس کی اُلٹی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی معتقد نہ رہے یا معتقد نہ ہو اور پھر بھی لوگ پٹتے ہیں، بس اس پر حسد ہے کہ کیا بات ہے کہ انھیں کے معتقد بڑھتے رہتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ سے تعلق بڑھاؤ اور ان خرافات کو چھوڑو۔ دیکھو پھر تمھارے بھی معتقد بڑھ جائیں گے ۔ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ علماء سلف پر خشیت غالب تھی ذرا بھی شبہ ہوتا تھا وہ فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ آج کل خشیت کی کمی ہے۔ کمی کیا قریب قریب مفقود ہے جیسا چاہو فتویٰ دلوالو۔ اِلاَّمَاشَاءَ اللہ ۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آجکل کا مناظرہ ہے ہی واہیات چیز اس میں احتیاط ہو ہی نہیں سکتی، گڑبڑ ہی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مجھ کو اس سے سخت نفرت ہے۔ وقت کا خراب ہونا، حق بات کو نہ ماننا ۔ غرض آجکل کے مناظرے کا حاصل یہ ہے کہ ہیٹی نہ ہو، سُبکی نہ ہو، اڑنگ بڑنگ، اُصول، بے اُصول ہانکے چلے جاؤ۔ زیادہ بولنا، چُپ نہ رہنا بس یہ کمال ہے (آجکل کے) مناظرے کا ۔

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آج کل لوگوں کا مذاق خراب اور برباد ہو گیا۔ کسی مفید کام کی طرف تو متوجہ ہیں نہیں ویسے ہی شب و روز شغل.... کرتے پھرتے ہیں نہایت بھدّی طبیعتیں ہیں ۔ میں نے ایک کتاب لکھی ہے حیوٰۃ المسلمین ۔ اس میں سب کچھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مضامین جمع کر دیے ہیں اگر اس پر کاربند ہوں اور ان مضامین کی اشاعت کریں اور ان پر عمل کریں تو چند روز میں ان شاء اللہ تعالیٰ، کایا پلٹ ہو جائے، اس میں جو مضامین ہیں میں نے بہت سوچ سمجھ کر لکھے ہیں اور عام فہم کرنے کے لیے سہل

بھی کر دیے ہیں ۔ ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی دُنیا اور دین دونوں کی فلاح و بہبود ہے۔
...... اگر واعظین صرف ان ہی مضامین کو جو حیوٰۃ المسلمین میں جمع کر دیے ہیں .... سُنا دیا کریں تو بہت ہی مُناسب اور مفید ہو اور ان پر سوچنے کا بھی بار نہ پڑے ۔ یہ لکھے لکھائے مضامین ہیں اور ان میں سب ضروریات، دُنیا اور دین کی موجود ہیں، مگر مسلمانوں میں حس نہیں ۔۔۔ بے ہوش ہو رہے ہیں ۔۔۔ میں نے بہت چاہا کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز ہو جس میں یہ اپنی ضروریات کا مشورہ کر لیا کریں مگر نہ ہو سکا ، یہی افسوس ہے، یہ سب اس کا اثر ہے کہ خلوص نہیں اور خلوص نہ ہونے کی وجہ دین (کے معاملے میں) کمزوری (اور کوتاہی) ہے ۔۔۔ ہر شخص اپنے اغراض میں مبتلا ہے ۔۔۔ اور یہ کمزوری مسلمانوں کی بڑی زبردست ہے کہ ان کی قوتِ اجتماع کا کوئی مرکز نہیں ۔۔۔ اور عادۃُ اللہ جاری ہے کہ مل کر کام ہوتا ہے ۔ دیکھئے "هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ"[۱] ۔۔۔ میں ۔۔۔ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ بھی بڑھایا گیا ۔ ورنہ مومنین کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی ؟ اس میں حق تعالےٰ نے یہ بتلا دیا کہ اتنی بڑی ہستی (رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم) کی نصرت میں بھی سُنّۃ اللہ یہی ہے کہ مل کر کام کیا جائے ۔۔۔
ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ پہلے ایسی شرارتیں کہاں تھیں ۔ (بعض) بدعتی بھی اللہ اللہ کرنے والے ، ذاکر ، شاغل ، نیک نیت ہوتے تھے ۔ اللہ کے نام لینے کی برکت سے (ان کے) قلب میں رقّت ، انکسار ، عاجزی ، فنا ، تواضع ہوتی تھی ۔ علماءِ اہلِ حق سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے ۔ ان کے قلوب میں علماء کی وقعت ، عظمت ، ادب و احترام ہوتا تھا ۔ کبھی ان کے سامنے قیل و قال نہ کرتے تھے ، اور اب تو نہ ذکر ہے نہ شغل ، نہ تواضع نہ ادب ، غرض تدیّن نہیں ..... کبائر تک میں ابتلا ہے اور پھر صوفی و درویش بنے ہوئے ہیں ۔۔۔ جو اہلِ ادب ہوتے تھے اہلِ حق بھی حدود کے اندر ان کی رعایت کرتے تھے ۔۔۔ تھانہ بھون کی جامع مسجد میں میرا بیان ہوا کرتا تھا ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس مجمع میں ایک ڈھولک باز بدعتی آیا کرتا ہے ذرا اس کی خبر لیجئے ۔ میں نے کہا میں خبر لیا نہیں کرتا خبر دیا کرتا ہوں اور میں نے

---

[۱] اُس اللہ ہی نے اپنی مدد سے اور مسلمانوں کی رفاقت سے تمھیں قوت بخشی ۱۲۔

کبھی اُس کے اس مسلک سے تعرض نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بخود اس کی اصلاح ہو گئی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ تبلیغ کا کام بھی ایک حکیمانہ کام ہے..... اس میں بڑے فہم اور بڑی عقل کی ضرورت ہے کہ کس محل میں اور کس عنوان سے کہنا چاہیے ۔۔۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ دُعا بڑی چیز ہے تمام عبادات کا مغز ہے اور سب سے زیادہ آج کل اسی سے غفلت ہے، اور دُعا ایسی چیز ہے کہ دُنیا کے کاموں کے واسطے بھی دُعا مانگنا عبادت ہے بشرطیکہ وہ کام شرعاً جائز ہوں۔ یہ غلطی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین ہی کے کاموں کے واسطے اور آخرت ہی کی فلاح اور بہبود کے لیے دُعا عبادت ہے۔ بعض لوگ بجائے درخواست دُعا کے لکھتے ہیں کہ فلاں کام کے لیے کوئی مجرّب عمل اور کوئی مجرّب وظیفہ بتلا دیجئے، میں لکھ دیتا ہوں کہ اس قید کے ساتھ مجھ کو عمل معلوم نہیں اور دُعا سے بڑھ کر کوئی وظیفہ اور عمل نہیں ۔۔۔ فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک اُستاذ الاستاذ بزرگ کا قول نقل فرمایا کرتے تھے ۔۔ کہ اگر کسی کو دین کا بنانا ہو تو درویش کے سپرد کر دو اور دُنیا کا بنانا ہو تو طبیب کے سپرد کر دو۔ اور اگر دونوں سے کھونا ہو تو شاعر کے سپرد کر دو۔۔۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں ایک فقہی مسئلے پر ایک مولوی صاحب کو آگاہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ میں سب سے زیادہ مشکل چیز فقہ کو سمجھتا ہوں اور لوگوں کو اکثر اسی پر دلیر پاتا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ فقہاء نے تو کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ فقہاء ہی کی اسقدر نظر ہے۔ احکام پر بھی، عللِ احکام پر بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ان حضرات کو الہام ہوتا تھا جس سے ایسی دین کی خدمت کی ہے ۔۔۔ حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں ۔۔۔

فرمایا کہ ناصحین حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ دُنیا کی طرف التفات مت کرو اور میں کہتا ہوں کہ خوب التفات کرو، کیونکہ جب دُنیا کی حقیقت کو خوب سوچو گے اور اس کے ساتھ آخرت کو بھی، تو موازنے کے بعد دین ہی کو دُنیا پر ترجیح دو گے، بلکہ میں اس میں اور ترقی کرتا ہوں کہ موازنے کے لیے بھی نہ سوچو بلکہ محض اس کی حقیقت ہی سے واقف ہونے کے لیے اس میں غور اور فکر کرو اور خوب توجہ کرو تاکہ اس مُردار کی حقیقت واضح ہو جائے اور

پھر کامل درجے کی اس سے نفرت ہو ۔

فرمایا کہ آجکل یہ بھی ایک مرض عام ہوگیا ہے کہ اگر کسی گروہ، کسی طبقے کی اصلاح کرو یا اصلاح کا طریقہ بتاؤ تو اس (طریقے) پر تو نظر کرتے نہیں بس ایک بات لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فلاں مفید بات سے منع کرتے ہیں ۔۔۔ اسی طرح یہ اہل بدعت ہیں انھوں نے ہزاروں لاکھوں بدعتیں ایجاد کر رکھی ہیں ۔ کوئی اصلاح کرے تو اس کو بدنام کرتے ہیں مثلاً اگر ان کو ایصال ثواب کا صحیح طریقہ بتاؤ تو کہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں ۔ اسی طرح اگر ..... کہا جائے کہ پہلے علم دین پڑھ کر بعد میں انگریزی پڑھو تو کہتے ہیں کہ انگریزی کو منع کرتے ہیں ۔۔۔ اسی طرح اہل مدارس کی حالت ہے اگر ان کو شرعی اصول کے ماتحت تحصیلِ چندہ کا طریقہ بتاؤ تو کہتے ہیں کہ تحصیلِ چندہ کو منع کرتے ہیں ۔ غرضکہ ہر طبقہ اس مرض میں مبتلا ہے ۔۔۔

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ برا بھلا اور ناگوار بات کہنے والوں نے کس کو چھوڑ دیا ؟ ۔۔۔ اللہ کو چھوڑ دیا، اللہ کے رسولؐ کو چھوڑ دیا، صحابہ کرامؓ کو چھوڑ دیا ؟ ائمہ مجتہدین کو چھوڑ دیا ؟ بعد کے علماء اور بزرگانِ دین تو کس شمار میں ہیں ۔ مگر کسی کے برا بھلا کہنے سے برا کیوں مانے ۔۔۔ اس سے بگڑتا کیا ہے ؟ معاملہ تو اللہ کے ساتھ ہے ۔۔۔ مخلوق سے لینا ہی کیا ہے ۔ اگر کسی کو اس کی فکر ہے تو یہ اچھی خاصی مخلوق پرستی ہے ۔ پھر خدا پرستی کہاں ؟ اور یہ فکر خود ایک مستقل اور بہت بڑا عذاب ہے کہ فلاں برا نہ کہے ۔ فلاں بھلا نہ کہے کون بیٹھا ہوا ان خرافات کا مراقبہ کیا کرے ۔ ایسے موقع کے متعلق ذوقؔ نے خوب کہا ہے ؂

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ
ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے

ایک موقع پر فرمایا ۔۔۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عجیب جامع تھے ۔ عاشق بھی بے بدل اور عارف بھی بے بدل ۔۔۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں ایک خاص کیف ہوتا ہے ۔۔۔ فرمایا کہ مقبول کی یہی شان ہوتی ہے ۔۔۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ اصلاح کا باب بڑا ہی نازک ہے بدون مہارت فن کے مشکل ہے کہ کسی کی اصلاح کر سکے ــــ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض لوگوں کو آجکل یہ مرض ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے ادھر اُدھر کی ہانکا کرتے ہیں یا دل ہی دل میں فضول منصوبے گانٹھا کرتے ہیں، حتیٰ کہ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر بھی ان وساوس میں آلودہ رہتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ معلوم نہیں عند اللہ حضرت حاجی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ زیادہ ہے یا حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ــــ حضرتؒ اس خطرے اور وسوسے پر (منجانب اللہ) مطلع اور آگاہ ہو گئے فرمایا میاں تم کو اس سے کیا بحث؟ بادل کا ہر ٹکڑا سیراب کرنے کے لیے کافی ہے ــ پھر تم کو اس کی کیا فکر کہ ان میں کون سا ٹکڑا بڑا ہے کون سا چھوٹا ــــ

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آیتوں کی باہم ترتیب بذریعہ وحی کے ہے اس میں کسی اجتہاد کا دخل نہیں۔ اس وجہ سے اس کا بھی قائل ہونا پڑے گا کہ آیات میں مناسبت ضرور ہے ورنہ ترتیب نزول کو نہ بدلا جاتا ــــ اب رہا یہ کہ وہ مناسبت کیا ہے سو اس کا بتلانا ہمارے ذمے نہیں ــ مگر اجمالاً یہ ضرور کہا جائے گا کہ قرآن شریف کی آیتوں میں تناسب اور تناسق ضرور ہے۔ اب یہ شبہ کہ وہ ربط سمجھ میں نہیں آتا تو سمجھ میں نہ آنا تو مستلزم اس بات کو نہیں کہ اس میں ربط نہ ہو ــ دوسری بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ جس ربط کو آجکل ربط سمجھا جاتا ہے کہ مسلسل متعارف تصنیفات کا سا رنگ ہو یہ قرآن میں نہیں، اس لیے کہ کریم اور رحیم خداوند جل جلالہ کا کلام ہے جو شفقت سے پُر ہے اور شفقت والے مخاطبات میں تصنیفات کا سا ربط نہیں ہوتا ــ مثلاً باپ نے ایک بیٹے کو ایک مجلس میں کئی نصیحتیں کیں تو اُن میں ایک گونہ مناسبت ہے مگر تصنیفات کا سا رنگ نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ خود حالات جو منشاء ان مخاطبات کے ہیں ــــ اُن میں بھی تو ویسا جوڑ نہیں ہوتا تو پھر باپ کی نصیحت میں متعارف ربط کیسے ہو؟ جب حالات میں خاص ارتباط نہ ہو تو نصائح میں کیسے ہوگا؟ بلکہ ارتباط کا نہ ہونا ہی خوبی ہے اور دلیل شفقت ہے ــــ اس لیے کہ مثلاً باپ نے پانچ نصیحتیں کیں اور اتفاق سے چار میں تو ربط تھا اور پانچویں میں نہ تھا تو جو شخص 'ارتباطِ متعارف' کا اہتمام کرے گا وہ اس وقت

پانچویں نصیحت کو ضرور موقوف رکھے گا (اور روک لے گا) جو کہ شفقت اور محبت کے منافی ہے اس لیے ایسا اہتمام (ارتباط کا) نقص ہے اور منافی محبت ہے۔ اگر کوئی باپ سے پوچھے کہ تمہاری اس پانچویں نصیحت میں ربط کیا تھا؟ وہ کہے گا ربط کیا ہوتا جو ضرورت دیکھی ظاہر کر دیا — غرض قرآن مجید میں تصنیفات کا سا رنگ نہیں اور یہی بڑی شفقت ہے حق تعالیٰ کی — اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مکررات ہیں — یہ تکرار بھی اسی انتہائی شفقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا — (ہم نے مختلف انداز میں بار بار قرآن میں بیان کیا تاکہ وہ سوچیں) اور کہیں کہیں مکررات کا جو عنوان مختلف ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے، کیونکہ مخاطب کے حالات بعض اوقات مختلف بھی ہوتے ہیں، مثلاً باپ نے دیکھا بیٹے کو کہ بری صحبت میں بیٹھتا ہے تو ایک وقت کچھ نصیحت کرتا ہے اور کسی طرز سے اور ایک وقت کچھ نصیحت کرتا ہے اور کسی ڈھنگ سے۔

ایک اور نظیر لیجیے کہ منادی کرنے والا جو منادی کرتا ہے سو جو ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں ان کو ظاہر کرتا ہے (بظاہر) ان میں کوئی خاص جوڑ نہیں ہوتا، اور یہ خاص جوڑ نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس اعلان میں یہ کسی بڑے آزاد، مختار کامل حاکم کا مامور ہے۔ اس حاکم نے اس منادی کرنے والے کو جو اعلان بتلا دیا ہے یہ منادی کرنے والا اسی طرح اعلان کر رہا ہے اگر وہ خود اپنی رائے سے اعلان کرتا تو اتنا مقید نہ ہوتا کہ اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا، خواہ اس میں (متعارف) ربط ہو یا نہ ہو بعینہٖ اعلان کر رہا ہے —

ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں متعارف مناظرے کا رنگ بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے حاکم کا کلام ہے کیونکہ حاکم کو ایسے مناظرے کی ضرورت نہیں — دیکھیے شیطان نے شرارت و نافرمانی کی دلیل کے ساتھ — (چنانچہ اس نے کہا) خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (اے اللہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا) اس کا جواب حق تعالیٰ حکیمانہ بھی دے سکتے تھے کہ ان مقدمات کا ابطال فرماتے مگر ایسا نہیں کیا کیونکہ اس میں مناظرے کا رنگ تھا — بلکہ حاکمانہ جواب دیا — اُخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ — تو یہاں سے نکل جا اس لیے کہ تو راندۂ درگاہ ہے — خلاصہ یہ ہے کہ

قرآن مجید جو ہے یہ ایک شفیق اور بڑے حاکم کا کلام ہے۔ کسی مصنف اور ناقص القدرۃ کا کلام
نہیں ۔۔۔ یہ لاکھوں روپئے کا نسخہ میں نے تبلا دیا ہے ۔۔۔ ایک اور بات بھی یاد آئی جس سے
یہ قرآن مجید (یقینی طور پر) خدا کا ہی کلام معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ہم کسی پر غصہ کر رہے ہوں
اور اس حالت میں کوئی عزیز و قریب آجائے تو اس وقت اُس سے بھی یک گونہ برہمی کے ساتھ
ہمارا کلام ہوگا ۔۔ اور حق تعالیٰ یہاں کفار کا ذکر قرآن میں فرماتے ہیں اُس کے متصل ہی مومنین
ومطیعین کا ذکر ہوتا ہے جس میں وہ پہلا رنگ ذرا نہیں آتا ۔۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کو قدرت ہے۔
یہ اُن ہی کا کام ہے کیونکہ وہ انفعال سے منزہ ہیں) ۔۔۔ اس تقریر کے اکثر اجزاء ذوقی و نظری
ہیں اس لیے طالبین حق اس کے مخاطب ہیں معاندین نہیں ۔۔۔

اسلامی ریاست میں

عورتوں کے حقوق و فرائض

—————— مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عاید ہوتے ہیں، اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں بہ حیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن دونوں کے حقوق و فرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے۔ یہ اختلاف جن حقیقتوں پر مبنی ہے ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

مغربی نظریہ مساوات اور اسلام

اسلام مساوات مرد و زن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام جس مفہوم میں عورت و مرد کی مساوات کا داعی ہے وہ یہ ہے کہ جس نفس واحدہ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کیا ہے اسی نفس واحدہ سے عورت کو بھی پیدا کیا ہے۔ جس طرح مرد اس نظام کائنات کا ایک ضروری عنصر ہے اور قدرت نے ایک خاص مقصد سے اس کو تخلیق کیا ہے اسی طرح عورت بھی اس کائنات کی مشین کا ایک ضروری پرزہ ہے اور قدرت نے اس کی تخلیق سے بھی ایک ضروری غرض وابستہ کی ہے۔ جس طرح مرد قدر و احترام کا مستحق ہے اسی طرح عورت بھی قدر و احترام کی حقدار ہے۔ جس طرح مرد کچھ خاص قابلیتیں اور قوتیں لے کر آیا ہے اسی طرح عورت بھی کچھ مخصوص قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوئی ہے۔ جس طرح مرد اپنے کچھ خاص جذبات

و عواطف اور کچھ فطری مقتضیات و مطالبات رکھتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے کچھ خاص رجحانات و میلانات اور کچھ فطری مطالبات اور مقتضیات رکھتی ہے۔ اس لیے عورت اور مرد کو اپنے اپنے فطری رجحانات و میلانات کے مطابق سورج اور چاند کی طرح اپنے اپنے دائرہ عمل میں قدرت کے منشا کی تکمیل میں سرگرم رہنا چاہیے۔ معاشرے کے اندر دونوں پر ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں ہونی چاہئیں اور ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کو حقوق ملنے چاہئیں۔

معاشرے میں عورت و مرد کی مساوات کا اعلان قرآن مجید ان واضح الفاظ میں کرتا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء)	اے لوگو! اپنے اس خدا سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور پیدا کی اسی سے اس کی بیوی اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سارے مرد اور بہت ساری عورتیں۔

اس آیت نے عورت کی کمتری اور حقارت سے متعلق ان تمام تصورات کا خاتمہ کر دیا جو قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں پائے جاتے تھے۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ جس نفس واحدہ سے مرد وجود میں آیا ہے، اسی سے عورت بھی وجود میں آئی ہے اور جس طرح انسانی معاشرہ کا ایک اہم رکن مرد ہے۔ اسی طرح معاشرے کی دوسری اہم رکن عورت ہے۔ معاشرے کا وجود، اس کا بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ جہاں تک عورت و مرد کی خصوصیات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ صلاحیتیں لے کر آئے ہیں۔ لیکن اس فرق کی وجہ سے ان میں سے کسی کے لیے بھی نہ اپنی ان خصوصیات پر مغرور ہونا یا ان کے سبب سے اپنے کو حقیر سمجھنا زیبا ہے اور نہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنا جائز ہے فرمایا:-

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ	اور اللہ نے عورت و مرد میں سے ایک کو دوسرے

عَلٰی بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ؕ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۔ (۳۲ ۔ نساء)

پر جو فضیلت دی ہے اس کے لیے اور ان نہ کرو۔ مرد حصہ پائیں گے اس میں جو وہ کمائی کریں گے۔ اور عورتیں حصہ پائیں گی اس میں سے جو وہ کمائی کریں گی۔ اللہ سے اس کی بخشش میں حصہ مانگو۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات صاف ہوگئی کہ قدرت کی طرف سے جو خصوصیات عورت و مرد کو عطا ہوئی ہیں ان میں فضیلت کا پہلو کسی ایک ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس فضیلت میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ عورت و مرد دونوں کی سعادت و کامیابی اس بات میں ہے کہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنے کے بجائے ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی نعمتوں کے لیے شکر گزار رہے۔ اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے۔

اس حقیقت کی ایک بہت بڑی شہادت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ایک واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ اسماء بنت یزید انصاریہ ایک مشہور دین دار اور عقل مند صحابیہ اور مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ مجھے عورتوں کی ایک جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے جو سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں عرض کرنے آئی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہوں جو میں گزارش کر رہی ہوں۔ عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ چناں چہ ہم آپ پر ایمان لائیں اور ہم نے آپ کی پیروی کی۔ لیکن ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والی اور گھروں کے اندر بیٹھنے والی ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش نفس پوری کرلیں۔ اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے گھر بار کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں تو کیا اجر میں بھی ان کے ساتھ ہم کو حصہ ملے گا؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے ان سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے جس نے

اپنے دین کی بابت سوال کیا ہے؟ تمام صحابہؓ نے قسم کھا کے اقرار کیا کہ نہیں یا رسول اللہ۔ اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے اسماء میری مدد کرو اور جن عورتوں نے تم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے۔ ان کو میرا یہ جواب پہونچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا، مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہو جو تم نے بیان کیے ہیں۔ حضرت اسماء رسول اللہ صلعم کی یہ بات سُن کر خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی واپس چلی گئیں[1]

معاشرتی نظام میں مرد کو عورت پر ترجیح حاصل ہے

جہاں تک معاشرتی واجتماعی دائرہ میں مرد وزن کی کامل مساوات کا تعلق ہے، قرآن اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ عورت بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حقوق رکھتی ہے اور اس کے حقوق بھی اسی طرح قطعی اور واجب الادا ہیں۔ جس طرح مرد کے حقوق قطعی اور واجب الادا ہیں لیکن معاشرتی نظام میں وہ مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے اور اس ترجیح کو نظام معاشرت میں توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کیوں کہ خاندان کی کفالت کا اصل بوجھ مرد اٹھاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ذمہ داری کی زیادتی کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہو۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ ۲۲۸)

اور عورتوں پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق ان کے حقوق بھی ہیں البتہ مردوں کے لیے ان کے اوپر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔

اس ترجیح کی نوعیت اور اس کے وجوہ کو دوسرے مقام میں یوں واضح کیا ہے کہ چوں کہ خاندان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی قابلیت اللہ تعالےٰ نے مرد ہی میں رکھی ہے اور اس بنا پر بیوی بچوں کے نفقہ کا قانونی ذمہ دار مرد ہی ہے۔ عورت نہیں ہے۔ اس لیے مرد ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو عورت کا قوام اور سردار بنایا جائے۔ فرمایا

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر ج ۲ ص ۷۱۲

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔

(۳۴- نساء)

اور مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بعض اعتبارات سے ترجیح دی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے۔ پس نیک بیبیوں کو سزاوار ہے کہ فرمانبرداری کرنے والی اور رازوں کی حفاظت کرنے والی بنیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے اس چیز کی حفاظت کی ہے۔

اجتماعی ذمہ داریاں اور عورت

عام معاشرتی فرائض میں بھی اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا ہے اور عورت کو ذمہ داریوں سے الگ رکھا ہے۔ اگر ناگزیر حالات میں کوئی بوجھ اس پر ڈالا بھی ہے تو اس کے فطری ضعف کا اعتبار کر کے اس کسر کا جبر بھی مہیا کیا ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

(۲۸۲- بقرہ)

اور گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو، اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، جن کو تم گواہوں میں پسند کرو، تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا سکے۔

اسلام معاشرت و تمدن کی اجتماعی سرگرمیوں کے جھمیلوں سے عورت کو الگ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان کی شرکت خود ان کاموں کے لیے بھی ضرر رساں ہے اور ان اہم مقاصد کے لیے بھی نقصان دہ ہے جو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ صرف عورتوں ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسلامی شریعت کی رو سے عورت نماز میں مردوں کی امام نہیں ہو سکتی اور اگر کسی مرد کی اقتدا میں وہ نماز ادا کرے تو اس کے لیے بھی بعض شرطیں ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے۔ اس حکم کی وجہ عورت کی کمتری یا مرد کی فضیلت نہیں ہے، بلکہ یہ سرتاسر اسلام کے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے۔ عورت کی فطری و جنسی خصوصیات اور مرد کے جنسی میلانات کی وجہ سے عورت کی امامت میں یہ

کھلا ہوا اندیشہ ہے کہ نماز کا وہ اخلاقی و رُوحانی مقصد ہی فوت ہو جائے جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اسلامی قوانین کی رو سے عورت مجسٹریٹ اور جج وغیرہ بھی نہیں بن سکتی[۱]۔ بعض فقہاء نے اگر اس کی اجازت دی بھی ہے تو بہت سے مستثنیات اور شرائط کے ساتھ۔ اس کی بنیاد بھی عورت کی حقارت پر نہیں ہے، بلکہ اُن مناصب کی ذمہ داریوں اور فرائض کے لحاظ پر ہے جو فطرت نے خاص طور پر عورتوں سے وابستہ کیے ہیں۔ عورت کی امارت کے متعلق خود حدیث میں یہ تصریح ہے:

عن ابی بکرۃ قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔	ابوبکرہ سے روایت ہے انھوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنایا تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنی زمامِ کار ایک عورت کے حوالے کر دی۔
(رواہ احمد البخاری والنسائی والترمذی وصححہ)	

یہی روایت بخاری میں ایک اور پہلو کی وضاحت کے ساتھ آئی ہے:-

عن ابی بکرۃ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امرءۃ۔	ابوبکرہ سے روایت ہے کہ ایک بات جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی اس نے مجھے جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا جبکہ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل کے ساتھ شریک جنگ ہو جاؤں۔ وہ بات یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنے تخت پر بٹھایا تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فائز المرام نہیں ہو سکتی جو اپنی حکومت ایک عورت کے سپرد کر دے[۲]۔
(بخاری۔ کتاب النبی الی کسریٰ)	

---

[۱] نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۷۴ [۲] جنگ جمل میں فوج کی اصل قیادت درحقیقت حضرت عائشہ کر رہی تھیں۔ ابوبکرہ کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے۔

فوج میں عورتوں کی شرکت کی نوعیت

فوج میں عورتوں کی شرکت کی بعض مثالیں اگرچہ احادیث و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ کبھی کبھی بعض عورتیں اپنے شوہروں یا دوسرے عزیزوں کی معیت میں اسلامی فوج کے ساتھ نکلی ہیں۔ لیکن اس نکلنے کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ مدافعت یا جہاد میں حصہ لینا عورتوں پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح مردوں پر فرض ہے۔ اسلام میں فریضۂ جہاد اصلاً و اولاً مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو براہ راست جہاد میں حصہ لینے کی نہ کبھی دعوت دی نہ کبھی ان کی شرکت پر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ عرب کے دستور کے مطابق اگر کچھ خواتین اپنے شوہروں اور عزیزوں کے ہمراہ کبھی نکل پڑیں تو ان کو مریضوں کی تیمارداری، زخمیوں کی مرہم پٹی، کھانا پکانے اور اس قسم کی خدمات میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا اور مالِ غنیمت میں بھی بطور حصہ کے نہیں بلکہ بطور عطیہ کے ان کو کچھ دے دیا گیا۔ لیکن نہ تو عورتیں اپنے عزیزوں کے بغیر کبھی ان غزوات میں نکلیں نہ ان کو کبھی جنگ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی، نہ براہِ راست جنگ میں حصہ لینے کا ان کو موقع دیا گیا، نہ مالِ غنیمت میں ان کو بحیثیت حصہ دار کے شریک کیا گیا اور نہ جنگوں میں ان کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چند صحیح احادیث ملاحظہ ہوں:-

عن عائشۃ انھا قالت یارسول اللّٰہ نری الجھاد افضل العمل افلا نجاھد قال لا لکم افضل الجھاد حج مبرور۔ (بخاری)	حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ یا رسول اللہ ہم جہاد کو سب سے زیادہ افضل نیکی سمجھتی ہیں تو کیا ہم جہاد نہ کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تمھارے لیے سب سے افضل جہاد حج مقبول ہے۔

بخاری میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ جھادُکُنَّ الحج (تمھارا جہاد حج ہے)

اُمِّ ورقہ بنت نوفل کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے بدر میں شرکت کی اجازت مانگی تو آپ نے اُن کو اجازت نہ دی۔ وہ قرآن کی عالمہ تھیں۔ انھوں نے اس بات کی اجازت مانگی کہ ان کو نماز اور تعلیم قرآن کے لیے اپنے گھر میں عورتوں کو جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محلہ کی عورتیں ان کے ہاں جمع ہوتیں اور وہ اِن کی امامت کرتیں[۱]

---

[۱] ابوداؤد۔ باب امامۃ النساء۔

پردہ کے احکام نازل ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حوصلۂ شرکتِ جہاد کے خلاف ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا تھا تاکہ یہ لے بڑھنے نہ پائے۔ چنانچہ غزوۂ خیبر سے متعلق یہ روایت ملتی ہے۔

عن حشرج بن زیاد عن جدتہ ام ابیہ انھا خرجت مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم غزوۃ خیبر سادس ست نسوۃ فبلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فبعث الینا فجئنا فرأینا فیہ الغضب فقال مع من خرجتن و باذن من خرجتن فقلنا یا رسول اللّٰہ خرجنا نغزل الشعر ونعین فی سبیل اللّٰہ و معنا دواء للجرحیٰ ونناول السھام ونسقی السویق قال قمن فانصرفن حتیٰ اذا فتح اللّٰہ علیہ خیبر اسھم لنا کما اسھم للرجال فقلت لھا یا جدۃ وما کان ذلک قالت تمرا۔

(احمد و ابوداؤد)

حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ غزوۂ خیبر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلیں۔ پانچ عورتوں کے ساتھ چھٹی وہ بھی تھیں۔ کہتی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے نکلنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ہمیں بلوا بھیجا، ہم حاضر ہوئیں تو ہم نے آپکو غضبناک پایا۔ آپ نے پوچھا تم کس کے ساتھ اور کس کی اجازت سے نکلیں ہم نے جواب دیا یا رسول اللہ ہم چلی آئی ہیں، اون کاتتی ہیں، کچھ اللہ کا کام کرتی ہیں۔ ہمارے ساتھ زخمیوں کے لیے مرہم پٹی کا کچھ سامان بھی ہے۔ ہم تیر پکڑا دیں گی، ستو گھول کر پلا دیں گی۔ آپ نے فرمایا چلو واپس جاؤ۔ پھر جب اللہ نے خیبر فتح کرا دیا تو آپ نے ہم کو مردوں کی طرح حصہ[1] دیا۔ حشرج کہتے ہیں، میں نے پوچھا دادی کیا چیز ملی تو فرمایا کھجور

حضرت عائشہؓ کے واقعہ کی نوعیت

صدر اول کی پوری تاریخ میں عملی سیاست میں کسی عورت کے حصہ لینے کی اگر کوئی قابلِ ذکر مثال ملتی ہے تو وہ صرف ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ملتی ہے۔

---

[1] حصہ سے مراد یہاں مردوں کی طرح مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ہے بلکہ خود ان کے بیان سے واضح ہے کہ کچھ کھجوریں وغیرہ ان کو دی گئیں۔

انھوں نے حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ سے وہ جنگ ہوئی جسے جنگ جمل کہتے ہیں۔ اس جنگ میں حق پر کون تھا اور کس سے اجتہاد کی غلطی صادر ہوئی اس امر سے اس موقع پر بحث نہیں ہے۔ ہم صرف اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے اس معاملہ میں پڑنا امّ المومنین کے لیے صحیح تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق متعدد صحابہ اور صحابیات کی رائیں رجال و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن چونکہ وہ کسی ایک فریق کی جانبداری پر محمول کی جاسکتی ہیں اس لیے ہم ان کو یہاں نقل نہیں کریں گے۔ البتہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے پیش کرتے ہیں جو دو پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہو۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو اس سارے جھگڑے میں غیر جانبدار رہے اور دوسرا یہ کہ ان کے علم و تقویٰ پر کبھی کسی نے حرف رکھنے کی جرأت نہیں کی۔ روایت ہے کہ انھوں نے صاف صاف کہا۔ کہ حضرت عائشہؓ کے لیے اس معاملے میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھتیں۔

ان بیت عائشۃ خیر لھا من ھودجھا[۱]	حضرت عائشہ کا گھر ان کے لیے ان کے ہودج سے بہتر تھا۔

حضرت علیؓ اس معاملہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ ان کی رائے کو زیادہ وزن نہ دیں۔ لیکن نازک سے نازک حالات کے اندر انھوں نے جس طرح اپنے سخت سے سخت مخالفوں کے مقابل میں اپنے آپ کو جذبات کی رو میں بہنے سے بچایا ہے اور جس طرح قول و فعل دونوں میں حق و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ خود جنگ جمل کے فتنہ میں انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح امّ المومنینؓ کے مرتبہ کا انھوں نے لحاظ رکھا ہے اُس کی بنا پر وہ حق رکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں اُن کی رائے کو ایک فریق کی رائے قرار دے کر نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ دوسرے تمام معاملات میں ان کی رایوں کو جو دینی و شرعی وقعت دی جاتی ہے اسی احترام کے ساتھ اس معاملہ میں بھی اُن کی رائے پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کس پہلو سے حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ کو اس بارے میں جو خط لکھا اُس کے الفاظ یہ ہیں:-

---

[۱] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ۔ ص ۵۵۔

اما بعد فانك خرجت مغضبة لله ولرسوله تطلبين امرا كان عنك موضوعا ما بال النساء والحرب والاصلاح بين الناس تطلبين بدم عثمان ولعمري لمن عرضك للبلاء وحملك على المعصية اعظم اليك ذنبا من قتلة عثمان وما غضبت حتىٰ اغضبت وما هجت حتىٰ هيجت فاتقى الله وارجعي الى بيتك۔

(الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ص ۶۴)

آپ اللہ اور رسول کی حمیت میں ایک ایسے مطالبہ کو لے کر اُٹھ پڑی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ اللہ و رسول کی جانب سے سبکدوش تھیں۔ عورتوں کو جنگ اور مردوں کے معاملات میں پڑنے سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا مطالبہ لے کر اٹھی ہیں حالانکہ اللہ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کیا اور اس غلطی پہ آمادہ کیا انھوں نے عثمان کے قاتلوں سے بڑی برائی آپ کے ساتھ کی۔ آپ دوسروں کے ابھارنے سے غصہ میں آگئی ہیں اور دوسروں کی انگیخت سے آپ میں اشتعال پیدا ہوگیا ہے! اللہ سے خوف کیجیے اور گھر کو لوٹ جائیے۔

ملاحظہ فرمائیے! اس خط میں حضرت علیؓ نفس معاملہ کے حق یا باطل ہونے پر کوئی بحث نہیں کرتے اور ام المومنین سے یہ نہیں کہتے کہ آپ بالکل غلط معاملہ کے لیے اُٹھ پڑی ہیں اور اس کے غلط ہونے کے دلائل یہ اور یہ ہیں جیسا کہ انھوں نے اپنے دوسرے مخالفوں کو لکھا۔ بلکہ ام المومنین پر ان کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے معاملے میں براہ راست اور عملی مداخلت کی ہے جس کی ذمہ داریوں سے ایک عورت ہونے کی حیثیت سے، اللہ اور اُس کے رسول نے ان کو بری کیا تھا لیکن محض دوسروں کی انگیخت سے وہ ایک غیر متعلق معاملہ میں پڑ گئی ہیں اور ایک بڑے فتنہ کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو اُلجھا لیا ہے جس سے بغیر کسی مسئولیت کے وہ اپنے تئیں علیٰحدہ رکھ سکتی تھیں۔

اُم المومنین نے حضرت علیؓ کے اس خط کا جو جواب دیا وہ محض اس قدر تھا "اب گلہ شکوہ کا وقت نہیں رہا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کے اعتراض کی قوت محسوس کی اور اُس سے متاثر بھی ہوئیں لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور

ان کے لیے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینا ناممکن ہو چکا تھا۔ ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس موقع پر اس مختصر جواب پر قناعت کر جاتیں اور حضرت علیؓ کے اس دعوے کو چیلنج نہ کرتیں کہ اس طرح کے معاملات عورتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے زندگی بھر وہ جس طرح لڑتی رہی ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود وہ اس کی تردید نہ کریں۔ ان کے تاثر کی شہادت ان کے بعد کی زندگی میں بھی ملتی ہے کیونکہ جنگ جمل کے بعد سیاسی فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اس کے بعد سے اُم المومنین نے اپنی ساری اصلاحی سرگرمیاں عورتوں تک محدود رکھیں۔ نہ صرف یہ کہ کسی عام سیاسی ہنگامہ میں کسی نوعیت سے حصہ نہیں لیا۔ بلکہ مختلف دلائل و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ جمل کی غلطی پر ان کو مدت العمر پچھتاوا رہا۔

عورت کے مزاج اور ریاست کے مزاج میں فرق ہے

ریاست کے انتظام میں عورت کی براہِ راست شرکت سے ریاست کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور ریاست کے مزاج میں فطری طور پر نامناسبت ہے۔ عورت کے مزاج میں فعل سے زیادہ انفعال، کسر سے زیادہ انکسار اور تاثیر سے زیادہ تاثر کا غلبہ ہے۔ وہ زود حس بھی واقع ہوئی ہے اور شدید التاثر بھی، اس وجہ سے واقعات و حالات سے وہ جلد اثر پذیر بھی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر تیز اور شدید بھی ہوتا ہے۔ اس کی یہ فطرت اس کے فطری دائرہ کے اندر جہاں معاملہ صرف اپنوں سے ہے اس کے فرائض کے لحاظ سے نہایت موزوں (اور ضروری بھی) اس کے سبب سے وہ متعلق افراد یعنی شوہر اور اولاد کے لیے سراپا ایثار و محبت بنی ہوئی رہتی ہے۔ ان کی ہر ضرورت اور ہر تکلیف کا وقت سے پہلے احساس کر لیتی ہے اور جب احساس کر لیتی ہے تو اس کے ازالہ کے لیے اس کے اندر ایسی بے چینی اور بے قراری پیدا ہو جاتی ہے کہ جب تک اسے دور نہ کر لے اس کو چین نہیں پڑتا اگرچہ اس کے لیے اسے سب کچھ قربان کر دینا پڑے۔

لیکن سیاست کے اندر اس کا یہ مزاج نہ تو خود اس کے مناسب حال پڑتا ہے، نہ ریاست کے۔ اول تو حکومت کا مزاج انفعال سے زیادہ فعل، انکسار سے زیادہ کسر اور تاثر سے زیادہ

تاثیر کا متقضی ہے۔ اس کی خصوصیات مردانہ ہیں۔ وہ اپنا ایک متعین ارادہ رکھتی ہے اور اس ارادہ کو ایک فاعلانہ عزم اور آمرانہ زور و قوت کے ساتھ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ ثانیاً اس کے معاملات نہایت پھیلے ہوئے، اپنوں اور بیگانوں ہر ایک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں اس لیے اس کے انصرام میں وہی رویہ زیادہ قرین مصلحت و سیاست ہوتا ہے جس میں جذباتی پن سے زیادہ سکونِ مزاج اور سرعت و جلد بازی سے زیادہ عزیمت غالب ہو۔ چنانچہ عورت ہی کے کچھ خصوصیت نہیں ہے وہ مرد بھی ریاست کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں جو جذباتی اور ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جاتے ہیں تو اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات سلطنت کو بھی خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

انفعالی عناصر (PASSIVE ELEMENTS) کی زیادتی یوں تو کسی ریاست کے مزاج کے بھی مناسب حال نہیں ہے لیکن ایک اسلامی ریاست تو کسی طرح بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتی، موجودہ زمانہ کی جمہوری حکومتیں جو عوام کی نمائندہ ہوتی ہیں اور جن کا کام اپنے آپ کو عوام کی پسند کے رنگ میں رنگنا ہے وہ تو ممکن ہے ایک حد تک اس کو برداشت کر لے جائیں۔ لیکن اسلامی حکومت جس کا اصلی مقصد عوام کے رنگ میں اپنے کو رنگنے کے بجائے لوگوں اور اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگنا اور اس کی مرضی پر چلانا ہے اور صرف کسی ایک دائرہ کے اندر ہی نہیں، بلکہ خدا کی پوری زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے وہ مشکل ہی سے اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اہلِ ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا لن یفلح قوم ولوا امرھم امراءۃ (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جنھوں نے اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی ہے)

فلسفۂ سیاست کا مشہور عالم بلنچلی (BLUNTCHLI) بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے وہ اپنی کتاب (THE THEORY OF THE STATE) میں لکھتا ہے:-

"جن عورتوں نے سیاست میں شہرت پائی ہے انھوں نے عموماً ریاست کو اور اپنے دوستوں کو نقصان پہونچایا ہے۔ ان کی ہوشیاری اور ذکاوت نے ایک سازش کی شکل اختیار کر لی ہو اور جب ایک مرتبہ نفرت، انتقام اور طمع کے جذبات عورت کے سینہ میں بھڑک اٹھتے ہیں تو وہ جنگل کی آگ کی طرح

پھیل گئے ہیں۔ یہ بات صرف بادشاہوں ہی کی آشناؤں ہی تک صحیح نہیں ہے بلکہ بہت سی بیویوں اور ماؤں کے متعلق بھی صحیح ہے جو تاریخ میں مشہور ہوئی ہیں۔ روم کی تاریخ، انقلاب فرانس کی سرگزشت اور شاہان فرانس کے درباروں کے حالات سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔" (ص ۱۹۲)

پچھلی جنگ کے موقع پر فرانس کے لیڈروں نے بھی اس امر کا اقرار کیا کہ ان کی شکست میں سب سے زیادہ اُن عورتوں کا ہاتھ ہے جو سیاست میں دخیل تھیں۔ اسلامی تاریخ کی شہادت اس بارہ میں جو کچھ ہے اُس کو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان بنیادی مباحث کو پیش نظر رکھ کر اب آئیے عورت کے حقوق و فرائض پر غور کیجئے:۔

عورت کے حقوق جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلامی ریاست عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔

——— اسلامی ریاست ہر عورت کی جان و مال اور ناموس کی حفاظت کا ذمہ لے گی۔

——— عورت اپنی ملکِ ذاتی (PRIVATE PROPERTY) رکھ سکے گی اور ریاست اسکے اس حق کی محافظ ہوگی۔

——— شریعت نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں ریاست اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے عورت کو پوری آزادی حاصل رہے۔ رسم و رواج کے قسم کی چیزیں اسکی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔

——— عورتوں کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ وہ اپنی انجمنیں بنا سکیں گی، اپنے اخبار اور رسالے نکال سکیں گی، حکومت پر تنقید کرسکیں گی، اپنے اسلامی حقوق کا مطالبہ کرسکیں گی۔ ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار رائے کرسکیں گی۔

——— عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہوگی۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی جائے گی۔

——— اسلام کے حدود کے اندر مسلک و مذہب اور رائے و خیال کی جو آزادی مردوں کو حاصل ہوگی وہ عورتوں کو بھی حاصل ہوگی۔

——— عورتوں کو قانونی مساوات حاصل ہوگی یعنی غربت و امارت اور شرافت و حقارت کی بنا پر

قانون ایک عورت اور دوسری عورت میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

—— نسل و نسب، غربت و امارت اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر اسلامی ریاست میں کسی کو شریف اور کسی کو کمین نہیں قرار دیا جائے گا۔

—— اسلامی بیت المال میں جس طرح مردوں کے حقوق ہوں گے اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہوں گے۔

—— ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہوگی۔

—— جس طرح مردوں کی تعلیم کا ریاست بندوبست کرے گی اسی طرح عورتوں کی تعلیم کی بھی وہ ذمہ دار ہوگی۔

—— بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لیے ہوگا اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوگا۔

—— اگر کوئی عورت قرض چھوڑ کر مرے گی اور کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑے گی جس سے وہ قرض ادا کیا جا سکے، تو ریاست اُس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔

—— کسی عورت کو اطاعتِ الٰہی کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

—— ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس پر اعتراض و نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں

ان حقوق کے معاوضہ میں عورتوں پر ریاست سے متعلق مندرجۂ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

سمع و طاعت —— جس طرح مردوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولو الامر کی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اطاعت کریں۔ اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کی حد تک اولو الامر کے احکام کی اطاعت کریں۔ اولو الامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہو جب ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

خیر خواہی و ہمدردی —— جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی فرض ہے، اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے۔ جو بات ریاست کے لیے نافع ہو اس کو حسبۃً للہ انجام دینے کی کوشش

کرے. محض ذاتی اغراض و فوائد کے لیے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے جو تجویز مفید ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے جو بات ریاست کے خلاف مفاد ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے روک سکے تو روک دے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے. اگر اس کی قابلیت نہ رکھتی ہو تو دل سے اس کو برا جانے. اپنی تنقید و احتساب میں بھی پوری طرح مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راست بازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے.

تعاون عورتوں کیلئے ان کے حالات کے لحاظ سے کارکنان ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی:۔ (۱) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود اپنی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی جو عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطۂ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی. اوپر اسماء بنت یزید انصاریہ کا واقعہ ہم نقل کر آئے ہیں کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے سوالات کیے اور پھر آنحضرت صلعم نے کس طرح ان کو اپنا نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا اور انھوں نے عورتوں کو آنحضرت صلعم کے جوابات سے آگاہ کیا اسی طرح شفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ:۔

کان عمر یقدمہا فی الرائے . یرضاہا	حضرت عمرؓ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے تھے ان کی رایوں
یفضلہا ، وربما ولاہا شیئا من	کو پسند فرماتے تھے ان کو ترجیح دیتے تھے اور بعض اوقات بازار
امر السوق [۱]	کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے.

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہوں گے مثلاً زنانہ کالج اور اسکول" زنانہ ہسپتال' زنانہ پولیس، زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ. یہ کلیتہً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے. اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کی انھیں خود مختاری ہوگی.

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی. بشرطیکہ وہ پردہ کے حدود کے احترام کے ساتھ انجام دی جا سکتی ہوں. جو عورتیں اپنی

---

[۱] الاستیعاب لابن عبدالبر ص ۱۴۷.

ذہانت و قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم و فن میں مہارت اور کسی شعبۂ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہونچائیں گی اُن کو کام کرنے کا بھی موقع دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

فوجی خدمات ــــ فوجی خدمات میں براہ راست حصہ لینے اور فوج میں عملی شرکت کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے.... لیکن ان کا اسلحہ کے استعمال، ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ، ابتدائی طبی امداد، اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے، اس لیے حکومت اس کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں۔ تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو عورتیں بھی ملک و ملّت کی مدافعت اور جہاد کے اجر و ثواب میں شریک ہوسکیں۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۲۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور ترجمات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
طباعت اعلیٰ کتابت دیدہ زیب عمدہ کاغذ، ۲۰۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش،
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ
Price Rs. 5/-

الفرقان
لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ..... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/۵۰
پاکستان سے ۸/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/۰۰
پاکستان سے ۴/۰۰

جلد (۳۷) بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۹ء شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جنوری ۱۹۷۰ء تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

یہ دنیا بلاشبہ عالم اسباب ہے اور یہاں افراد اور قوموں پر اچھے یا برے جو حالات آتے ہیں، عموماً اُن کے کچھ ظاہری اسباب ہوتے ہیں لیکن اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید نے اور اُس کے صادقِ مصدوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلایا ہے کہ ہمیں محسوس ہونے والے اور ہماری آنکھوں سے نظر آنے والے اس ظاہری سلسلۂ اسباب کے علاوہ، اسباب کا ایک غیبی اور مخفی سلسلہ بھی ہے جو ہمارے حواس اور ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہے اور جس کا زیادہ تر تعلق انسانوں کے اچھے اور برے اعمال سے ہوتا ہے۔ —— مثلاً بارش کا جو ظاہری سلسلۂ اسباب ہے اس کو تو ہم سب جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں جو بادلوں کے ٹکڑوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، پھر وہ باہم جڑتے چلے جاتے ہیں، ہوائیں اُن کو اِدھر اُدھر لیے پھرتی ہیں، پھر انھیں سے بارش ہوتی ہے۔ یہ بارش کے ظاہری اسباب کا وہ سلسلہ ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں ——
لیکن قرآن پاک میں تبلایا گیا ہے کہ اگر کوئی قوم گناہوں سے سچی توبہ اور استغفار کر کے نیکوکاری اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کر لے تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالےٰ اُس کے علاقہ پر بارشیں نازل کرتا ہے اور اس کی کھیتیوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔

سورۂ نوح میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا تھا

اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ (سورۂ نوح ع ۱)	لوگو اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر بھرپور بارشیں نازل کرے گا۔

اور سورۂ ھود میں ہے کہ ھود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا

يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (سورۂ ھود ع ۵)

اے میری قوم والو! اپنے پروردگار سے تم اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور صدق دل سے اس کی طرف رجوع ہو جاؤ، وہ تم پر بھرپور بارشیں نازل کرے گا اور تمہاری قوت وطاقت میں اضافہ کر دے گا۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا گناہوں سے سچی توبہ کر کے خدا پرستی اور نیکوکاری کی زندگی اختیار کر لینا بھی بارش کا ایک سبب ہے اور دوسری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کی تبدیلی کی وجہ سے قوموں کی قوت وطاقت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ حالانکہ ظاہری اسباب میں تو کسی قوم کی طاقت وقوت کا دارومدار بس اس کی تعداد فوج واسلحہ وغیرہ خالص مادی وسائل ہی پر سمجھا جاتا ہے۔

علیٰ ہذا کسی قوم کی خوش حالی اور زمین کی پیداوار سے اسکے مالا مال ہونے کی ظاہری تدابیر اور طبعی اسباب تو وہ ہیں جنھیں ہم سب جانتے ہیں، یعنی زراعت کو ترقی دینا، زیادہ پیداوار کے لیے نئے نئے وہ سب ترقی یافتہ طریقے استعمال کرنا جو یورپ وامریکہ میں استعمال ہوتے ہیں، صنعت کو ترقی دینا، تجارت کو بڑھانا وغیرہ وغیرہ

بہرحال کسی قوم کی خوش حالی کے لیے یہی عام ظاہری تدبیریں ہیں جن کو سب جانتے ہیں لیکن قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ایمان وتقویٰ والی زندگی اختیار کر لینا بھی اس کا ایک ذریعہ اور سبب ہے۔ —— ارشاد ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف ع ۱۲)

اور اگر ان بستیوں والوں نے ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کی ہوتی تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

اور جس طرح قرآن مجید کی ان آیات میں کسی قوم کی نیکوکاری اور پرہیزگارانہ زندگی کو خوشحالی وترقی اور عزت وشوکت کا سبب تبلایا گیا ہے، اسی طرح فسق وفجور اور معصیت وخدا فراموشی کی زندگی کو بدحالی اور ذلت وپستی اور آلام ومصائب کا سبب فرمایا گیا ہے —— سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ

اور جو لوگ بے پروائی اور بے رخی برتیں گے میری نصیحت سے تو ان کے واسطے اس دنیا

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ (طٰہٰ ع) میں تنگی اور بے چینی والی زندگی ہے، اور قیامت کے دن ہم اُن کو اٹھائیں گے اندھا۔

الغرض قرآن مجید کی بہت سی آیات نے ہمیں اس حقیقت پر مطلع فرمایا ہے کہ قوموں کے اچھے بُرے حالات اور اُن کے عروج و زوال کا سبب اُن کے نیک و بد اعمال و اخلاق بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے اس زمانہ میں صرف ہم ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ سارے عالم کے مسلمان جن ناسازگار حالات سے دوچار ہیں اور دنیا کی نیزان میں وہ جس قدر بے وزن ہیں، اُس کا بنیادی سبب قرآن مجید کی اِن آیات کی روشنی میں ان کی زندگی کا وہ بگاڑ و فساد ہے جو کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ پورے عالم اسلامی میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جن تدبیری کوتاہیوں اور سیاسی غلطیوں اور غفلتوں کو ہم ظاہری نقطۂ نظر سے اس صورت حال کا سبب سمجھتے ہیں، دراصل وہ سب بھی زندگی کے فساد و بگاڑ اور پھر اس کے نتیجہ میں خدا کی نظر عنایت اور اس کی مدد سے محرومی کے ثمرات ہیں، اس لیے ان حالات اور مصائب و آفات سے نجات پانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے تعلق کو درست کیا جائے اور زندگی کو غیر ایمانی افکار و خیالات اور خلاف شریعت اعمال و اخلاق کی اُن گندگیوں سے پاک کیا جائے جو قوموں اور اُمتوں کو اللہ کی رحمت اور نصرت سے محروم کر کے اس کے قہر و غضب کا مستحق بنا دیتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور جلیل القدر صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے بحوالہ "حلیۃ ابونعیم" "مشکوٰۃ شریف" میں یہ حدیث قدسی نقل کی گئی ہے کہ

قال رسول الله صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ
عليه وسلم ان الله تعالىٰ	اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں ہی اللہ ہوں۔
يقول انا الله لا اله الا	(ساری کائنات کا مالک و معبود ہوں) میرے
انا مالك الملوك وملك الملوك	سوا کوئی معبود اور میرا کوئی شریک نہیں، میں
قلوب الملوك في يدي	حاکموں کا حاکم اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں،
وان العباد اذا اطاعوني	دنیا بھر کے حاکموں اور فرمانرواؤں کے قلوب
حولت قلوب ملوكهم عليهم	میرے ہاتھ میں ہیں (اور میرا یہ دستور ہے کہ)
بالرحمة والرأفة وان العباد	جب بندے میری فرمانبرداری والی زندگی

اذا عصونی حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسكم بالدعاء على الملوك ولكن اشغلوا انفسكم بالذكر والتضرع كى اكفيكم"

اختیار کریں گے تو میں اُن کے حاکموں کے دلوں میں اُن کے لیے رحمت و رافت ڈالدوں گا، اور (اس کے برعکس) جب وہ میری نافرمانی کی راہ پر چلیں گے تو میں اُن کے حاکموں اور فرمانرواؤں کے دلوں میں اُن کے حق میں سخت گیری اور تشدد کا رجحان پیدا کردوں گا پھر وہ اُن کو سخت تکلیفیں اور شدید اذیتیں دیں گے، پس اس صورت میں تم ان حاکموں کے حق میں بد دعا نہ کرنا (کیونکہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اُن حاکموں کا کچھ نہیں بگڑے گا) بلکہ ایسے وقت اپنے کو (ظاہر و باطن سے) اللہ کی یاد اور اس کے حضور میں توبہ و تضرع کے ساتھ دعا میں مشغول کردینا، تاکہ میں تمہارے لیے کافی ہو جاؤں (اور حاکموں کے عذاب سے تمہیں نجات دیدوں)

ظاہری تدابیر اور اسبابی جدوجہد سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں، خود قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ نے اُس کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن ایمانی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے حق میں اس کی کامیابی کے لیے یہ شرط ہے کہ اللہ سے ٹوٹے ہوئے تعلق کو جوڑا جائے اور زندگی کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا پابند کر دینے کا فیصلہ کیا جائے، اس کے بغیر نہ اسبابی کوششیں کامیاب ہوں گی نہ دعائیں سنی جائیں گی، اُمت مسلمہ کے لیے یہی اللہ کا قانون اور یہی اس کی تقدیر ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم

۱۹ر دسمبر کے صدق جدید (لکھنؤ) سے یہ معلوم کر کے دلی رنج ہوا ہے کہ پاکستان کے نامور فلسفی اور مفکر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب۔ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ، کراچی میں ۱۰ر رمضان کی دوپہر کو ایک رکشہ کے حادثہ میں دفعتاً انتقال

فرما گئے۔

ڈاکٹر صاحب سے واقفیت غائبانہ ہی تھی جس کا سلسلہ اُن کی کتاب "قرآن اور علم جدید" سے شروع ہوا۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے شائع کی تھی اور الفرقان میں تبصرہ کے لیے آئی تھی کتاب کے بعض بنیادی افکار سے اتفاق نہیں کیا جا سکا مگر بحیثیت ایک مصنف اور مفکر کے اس نے ڈاکٹر صاحب کا جو نقش دماغ پر قائم کیا وہ آج تک اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کتاب کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بہت سے مقالات اقبال اکیڈمی کراچی کے سہ ماہی مجلہ "اقبال ریویو" میں نظر سے گزرے، جن سے اُن کی شخصیت کا نقش اور زیادہ گہرا ہوا۔ چند سال پہلے تک موصوف ہی اس اکیڈمی کے ڈائرکٹر اور اس مجلہ کے اڈیٹر تھے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد لاہور میں قیام فرما تھے۔ اور ہمہ تن ایک نظام تعلیم اور نصاب تعلیم وضع کرنے میں لگے ہوئے تھے جو جدید و قدیم کا جامع ہو۔ اُن کے افکار کا کچھ اندازہ ناظرین الفرقان کو اُن مضامین سے ہوا ہوگا جو اسی سال الفرقان کے متعدد شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے مضامین سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علمی سطح پر اسلام کو دنیا کے تمام نظامہائے فکر پر غالب کر دینے کی تڑپ سے بے قرار تھے اور اس کے لیے اسلام سے بھرپور شعوری عقیدت کے ساتھ جس جدید علمی اور فکری لیاقت کی ضرورت ہے، اُس کے لحاظ سے ایک گوہر یکتا کہے جانے کے مستحق تھے۔

اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت اور بے پایاں رحمت و کرم سے نوازے۔ اور اُن کا نعم البدل پاکستان اور عالم اسلام کو عنایت فرمائے۔ (ع۔ س)

معذرت

الفرقان کا یہ شمارہ بہت زیادہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس کا سبب وہی مرتب کی خرابیٔ صحت جو بعض دنوں میں بالکل کام کے قابل نہیں رہنے دیتی۔ ادھر جولائی سے یہی صورت حال ہے جس کے باوجود رسالہ والد ماجد کی زحمت کشی سے کسی نہ کسی طرح وقت پر نکلتا رہا، مگر اکتوبر میں وہ محترم رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور پھر آخر نومبر میں واپسی ہوئی جس کی بنا پر دسمبر کے شمارہ کا کام دسمبر میں ہی شروع ہو سکا۔ ناظرین کو اس بے اعلان تاخیر سے جو انتظار کی زحمت ہوئی ہوگی، امید ہے کہ اس معذوری کے پیش نظر معاف فرمائیں گے۔ اب آئندہ شمارہ انشاء اللہ فروری میں شائع ہوگا۔ اور اگر ہو سکا تو یہ جنوری و فروری (دونوں ماہ) کی ضخامت کا شمارہ ہوگا تاکہ اشاعت وقت پر آ جائے۔

درسِ قرآن۔ مرکزوالی مسجد

۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء (یکشنبہ)

• شرک کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کا جہاد اور توحید خالص کا اعلان
• ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ اور حکیمانہ حجت
• سب پیغمبر ہدایت یافتہ، شرک سے پاک اور توحید کے داعی تھے

حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ

هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ
رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ
فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۳﴾
وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ
وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ
وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَزَكَرِيَّا
وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ
وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ
وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۸﴾ ذٰلِكَ
هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا
لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ
اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى
لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا کہ تم بتوں کو معبود مانتے ہو؟ (اور ان کی پرستش کرتے ہو) میں تو تمہیں اور تمہاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھ رہا ہوں ـــــ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی فرمانروائی اور (اس کے عجائبات) کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ کامل الیقین ہو جائے۔ پھر جب رات اپنی تاریکی کے ساتھ اس پر چھا گئی تو اُس نے ایک درخشاں ستارہ دیکھا (اپنی قوم کے مشرکانہ عقیدہ کا بطلان ثابت کرنے

کے لیے اس نے گویا اُن ہی کی زبان میں کہا کہ، یہ ستارہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اُس نے کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کو نہیں چاہتا اور اُن کو رب اور خدا نہیں مان سکتا، پھر جب چاند کو چمکتا اور چاندنی بکھیرتا، دیکھا تو (اسی طرح) کہا یہ ہے میرا رب، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اُس نے کہا کہ اگر میرے رب نے رہنمائی نہ فرمائی ہوتی تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ پھر جب سورج کو چمک دمک کے ساتھ نکلتا دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے، یہ تو بہت ہی بڑا ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو (اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے) اُس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگوں میں اُن سب چیزوں سے بری اور بیزار ہوں جن کو تم (خدا کا) شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رُخ سب سے یکسو ہو کر اُس پاک ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہو اور میں اُن میں سے نہیں ہوں جو کسی بھی چیز کو اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اور اُس کی قوم اُس سے جھگڑنے لگی، تو اُس نے کہا کیا تم اللہ وحدہٗ لاشریک کے بارہ میں مجھ سے حجت اور بحث کرتے ہو، درانحالیکہ اسی نے مجھے ہدایت سے نوازا ہے، اور میں نہیں ڈرتا تمہارے اُن (مصنوعی معبودوں) سے جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو (وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچانی چاہے (تو بے شک وہ پہنچ کے رہے گی) میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، تو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ اور میں اُن (دیمی اور فرضی معبودوں) سے کیسے ڈروں جن کو تم نے خدا کا شریک ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک بنا دیا ہے جن کے بارہ میں اُس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری، (ذرا سوچو) تو ہم دونوں فریقوں میں سے کون امن اور مطمئن رہنے کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم کچھ جانتے ہو! ـــ در حقیقت یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان ہی کے لیے امان اور اطمینان ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔

یہ ہماری وہ حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے عطا کی تھی، ہم جس کے چاہتے ہیں، مرتبے بلند کرتے ہیں، بے شک تمہارا رب بڑی حکمت والا، بڑے علم والا ہے۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب بخشے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت سے نوازا، اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت سے نوازا، اس سے پہلے، اور اُس کی نسل میں سے داؤد، سلیمان، ایوب،

یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی، اور ہم اسی طرح نیک کرداروں کو صلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی (ہم نے ہدایت سے نوازا) یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی (ہم نے ہدایت بخشی) اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا جہاں والوں پر برتری عطا کی۔ اور اُن کے آباء و اجداد اور اُن کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور اُن کو برگزیدہ کیا، اور اُن کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی ـــــ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ وہ اس سے سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اور اگر یہ لوگ بھی (توحید کی راہ چھوڑ کے) شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال اکارت ہو جاتے ـــــ یہ سب وہ بندے ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت (شریعت) اور پیغمبری عطا کی، پس اگر یہ (مشرکین مکہ) ان تعلیمات اور ہدایات کو نہ مانیں تو (کچھ پروا نہیں) ہم نے اُن کے ماننے کے لیے کچھ دوسرے لوگ مقرر کر دیے ہیں جو ان کا انکار نہیں کریں گے (بلکہ قدر کے ساتھ قبول کریں گے اور سینہ سے لگائیں گے) یہ سب وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے نوازا ہے، تو تم بھی ان ہی والی ہدایت کی پیروی کرو ـــــ کہدو میں تم سے اس رہنمائی پر کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں مانگتا، یہ تو تمام دنیا جہان والوں کے لیے بس نصیحت اور یاددہانی ہے ـــــ الانعام آیات ۸۴ تا ۹۰

(تفسیر و تشریح) یہ بات بار بار بیان کی جا چکی ہے کہ یہ سورہ "الانعام" مکی ہے، اور اس کے اولین مخاطب مکہ کے مشرکین ہیں، اور ردِّ شرک اور دعوتِ توحید اس کا خاص مرکزی مضمون ہے۔ شروع سورہ سے اب تک مختلف طور طریقوں سے توحید کی دعوت اور شرک کی تردید کی جاتی رہی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف قسم کے دلائل و براہین پیش کیے جاتے رہے ہیں ـــ اس وقت جو آیتیں تلاوت کی گئی ہیں اور جو آج زیر درس ہیں، ان میں شرک سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان بیزاری اور اُس دعوتِ توحید کا ذکر ہے جو انھوں نے بالکل شروع میں اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی تھی، اور اس سلسلہ میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے جو ایک نہایت موثر طریقۂ استدلال اس دعوت و تلقین کے لیے اختیار کیا تھا وہ بھی ان آیتوں میں پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل یہود و نصاریٰ بھی اُن کو اپنا دینی مورث اور امام مانتے تھے اور بنی اسماعیل مشرکین مکہ بھی گویا ان ہی کا کلمہ پڑھتے تھے، اس

لیے قرآن پاک میں جا بجا یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں بھی حضرت ابراہیم کے حنیفی مسلک کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اُس یہودیت یا نصرانیت کے داعی نہیں تھے جس کو یہود و نصاریٰ نے اپنا دین و مذہب بنا لیا ہے بلکہ وہ اسی خداوندی دین (اسلام) کے داعی اور علمبردار تھے جس کو ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں اور سارے نبیوں کا وہی دین رہا ہے ـــــ اور بنی اسماعیل یعنی مشرکین عرب کے سامنے بھی قرآن پاک میں جا بجا حضرت ابراہیم کی دعوت توحید اور اُن کے حنیفی مسلک کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اُن پر حجت قائم کی گئی ہے سورۂ انعام کی ان آیتوں میں مشرکین مکہ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید کو پیش کیا گیا ہے اور ایک واقعہ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی کواکب پرست قوم پر شرک کا بطلان واضح کرنے کے لیے کیسا عجیب و غریب اور کسقدر موثر طرز استدلال اختیار کیا تھا ـــــ ارشاد ہوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ آزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا آلِهَةً اِنِّيْ اَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۝

اور یاد کرو اس واقعہ کو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ کیا تم پتھر کے بتوں کو معبود مانتے ہو اور اُن کی پرستش کرتے ہو؟ میری نگاہ میں تو یہ تمہاری اور پوری قوم کی صریح گمراہی ہے کہ اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کو معبود بنا کر اُن کی پرستش کی جارہی ہے۔

اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات اختصار اور اجمال کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ اسی کو سورۂ مریم میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ۝ يَا اَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝

اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا اے میرے باپ آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت اور پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ اے میرے باپ مجھے خدا کیطرف سے وہ علم حاصل ہوا ہے جو آپ کو نہیں ملا ہے اس لیے آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھے راستہ کی رہنمائی کروں گا۔

بعض مفسرین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ نہیں بلکہ چچا تھے اور حضرت ابراہیم نے یہ بات اپنے ان چچا سے ہی کہی تھی اور قرآن پاک میں اس سلسلہ کی آیتوں میں جہاں جہاں "اب" کا لفظ آیا ہے، ہر جگہ وہ چچا ہی کے لیے مجازاً استعمال کیا گیا ہے ــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یا کسی صحیح حدیث سے اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، اس کے برعکس قرآن پاک میں اور احادیث صحیحہ میں ہر جگہ اس سلسلہ میں "اب" کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے، جس کے اصلی اور حقیقی معنی والد ہی کے ہیں اس لیے راجح یہی ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے والد ہی کا نام ہے اور حضرت ابراہیم نے یہ بات اپنے والد ہی سے کہی تھی۔ ــــ اور کسی نبی کے لیے ہرگز یہ عیب کی بات نہیں ہے کہ اُس کے باپ کافر یا مشرک رہے ہوں، یہ تو اللہ کی شان ہے۔

سورہ انعام کی اس آیت میں "اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً" کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر بتوں کو معبود مان کر اُن کی پرستش کرتے تھے، اور اگلی آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اُن کی قوم بتوں کے سوا چاند، سورج اور بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتی تھی، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اُن میں دونوں طرح کے شرک مروج تھے۔

آگے ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالےٰ کے ایک خاص الخاص انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ اُن کو "مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" کا مشاہدہ کراتا تھا، یعنی ہماری اس دنیا میں اور عالم سماوات میں اللہ تعالےٰ کی فرمانروائی اور اس کی قدرت و مشیت کی کارفرمائی جس طرح ہو رہی ہے، اور خالق کا حکم مخلوقات پر جس طرح چل رہا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ اس کو منکشف فرماتا تھا۔ یہ اُن پر اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص انعام تھا اور اُس کی وجہ سے اُن کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس طرح کے دوسرے حقائق کے بارہ میں حق الیقین کا مقام حاصل تھا ــــ اگلی آیت میں اسی کو ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ابراہیم کو توحید کی نعمت عطا فرمائی اور اسکی دعوت و تبلیغ کی توفیق دی۔ اسی طرح ہم ان کو "مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کا مشاہدہ کراتے تھے اور کائنات پر اللہ تعالےٰ کی فرمانروائی کے اسرار اور جلوے ان کو دکھاتے تھے۔

اس کے آگے کی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام ہی کا ایک عجیب و غریب واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اُن

کی قوم چاند، سورج اور ستاروں کو اپنا رب مانتی اور اُن کی پرستش کرتی تھی، ایک دفعہ جب رات کا اندھیرا چھا گیا اور آسمان پر ایک چمکدار ستارہ ظاہر ہوا تو حضرت ابراہیم نے بہ ظاہر اپنے ہی کو مخاطب کر کے لیکن فی الحقیقت اپنے گھر والوں اور قوم کے لوگوں کو سنانے کے لیے گویا اُن کا خاکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "هٰذَا رَبِّیْ" یہ چمکدار ستارہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ قانون قدرت کے مطابق اپنے وقت پر ڈوب گیا تو حضرت ابراہیم نے پکار کر کہا "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" میں ڈوبنے والی کسی چیز کو محبوب و معبود نہیں بنا سکتا، اس لیے ڈوب جانے والے اس ستارہ کو اپنا رب نہیں مان سکتا ــــ اسی طرح جب ایک رات کو چاند اپنی پوری روشنی کے ساتھ نمودار ہوا تو حضرت ابراہیم نے پھر اُن لوگوں کو سنا کے اور گویا اُن ہی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "هٰذَا رَبِّیْ" اچھا تو یہ حسین اور روشن چاند میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی اپنے وقت پر ڈوبا تو پکار کے کہا "لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَکُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ۝" نہیں یہ ڈوب جانے والا چاند بھی رب اور معبود نہیں ہو سکتا۔ میرے اللہ نے مجھے یہ حقیقت سمجھا کے کہ ڈوبنے اور فنا ہو جانے والی کوئی چیز کبھی پروردگار اور معبود نہیں ہو سکتی، مجھے اس گمراہی سے بچا لیا، اگر میرا خدا رہنمائی نہ فرماتا تو میں بھی ایک گمراہ آدمی ہو کے رہ جاتا ــــ پھر جب رات ختم ہو کر صبح ہوئی اور سورج اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نکلا، جو اُن کی قوم کا معبود اکبر تھا، تو ابراہیم علیہ السلام نے پھر لوگوں کو سنا کے کہا "هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَکْبَرُ" اچھا تو یہ سورج میرا رب ہے۔ یہ تو سب سے بڑا ہے، اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا، پھر جب شام ہوئی اور وہ بھی ڈوب گیا اور ظاہر ہو گیا کہ بیچارے ستارے اور چاند کی طرح یہ بھی کسی کے حکم سے نکلتا اور ڈوبتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پکار کے اور قوم کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝"	اے میری قوم کے لوگوں میں تمہارے ان سب معبودوں سے براءت اور بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، جن کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو، میں نے ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف موڑ لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

پیدا کیا ہے، اور میں اہل شرک میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم جس قسم کے شرک میں مبتلا تھی، اُس کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے کے لیے یہ بہترین طریقہ تھا جو ابراہیم علیہ السلام نے استعمال کیا۔ اور اگر قوم میں تفکر ہوتا اور صلاحیت ہوتی تو وہ سب شرک کا راستہ چھوڑ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول کر لیتے۔ لیکن اُن کی ذہنیتیں مسخ ہو چکی تھیں، بجائے قبول کرنے کے انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حجت بازی شروع کر دی اور اُن کو اپنے معبودوں سے ڈرانے لگے کہ تم نے اُن کا انکار کیا ہے اور اُن کی توہین کی ہے، اب تم پر یہ آفت آئے گی اور تمہیں یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا، ـــ چنانچہ ارشاد ہے

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ۝

مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ اُن سے حجت بازی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے۔ حضرت ابراہیم نے اُن سے فرمایا کہ تم مجھ سے اللہ کی توحید اور اس کی صفات و افعال کے بارہ میں جھگڑتے ہو، تو اسی نے مجھے یہ ہدایت بخشی ہے، اور گویا حقیقت مجھے آنکھوں سے دکھا دی ہے، اور تم جو مجھے اپنے ان فرضی اور وہمی معبودوں اور دیوتاؤں سے ڈراتے ہو تو سُن لو کہ میں اِن سے بالکل نہیں ڈرتا، یہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ہاں میرا پروردگار جس کی ساری کائنات پر حکومت اور فرمانروائی ہے، وہ جو چاہے گا وہ ہوگا، اس کے علم میں سب کچھ ہے۔ وہ میرے حال سے بھی باخبر ہے اور تمہارے حال سے بھی۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے اپنی حفاظت میں اور اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔

آگے ہے " وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا " یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے اُن لوگوں سے جو ان کو اپنے دیوتاؤں کی مخالفت اور انکار کی وجہ سے ڈراتے تھے، مزید فرمایا کہ میں تمہارے

ان دیوتاؤں سے جو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور جن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، کیوں ڈروں، جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس گناہ عظیم سے اور اُس کے بُرے انجام سے نہیں ڈرتے ہو کہ اللہ پاک کے ساتھ تم ایسی چیزوں کو شریک کر رہے ہو، جن کی شرکت کی اللہ نے تم پر کوئی دلیل اور سند نہیں اتاری، مطلب یہ ہے کہ تم تو اتنا بڑا جرم کرنے کے باوجود خداوند قہار کے قہر و غضب سے نہیں ڈرتے، اور مجھے ان جھوٹے معبودوں اور بے حقیقت دیوتاؤں سے ڈراتے ہو، سو چو کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کے لیے بے خوفی اور اطمینان کا زیادہ سزاوار ہے، پھر خود ہی اس سوال کے جواب میں فرمایا ـــــ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ یعنی بے خوفی اور امان کے مستحق وہ ہیں جو خدا پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انھوں نے شرک کی آلودگی سے بالکل ہی محفوظ رکھا۔ اُن کے لیے خدا کی امان ہے اور وہ سیدھی راہ یاب ہیں۔

آگے ارشاد ہے ـــــ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے مقابلہ میں (جو چاند سورج اور ستاروں کو معبود مانتی تھی اور ان کی پرستش کرتی تھی) جو حجت قائم کی اور جس طرح اُن پر ثابت کیا کہ یہ سیارے جو روز چمکتے چڑھتے اور ڈوبتے ہیں، خدا نہیں ہوسکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ برہان و استدلال جو اُن کی قوم کی ذہنیت اور مزاج کے لحاظ سے موثر ترین استدلال تھا۔ یہ اُن کو ہم نے عطا فرمایا تھا اور ہم نے اس طرف ان کی رہنمائی کی تھی، لعدیہ اپنے بندے ابراہیم پر ہمارا خاص انعام تھا، اس کے ذریعہ ہم نے ان کو رفعت بخشی اور اُن کا مرتبہ بلند کیا، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں، بلند کرتے ہیں، لیکن ہمارے تمام فیصلے علم اور حکمت کی بنا پر ہوتے ہیں۔ یوں ہی اندھادھند کسی کو ہم بلند یا پست نہیں کر دیتے "اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝ تمہارا رب جو ساری کائنات کا رب ہے وہ بڑا حکیم بڑا دانا ہے ـــــ آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم پر یہ نوازش بھی کی کہ اُن کو اسحاق جیسے بیٹے اور یعقوب جیسے پوتے بخشے اور اُن کو بھی ہم نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور پھر اُن کی نسل میں بھی مسلسل پیغمبر آتے رہے ہیں جن سے دنیا میں ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ ارشاد ہے

"وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ"

یہاں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کے بعد حضرت نوح کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اُن کی نسل میں ہدایت اور نبوت کا سلسلہ جاری رہا اسی طرح اُن سے اوپر اُن کے جدِ اعلیٰ نوح کو بھی ہم نے ہدایت سے نوازا تھا اور اُن کا دین اور مسلک بھی وہی تھا جو ابراہیم کا تھا اور وہ بھی توحید ہی کے داعی اور علمبردار تھے۔

اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں اسحاق و یعقوب علیہم السلام والی شاخ ہی میں بعد میں آنے والے مشہور پیغمبروں کا نام بنام ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان سب کو ہدایت کی نعمت سے نوازا گیا تھا اور ان سب کا دین و مسلک بھی وہی تھا جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا اور یہ سب توحید ہی کے داعی تھے جس کی دعوت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں ــــ ارشاد ہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝

اوپر فرمایا گیا تھا کہ ہم نے ابراہیم کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا جس کے بعد انھیں حق الیقین کی وہ دولت حاصل ہو گئی جو اصحاب مشاہدہ ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر انھوں نے ہماری رہنمائی سے اپنی مشرک قوم پر وہ حجت قائم کی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ سب اپنے بندے ابراہیم پر ہمارے انعامات تھے اور ہم نے ان کو اسحاق و یعقوب عطا فرمائے اور اُن کو بھی ہدایت کی نعمت سے نوازا، اور اُن کے اوپر کے سلسلہ میں اُن کے مورث اعلیٰ نوح کو بھی ہدایت اور نبوت کی نعمت سے نوازا تھا

آگے ان آیتوں میں تبلایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں اسحاق و یعقوب کے بعد بھی یہ تسلسل قائم رہا۔ اُن کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور موسیٰ و ہارون کو بھی ہدایت کی نعمت سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ و الیاس کو بھی یہ نعمت عطا فرمائی گئی۔ نیز

اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط ان سب کو بھی ابراہیم کی اس وراثت سے حصہ ملا۔ اور صرف انھیں کو نہیں بلکہ ان کے آباد اجداد اور ان کی ذریت اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی بہت سوں کو ہدایت کی نعمت اور برگزیدگی عطا فرمائی گئی ــــ آگے فرمایا گیا ہے ــــ "ذالك هدى الله الخ" یعنی یہ سب جس ہدایت کے حامل تھے اور جس کی دعوت دیتے تھے، جس کی اصل و اساس توحید تھی وہ خدا کی ہدایت تھی اور اگر بالفرض اللہ کے یہ مقبول بندے بھی جن کی زندگی اعمال صالحہ والی زندگی تھی شرک کے مرتکب ہو جاتے تو ان کے سارے اعمال صالحہ اکارت ہو جاتے ــــ کیونکہ شرک وہ آگ ہے جو سارے اعمال صالحہ کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

شرک کی سنگینی اور گندگی ظاہر کرنے کے لیے قرآن پاک میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں یہ بات سب سے زیادہ سخت ہے کہ اگر بالفرض اللہ کے کسی نبی سے بھی شرک سرزد ہو جائے تو اللہ اس کو بھی نظر انداز نہیں فرمائے گا۔ اور اس کے سارے پاکیزہ اعمال سوخت ہو کر رہ جائیں گے ــــ العیاذ باللہ

یہ بات دراصل مشرکین کو اور خاص کر مکہ کے مشرکوں کو سنائی جا رہی ہے جو شرک کی گندگی میں ملوث ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے اور ان کی نسبت پر فخر کرتے تھے اور خانہ کعبہ کی نسبت سے اپنے کو خدا کا برگزیدہ سمجھتے تھے۔ پہلے تو ان کو یہ بتایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک اور طریقہ کیا تھا اور شرک کے خلاف انھوں نے کس طرح جنگ کی، پھر یہ بتایا گیا کہ ان سے پہلے ان کے مورث اعلیٰ نوح کا اور ان کے بعد ان کے اخلاف اسحاق و یعقوب اور پھر ان کی نسل میں تسلسل کے ساتھ آنے والے سب نبیوں کا مسلک اور طریقہ بھی وہی تھا، یہ سب توحید کے حامل اور داعی اور معلم تھے اور اللہ کے بندوں کو شرک کی گندگی سے نکالنا ان کا مشن تھا۔

آگے ان سب نبیوں کے بارہ میں جن کا اوپر ذکر ہوا، فرمایا گیا ہے ــــ "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ـ یعنی ہم نے ان سب کو کتاب ہدایت دی اور حکمت و شریعت دی، اور منصب نبوت سے سرفراز فرمایا، اور یہی چیزیں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں، پس اگر یہ مشرکین مکہ ان عظیم نعمتوں کی قدر نہ کریں اور کفر و انکار ہی کے رویہ پر جمے رہیں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں ہم نے اور لوگ اس کے لیے مقرر کر رکھے ہیں وہ ان نعمتوں کو قبول کریں گے اور سینے سے لگائیں گے

یہ اُس زمانہ کی آیتیں ہیں جب مکہ میں گنتی کے چند ہی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا تھا، جن میں زیادہ تر ضعفا اور غربا تھے، ان کے علاوہ مکہ کی عام فضا کفر و انکار اور شدید مخالفت کے شور و شغب سے گونج رہی تھی اور کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دین کو کبھی استحکام اور قبول عام بھی حاصل ہو سکے گا، اسی حالت میں اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ بہت سے لوگوں کو اس کی توفیق ملے گی، اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس پیشین گوئی کا ظہور ہو گیا۔

آگے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝

مطلب یہ ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام کا اوپر ذکر کیا گیا یہ سب اللہ کی طرف سے ہدایت یاب تھے ان کی تعلیم اور ہدایت خدا ہی کی تعلیم اور ہدایت تھی، لہٰذا اے رسول تم اسی ہدایت کی پیروی کرو، جو جو ان انبیاء سابقین کو خدا کی طرف سے ملی تھی، اور جس طرح خدا کے یہ نبی توحید کی اور خدا کی فرمانبرداری کی تبلیغ کرتے تھے تم بھی اس طرح کرو اور اپنے مخاطبین سے کہدو کہ میں تم سے اس تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا یہ تو ساری دنیا کے لوگوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے، میں تم سے کچھ لیتا نہیں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ تم اللہ کی اس نعمت ہدایت کو مجھ سے لے لو اور نہ صرف تم مکہ والے اور میرے کنبے قبیلے والے بلکہ ساری دنیا والے اور ساری قوموں کے لوگ لے لیں۔

ان آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی، کتنی بڑی نعمت ہے، یہ وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصلاً اور براہ راست انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتی ہے، پھر جو بندے ان کی دعوت پر اس ہدایت کو قبول کر لیں وہ گویا اُن کے دسترخوان کے شریک ہو جاتے ہیں ــــ ہم آپ نے اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مبارک دور نہیں پایا بلکہ قریباً ۱۴ سو سال بعد کا زمانہ پایا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کتنا عظیم انعام و احسان ہے کہ ایمان لا کر اور آپ کا دین قبول کر کے آپ کے دسترخوان کے شریک بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اس نعمت کی قدر و قیمت کو کچھ سمجھیں اور اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش اور فکر کریں۔ اس کا شکر یہی ہے کہ اپنی زندگی کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا پورا پورا پابند بنائیں، جو جس درجہ میں آپ کا اور آپ کی ہدایات و تعلیمات کا اتباع کرے گا، وہ اسی درجہ میں آپ سے قریب اور آپ کی لائی ہوئی نعمت میں شریک ہوگا ـــــ بس اللہ تعالیٰ توفیق دے۔
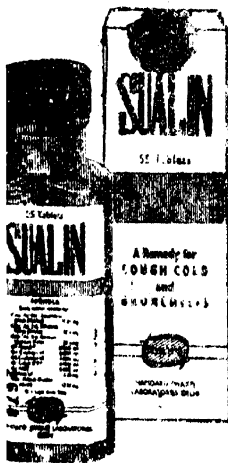
ارشاداتِ حکیم الامتہ حضرت تھانویؒ

علماء و طلباء، اصحابِ درس و اربابِ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

(۴)

تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل خوش خطی تو فنا ہی ہوگئی، اکثر بہت بھدّے خطوط آتے ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خطِ نسخ و نستعلیق دونوں قسم کا نہایت پاکیزہ تھا۔.. .... حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا (بھی) نہایت خوش نما خط تھا۔ ان حضرات کی تو ہر بات ہی دلکش تھی۔

فرمایا ——— ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ (اللہ کی) عطا ہے اور عطا پر انسان کو ناز نہ کرنا چاہیے جب چاہیں نکال باہر کریں پھر ناز کیسا؟ ہاں شکر کرو ——— اور اہل اللہ کو چونکہ نعمت کی حقیقت زیادہ معلوم ہے اس لیے ان کو نعمت پر شکر زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ جس قدر تعلق نعمت سے ہے اُس سے زیادہ منعم سے تعلق ہوتا ہے' اُن کی زیادہ نظر منعم پر ہوتی ہے، نیز وہ ہر نعمت کو اپنے استحقاق سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ موجود پر راضی رہتے ہیں، مفقود پر نظر نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک شخص نے شکایت کی ایک بزرگ سے ——— (کہ) مجھے افلاس زیادہ ہے (بزرگ نے) فرمایا کہ میاں اگر دل میں اطمینان ہو، بدن میں کوئی مرض نہ ہو، ایک دن کا کھانے کو ہو، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟ اسی لیے اہل اللہ کی یہ شان ہے کہ اگر مل گیا تو شکر نہ ملا تو اُس کو بھی نعمت سمجھ کر صبر۔ اور عبدیت

کی وجہ سے وہ حاجت کی ہر چیز مانگتے ہیں لیکن اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس پر بھی راضی رہتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے لیے نعمت ہے ...... ان حضرات کو اگر کسی نعمت کی طلب ہوتی ہے تو وہ بھی اس واسطے کہ جمعیتِ قلب میسر ہو۔ قلب کو پریشانی نہ ہو تاکہ اطمینان کے ساتھ کام میں لگیں۔ ان حضرات کے یہاں جمعیتِ قلب کا بڑا اہتمام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر کا سامان ازواجِ مطہراتؓ کو عطا فرما دیتے تھے۔ گو حضورؐ کی جمعیتِ قلب اس پر موقوف نہ تھی، مگر حضورؐ نے اپنے مذاقِ مبارک کے خلاف، صرف ہماری رعایت فرمائی اور ایسا (عملدرآمد) فرما کر اس فعل کو جائز سے آگے بڑھا کر سنت بنا دیا، تاکہ آپ کی امت کو دنیا میں بھی دین کا ثواب ملے۔ کیونکہ اتباعِ سنت تو دین ہی ہے۔ کیا انتہا ہے اس شفقت کی کہ ہم نالائقوں کی رعایت سے سال بھر کا خود انتظام فرمایا جس سے مقصود یہ تھا کہ امت کو ایسا کرنے سے جمعیتِ قلب حاصل ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل میں یہی شفقت ہے، کیا یہ شفقت نہیں کہ آپ ساری ساری رات کھڑے ہو کر امت کی سفارش فرما رہے ہیں حتیٰ کہ قدم مبارک پر ورم بھی آ گیا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب شان تھی۔ عبدیت کا اسقدر غلبہ تھا کہ آپ کی ہر بات سے شانِ فنا ٹپکتی تھی۔ چنانچہ باوجود زاہد ہونے کے گھر کی حاجت کے لیے یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ کوئی ایسا ٹھکانہ دے دیجیے جس میں بیٹھ جاؤں اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہاں سے اٹھو، سو حق تعالیٰ نے ایسا ہی سامان فرما دیا۔

فرمایا — کہ نعمت کی تحقیر کا کسی کو کیا حق ہے۔ نعمت وہ چیز ہے کہ ہمارے یہ سارے لمبے چوڑے دعوے کمالات کے اور سارا طنطنہ جب ہی تک ہے جب تک انھوں نے اپنی نعمت سے نواز رکھا ہے ورنہ ایمان کا سنبھلنا بھی مشکل تھا۔

فرمایا کہ یہ سب جو کچھ دیکھتے ہو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کی برکت ہے ورنہ یہاں کیا رکھا ہے۔

فرمایا — کانپور کے مدرسہ) جامع العلوم میں ایک شاگرد نے استاد کی بے ادبی کی تھی اس نے خود اقرار کیا کہ تمام علم، سلب ہو گیا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ کام میں لگے اور بے نتیجہ فکروں میں نہ پڑے۔

..... میرا مطلب یہ ہے کہ آگے چلنے کی فکر کرے، بے نتیجہ خیالات میں وقت صرف نہ کرے، اعمال میں وقت صرف کرے ...... انسان مکسوب اور اختیاری اعمال کا مکلف ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ○ ــــ (مردوں کے لیے اُن کے اعمال کا حصہ ثابت ہے، اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں)

ایک بزرگ نے کسی سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ کہا کہ توکّل کی مشق کر رہا ہوں (بزرگ نے) فرمایا کہ میاں ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے؟ یعنی توکّل کی مشق کا مقصود یہی تو ہو کہ پیٹ سے بے فکری ہو جائے۔ اصل چیز میں کب لگو گے؟ بس توکّل اختیار کرو مشق ہو یا نہ ہو..... اسی طرح یہ خیالات بھی مضر ہیں کہ میں کامل ہوا یا نہیں؟ میں کچھ ہوا یا نہیں؟ غرض بے نتیجہ خیالات اس راہ میں راہزن ہیں۔ کام کرنے والوں کی شان ہی جدا ہوتی ہے، وہ ایسی چیزوں کو کب دیکھتے ہیں؟ ــــ

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ جس قدر الفت و محبت بڑھتی ہے اسی قدر تکلف جاتا رہتا ہے، اور یہ بے تکلفی اور دل کا ملنا شرطِ اعظم ہے نفع باطن کے لیے ــــ مگر اکثر لوگوں کو ان باتوں کی خبر ہی نہیں ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جس قدر غیر مسلم اقوام ہیں سب نے اسلام کے اصول لے لیے ہیں راحت اٹھا رہے ہیں اور مسلمانوں نے چھوڑ دیئے پریشان ہیں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مدراس میں ایک انگریز مسلمان ہوا نماز کے لیے مسجد میں آیا دیکھا کہ نالی میں صفائی نہ تھی، اس نے اس پر خادم مسجد سے کہا کہ ذرا صفائی رکھنا چاہیے تو جاہل لوگوں نے کہا کہ بڑا صفائی صفائی گاتا ہے معلوم ہوتا ہے ابھی تو عیسائی ہے۔ گویا مسلمان وہ ہے جس میں صفائی نہ ہو میلا کچیلا رہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ لوگوں کو حس نہیں رہی ــــ دیکھئے حدیث میں ہے نَظِّفُوا أَفْنِيَتَكُمْ ــــ یعنی گھر سے باہر جو سامنے میدان ہے اس کو صاف رکھو ــــ سو ظاہر ہے کہ جب مکان سے باہر کی صفائی کا اس قدر اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کس قدر مطلوب ہوگی، پھر کپڑے کی اس سے زیادہ اور جسم کی اس سے زیادہ، اور روح کی صفائی تو کس قدر مطلوب ہوگی؟ ...... میں جب حیدرآباد دکن گیا تھا

.....(دوراں) بعض احباب نے مشہور چیزوں کی سیر کرائی، اسی سلسلے میں دارالضرب بھی دیکھنے گیا، وہاں ایک انگریز دکھلانے والا تھا جب سب کچھ دیکھ کر واپسی کے لیے دروازے پر آئے تو میں نے اس انگریز سے کہا کہ آپ کے اخلاق سے بڑی خوشی ہوا، آپ کے اخلاق تو ایسے ہیں کہ جیسے مسلمانوں کے ہوتے ہیں اس پر وہ انگریز خوش ہوا کہ ایک مذہبی شخص نے اس کی تعریف کی۔ میرے ساتھ ایک بڑے آفیسر مسلمان بھی تھے انھوں نے مجھ سے آگے چل کر کہا کہ آپ نے..... عجیب وغریب طرز سے تعریف کی، بڑھا بھی دیا اور گھٹا بھی دیا..... وہ تو اس پر خوش ہوا کہ ایک مذہبی شخص اپنے مذہبی لوگوں کے ساتھ مجھ کو تشبیہ دیتا ہے، اور گھٹا یوں دیا کہ اخلاق میں مسلمانوں کو کامل اور اس کو ناقص قرار دیا — میں نے جواب دیا کہ میں نے حقیقت کو بیان کیا کہ اپنے اخلاق پر ناز نہ کرنا یہ سب تم نے اسلام سے اور مسلمانوں سے لیا ہے۔ یہ تمھارے گھر کی چیز نہیں بلکہ مسلمانوں کے گھر کی چیز ہے —

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بعض آثار طبیعہ فطری ہوتے ہیں وہ زائل نہیں ہوتے گو کمی تو ہو جاتی ہے مگر رہتے ضرور ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اتنا زمانہ ہدایا قبول کرتے ہوئے ہوگیا مگر اب تک طبیعت میں جھجک ہے اور اجنبی سے تو بالکل ہی طبیعت قبول نہیں کرتی جی شرماتا ہے۔ بے تکلفی کی جگہ بھی جھجک تو ہوتی ہے مگر کم — مولوی صدیق گنگوہی اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب مدرسہ دیوبند میں داخل ہوئے تو ایک مکان میں کھانا مقرر ہوا، جب کھانا لانے کے لیے گئے تو وہاں پہونچ کر اب چپ کھڑے ہیں زبان نہیں اٹھتی۔ اتفاق سے صاحب خانہ آ گئے انھوں نے بڑے احترام سے بٹھایا اور کھانا خود لا کر دیا، مگر رفتہ رفتہ اس خجلت کا کم ہونا شروع ہوا — ان چیزوں میں عادت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے مگر جو چیز فطری ہوتی ہے وہ کچھ نہ کچھ رہتی ہے اور فطرت کے ساتھ اگر عادت بھی منضم ہو جائے (مل جائے) تو اگر وہ امر محمود ہے تو نور علیٰ نور ہو جاتا ہے اور اگر امر مذموم ہے تو کریلا اور نیم چڑھا ہو جاتا ہے..... مجھ پر عجیب خدا تعالیٰ کی یہ رحمت ہوئی کہ باپ بھی ایسے ملے کہ انھوں نے شیخ کی طرح تربیت کی اور شیخ تو پھر شیخ ہی تھے..... والد صاحب کا معمول تھا کہ دعوت میں ہم کو نہ لے جاتے تھے الّا نادراً — حالانکہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بچوں کو ہمراہ لے جاتے ہیں۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ یہ ٹھیک نہیں اس سے بچوں کو عادت ہو جائے گی

پھر استنکار ہونے لگے گا۔ ایسے عاقل تھے ان کی باتیں ایسی تھیں جیسے شیوخ کی ہوتی ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ باپ بھی ایسے ملے اُستاد بھی ایسے ہی شیخ بھی ایسے ہی ملے۔ یہ ان کا بڑا فضل اور بڑی رحمت ہے۔

فرمایا ــ یہاں ہماری برادری میں ایک صاحب تھے جن کا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خادمی کا تعلق تھا اس بناء پر مجھ سے بھی محبت کرتے تھے، ان کے یہاں کوئی پھل آیا کوئی اچھا کھانا پکا میرے لیے بھیج دیتے تھے اور یہاں سے بھی جاتا رہتا تھا، گو کم وبیش کا تفاوت تھا۔ اتفاق سے ایک فرائض کا مسئلہ انھوں نے مجھ سے پوچھا میں نے بتلا دیا وہ اُن کے خلاف تھا اور اس میں اُن کے فریق مخالف کا نفع تھا۔ اس پر کہا کہ ہم اتنے زمانہ سے خدمت کرتے ہیں مگر جب ہمارے کام کا وقت آیا تو ہماری کچھ رعایت نہ کی۔ دیکھئے کتنی رنج دہ بات ہے۔ اس وجہ سے بعض ہدیہ میں شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا بھی یہی انجام نہ ہو ــ اور ہدیہ دے کر کسی رعایت کی توقع تو نہایت منکر و قبیح ہے۔ مجھ کو تو یہ بھی پسند نہیں کہ ہدیہ دے کر دُعا کے لیے کہا جائے۔ اس لیے کہ ہدیہ تو محض طیب قلب سے اور تطییب قلب کے لیے (یعنی خوشدلی سے اور دوسرے کے قلب کو خوش کرنے کے لیے) ہوتا ہے۔ اس میں اور اغراض کی یا دوسرے مصالح کی آمیزش کیسی؟ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ شخص ہم کو غریب سمجھ کر ہدیہ دے رہا ہے تو ہدیہ لینے کو جی نہیں چاہتا، ہم غریب ہی سہی مگر اس کو کیا حق ہے کہ وہ غریب سمجھ کر دے ــ تو مولانا نے دفع حاجت کی مصلحت کی آمیزش کو پسند نہیں فرمایا، اور (مولانا کا) ایک یہ بھی معمول تھا کہ سفر میں ہدیہ لینا پسند نہ فرماتے تھے ــ بعض اوقات پہلے سے آمادگی نہیں ہوتی منہ دیکھ کر خیال ہو جاتا تو طیب قلب سے نہ ہوا۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ..... کو رخصت کے وقت، کوئی ہدیہ پیش کرتا تو قبول نہ فرماتے اور جو شخص آتے ہی دیتا لے لیتے تھے۔ جانے کے وقت دینے کے متعلق فرماتے کہ کیا مجھے روٹی کی دوکان والا سمجھا ہے کہ حساب لگا کر دیتا ہے کہ آٹھ آنے کا کھایا ہوگا لاؤ روپیہ دے دو۔ دیکھئے یہاں بھی ہدیہ کے ساتھ ادائے عوض کی مصلحت شامل ہو گئی (اسی وجہ سے حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہدیے کو نہ لیتے تھے) ــ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ زیادہ مقدار میں ہدیہ نہ لیتے تھے کم مقدار میں لیتے تھے اور ہدیہ لینے کے وقت بے حد شرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری اتنی بڑی

حیثیت نہیں۔ اپنے کو ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ دے دو۔۔۔ اس میں بھی یہ راز ہے کہ بعض اوقات زیادہ مقدار میں ہدیہ دینے والے کو طیب قلب نہیں ہوتا قلیل مقدار سے شرماکر (خواہ مخواہ) زیادہ دیتا ہے ۔ ..... ان کی (حضرت مولانا گنگوہیؒ کی) ہر بات میں ایک محبوبانہ شان معلوم ہوتی تھی ــــ ایک مرتبہ حضرت (مولانا گنگوہیؒ) نے (مجھ سے) فرمایا کہ میاں تم بہت دنوں سے آتے ہو ہم نے تمہیں کبھی کھانا نہیں کھلایا آج تمھاری دعوت ہو دیکھئے اس سے سادگی کی کیسی عجیب وغریب شان مترشح ہوتی ہے جو محبوبانہ انداز کی بڑی فرد ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اہل اللہ اور خاصانِ حق کی صحبت میں، ان کی دعا میں اُن کی نصیحت میں نور اور برکت ہوتی ہے۔ دہلی میں جو حکیم نابینا ہیں اُن کی نباضی مشہور ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ حضرت میں نابینا ہوں بجز نبض کے اور علامات کا مشاہدہ نہیں کر سکتا، نبض شناسی کی دعا کر دیجئے، آپ نے نبض کے لیے دعا فرمادی جس میں ان کا کمال مشاہد ہے تو یہ اس دعا کی برکت ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اعتراض کرنا کیا مشکل ہے؟ زبان ہی تو ہلانا پڑتی ہے. تحقیق کا درجہ مشکل ہے اسی لیے محقق پر سیکڑوں اعتراض ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس کی نظر تمام جوانب پر ہوتی ہے اور غیر محقق کی نظر صرف ایک بات پر ہوتی ہے سو مختلف جوانب کو جمع کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر مشکل ہے ــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی اسی میں ہے کہ ہر جگہ (جمعیتیں اور) انجمنیں قائم ہو جائیں تاکہ ایک دوسرے کی خبر گیری کر سکیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ جیسے دنیا کے کاموں کے لیے پنچائت کرتے ہیں۔ ایسے ہی دین کے لیے اور اپنے بھائیوں کی حفاظت کے لیے بھی پنچائتیں قائم کریں مگر مشکل تو یہ ہے کہ دنیا کی باتوں کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور ان مقاصد کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ بے حد ضروری ہیں۔

ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض لوگ ..... طعنے دیتے ہیں. فرمایا کہ تم طعنے سے بچنا چاہتے ہو یا گناہ سے؟ طعنے تو نبیوں کو بھی دیتے ہیں. اللہ کو دیتے ہیں. صحابۂ کرام اور ائمہ مجتہدین کو دیتے ہیں تم بے چارے تو کیا ہو..... عرض کیا کہ مولویوں کی حافظوں کی کوئی دعوت نہیں کرتے، فرمایا کہ تو

اِس سے ضرر کیا ہے؟ عرض کیا کہ حضرت دُنیا کی عزّت کی بھی تو ضرورت ہے. فرمایا کہ اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ طبیب، صحت کی تدبیر کرتا ہے، یہ نہیں کہ کشتی گری کا بھی ذمہ دار ہے کہ ایسا علاج کروں گا کہ تو کسی سے مار نہ کھائے گا ــــ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صاحب نے اپنے مدرسے کے لیے مجھ سے کسی مالدار سے سفارش چاہی تھی ــ میں نے بجائے ترغیب اُن کو یہ لکھدیا کہ یہ شخص بڑے متدین ہیں. اگر کوئی مدرسے میں کچھ دے گا تو یہ مدرسے میں پہونچادیں گے ــــ باقی (مبالغہ کیساتھ) ترغیب دینا یہ تو آج کل مانگنا ہے. مجھ کو اس سے بھی غیرت آتی ہے ــــ

ایک صاحب نے مجھ کو عربی میں خط لکھا. میں نے دریافت کیا کہ عربی میں خط کیوں لکھا جبکہ اُردو میں لکھ سکتے تھے. جواب میں لکھتے ہیں کہ جنتیوں کی زبان عربی ہی ہوگی اس لیے برکت کے لیے عربی میں لکھا. میں نے لکھا کہ قسم کھا کر لکھو کہ اگر تم کبھی یہاں پر آئے، تو کیا عربی میں گفتگو کروگے؟ اس لیے کہ جیسے عربی تحریر میں برکت ہے ایسے ہی عربی تقریر میں بھی برکت ہے ــــ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایسا جواب دیا کہ اُس پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہو سکتا ــ تفاخر، بڑائی، اظہارِ علم و قابلیت کے سوا اور کچھ نہیں. عاجزی اور انکساری ..... رہی ہی نہیں ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ لوگ (فقط) اعمال کو دیکھتے ہیں مگر دیکھنے کی چیز ہے (آدمی کا) قلب کہ اس کے دل میں اللہ اور رسولؐ کی محبت کس قدر ہے؟

بدوی ہیں. گاؤں کے رہنے والے لوگ ہیں مگر اُن کے دل میں اللہ اور رسولؐ کی عظمت اور محبّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ــ اور زیادہ ضرورت اسی کی ہے کہ دل میں دین کی وقعت ہو، عظمت ہو.

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں تو اِس کو پسند کرتا ہوں کہ ہر شخص کام میں لگے چاہے وہ کام دین کا ہو یا دُنیا کا ــ جو شخص مشغول ہوتا ہے وہ بہت سی خُرافات سے بچا رہتا ہے ــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ پہلے تو صرف آدمیوں کے نام رکھے جاتے تھے، اب بکثرت مکانوں کے بھی نام رکھے جانے لگے .... فُلاں منزل، فُلاں منزل ایک قصبے میں ایک چھوٹی سی کوٹھری کا (نام) مدرسہ دار الفیض رکھا گیا تھا ــ مدرسۂ دیوبند اس قدر بڑا مدرسہ ہے اور بزرگوں کے وقت میں اس کا کچھ بھی نام نہیں تھا ــــ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ محسن کشی کا خاص مرض آج کل عام ہوگیا ہے. بڑا ہی نازک زمانہ ہے. یہ سب بددینی کی بدولت ہو رہا ہے ــــ ..... ایک مولوی صاحب کے

سوال کے جواب میں فرمایا کہ حدیث شریف میں یہ قصہ آیا ہے کہ دو شخصوں میں مقدمہ ہوا، ایک ہار گیا اور ایک جیت گیا تو ہارنے والے نے کہا حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ جس کے معنی باعتبار محاورے کے یہ ہیں کہ اللہ کی یہی مشیت تھی (وہی کافی اور بہترین کارساز ہے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سُن کر) فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کم ہمتی کو پسند نہیں فرماتے۔ اوّل کوشش کرو، جب بالکل عاجز ہو جاؤ تب کہو حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمادیا کہ تدبیر اور رضا بتقدیر میں منافات نہیں ہے ۔۔۔ اسی طرح قرآن مجید میں مسئلہ تقدیر کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ ۔۔۔ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ اس میں بھی یہ بتلا دیا کہ تقدیر کا مسئلہ اس لیے تعلیم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو کوشش کے بعد ناکامی پر حسرت نہ ہو اور حسرت میں ہمت نہ گھٹے تو یہ مسئلہ ہمت بڑھانے کو سکھایا گیا تھا نہ کہ گھٹانے کو ۔۔۔ اب لوگ اُلٹا سمجھ گئے کہ کچھ نہ کرو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاؤ ۔۔۔ یہ سب کمی علم کی وجہ سے گڑبڑ ہو رہی ہے ۔۔۔ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ سب میں سہل یہ نام مبارک ہے یعنی اللہ حتیٰ کہ اگر کوئی بہت ہی چھوٹے بچے کو بھی سکھادے اللہ اللہ تو بسہولت سیکھ سکتا ہے ۔۔۔ مسمّیٰ تو اتنی بڑی شان کا کہ وہاں تک رسائی مشکل اور نام اتنا سہل کہ بچے بھی اس نام کے لینے پر قادر ہیں ۔۔۔ کیا برکت والا نام ہے اور کیسا پیارا سُبْحَانَ اللّٰہِ ۔۔۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل بعض علماء کا بالخصوص مفتیوں کا یہ طرز نہایت بُرا ہے کہ سائل کے تابع بن جاتے ہیں خواہ اُس کا سُوال فضول ہے یا اُس کے فہم سے بالاتر ہو۔ جواب ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں مفتیوں سے کہتا ہوں کہ ان سب اُمور کو سوچ سمجھ کر جواب دیا کریں یہ نہیں کہ بالکل سائل کے تابع بن جائیں بلکہ سائل کو بھی اس کی غلطی پر تنبیہ کردیا کریں ۔۔۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ لوگ بڑے ہی چالاکی، ہوشیاری اور بیدار مغزی سے سوالات کرتے ہیں۔ بڑی بڑی تمہیدیں اور بندشیں لگاتے ہیں لیکن میرے جوابوں کو بحمداللہ وہ آلۂ نزاع نہیں بنا سکتے ورنہ آج کل تو یہ شغل ہو گیا ہے کہ مولویوں کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے گویا کہ ..... جھگڑوں میں یہ اُن کے آلۂ کار ہیں ۔۔۔ میں بحمداللہ اُن کی نبضیں خوب پہچانتا ہوں یہی وجہ ہے کہ مجھ سے خوش نہیں میرے جوابات پر جھلاتے ہیں، بُرا بھلا کہتے ہیں ۔۔۔ دوسروں کو اپنا تابع بنا کر اپنے اغراض اور کام نکالنا

چاہتے ہیں ـــــ یہاں سے کوئی بات ہاتھ نہیں لگتی. اس لیے خفا ہیں ـــــ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جو عمل خلوص اور محبت سے خالی ہوگا. وہ بے مغز کا بادام ہے. بے رس کا آم ہے ـــــ اس کے (یعنی خلوص و محبت کے) پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور جب تک نہ ہو اُس وقت تک اس نقالی کو بھی بے کار نہیں سمجھنا چاہیے. اس لیے کہ صورت کبھی کبھی سیرت تک پہونچا دیتی ہے ـــــ تعمیر الظاہر والباطن کی ضرورت ہو. اگر اجتماعاً (ساتھ ساتھ) نہ ہو تعاقباً (یکے بعد دیگرے) ہی سہی ـــــ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عمل ریا سے بھی ہو تو اس کو نہیں چھوڑنا چاہیے "کرتا رہے" اس لیے کہ ریا سے عادت ہو جاتی ہے اور عادت سے عبادت.

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک شخص حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، بیعت کی درخواست کی حضرتؒ نے انکار فرمایا، اُس نے بے حد اصرار کیا، رویا پیٹا مگر حضرتؒ انکار ہی فرماتے رہے بعد میں معلوم ہوا کہ خفیہ پولیس کا افسر تھا ـــــ

یہ حضرت گنگوہیؒ کی فراست تھی اور فراست صادقہ کشف سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے..... حضرت گنگوہیؒ کی فراست کا ایک واقعہ اور یاد آیا ـــــ دو شخص آدھی رات کے قریب آپ کی خدمت میں آئے کہ یہ روپیہ ہے اس کو مجاہدین سرحد کے پاس پہونچا دیجئے. حضرتؒ نے فرمایا کہ نکالو اُن بیہودوں کو ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دو افسر انگریز تھے. امتحان کرنے آئے تھے کہ اِن کا کچھ تعلق اُن مجاہدین سے ہے یا نہیں؟ ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ محض زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا. کام کرنے سے کام چلتا ہے ایک بزرگ نے بہت اچھی بات لکھی ہے. بڑے کام کی بات ہے کہ اے عزیزو. تم (فقط) بزرگوں کے ملفوظات کے یاد کرنے کا اہتمام نہ کرو بلکہ اس کی کوشش کرو کہ تم ایسے ہو جاؤ کہ تمہاری زبان سے بھی وہی نکلنے لگے جو اُن کی زبان سے نکلا ـــــ اس کی ایک مثال ہے کہ ایک قلعہ ہے اس میں رسد جمع کرنا ہے تو پانی کا ایک بہت بڑا حوض تیار کرایا اور اُس کو بیرونی پانی سے بھر لیا ـــــ مگر اس سے اچھا یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا کنواں اندر کھود لو. گو پانی تھوڑا ہوگا مگر آتا رہیگا، برابر خرچ کرتے ہو نکالتے رہو کمی نہ ہوگی. اسی طرح اپنے اندر کنواں کھود لو ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ جو مشہور ہے کہ ایک روپیہ ایک عقل. دو روپیہ دو عقل. تجربے کے خلاف اور بالکل غلط ہے. تجربہ تو یہ ہے کہ روپیہ (زیادہ) ہونے سے عقل کو اور زوال ہو جاتا ہے اور یہ

خود اہلِ اموال کی اقراری ڈگری ہے وہ اس کے مُقِر ہیں اور عام طور سے زبان زد ہے کہ تین روپے میں ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے تو اگر کسی کے پاس ہزار روپے ہوں تو دس بوتلوں کا نشہ ہوا اور جب ایک چلّو شراب میں آدمی اُلّو بن جاتا ہے تو دس بوتلوں میں عقل کہاں ــــ اس لیے وہ مقولہ تجربے کی بنا پر محض غلط ہے عقل سے پیسے کا کیا تعلق؟ ہاں بجائے عقل کے اگر یوں کہا جائے کہ (زیادہ) پیسہ پاس ہونے سے اَکل (کھانا) بڑھتا ہے تو بالکل مناسب ہے۔ آج کل عقل کہاں؟ اَکل ہے، عاقل کہاں؟ آکل (کھانے والے) ہیں کہ ہر وقت پیٹ کی فکر ہے، اِس کا نام رکھا ہے کہ عاقل ہیں ــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اصل رُعب وہ ہے جو عظمت سے ہو اور محض غصّہ سے جو رُعب ہوتا ہے وہ رُعب نہیں دہشت ہے۔ اس صورت میں یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ نقصان نہ پہونچا دے اور اور عظمت کے ساتھ جو رُعب ہوتا ہے اُس میں ایک محبوبانہ شان ہوتی ہے۔ دلکشی ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کے غصّے کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے ــــ

تم کو آتا ہے پیار پہ غصّہ ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خداداد ہیبت کی یہ حالت تھی کہ اگر خود کلام میں ابتدا فرماتے تو دوسروں کی ہمت کلام کرنے کی ہوجاتی تھی ورنہ بڑے بڑے ویسے ہی واپس ہوجاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمت نہیں ہوتی کلام کرنے کی۔ یہ خداداد بات ہوتی ہے ــــ ..... سب خدا کی طرف سے ہے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ رُعب اور ہیبت میں کیا رکھا ہے۔ بندہ بن کر رہنا چاہیے خواہ رُعب ہو یا نہ ہو۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل بڑی دوستی اسی کو سمجھا جاتا ہے کہ آپس میں کوئی ناگوار اور بے لطفی کی بات کبھی پیش نہ آئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حافظ محمد احمد صاحب کی دوستی ضرب المثل تھی۔ اس پر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک بار ان صاحبوں سے استفسار فرمایا کہ میاں تم دونوں میں کبھی رنجش بھی ہوتی ہے؟ عرض کیا کہ ہوتی ہے۔ فرمایا تو اِن شاء اللہ تمہاری دوستی باقی رہے گی۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مبصّر ہوتے ہیں۔ جو چیز دوسروں کے یہاں نقص ہے، اُن کے یہاں کمال ہو، جو دوسروں کے یہاں کمال ہے، وہ اُن کے یہاں نقص ــــ بات یہ ہے کہ یہ حضرات، حقیقت شناس ہوتے ہیں۔ عارف ہوتے ہیں۔ کیسی عجیب، معنی خیز اور پاکیزہ بات فرمائی۔ بظاہر تو معمولی سی بات ہے لیکن حقیقت میں بڑی بات ہے کہ جب تک شکایت رہے دوستی باقی ہے کیونکہ شکایت اُسی وقت ہوتی ہے

جب تعلق کا باقی رکھنا مقصود ہوتا ہے اور قطعِ تعلق کے بعد شکایت کو بے کار سمجھتے ہیں اسی واسطے کسی نے کہا ہے۔ ویبقی الودُّ ما بقی العتابُ (جب تک غصہ و شکایت باقی ہے، محبت بھی باقی ہے) ذوق کا شعر ہے ؎

بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے
بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ جن لوگوں پر ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک زیادہ کرتا ہوں یہ واقعہ ہے کہ اُن کے متعلق یہ جی چاہتا ہے کہ یہ مجھ سے اچھے ہو جائیں گو عام لوگ اس کو عدم مناسبت اور بے تعلقی کی دلیل سمجھتے ہیں۔ دیکھیے جس لڑکے کو اُستاد ڈانٹتا ڈپٹتا ..... رہتا ہے سمجھ لو کہ اُس کی طرف خاص توجہ ہے۔ شفقت ہے۔ اُس کو کسی قابل بنانا چاہتا ہے یا باپ اپنی اولاد کو مارتا ہے تو کیا یہ بے تعلقی ہے؟ کوئی عاقل یہ کہہ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل اور سمجھدار شخص یہی کہے گا کہ اُس کو بنا رہا ہے۔ سنوار رہا ہے ـــ ایک مولوی صاحب یہاں چندے مقیم تھے اور تھے بہت خوش وضع اور پُر تکلف، کبھی اصلاح کے لیے اُن کی روک ٹوک، ڈانٹ ڈپٹ کرتا تو قرائن سے معلوم ہوتا کہ اُن کو (یہ امر) ناگوار ہوتا ہے میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ ہی کو کون غرض ہے۔ میں نے اپنے طرز کو بدل دیا اور اُن پر ظاہر بھی کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ میری تعظیم و تکریم ہونے لگی۔ حالانکہ یہ رنج کی بات تھی مگر سمجھدار اور فہیم شخص ہی کے لیے یہ سب کچھ ہے۔ بدفہم .... کے لیے کچھ بھی نہیں ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ـــ سلطنت اور حکومت تو عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ کسی پر ظلم نہیں کیا۔ عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مظلوم کی ہمیشہ دادرسی کی۔ کسی جگہ کی نسبت معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کسی قابو یافتہ شخص نے .... کسی پر ظلم کیا ہے تو خود تنہا غیر شناسا ہیئت میں پہونچتے اور تحقیق کرتے ...... اور اس کا تدارک کرتے ..... خداداد رُعب تھا۔ ہیبت تھی ـــ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت اور حکومت کرنا تو دینداروں ہی کا کام ہے۔ بے دینوں کا کام نہیں ـــ پھر اگر کہیں بددین مسلّط ہوں تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ان بددینوں میں خوبی نہیں جس کی وجہ سے ان کو سلطنت دی گئی بلکہ ہماری بداعمالی اور ہمارے نقص کی وجہ سے سزا کے طور پر ہم پر ان کو مُسلّط کیا گیا ہے ـــ پھر فرمایا کہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ متبع شریعت اور متبع سُنّت تھے۔ اس لیے وہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کو (خواہ مخواہ) بدنام کیا گیا ہے ـــ میں اُن کے مزار پر گیا ہوں حیدرآباد دکن سے واپسی پر اتفاق ہو گیا ـــ مزار پر جانا

انوار معلوم ہوتے تھے اور یہ اتباعِ سنّت کی برکت ہے ___

فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ جامع مسجد دیوبند میں ہوا۔ ایک مضمون کے سلسلے میں حضرتؒ نے ایک مرتبہ کہا اللہ۔ تمام مجمع ایک دم نیم بسمل کی طرح لوٹنے لگا۔ قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوریؒ بھی موجود تھے وہ جوش میں آکر کہتے ہیں کہ ہاں مولوی جی کبھی کبھی یوں (کبھی تصرف و توجہ) کر دیا کرو۔ یہی میں چاہتا تھا ___ اشارہ تھا ایک قصے کی طرف قاضی صاحبؒ نے حضرت مولاناؒ کو ایک بار مشورہ دیا تھا کہ توجہ بھی دیا کیجیے۔ حضرتؒ نے فرمایا میں کیا جانوں (توجہ دینا) ___ عجیب و غریب زمانہ تھا جب یہ سب حضرات جمع تھے ___

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے بزرگوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں۔ ۱۲۹۵ھ کے آخر سے ۱۲۹۷ھ (اور ۱۳۰۴ھ) تک (قلیل عرصے میں) بہت سے بزرگ اُٹھ گئے ___ مولانا احمد علی صاحب (محدّث سہارنپوریؒ) مولانا محمد قاسم صاحب (نانوتویؒ) مولانا عبد الحی صاحب (فرنگی محلیؒ) (وغیرہم) ___

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ (آج کل) اکثر علماء و مشائخ نے خود ایسا طرز اختیار کر رکھا ہے جس کی وجہ لوگوں کو اُن کو نظرِ تحقیر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ ایسے طرز سے بحمد اللہ اجتناب رکھا ___

فرمایا حضرت؏ مولانا گنگوہیؒ بہت ہی چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے۔ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ البروج، والتین ___ حضرت رحمۃ اللہ علیہ قرآن شریف بہت اچھا پڑھتے تھے اور بالکل سادہ پڑھتے تھے۔ باوجود اس کے کہ حضرت کے دانت نہ رہے تھے مگر حروف اصلی صفات کے ساتھ صحیح مخارج سے ادا ہوتے تھے اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ نہیں کہ بار یک آواز ہو بلکہ دلکش اور متین آواز سے اور اس کے ساتھ وہ خوش آوازی بھی ہوتی تھی جس کی تعریف سلف سے منقول ہے کہ تم جب اس کو پڑھتے سنو تو یہ معلوم ہو کہ خدا سے ڈر رہا ہے ___

؏ مولانا قاضی علی رضا مرحوم ساکن موئی ضلع بریلی راوی کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت تھے اور خانقاہ گنگوہ میں متعدد بار حاضر ہوئے ہیں) مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ اگرچہ حافظ قرآن تھے مگر پارہ عم یتساءلون میں سے ہی ہر جہری نماز میں پڑھتے تھے۔ فجر میں بھی، مغرب میں بھی، عشاء میں بھی۔

الانسان فی القرآن

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

اس عالم آب و گل میں انسان کی حیثیت بڑی عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف قدرت نے اس میں وہ قوتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں جن سے کام لے کر وہ مخلوقات ارضی پر حکمرانی کرتا ہے اجرام علویہ سے اپنی خدمت اور نفع رسانی کا کام لیتا ہے، ہوا میں اڑتا اور فضا میں تیرتا ہے۔ اب تک اس کا مسکن زمین تھی لیکن اب عالم بالا میں شہہ نشینی کی جد و جہد بھی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس وہ دوسری جانب دکھوں، بیماریوں ارضی و سماوی آفات و بلیات کے نرغے میں گھرا ہوا ہے۔ جہاں قدم قدم پر اپنی طاقت و قوت، دولت و ثروت علم و ہنر اور قوت ایجاد و اختراع کے باوجود اسے اپنی کمزوری بے کسی اور ہیچ میرزی کا احساس ہوتا ہے اور بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے:-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

پھر انسان کی فطرت میں ایک جذبۂ نیائش و پرستش اور عاطفہ، محبت و عشق بھی ہے۔ وہ اس جہاں میں حسن و جمال، رنگ و بو، دبدبہ و شوکت اور سطوت و عظمت دیکھتا ہے تو طبعی طور پر وہ ان صفات کے مظاہر کی طرف مائل اور متوجہ ہو کر ان سے ہم آہنگی یا وابستگی پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن جلد یا بدیر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جن چیزوں سے دل لگایا اور جن کو اپنے لیے سرمایۂ راحت و تسکین یا ذریعۂ نجات و سلامتی سمجھا تھا۔ وہ بھی اس کی ہی طرح ناقص، حادث، ناپائیدار اور تغیر پذیر تھیں۔ یہ صورت حال انسان کے لیے سخت اضطراب و کشمکش کا باعث ہوتی ہے اور جب وہ اس سے نکلنا چاہتا ہے تو قدرتی طور پر سب سے پہلا سوال اس کے دماغ

میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟ اور میری غرض تخلیق کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سب سے اہم، مقدم اور بنیادی سوال یہی ہے اور جب تک انسان کو اس کا صحیح جواب نہیں مل جاتا میدان عدنیت میں اس کی کوئی جد وجہد اس کی فکری تگ و دو اور اس کی عملی سعی و کوشش ان میں سے کوئی چیز بھی اس کو اطمینان و سکون اور یکسوئی و دلجمعی نہیں دے سکتی۔ اب تمام مذاہب اور فلسفوں کا مطالعہ کر جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان دو بنیادی سوالات کا جتنا واضح اور مکمل جواب قرآن نے دیا ہے کسی نے نہیں دیا ہے۔۔۔۔ تخلیق آدم کا ذکر انجیل میں بھی ہے لیکن بس اس قدر:-

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا۔ اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا کہ تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ آدم جیتی جان ہو پیدا ہوا۔" (پیدائش ۲: ۵-۷)

لیکن قرآن کو دیکھئے، وہ انسان کون ہے؟ وہ کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟ اس میں کون کون سے اعلیٰ صفات اور کمالات ہیں؟ اور نقائص اور کمزوریاں بھی کس قسم کی ہیں؟ اور وہ کس طرح ان نقائص اور کمزوریوں کو دور کر کے اپنی شخصیت کی تکمیل اور اس کے ذریعہ اپنے لیے بقائے دوام کا سر و سامان کر سکتا ہے؟ ان میں سے ہر سوال کا واضح جواب دیتا ہے:

ان سوالات میں جو ترتیب ہے اب ہم اسی کے مطابق ہر سوال کا جواب قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

انسان کون ہے؟ اس سوال کا جواب سورۂ بقرہ کے شروع کی یہ آیت ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ　　اور اس وقت جبکہ تیرے پروردگار نے فرشتوں
إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً　　سے کہا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔

اس آیت میں خلیفہ کا لفظ مطلق ہے یعنی کسی کی طرف مضاف نہیں ہے اس بنا پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کا نائب؟ عام طور پر مشہور یہی ہے کہ اس سے مراد خلیفۃ اللہ ہے چناں چہ صحابہ کرام میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے اور تابعین میں حضرت مجاہد سے مروی ہے لیکن اس قول کو نقل کرنے کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی نے اپنی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس اور حسن بصری سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:۔ انّہ خلف من سلف فی الارض قبلہ:۔ یعنی انسان اس مخلوق کا قائم مقام ہے جو اس کی پیدائش سے قبل زمین

پر آباد تھی علاوہ ازیں ابن خلدون نے (مقدمہ فصل ۲۶) میں جہاں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو بکر کو جب خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں تو ساتھ ہی حضرت ابو بکر کے قول کی توجیہہ یہ بھی کی ہے کہ استخلاف تو غائب کے حق میں ہوتا ہے نہ کہ حاضر اور موجود کے حق میں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن خلدون کی رائے میں بھی انسان خلیفۃ اللہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں کہیں کسی جگہ خلیفہ کے لفظ کی اضافت، اللہ کی طرف نہیں ہے اور غالباً کوئی صحیح حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فرمایا گیا ہو۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن مجید میں خلیفہ کا لفظ اپنی جمع کے ساتھ متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے اور ان سب جگہ ایک قوم کے دوسری قوم کے جانشین ہونے پر مستعمل ہوا ہے، چناں چہ سورۃ الانعام میں ہے:

وھو الذی جعلکم خلٓئف	اور وہ خدا وہ ہے جس نے تم کو ایک دوسرے کا
الارض ورفع بعضکم فوق	جانشین بنایا ہے اور تم میں سے بعض کا مرتبہ
بعض درجٰت لیبلوکم فیما	بعض سے اونچا کیا ہے تاکہ اس نے تم کو جو کچھ
آتاکم۔	دیا ہے اسی میں وہ تم کو آزمائے۔

اس مضمون کو سورۃ النمل میں ربانی احسانات و انعامات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح فرمایا گیا ہے

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ : اور وہ خدا تم کو زمین پر اگلوں کا نائب کرتا ہے۔

سورۃ الاعراف میں بعض ان قوموں کا نام بھی لے لیا گیا ہے جن کی جانشینی ان کے بعد آنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی چناں ارشاد ہوا:

واذکروا اذ جعلکم خلفاء	اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ اللہ تعالیٰ نے
الارض من بعد قوم نوح۔	تم کو قوم نوح کے بعد ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔

اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا:

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد	اور یاد کرو جب کہ خدا نے عاد کے بعد تم کو
عاد وبوّأکم فی الارض :	ان کا جانشین بنایا اور اسی نے تم کو زمین پر ٹھکانا دیا

ان آیات سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں بھی خلیفہ سے مراد اس مخلوق کا جانشین ہوتا ہے جو تخلیق آدم سے قبل زمین پر موجود تھی لیکن سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں خصوصاً اور دوسری

سورتوں میں عموماً تخلیق آدم کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اگر اس کو تمام تر پیش نظر رکھا جائے اور اس کے اسلوب بیان اور اس کے اجزاء پر غور کیا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ لفظ خلیفہ سے خلیفۃ اللہ مراد ہو یا نہ ہو لیکن اس سے اس مخلوق کا جانشین جو آدم سے پہلے زمین پر موجود تھی ہرگز مراد نہیں ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ کلام مجید میں خلائف اور خلفاء کے الفاظ سابقہ قوموں کے جانشینوں کے معنی میں آئے ہیں جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس معنی میں خلافت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بڑی نعمت قرار دیا ہے اور اس پر بندوں سے شکر گزاری اطاعت خداوندی اور عدم فساد فی الارض کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ لیکن تخلیق آدم کے قصہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی شان ہی عجیب اور بالکل نرالی ہے۔ یہاں ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے اپنی مشیت کا اظہار کرتا ہے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اب تک فرشتوں نے ارضی مخلوق کو جیسا ظالم، سفاک اور بے رحم پایا تھا سمجھے کہ اب زمین پر جو ایک نئی مخلوق آدم کی پیدا ہونے والی ہے وہ بھی ایسی ہی ظالم اور سفاک ہوگی اور خدا جس کو خلیفہ بنائے اسے ان کے خیال میں لازمی طور پر سبحہ گرداں و تقدیس مآب ہونا چاہیے۔ اس بنا پر خدا سے اس کی مشیت کا علم ہوتے ہی ان کے دل میں ایک کھٹک پیدا ہوئی۔ اور وہ اپنے تعجب کا اظہار بہ شکل استفہام کر ہی بیٹھے کہ اے خدا کیا تو اس مخلوق کو خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد انگیزی اور خونریزی کرے گی حالانکہ ہم تو تیری حمد میں زمزمہ سنجی کرتے اور تیری تقدیس بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ان دونوں میں سے کسی ایک بات کی نہ تردید کی اور تغلیط۔ بلکہ صرف یہ فرمایا انی اعلم مالا تعلمون ۰ تم جن چیزوں کو نہیں جانتے، میں جانتا ہوں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتوں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا بلکہ یہ سمجھنا غلط تھا کہ خلافت کے استحقاق کا دارومدار صرف تسبیح و تقدیس پر ہے۔ اس بنا پر جو چیز درحقیقت وجہ استحقاق خلافت تھی اب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے ہونے والے خلیفہ یعنی آدم کو تمام حقائق اشیاء کا علم عطا فرمایا اور پھر عالم کائنات سے پردہ اٹھا کر فرشتوں سے اس کی حقیقت دریافت کی تاکہ ان کے استحقاق خلافت کے دعوے کا جھوٹ سچ ہونا ظاہر ہو جائے۔ فرشتوں کو ان حقائق اشیاء کا علم کہاں تھا؟ فوراً اپنی عاجزی، درماندگی کا اعتراف کر لیا۔ اس کے بعد آدم کو علم حقائق عطا ہو ہی چکا تھا۔ اب اس سے پوچھا گیا تو اس نے تمام حقائق بیان کر دیئے اور اس طرح خدا نے فرشتوں کو بتایا کہ خلافت کا دراصل کیا راز ہے اور اس کی کیا اساس ہے! یہ تو تھی استحقاق خلافت اور اس کی اہلیت و صلاحیت کی بات۔ اب خدا نے یہ بتانا چاہا کہ جو مخلوق پروانۂ خلافت سے سرفراز کی گئی ہے، اس کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اس بنا پر فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ

خلیفہ کو نذرانۂ عقیدت پیش کریں۔ انھوں نے بے چوں و چرا اس تعمیل کی۔ یہ مطالبہ ابلیس سے بھی تھا لیکن وہ اکڑ گیا اور تعمیل حکم سے سرتابی کر بیٹھا۔ اس کی پاداش میں وہ راندۂ درگاہ قرار پایا اور یہیں سے ایمان و کفر کی معرکہ آرائی کے دور کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب کہ آدم سے لغزش ہو جاتی ہے اور اس سے ان کی بے راہ روی ہوتی ہے قرآن میں اس لغزش کو اس طرح بیان کیا گیا ہے فعصیٰ آدم ربّہٗ فغوی۔ یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ راہ سے بے راہ ہو گیا۔ اس کی ان کو یہ سزا ملی کہ جنت سے نکلنا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ جب آدم کو زمین میں کار خلافت دینا تھا تو بہرحال انھیں زمین میں آنا تھا تو پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک نافرمانی کی پاداش میں انھیں جنت سے زمین میں آنا پڑا۔؟ اصل یہ ہے کہ آدم کی نافرمانی کا واقعہ کوئی الگ اور منفرد واقعہ نہیں ہے بلکہ ما قبل سے مربوط اور استحقاق خلافت کا ہی تتمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بتانا تھا کہ کار خلافت وہی مخلوق انجام دے سکتی ہے جس میں خیر و شر، نیکی و بدی اور طاعت و معصیت دونوں کی صلاحیت ہو۔ جو نرم بھی ہو سکتا ہو اور گرم بھی۔ جو سیدھے راستے پر چل سکتا ہو اور بہک بھی سکتا ہو اور یہ تنوع آدم میں ہی پایا جاتا ہے۔ نہ کہ فرشتوں میں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے ارتکاب معصیت کر ہی نہیں سکتے جس طرح دلیری وہی معتبر ہے ... جس میں قہاری بھی ہو۔ اسی طرح وہی طاعت وقیع تر ہے جو معصیت کوشی کی صلاحیت کے ساتھ ہو پھر آدم کے لیے جس کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ کسب خیر و شر کی یہ صلاحیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ ابلیس کی نافرمانی اور راندہ درگاہ ہونے کے بعد اس کے چیلنج لاغوینھم اجمعین نے زمین پر نزاع خیر و شر اور آویزش طاعت و معصیت کا ایک مستقل ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اور اس سے وہی مخلوق عہدہ برآ ہو سکتی تھی جس میں قوت شہوی بھی ہو اور قوت غضبی بھی۔ اور ان قوتوں میں افراط و تفریط بھی ہو سکتی ہو اور اعتدال بھی۔ افراط و تفریط سے رذائل اخلاق پیدا ہوتے ہوں اور اعتدال سے فضائل اخلاق! ظاہر ہے یہ صفات آدم میں ہی پائے جاتے تھے۔ اس بنا پر جنت میں آدم کی لغزش درحقیقت اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ خلافت کا استحقاق صرف آدم کو ہے، فرشتوں کو نہیں اور اسی حقیقت کو مرتسم کرنے کی غرض سے قرآن میں تخلیق آدم کے قصہ کے ساتھ اس واقعہ کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ سب اجزا ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔

بہرحال تخلیق آدم کا واقعہ جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا مکالمہ، اللہ تعالیٰ کا آدم کو تمام حقائق اشیاء کا علم عطا فرما دینا اور پھر فرشتوں کا ان حقائق کے بیان کر دینے سے عاجز

نہ جاننا اور آدم کا اس میں کامیاب ہونا' اس کے بعد آدم کا مسجود ملائکہ بننا اور ابلیس کا سرتابی کرنا اور آخر میں آدم کا ہبوط الی الارض۔ یہ سب چیزیں مجموعی طور پر اسی بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً میں خلیفہ سے مراد زمین کی پیشرو مخلوق کا جانشین ہونا نہیں ہے۔ اور جب یہ معنی مراد نہیں ہیں، تو پھر کیا مراد ہیں' اس کا جواب بجز اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس سے مراد اللہ کا نائب ہونا ہے۔ نائب۔ جیسا کہ ابن خلدون نے کہا ہے۔ صرف غائب کا نہیں ہوتا بلکہ حاضر کا بھی ہوتا ہے اور خدا کے نائب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو خدا کی طرف سے کچھ فرائض سونپے گئے ہیں اور ان فرائض کا ادا کرنا ہی اس کی تخلیق کا مقصد اور غرض و غایت ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کے سلسلہ میں جگہ جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

"مرا داے جہاں را تو بساری تو بینی"

اُردو میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں کہیں خلیفۃ اللہ مذکور نہیں ہے لیکن بعض مقامات پر ایسے اشارات ضرور ہیں جن سے انسان کی نیابت الٰہی پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً سورۂ النور میں اللہ تعالیٰ نے مال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے:

وآتوھم من مال الله الذی آتاکم (رکوع ۴)	اور تم ان (غلاموں) کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اور سورۂ الحدید میں فرمایا گیا

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۔ (رکوع ۱)	اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں خدا نے تم کو نائب بنایا ہے۔

دونوں آیتوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مال دراصل اللہ کا ہی تھا۔ لیکن اس نے انسانوں کو اس میں نائب بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں اِنَّ اللّٰهَ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے یداللہ

فوق ایدیھم: اللہ کا ہاتھ انکے ہاتھوں پر ہے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ ارشاد "ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی" اور آپ نے کنکریاں نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ یہ اور اسی طرح کی بعض اور آیات مثلاً ونحن اقرب الیکم من حبل الورید: اور ہم شہ رگ گردن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہیں" قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، پھر اللہ تم سے محبت کرے گا۔ "فاذکرونی اذکرکم": تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ یہ سب بطور اقتضاء النص انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔"

بحیثیت خلیفہ انسان کے فرائض اس خلیفہ کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ قرآن کی رو سے وہ دو ہیں:

۱. بندہ بنے رہنا اور بندوں کی طرح زندگی بسر کرنا۔

۲. کار جہاں اور تعمیر گیتی کے کاموں کا انجام دینا۔

نمبر ایک کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں احکام خداوندی کے ماتحت اسی طرح رہنا ہے جس طرح غلام آقا اور محکوم حاکم کے احکام کے ماتحت رہتا ہے اور نمبر ۲ سے یہ مراد ہے کہ خدا نے اسے وعلم آدم الاسماء کلھا کے ارشاد کے مطابق جو علم کائنات عطا فرمایا ہے۔ اس سے کام لے کر زندگی میں حسن ترتیب و تنظیم اور زیبائش و آرائش پیدا کرنی چاہیے۔ اب قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے تو نظر آئیگا کہ بس یہی دو چیزیں ہیں جن کے متعلق احکام و تمثیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حضرت داؤد کو جب خلیفہ بنایا گیا تو ارشاد ہوا:

یٰداؤد انا جعلناک خلیفۃً فی	اے داؤد ہم نے تجھ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے اس
الارض فاحکم بین الناس بالحق	لیے تو لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ
ولا تتبع الھوی فیضلک عن	فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ یہ
سبیل اللہ۔	پیروی اللہ کے راستہ سے منحرف کر دے گی۔

اسی آیت میں خلیفہ بصیغۂ واحد اور بغیر اضافت کے ہے اور پھر حضرت داؤد پیغمبر ہونے کے باعث اللہ کی طرف سے تبلیغ و تنفیذ احکام الٰہیہ کے لیے مامور بھی تھے۔ اس بنا پر یہاں خلیفہ سے مراد یقیناً خلیفۃ اللہ ہے لیکن جہاں خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ نہیں ہے۔ وہاں بھی خلیفہ کے فرائض وہی بتائے گئے ہیں

جو خلیفۃ اللہ کے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی اصطلاح اور اس کی زبان میں یہ گنجائش ہے کہ یہ شخص یا یہ قوم اللہ کی خلیفہ ہے یا اپنے سے پیش رو شخص یا قوم کی خلیفہ ہے۔ بہر حال نفس خلافت کا مقتضا یہ ہے کہ خلیفہ اطاعت خداوندی کرے۔ زمین میں امن و امان قائم کرے۔ فتنہ فساد کا خاتمہ کرے اور زندگی کو سنوارنے بنانے اور اسے تکمیل و ترقی کی منزل تک پہنچانے کا کام انجام دے۔ چناں چہ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے:

واذکروا اذ جعلکم خلفاءَ من بعد قوم	اور خدا کا وہ احسان یاد کرو جب کہ اس نے تم
نوح و زادکم فی الخلق بصطۃً	کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تن و
فاذکروا آلاءَ اللہ لعلکم تفلحون ۝	توش کا پھیلاؤ بھی تم کو اوروں سے زیادہ دیا
(الاعراف)	تو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

پھر چند آیات کے بعد ہی فرمایا گیا:

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد	اور خدا کا وہ احسان یاد کرو جب کہ اس نے تم کو
عادٍ و بوّاکم فی الارض تتخذون من	قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تم کو زمین
سھولھا قصوراً و تنحتون الجبال بیوتاً	زمین پر اس طرح بسایا کہ تم میدان میں تو محل
فاذکروا آلاءَ اللہ ولا تعثوا فی الارض	کھڑے کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے
مفسدین۔	ہو تو اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد
(الاعراف)	پھیلاتے مت پھرو۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آدم کسی شخص واحد کا نام ہو جیسا کہ جمہور علما اور مفسرین کا خیال ہے اور قرآن سے بھی بہ ظاہر اس کی ہی تائید ہوتی ہے یا اس سے مراد نوع انسان ہو جیسا کہ بعض حضرات کی رائے ہے۔ بہر حال خلافت آدم سے مراد خلافت نوعی ہے نہ کہ فردی اور شخصی کیونکہ تخلیق آدم کے وقت ملاء اعلیٰ میں جو ہنگامہ برپا ہوا وہ اس وقت ہرگز نہیں ہو سکتا تھا جب کہ معاملہ صرف کسی ایک شخص کا ہوتا اور وہ اس عالم آب و گل میں آنے کے بعد حیات مستعار کے چند برس گزارنے کے بعد یہاں واپس چلا جاتا۔ اس بنا پر اگر چہ ذکر شخص واحد کا ہے لیکن اس کی تخلیق کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کا تعلق اسی نوع سے ہے جس کی نمائندگی یہ شخص کر رہا تھا۔ چناں چہ ایک اور آیت میں اس خلافت کو امانت کہا گیا اور اس کی نسبت انسان کی طرف کی گئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات	ہم نے امانت آسمانوں پر زمین پر اور پہاڑوں پر پیش
والارض والجبال فابین ان یحملنھا	کی تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور
واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ	انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا۔ بے شک انسان
کان ظلوماً جھولاً۔	بڑا ظالم اور جاہل تھا۔

بہرحال انسان اب خلیفہ تھا اور نیابت خداوندی کے شرف و مجد کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا تھا تو ضروری تھا کہ اپنے دوگانہ فرائض منصبی ادا کرنے کے لیے جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اس کو اس ساز و سامان سے آراستہ کیا جائے جن کی مدد سے وہ اپنے فرائض کو باحسن وجوہ انجام دے سکے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فرض اول یعنی اطاعت و امتثال احکام خداوندی کے سلسلہ میں انبیاء و رسل کی بعثت کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جو تکمیل دین کے بعد نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا اور غرض دوم یعنی اصلاح و تعمیر جہاں کے لیے اس نے ایک طرف اسے عقل عطا فرمائی اور اس میں حقائق اشیاء کے ادراک و دریافت کی طاقت و استعداد ودیعت فرمائی اور دوسری جانب کائنات ارضی و سماوی کو اس کے زیر نگیں کر دیا۔ چناں چہ ارشاد ہوا۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی	کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لیے ان چیزوں
السمٰوات وما فی الارض واسبغ	کو جو آسمانوں میں ہیں اور ان چیزوں کو جو زمین
علیکم نعمہٗ ظاھرۃً وباطنۃً	میں ہیں مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور
(لقمان)	باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

اس آیت میں کائنات ارضی و سماوی کا ایک جامع بیان ہے۔ اس کے علاوہ بھی آیات بکثرت ہیں جن میں بعض خاص اور اہم چیزوں کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

وسخر لکم الشمس والقمر دائبین	اور اس نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو جو ایک
وسخر لکم اللیل والنھار ۰	دستور پر چل رہے ہیں، مسخر کر دیا۔ اور تمہارے
وآتاکم من کل ما سألتموہ ط	لیے دن اور رات کو مسخر کر دیا اور اس نے تم کو وہ
(ابراہیم)	سب کچھ دیا جس کا تم نے اللہ سے سوال کیا تھا۔

علاوہ ازیں سورۃ النحل کا مطالعہ کیجئے اس میں چاند سورج ستارے، سمندر، نباتات اور حیوانات، پانی اور کشتی وغیرہ کا ذکر الگ الگ ہے اور ان کا نام لے کر فرمایا گیا ہے کہ یہ سب چیزیں انسان کے فائدہ اور اس کی

خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ظاہر ہے کہ کسی شے سے انتفاع اور استخدام اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس چیز کے خواص اس کی اصل ماہیت اور حقیقت کا علم نہ ہو۔ اور صرف علم کافی نہیں۔ بلکہ اس چیز کو اس کی دسترس میں ہونا چاہیے اور اس میں تصرف کرنے کی طاقت و قوت اور صلاحیت و استعداد بھی ہونی ضروری ہے۔اس کا نام ایجاد و اختراع اور ترتیب و تنظیم ہے۔ اس موقع پر یہ یاد دلانا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ یہ اور اسی نوع کی دوسری آیات ہیں جن کی اسپرٹ سے سرشار ہو کر مسلمانوں نے دور عروج و اقبال میں کائنات ارضی و سماوی سے متعلق علوم و فنون کے چمن کھلائے اور ان کو اس درجہ ترقی دی کہ محققین یورپ کے بقول مسلمانوں کے یہی علوم و فنون ...موجودہ مغربی ثقافت (WESTERN CULTURE) کی بنیاد یا ان کا سنگ میں قرار پائے۔

اور جب انقلاب روزگار کا شکار ہو کر استاد بہت پیچھے رہ گیا اور شاگرد نے علوم و فنون میں قیادت کی زمام سنبھال لی تو اقبال نے ترجمان حقیقت بن کر پوچھا:

آتی ہے دم صبح صدا عرش بریں سے　　　کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق　　　ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا جو بے ساختہ زبان قلم سے ٹپک پڑا۔ اور اس لیے کہ دل

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

بہر حال اب جبکہ انسان کو خلافت الٰہی کے فرائض انجام دینے کی منزل میں قدم رکھنا تھا تو جس طرح بادشاہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرتا ہے تو راستہ کے تمام نشیب و فراز۔ اس کی دقتیں اور دشواریاں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے سب کچھ سمجھا دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ضروری تھا کہ انسان کو یہ بتا دیا جائے کہ اس کے راستے میں کیا کیا خطرے اور اندیشے ہیں۔ اس میں کون کون سی گھاٹیاں اور وادیاں ہیں۔ کیا کیا نشیب و فراز ہیں اور ان سب سے دامن بچاتے ہوئے اسے کس طرح سفر کرنا ہے۔ ساتھ ہی خود اس میں کیا کیا کمزوریاں اور گمراہ ہو جانے کی صلاحیتیں ہیں اور وہ اپنی اصل ساخت میں کیا ہے۔ یہ سب کچھ بھی اسے جتا دینا ضروری تھا تاکہ وہ نہ گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا ہو اور نہ احساس کمتری کا شکار بنے۔ چناں چہ قرآن نے رہنمائی کے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ اس نے پہلے انسان کی ساخت کو بیان کیا اور بتایا:

(۱) خلق الانسان من صلصال کالفخار (رحمٰن)	ہم نے انسان کو کمہار کی مٹی سے بنایا۔
(۲) انا خلقنٰہم من طین لازب (الصّٰفّٰت)	ہم نے انسان کو چپکتی مٹی سے بنایا۔
(۳) ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون (حجر)	ہم نے انسان کو کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے بنایا۔
(۴) ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین (مومنون)	اور بے شبہ ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا۔

یہ سب کچھ اس لیے فرمایا گیا کہ گھمنڈ سب سے بری بلا ہے۔ شیطان بھی اسی سے مارا گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان بھی منزل حیات کے کسی مرحلے میں اسی میں مبتلا ہو کر اپنا سب کچھ کیا کرایا غارت کردے چناں چہ ارشاد ہوا: فلینظر الانسان مم خُلِق ۔ پس انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے ــــ ایک اور آیت میں ارشاد ہوا: اولم یر الانسان انا خلقنٰہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین: کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے[1]۔ یہ اور اسی طرح کی اور بھی آیات تو انسان کے مادۂ تخلیق اور اس کی خلقت کی اصلیت سے متعلق ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کی نفسانی قوتوں کا کیا حال ہے؟ اسی سلسلہ میں ارشاد ہوا: فالھمھا فجورھا وتقوٰھا نفس انسانی میں معصیت کوشی اور پرہیزگاری دونوں کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کی نسبت کہا گیا: وھدینٰہ النجدین ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ اب انسان کو یہ بھی بتانے کی ضرورت تھی کہ طبیعت بشری میں کیا کیا کمزوریاں ہیں جن سے ہوشیار اور باخبر رہنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوا خلق الانسان ضعیفاً انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کی یہ کمزوری مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی جلد بازی کی صورت میں خلق الانسان من عجل : کبھی تھڑدلی کی صورت

---

[1] اس موقع پر یہ یاد رکھنا بھی مفید ہوگا کہ علمائے حیاتیات کے نزدیک انسان کا مادۂ حیات جن عناصر سے مرکب ہے یعنی کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائیٹروجن، سلفر، فاسفورس، کلورین، پوٹیشیم، سوڈیم، کیلشیم، آئرن وغیرہ وہ سب اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی اجزاء مختلف کیمیادی مرکبات کی شکل میں مٹی کے اندر موجود ہیں۔ اور جیسا کہ محمد احتشام علی صاحب نے اپنی قابل قدر کتاب "قرآن مجید اور تخلیق انسانی" میں لکھا ہے۔ چونکہ مادہ حیات (PROTOPLASM) کے کیمیادی اجزا کے علاوہ اور بہت سی کیمیادی اشیا بھی مٹی میں پائی جاتی ہیں اس بنا پر سلالۃ من طین یعنی مٹی سے چنی ہوئی چیز ہی فرمایا گیا۔

میں ان الانسان خلق ھلوعاً۔ اذا مسّہ الشرّ جزوعاً ۥ وّ اذا مسّہ الخیر منوعاً ؁ ؀
انسان بڑا تھڑ دلا پیدا کیا گیا ہے جب اس کو شر پہنچتا ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اس کو خیر پہونچتا ہے تو وہ۔
... منع کرنے لگتا ہے۔ مال و دولت کا بڑا رسیا ہے۔ وانہ لحب الخیر لشدید۔ اسے سینت سینت
کے رکھتا ہے اور اسے اپنی بقائے ودوام کا ذریعہ جانتا ہے۔ الذی جمع مالاً وعددہ یحسب
ان مالہ اخلدہ: دولت و ثروت کی بہتات پر اکڑ فوں دکھاتا اور خدا سے غافل ہو جاتا ہے الھٰکم
التکاثر: لیکن ان خلقی اور طبعی کمزوریوں کے باعث انسان کو مایوس بددل اور غمگین نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس کی
نطرت فطرۃ اللہ ہے فطرۃ اللہ الّتی فطر الناس علیھا: خدا نے اس کو بہترین سانچہ میں پیدا
کیا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم: اور خدا نے اس کو بڑا مکرم بنایا ہے۔
ولقد کرمنا بنی آدم اور پھر خدا اپنے بندوں کو دیکھنے والا اور اُن پر رحم کرنے والا بھی ہے واللہ
رؤف بالعباد اور واللہ بصیرٌ بالعباد۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں خیر،
صلاح اور تقویٰ ہے اور اس میں شر، بدی اور معصیت کوشی عوارض اور خارجی اسباب وعوامل سے پیدا ہوتی
ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں صاف ارشاد بھی ہے: کل مولودٍ یولد علیٰ فطرۃ الاسلام
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ خلافت آدم
چونکہ ایک شخصی اور انفرادی خلافت نہیں ہے بلکہ نوعی ہے اور نوع کا خارج میں کوئی مستقل وجود نہیں
نہیں ہوتا بلکہ افراد کے ضمن میں اس کا تحقق ہوتا ہے۔ اور افراد سب ایک سے نہیں ہو سکتے اس بنا پر جس طرح
محض کسی شریف اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کی اساس پر کوئی شخص شریف اور اعلیٰ مرتبت نہیں ہوتا۔
اسی طرح محض بنی نوع انسان کا ایک فرد ہونے کے باعث کوئی فرد بشر خلافت کے اعزاز کا مستحق نہیں ہو سکتا
اور اس کا استحقاق صرف ان لوگوں کا ہوگا جو خلافت الٰہی کے فرائض و واجبات اور اس کے شرائط و لوازم کو
پورا کر رہے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ان فرائض و واجبات خلافت کا نام ایمان اور عمل صالح ہیں چنانچہ
قرآن نے افراد بنی نوع انسان میں یہ تفریق اور تقسیم بار بار بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا:
والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق
وتواصوا بالصبر سورہ والتین میں ارشاد ہوا: ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

ثم رددنٰہ اسفل سافلین ہ الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فلھم اجرٌ غیر ممنون۔

سورۂ معارج میں جہاں انسان کے تھڑدلے پن کا بیان ہے. وہاں اس کمزوری کے ذکر کے بعد استثنا کی شکل میں ایمان اور عمل صالح کے صفات اور اس کے اقسام کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے. اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خلافت الٰہی کے اعزاز اور شرف و مجد انسانی کی قبائے زرین صرف انھیں افراد بنی نوع انسان کے قد و قامت پر راست آسکتی ہے جو ایمان اور عمل صالح کے زیور سے آراستہ ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو نوع انسان کی اصل روایات کے حامل ہیں اور اسی لیے اس نوع کا وقار اور بھرم انھیں کے دم قدم سے قائم ہے محفل ہستی کی رونق اور چمن زار عالم کی بہار یہی ہیں. بہر حال انسان دو ہیں. ایک بمرتبۂ کلی اور دوسرا بمرتبۂ جزئی. پہلا انسان وہ ہے جس کی نسبت غالبؔ نے خدا سے شکوہ کیا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اور یہ دوسرا انسان وہ ہے جس کے متعلق غالبؔ نے ہی کہا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور یہی وہ دوسرے قسم کا انسان ہے جو اقبالؔ کا مردِ مومن ہے اور جس کو اس نے آواز دیکر کہا تھا:

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ معمارِ حرم باز بتعمیر جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

(برہان دہلی)

حرمین پاک کی حاضری

—— محمد منظور نعمانی

رابطۂ عالم اسلامی کا اجلاس جو گزشتہ چند سالوں سے مکہ معظمہ میں رجب میں ہوتا تھا۔ اس سال وہ شعبان میں ہوا۔ یہ عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں اس میں شرکت کے لیے ۱۴ اکتوبر کو (جبکہ حجاز مقدس میں شعبان کی تیسری تاریخ تھی) مکہ مکرمہ پہنچے۔ اور عمرہ ادا کرنے کے بعد اجلاس میں شریک ہو گئے — حسب معمول اجلاس دو ہفتے جاری رہا — ۱۴ شعبان (۲۵ اکتوبر) کو اجلاس ختم ہوا۔ اگلے دن ہم لوگ مدینہ طیبہ چلے گئے۔ وہاں بھی تقریباً دو ہفتے قیام نصیب رہا۔ مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا (شیخ الحدیث) دامت برکاتہم کا قیام بھی ان دنوں وہیں تھا — حضرت ممدوح آخر اپریل میں تشریف لے گئے تھے اندازہ یہ تھا کہ رمضان مبارک سے پہلے واپسی ہو جائے گی۔ لیکن بعد میں رمضان مبارک وہیں گزارنا طے فرمالیا — شروع میں چند روز مکہ مکرمہ قیام رہا تھا۔ اس کے بعد سے مدینہ طیبہ ہی مستقر رہا — الغرض جب ہم لوگ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضرت وہیں مقیم تھے اور یہ بھی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک مستقل نعمت تھی۔

حضرت شیخ کا قیام مسجد نور میں تھا جو مدینہ طیبہ کی آبادی سے باہر جنت البقیع کی جانب اس سے تقریباً ۳۔۲ فرلانگ کے فاصلہ پر ایک نو تعمیر مسجد ہے جس کے آس پاس چند مکانات بھی ہیں۔ یہ مسجد مدینہ طیبہ میں تبلیغی کام کرنے والوں کا گویا مرکز ہے۔ اور انھوں نے خود ہی حال ہی میں بنائی ہے — بہرحال حضرت شیخ اور ان کے رفقا کا قیام اسی مسجد سے ملحق ایک مکان میں تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز مسجد نبوی میں ادا فرماتے تھے، بلکہ دن کے اوقات کا بڑا حصہ بعد عشا تک مسجد شریف ہی میں گزرتا تھا، مسجد نور والے مکان میں صرف رات کے اس حصہ میں قیام رہتا تھا جس میں مسجد شریف کے دروازے بند رہتے ہیں، اس کے علاوہ فجر کے بعد ذکر کا حلقہ بھی وہیں ہوتا تھا اس کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اور چاشت کے نوافل پڑھ کر مدرسہ شرعیہ تشریف لے آتے اور وہاں بیٹھ کر

ضروری خطوط لکھواتے، اس کے بعد عشاء تک کے لیے مسجد شریف میں تشریف لے آتے اور اس پورے وقت میں اپنے اشغال و معمولات میں مشغول رہتے۔

ہم لوگ روزانہ دو وقت خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک صبح نماز فجر کے بعد جو ذکر کے حلقہ کا وقت تھا۔ دوسرے عشاء کے بعد دسترخوان پر، اس طرح رات کو روزانہ ہم حضرت شیخ ہی کے مہمان ہوتے تھے ـــــ دن رات کے چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں بس یہی وقت یعنی عشاء کی نماز سے واپسی کے بعد دسترخوان پر مہمانوں اور دوستوں سے حضرت شیخ کے ملاقات اور بات کرنے کا وقت تھا، دن میں اکثر تو روزہ ہوتا اور روزہ نہ ہونے کی صورت میں بھی دن میں کھانے کا معمول بالکل نہیں تھا۔

حضرت شیخ الحدیث نے اپنے بارے میں طے فرما رکھا تھا کہ رمضان مبارک کا پہلا عشرہ مکہ معظمہ میں گزاریں گے۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ آجائیں گے اور اخیر عشرہ کا اعتکاف مسجد نبوی ہی میں کریں گے۔ ہم لوگ بھی رمضان مبارک کا پہلا عشرہ مکہ معظمہ ہی میں گزارنا چاہتے تھے ـــــ ۲۸ شعبان کو طے ہو گیا کہ انشاء اللہ کل ۲۹ شعبان کو مکہ معظمہ کے لیے روانگی ہوگی۔

۲۹ شعبان کو اتوار کا دن تھا، چاشت کے وقت مدینہ طیبہ ہی میں عمرہ کا احرام باندھا۔ رکعتیں احرام مسجد نبوی میں ادا کیں اور روضۂ اقدس پر رخصتی سلام عرض کر کے حضرت شیخ اور حضرت کے ساتھ ہم لوگ بھی مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت حضرت شیخ کا جو حال دیکھا وہ ہم لوگوں کے لیے بڑا سبق آموز تھا۔

بدر کی منزل مدینہ طیبہ سے قریباً ۱۵۰ کیلو میٹر پر ہے۔ سڑک سے ۲-۳ ہی فرلانگ پر وہ مقام ہے جہاں بدر کا معرکہ پیش آیا تھا اور جہاں شہداء بدر مدفون ہیں۔ اس سے کچھ پہلے راستہ ہی میں وہ مقام ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "عریش" بنایا گیا تھا یعنی سایہ دار جگہ بنادی گئی تھی، صفوں کو ترتیب دینے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی عریش میں نماز اور دعا میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور اسی دعا میں، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیسی اضطراری کیفیت کے ساتھ آپ نے بالکل غیر معمولی قسم کا یہ کلمۂ ناز اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا تھا " اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃ لن تعبد فی الارض بعد " (یعنی اے اللہ اگر تیرے بندوں کی یہ مختصر سی جماعت تیری مشیت اور تیرے حکم سے یہاں ہلاک ہو گئی تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہو سکے گی) اور پھر آسمان سے فرشتے اترے

تھے اور رہ ہوا تھا جو معلوم ہے — اب اس جگہ پر مسجد بنی ہوئی ہے اُس کا نام ہی "مسجد عریش" ہے — پہلے بھی وہاں ایک دو دفعہ حاضری نصیب ہوئی ہے۔ اس دفعہ ہماری موٹریں سڑک پر منزل کے قہوہ خانہ کے بجائے مسجد عریش ہی پر جا کر رکیں، حضرت شیخ تو مسجد میں داخل ہو کے نوافل میں مشغول ہو گئے، ہم لوگ بھی وہیں رہے، بعض رفقاء جن کا پہلا موقع تھا شہداء بدر کی زیارت کو چلے گئے۔ اُن کے واپس آ جانے کے بعد مکہ معظمہ کی طرف روانگی ہوئی۔ اگلی منزل مستورہ تھی، وہاں ایسے وقت پہنچے کہ مسجد میں ظہر کی جماعت تیار تھی۔ اتر کے جماعت سے نماز ادا کی، اس کے بعد وہیں مسجد میں کھانا کھایا، حضرت شیخ کا معمول دن میں کھانے کا نہیں تھا، لیکن اُس دن ہماری رعایت سے ہمارے ساتھ ہی تناول فرمایا، بلکہ ہم سب نے حضرت ہی کے دسترخوان پر حضرت کا ہی کھانا کھایا یہاں کی تلی مچھلیاں مشہور ہیں، حضرت نے ہم لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی تلی ہوئی مچھلی منگوائی، عمر بھر میں کبھی اتنی اعلیٰ قسم کی مچھلی کھانا یاد نہیں۔ (بعد میں ایک ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مچھلی دس ریال میں خریدی گئی تھی) مستورہ سے روانہ ہو کر قریباً ڈھائی گھنٹے میں مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچے کہ حرم شریف میں عصر کی نماز ہو چکی تھی، ہم لوگوں نے مدرسہ صولتیہ اتر کے عصر کی نماز پڑھی۔ اب ہم سب کو عمرہ کا طواف اور اس کے بعد سعی کرنی تھی — حضرت شیخ الحدیث اپنی معذوری کی وجہ سے چونکہ طواف عربیۃ (ہاتھ گاڑی) ہی پر کر سکتے تھے اور اس کی اجازت رات کے ۱۲ بجے سے پہلے (ہمارے یہاں کے ۸ بجے سے پہلے) نہیں ہوتی۔ اس لیے حضرت کو تو اُس وقت تک کا انتظار کرنا تھا۔ ہم لوگوں نے مغرب کی نماز حرم شریف میں ادا کر کے عمرہ کا طواف کیا۔ اور سعی کے لیے مسعیٰ چلے گئے۔ سعی کے آخری پھیرے میں عشاء کی اذان ہو گئی۔ سعی سے فارغ ہو کر ہم نے وہیں عشاء پڑھی، اس کے بعد عمرہ کے اختتامی عمل حلق یا قصر کے لیے مروہ کے قریب ہی ایک جان پہچان والے حلاق کی دوکان پر چلے گئے۔

مسجد حرام میں جب ہم مغرب کے بعد طواف سے فارغ ہوئے اور سعی کے لیے جانے لگے تو مجھے خیال آیا کہ حلاق کو دینے کے لیے ایک ریال بھی اپنے پاس نہیں ہے، اور اندازہ تھا کہ ہمارے مولانا علی میاں کے پاس بھی کچھ نہ ہوگا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے قاری محمد سلیمان صاحب کو بھیج دیا۔ میں نے ان سے کہا کچھ ریال جیب میں ہوں تو دیجئے، اُن کے پاس آٹھ ریال نکلے وہ انھوں نے عنایت فرما دیے، لیکن جب سعی سے فارغ ہو کے ہم لوگ حلاق کی دوکان پر پہنچے تو اس نے بتایا کہ ابھی ابھی مولانا عبداللہ عباس آئے تھے، وہ آپ حضرات کے حساب میں دس ریال مجھے دے گئے ہیں۔

مولانا عبداللہ عباس عشاء کی نماز میں ہمارے ساتھ ہی تھے ہم لوگ تو نماز سے فارغ ہو کر حلاق کی دوکان

چلے گئے تھے اور مولانا موصوف کو میں نے لکھنؤ ایک تار دینے کے لیے تار گھر بھیجا تھا ــــ ابھی تک چاند کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ مولانا عبداللہ عباس تار دے کر حلاق کی دوکان ہی پر آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے تار گھر پر معلوم ہو گیا ہے کہ چاند کی اطلاع ریاض سے آ گئی ہے۔ عنقریب سرکاری طور پر اعلان ہونے والا ہے ــــ چند ہی منٹ کے بعد ریڈیو سے سرکاری اعلان ہو گیا۔ اور رمضان مبارک کے استقبال میں وہاں کے معمول کے مطابق حکومت کی جانب سے توپیں دغنے لگیں ــــ ہم نے قیام گاہ پہونچ کے جلدی جلدی احرام کی چادریں اتاریں اور کپڑے پہنے۔ اسی درمیان کسی نے بتایا کہ حرم شریف میں تراویح کی نماز شروع ہو گئی۔ ہم فوراً حرم شریف آ گئے لیکن ہمارے پہنچنے تک ۴ رکعتیں ہو چکی تھیں، دس رکعتیں ایک امام صاحب نے پڑھائیں، دس دوسرے امام صاحب نے ــــ دونوں نے صرف آدھا آدھا پارہ پڑھا یعنی بیس رکعت میں مشترکہ طور پر صرف ایک پارہ۔ معلوم ہوا کہ یہی یہاں کا معمول ہے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں لیکن دو سلاموں کے ساتھ، جو حنابلہ اور شافعیہ وغیرہ کا طریقہ ہے۔ تیسری رکعت میں رکوع کے بعد بڑے درد اور جوش کے ساتھ بالجہر طویل قنوت پڑھی جو بہت سی ماثور دعاؤں پر مشتمل تھی۔

یہ رمضان مبارک کی پہلی رات تھی اور عشاء کی نماز کے کافی دیر کے بعد چاند کا اعلان ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں کا اندازہ تھا کہ تراویح دیر کے بعد شروع کی جائے گی۔ لوگوں نے ہم سے بھی کہا تھا کہ گھنٹے پون گھنٹے کے بعد تراویح شروع ہوگی، مگر اعلان کے بعد فوراً ہی شروع ہو گئی۔ اس لیے آج کے دن بہت سے لوگ نہیں شریک ہو سکے اور حرم شریف میں جیسا مجمع اور جو منظر رمضان مبارک کی راتوں میں تراویح میں ہوتا ہے۔ وہ پورے طور پر دوسری رات سے دیکھا جا سکا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گنہگار بندہ کو بار بار حرمین پاک کی حاضری اپنے فضل و کرم سے نصیب فرمائی ہے۔ لیکن اس سے پہلے رمضان مبارک میں حاضری کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی　حق یہ ہے کہ رمضان مبارک کی راتوں میں خاص کر تراویح کے وقت مسجد الحرام میں جو حسن و جمال اور جو نورانی سماں ہوتا ہے اس کو کسی طرح بھی الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھنا نصیب فرمائے۔

معلوم ہوا کہ مملکت کے دوسرے شہروں اور علاقوں سے اور قریبی عرب ممالک سے بھی لوگ بہت بڑی تعداد میں صرف رمضان مبارک گزارنے کے لیے مکہ مکرمہ آتے ہیں، بہت سے ملکوں سے حجاج کی بھی اچھی خاصی تعداد رمضان مبارک سے پہلے پہونچ جاتی ہے۔ خود ہمارے ہاں سے بھی حاجیوں کا ایک بحری جہاز آخر شعبان میں پہونچ چکا تھا، اور خود اہل مکہ جس ذوق شوق سے رمضان مبارک میں تراویح کی نماز میں آتے ہیں معلوم ہوا کہ دوسری نمازوں میں اس طرح کبھی نہیں آتے ــــ اس لیے تراویح میں حرم شریف قریب قریب موسم

حج کی طرح بھرا نظر آتا تھا، پھر اس وقت موسم بھی حسن اتفاق سے نہایت خوشگوار تھا۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ فضا میں غیر معمولی قسم کی کچھ روح پرور لہریں جاری ساری ہیں

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا تراویح کی ۲۰ رکعت میں صرف ایک پارہ پڑھا جاتا تھا، اس لیے ضعیفوں اور کمزوروں کے لیے بھی تھکنے کا کوئی سوال نہیں تھا، اور غالباً اسی واسطے تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد بیٹھنے اور سستانے کا وہاں وہ معمول نہیں دیکھا جو ہمارے ہاں ہے بلکہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر کے فوراً ہی کھڑے ہو جانے کا دستور ہے

حرم شریف کے جو دو امام صاحبان تراویح دس دس رکعت پڑھاتے تھے، دونوں حضرات کی قرأت نہایت سادہ ہونے کے باوجود بڑی دلکش ہوتی تھی۔ پورے حرم شریف میں لاؤڈ اسپیکر کا اتنا اچھا انتظام ہے کہ صحن میں یا دالانوں میں یا نئے حرم کے کسی بھی حصہ میں آدمی کھڑا ہو جائے بالکل اس طرح سنتا ہے جس طرح امام کے قریب کھڑے ہونے والے سنتے ہیں۔

حرم شریف کی نماز میں امت کے تمام ہی فرقوں اور طبقوں کے نمونے نظر آجاتے ہیں، بعض ایسی باتیں دیکھنے میں آجاتی ہیں جن کے دیکھنے کی آنکھیں بالکل عادی نہیں ہیں۔ اس دفعہ بعض حضرات کو دیکھا کہ تراویح کے لیے امام کے تکبیر تحریمہ کہنے کے ساتھ انھوں نے بھی نیت کر لی، جب امام صاحب نے قرأت شروع کی تو انھوں نے قرآن شریف اپنی جیب سے نکالا اور بڑے اطمینان سے انھوں نے نماز ہی کے اندر ورق گردانی کر کے وہ رکوع نکالا جو آج امام صاحب پڑھ رہے تھے اور امام کی قرأت کے ساتھ ساتھ دیکھتے رہے اور پوری تراویح میں ان کا یہی معمول رہا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض مساجد میں تراویح کی نماز ہی اس طرح ہوتی ہے کہ امام صاحب قرآن شریف جیب میں رکھتے ہیں اور سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد جیب سے نکال کے اس میں دیکھ کے پڑھتے ہیں۔

ـــــــ اور واقفین نے بتایا کہ حجاز مقدس میں بلکہ اکثر بلاد عربیہ میں زیادہ تر مسجدوں میں تو تراویح میں قرآن پاک کی بس آخری چھوٹی چھوٹی سورتیں ہی پڑھی جاتی ہیں۔ ایسی مسجدیں شاذ و نادر ہیں جن میں تراویح میں ہمارے ہاں کی طرح قرآن مجید سنایا جاتا ہو۔ اور یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ وہاں عرصہ سے حفظ قرآن کا رواج بہت کم ہو چکا ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون ۰

پاکستان علاقۂ سندھ کے ایک باتوفیق مسلمان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت کے ساتھ دین کے درد کی نعمت بھی بخشی ہے، انھوں نے اس صورت حال کو دیکھ کر کہ قرآن پاک جہاں نازل ہوا تھا وہاں حفظ

قرآن کا رواج اس طرح ختم ہو رہا ہے، کئی سال پہلے سے وہاں حفظ قرآن کی ایک خاص علمی تحریک چلا رکھی ہے جس کا عنوان "تحفیظ القرآن" ہے، اس تحریک کے ذریعہ انھوں نے حرمین شریفین سے شروع کرکے اب قریب قریب پوری مملکت میں حفظ قرآن کے نظام کا ایک جال بچھا دیا ہے، طریقہ کار یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں میں وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اسکولی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے وہ ایک گھنٹہ حفظ قرآن کے لیے بھی دیدیں۔ جو بچے اس کے لیے تیار ہو جاتے ہیں وہ اُن کو معقول وظیفے دیتے ہیں اور اپنی طرف سے حافظ قاری استاد مقرر کرتے ہیں اور اس کی تنخواہ کی خود ہی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس تحریک کو سعودی حکومت کی بھی پوری معاونت بلکہ کہنا چاہیے کہ سرپرستی حاصل ہے، نیز حجاز مقدس کے کچھ اہل خیر بھی اشتراک عمل اور تعاون کر رہے ہیں، اس کا لاکھوں کا بجٹ ہے ـــــ اب اس تحریک اور کوشش کا یہ نتیجہ اور پھل بھی سامنے آگیا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں تعلیم پانے والے سیکڑوں لڑکے حافظ ہو گئے ہیں، معلوم ہوا تھا کہ ان میں سے ستّر سے زیادہ لڑکے اس سال مختلف مقامات پر مسجدوں میں تراویح میں قرآن پاک سنا رہے ہیں ـــــ ان میں سے دس لڑکے حرم شریف میں بھی تراویح ختم ہو جانے کے بعد مختلف سمتوں اور گوشوں میں نوافل میں قرآن مجید سنا رہے تھے، ان کے پیچھے سننے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہو جاتی تھی، خود راقم سطور نے انمیں سے کسی ایک کا سنا، جن کا سنا بہت ہی اچھا پڑھتا ہوا پایا۔

اللہ کی شان ہے کہ اس کی توفیق اور مدد سے اُس کے ایک بندہ کی ہمت نے حجاز مقدس کے اندر حفظ قرآن کے مستقبل کو جو بالکل تاریک نظر آرہا تھا، ایسا روشن کر دیا ہے۔ یہ صاحب یوسف سیٹھی کے نام سے معروف ہیں، ایک نومسلم خاندان کے فرد ہیں، غالباً اُن کے والد ہی نے (جو ایک بنیے تھے) اسلام قبول کیا تھا اور وصیت کی تھی کہ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس کے لیے سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ کس قدر برمحل ہے اگر کہا جائے۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

رمضان مبارک کی چودھویں رات، مکہ معظمہ میں ہمارے قیام کی آخری رات تھی، اس رات کو ہم لوگ، شیخ صالح قزاز کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ یہ بہت سی حیثیتوں سے مکہ معظمہ کے خواص معززین میں بلند مقام ہیں۔ رابطہ کے نائب امین عام بھی ہیں، بڑی قابل ذکر سعادت یہ ہے کہ حرم شریف کی جدید تعمیر کا سارا کام ان ہی کی نگرانی میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے، حکومت نے ان ہی کو اہل سمجھ کر یہ عظیم ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی گویا یہی اس شعبہ کے مدیر (ڈائرکٹر) ہیں۔ اسم بامسمی شیخ صالح ہیں، تحریک تحفیظ القرآن کے بھی مخصوص

ترین معاون ہیں۔ انھوں نے کھانے پر ہمارے ساتھ یوسف سیٹھی صاحب اور اُن کے رفیق کار ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب کو بھی مدعو کیا تھا، اس موقع پر تحریک کی رفتارِ ترقی پر تفصیل سے گفتگو کا موقع ملا، اسی صحبت میں یہ معلوم ہوا کہ اب لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں میں بھی حفظ قرآن کی سعی کوشش اُسی نہج پر شروع کر دی گئی ہے، اس کے لیے سو حافظ قرآن خواتین کی خدمات حاصل کی جاچکی ہیں اور وہ لڑکیوں کو قرآن پاک حفظ کرا رہی ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی عبرت ہوئی اور دل پر چوٹ لگی کہ تلاش اور کوشش کے باوجود ایک بھی حافظ قرآن حجازی خاتون اس کام کے سلسلہ میں حاصل نہیں ہو سکیں، جو سو خواتین اب تک دستیاب ہوئی ہیں اُن میں سے ایک پاکستانی ہیں اور باقی ۹۹ نادے جاوی ہیں۔ اللہ کی شان اجاوی، مہبط قرآن حجاز مقدس سے بعید ترین ملک ہے، لیکن اس بیسویں صدی میں بھی قرآن پاک کے ساتھ ایسا تعلق کہ سو میں ننادے حافظات جاوی، مبارک ہو جاوی کو یہ امتیاز اور یہ توفیق! وفی ذالك فليتنافس المتنافسون ٥

بہرحال امید کرنی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حجاز مقدس میں لڑکیوں میں حفظ قرآن کا یہ کام شروع کرا دیا ہے تو انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں سیکڑوں اور اس کے بعد ہزاروں حافظات وہاں ہو جائیں گی۔

اس عاجز نے تحریک حفظ قرآن اور ادارہ تحفیظ القرآن کا کسی قدر تفصیل سے یہ تذکرہ صرف اس امید پر یہاں کر دیا ہے کہ اللہ کے بندے اس سے سبق حاصل کریں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب ہم لوگ وسط شعبان میں مدینہ منورہ پہنچے تو حضرت شیخ الحدیث وہیں مقیم تھے۔ پھر ۲۹ر شعبان کو جب حضرت مکہ معظمہ گئے تو ہم لوگ بھی ساتھ ہی آئے۔ اور جب تک ہم لوگ مکہ معظمہ رہے، حضرت کا قیام بھی وہیں رہا۔

الفرقان کے ناظرین میں یقیناً اچھی خاصی تعداد ایسے حضرات کی ہے جن کا حق ہے کہ حضرت کے شب و روز کا جو نظام حرمین پاک کے زمانۂ قیام میں دیکھا وہ ان تک بھی پہونچا دیا جائے۔ اس لیے کافی فکر و تامل کے بعد چند سطریں اس بارے میں بھی لکھ دینے کا فیصلہ کیا ہے یقین ہے کہ اللہ کے بہت سے بندوں کے لیے یہ تذکرہ انشاء اللہ بہت نافع ہوگا۔ اور یہ عاجز اپنی کم نصیبی اور آرام طلبی کی وجہ سے جو فائدہ آنکھوں سے دیکھ کے نہ اٹھا سکا، انشاء اللہ بہت سے باتوفیق بندے الفرقان کے صفحات میں پڑھ کے اٹھالیں گے، اور پھر رب کریم مجھے بھی ان کے حساب میں اجر سے نوازے گا، اور اس طرح کسی درجہ میں میری محرومی کی انشاء اللہ تلافی بھی ہو جائیگی۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ مدینہ طیبہ میں حضرت کا قیام مسجد نور سے ملحق ایک مکان میں تھا۔ دن کے زیادہ تر اوقات تو نماز عشاء کے بعد تک مسجد نبوی ہی میں گزرتے تھے، لیکن رات کو بعد عشاء جب مسجد شریف کے دروازے بند ہونے کا وقت قریب آتا تھا تو حضرت (نماز فجر تک کے لیے) یہاں قیام گاہ پر آجاتے۔ فوراً ہی دستر خوان لگ جاتا۔ بہت سے مخلصین و محبین اپنے اپنے گھروں سے بھی انواع و اقسام کے کھانے لاتے اور سب شریک ہوتے۔ حضرت شیخ کے کچھ کھانے پینے کا اور دوستوں، نیاز مندوں اور دوسرے آنے جانے والے حضرات سے ملاقات اور بات چیت کا بھی دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بس یہی ایک وقت تھا، اس لیے اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔

دستر خوان پر مختلف انواع و الوان کے اتنے کھانے جمع ہو جاتے جن کا شمار بھی آسان نہ ہوتا۔ اور صاف محسوس ہوتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "حسنۂ دنیا" اور "مائدۂ ربانی" ہے ـــــ حضرت شیخ کا دستر خوان پر بیٹھنے کا یہ پورا وقت اور ساری فکر و توجہ اس پر صرف ہوتی کہ ہر مہمان اور ہر شریک دستر خوان کو حتی الوسع کھانے پینے کی چیزیں پہونچ جائیں اور حسن التفات سے بھی ہر ایک کا دل خوش کیا جائے۔ اور فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر ایک کا حق ادا کیا جائے ـــــ غور کرنے والا دیکھ لیتا کہ خود برائے نام کھا رہے ہیں۔ بس کوئی کوئی چیز چکھ رہے ہیں، صرف دوسروں ہی کو کھلا رہے ہیں۔ اور ان کا دل خوش کرنے کے لیے انتہائی بے تکلفی کے اپنے خاص انداز میں گفتگو فرما رہے ہیں۔ ظریفانہ باتیں اور دلچسپ نقرے سنا رہے ہیں۔ بہت سے نئے آدمیوں کے لیے یہ بات موجب حیرت ہوتی ہوگی کہ دستر خوان پر اپنے مہمانوں اور نیاز مندوں کے لیے اتنا ہشاش بشاش اور ایسی ذائقہ دار باتیں کرنے والا وہی آدمی ہے، جو اس وقت کے علاوہ اپنے باقی سارے اوقات میں اور دن بھر مسجد شریف میں بالکل ساکت و صامت اپنے اشغال و معمولات میں مشغول رہتا ہے ـــــ تھوڑی دیر کی اس دستر خوانی مجلس میں جنت کا لطف آجاتا ـــــ تقریباً پون گھنٹہ اس کھانے کھلانے میں صرف ہوتا۔ اس کے بعد "اِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا"[1] کے قرآنی حکم پر عمل ہوتا اور مجلس ایک دم منتشر ہو جاتی۔ سب لوگ فوراً ہی اپنی اپنی جگہ کو روانہ ہو جاتے اور حضرت بعجلت لیٹ جاتے۔ تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد سویرے ہی تہجد کے لیے اٹھ جاتے اور آخر شب تک اس میں مشغول رہتے۔ فجر کا وقت قریب آنے پر اس کی تیاری فرماتے اگر روزہ کا دن ہوتا تو صبح صادق ہونے سے پہلے چائے کی ایک پیالی پی لیتے۔ کبھی کسی خادم کے اصرار سے اس کے ساتھ ایک دو چمچہ کھانے کی کوئی چیز بھی لے لیتے۔ ورنہ چائے ہی پر اکتفا فرماتے۔ اور بس یہی سحری ہو جاتی۔ پھر اذان فجر سے پہلے مسجد شریف آجاتے۔ نماز فجر کے بعد پھر قیام گاہ واپسی ہوتی۔ اور تقریباً ایک گھنٹہ یعنی اشراق تک ذکر کا حلقہ

[1] جب کھانا کھا چکو تو چلے جاؤ۔ ۱۲

ہوتا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد سب رفقاء اور خدام تو چائے ناشتہ وغیرہ کرتے یا کچھ آرام کرتے لیکن حضرت نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ اور قریباً دو گھنٹے میں فارغ ہوتے۔ اگر روزہ کا دن نہ ہوتا تو اس وقت صرف ایک پیالی چائے پیتے۔ اور عشاء تک کے لیے کھانے پینے سے بالکل فارغ ہو جاتے۔ حجازی وقت کے حساب سے قریباً ۲ بجے (ہمارے یہاں کے قریباً ۱۰ بجے صبح) مدرسہ شرعیہ آجاتے (جو مسجد شریف کے بالکل برابر میں ہے) اور وہاں ضروری ڈاک لکھاتے۔ یا کسی کو تخلیہ کا وقت دیا ہوتا تو اس سے ملاقات اور بات فرما لیتے، پھر وضو وغیرہ سے فارغ ہو کے مسجد شریف آجاتے۔ اور ظہر تک اپنے اشغال و معمولات میں مشغول رہتے۔ نماز ظہر کے بعد پھر مدرسہ شرعیہ ہی میں تھوڑا سا آرام کر کے عصر سے بہت پہلے مسجد شریف چلے جاتے اور اکثر دنوں میں اس وقت سے عشاء تک مسلسل مسجد شریف ہی میں اپنے معمولات میں مشغول رہتے۔

ہفتہ کے ۲۔۳ دنوں میں عصر کے بعد بھی تھوڑی دیر کے لیے مدرسۂ شرعیہ میں تشریف لاتے اور قریباً ایک گھنٹہ مجلس ہوتی۔ جس میں کوئی مفید دینی و اصلاحی کتاب پڑھی جاتی اور کبھی حضرت اپنے بزرگوں کے سبق آموز واقعات سناتے۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں شروع میں قریباً دو مہینے تو مسلسل بلا ناغہ روزے رہے۔ یہ دو مہینے مئی جون کے تھے۔ اس کے بعد سے ایسا نظام تھا کہ اوسطاً مہینے کے نصف دنوں میں روزہ ہوتا تھا اور نصف دنوں میں روزہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا۔ روزہ نہ ہونے کے دن بھی صبح صرف چاشت کے وقت ایک پیالی چائے پیتے تھے۔ پھر جس دن روزہ ہوتا تھا صرف ایک کھجور سے افطار کر کے عشاء تک اوابین اور اپنے معمولات میں مشغول رہتے۔ عشاء کے بعد ہی احباب و رفقاء کے ساتھ دسترخوان پر کچھ کھاتے۔

یہ نظام یا پروگرام تو مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام میں دیکھا ــــ مکہ معظمہ میں آکر رمضان مبارک میں اس پر یہ اضافہ ہو گیا کہ روزانہ رات کو حرم شریف میں تراویح ختم ہونے کے بعد "تنعیم" یا "جعرّانہ" جا کر عمرہ کا احرام باندھتے، وہاں سے آکر طواف اور سعی کرتے اور حلق کراتے۔ اس کے بعد سحر تک کے لیے تہجد میں مشغول ہو جاتے، اور سحر میں بس ایک پیالی چائے پی کے یا کسی خادم کے اصرار سے اس کے ساتھ ایک آدھ چمچہ کوئی چیز لے کر فجر کی نماز کے لیے حرم شریف آجاتے۔ فجر کے بعد قیامگاہ (مدرسہ صولتیہ) آکر تھوڑا سا آرام کر کے پھر چاشت کے نوافل میں اور پھر اس کے بعد تلاوت وغیرہ اپنے معمولات میں اگلی فجر تک کے لیے مشغول ہو جاتے۔ یعنی رمضان مبارک میں آرام رات کو بھی بالکل نہیں۔ بلکہ صرف فجر کے بعد سے چاشت کے وقت تک بس دو ڈھائی گھنٹہ

اس کے علاوہ دن رات میں کسی وقت لیٹنا بھی نہیں ــــ پھر رمضان میں بھی روزانہ صرف ایک کھجور سے افطار کر کے نوافل میں عشاء تک مشغول رہتے۔

یہ سب کچھ ضعف و ناطاقتی کی اس حالت میں ہے کہ برسوں سے یہ کیفیت ہے کہ دو آدمیوں کے سہارے کے بغیر نہ کھڑے سے بیٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھے سے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ نہ دو قدم چل سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر کیا جا چکا دن رات کے ۲۴ گھنٹے میں مشکل سے ۲، ۳ گھنٹے آرام اور سونے کے مستثنیٰ کر کے باقی سارے وقت اپنے اشغال و معمولات میں اس انہماک اور پابندی سے مشغول رہتے ہیں کہ غور سے دیکھنے والا سوچنے لگے کہ یہ بندہ گوشت پوست سے بنا ہوا آدمی ہے یا لوہے سے بنی ہوئی کوئی مخلوق۔

الحمد للہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ایسے نمونے اب بھی موجود ہیں۔ بلاشبہ ہماری اس دنیا میں ایسے بندگانِ خدا کا وجود آپ کی اور آپ کے لائے ہوئے دینِ حق کی صداقت کی نشانیوں میں سے ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ نظامِ زندگی ایسا نہیں ہے جس کی سب تقلید کر سکیں یا جس کی سب کو دعوت دی جائے۔ مگر اس سے سبق نہ لینا بڑی محرومی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم جیسے آرام طلبوں اور عیش کوشوں کو سبق لینے اور عبرت حاصل کرنے کی توفیق دے۔

ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ چند مہینے پہلے راقم سطور نے الفرقان کے صفحات میں اہلیہ کی علالت کا ذکر کر کے دعائے صحت کی درخواست کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت، اُن کی علالت کا وہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس درمیان میں حالت کبھی کچھ بہتر اور کسی حد تک قابلِ اطمینان رہی۔ اور کبھی اس کے برعکس اور زیادہ سقیم ہو گئی شروع ستمبر (آخر رجب) میں رابطہ کے اجلاس کا وقت قریب آیا تو ان کی حالت کچھ غنیمت چل رہی تھی اسی لیے میں سفر کا فیصلہ کر سکا۔ اور نیت کر کے روانہ ہوا کہ اگر کیفیت ایسی ہی رہی تو انشاء اللہ رمضان مبارک وہیں گزار کے واپسی ہوگی۔ شروع میں یہی اطلاع ملتی رہی کہ مرض میں کوئی زیادتی نہیں ہے۔ حالت ایسی ہی چل رہی ہے۔ اس لیے رابطہ کے اجلاس کے خاتمہ کے بعد میں مدینہ طیبہ چلا گیا اور دو ہفتے وہاں قیام رہا۔ وہیں یہ نظام بنایا کہ اگر جلدی لوٹنے کی مجبوری نہ ہوئی تو انشاء اللہ حضرت شیخ الحدیث کے پروگرام کے مطابق رمضان مبارک کا پہلا عشرہ یا کچھ مزید مکہ معظمہ میں گزار کے حضرت کے ساتھ ہی پھر مدینہ طیبہ آجائیں گے۔ لیکن مکہ معظمہ واپس آ کر میرے استفساری تار کے جواب میں ۲ رمضان کو تار ملا جس میں اہلیہ کی حالت کے پیشِ نظر جلدی واپسی کا مشورہ دیا گیا تھا چنانچہ

واپسی کا فیصلہ کر لینا پڑا ـــــ رفیق محترم مولانا علی میاں کو بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کاموں سے وسط رمضان تک لکھنؤ پہنچ جانا تھا۔ چناں چہ ہم دونوں رمضان مبارک کے صرف ۱۴ دن مکہ معظمہ میں گزار کے ۱۵ ویں کی صبح جدہ سے روانہ ہو کر اسی دن بمبئی آ گئے ـــــ یہ دوشنبہ کا دن تھا اور ہمارا ۱۵ واں روزہ تھا لیکن بمبئی میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس دن رمضان مبارک کی تیرھویں تاریخ اور تیرھواں روزہ تھا تو اس بنا پر رمضان کے آخری منگل کو جب یہاں ۲۸ واں روزہ تھا تو ہمارا تیسواں تھا۔ بدھ کو ہم نے ۳۱ واں روزہ رکھا۔ اگر ہندوستان کے بہت سے دوسرے شہروں کی طرح لکھنؤ میں بھی ۲۹ کی رویت ثابت نہ ہوئی ہوتی تو ہم کو بتیسواں روزہ بھی رکھنا پڑتا، کیونکہ قرآن مجید نے پورے ماہ رمضان کے روزے فرض کیے ہیں۔ پس جس ملک میں ہم ہوں جب تک وہاں رمضان رہے گا ہم پر روزہ فرض ہوگا۔ اور جس دن شوال کی پہلی تاریخ ہوگی ہمارے لیے روزہ رکھنا ناجائز ہوگا۔ اب خواہ روزے ۳۱، رکھنے پڑیں یا ۳۲ یا بعض صورتوں میں صرف ۲۸ یا ۲۷۔

یہ ان مسائل میں سے ہے جن کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن نئے حالات میں وہ واقعات بن کر سامنے آ گئے ہیں ـــــ ہماری فقہ کی عام کتابوں میں اصل مذہب اسی کو قرار دیا گیا ہے اور اسی کو مفتی بہ لکھا جاتا رہا ہے کہ رویت ہلال کے بارے میں اختلاف مطالع معتبر نہیں۔ اور مشرق یا مغرب میں کہیں بھی رویت ہو جائے تو سب پر اس کے مطابق عمل لازم ہوگا۔ لیکن اب یہ بات ایک واقعہ بن کر سامنے آ گئی ہے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اور بعد مسافت اور اختلاف مطالع کی وجہ سے رویت میں ۱-۲ دن کا بلکہ اس سے زیادہ کا بھی فرق ہو سکتا ہے بلکہ ہونا لازم ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں نئے حالات اور نئے اکتشافات اور معلومات نے از سر نو غور و فکر اور نئے فیصلوں کی ضرورت پیدا کر دی ہے۔ فقہ اسلامی کی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ نئے حالات اور معلومات سامنے آنے پر فقہاء نے نئے سرے سے غور و فکر کیا اور نئے فیصلے کیے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس عہد کے علماء شریعت کو اس ذمہ داری کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

Regd. No. L-358

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 37 NO. 9 DECEMBER. 1969

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

اس شمارہ کی قیمت ـــــ ایک روپیہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ...... ۵۰/۔
پاکستان سے ...... ۵۰/۔
ششماہی
ہندوستان سے ...... ۴/۔
پاکستان سے ...... ۴/۔

جلد ۲۷	بابت ماہ شوال و ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ مطابق جنوری و فروری ۱۹۷۰ء	شمارہ ۱۰، ۱۱

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری ۱۹۷۰ء تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

چاند کے مسافر (جنھیں چاند کا فاتح بھی کہا جاتا ہے) اپنے ساتھ وہاں کے خاک پتھر کی جو سوغات لائے ہیں اُس کی جانچ پڑتال کے بعد سائنسداں اس نتیجہ پر پہونچ رہے ہیں کہ انھوں نے چاند کے متعلق جو یہ نظریہ قائم کر رکھا تھا کہ یہ وہ ٹکڑا ہے جو زمین سے ٹوٹ کر کسی وقت الگ ہو گیا تھا، یہ صحیح نہیں. کیونکہ وہاں کی چٹانوں کے نمونوں میں یہاں کی چٹانوں سے مشابہت نہیں ہے۔

چاند کے متعلق سائنسدانوں کا یہ نظریہ اُن نظریات کی ایک کڑی تھی جن سے کائنات کے مختلف اجزاء کے وجود میں آنے اور موجودہ حالت تک پہنچنے کی توجیہ کی جاتی ہے. جس طرح یہ نظریہ کہ چاند ہماری زمین ہی سے ٹوٹ کر الگ ہو جانے والا ایک ٹکڑا ہے، محض تخمین پر مبنی تھا، بالکل یہی حال اس سلسلہ کے دوسرے نظریات کا بھی ہے. ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب غلط ہوں مگر قطعیت کے ساتھ کسی ایک کے بارے میں بھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ واقعہ کے عین مطابق ہے. کائنات کے وجود میں آنے اور اُس کے مختلف اجزاء کے اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے کا تصور جو سائنسداں پیش کرتے ہیں وہ مختصر طور پر یہ ہے کہ

> کائنات کا ابتدائی مادہ ایک خاص قسم کی شعاعیں تھیں جو آپ سے آپ فضا میں متحرک تھیں. ایک عرصہ کے بعد ان متحرک شعاعوں میں آپ سے آپ جا بجا گرہیں پڑ گئیں، جو مثبت اور منفی قسم کے برقی احاد (UNITS) کی شکل میں تھیں جنھیں الکٹران اور پروٹان کہا جاتا ہے. پھر یہ برقی احاد اپنی باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل اختیار کر گئے، جنھیں ہم سالمات کہتے ہیں. یہ سالمات اپنے الکٹرانوں اور پروٹانوں کی تعداد و ترتیب کے لحاظ سے چوراسی مختلف قسموں کے تھے. ان میں سے ہر نمونے کے سالمات آپس میں مل کر کیمیاوی عناصر کے ذرات بن گئے. یہ ذرات شروع میں دھوئیں یا گیس کے ایک بہت بڑے گھومتے ہوئے بادل کی شکل میں تھے. یہ بادل چونکہ اتنا بڑا تھا کہ اس کی اندرونی کشش ثقل اسے سالم نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گیا. اور پھر ہر ٹکڑا اپنے محور کے گرد گھومنے لگا. ابتدا میں ہر ٹکڑے کی (جسے نبولا (NEBULA) کہا جاتا ہے) شکل گول تھی اور اس کی محوری حرکت کی رفتار بھی کم تھی لیکن اندرونی طور پر اُس کے اجزاء اپنے ایک بلند درجۂ حرارت کی وجہ سے نہایت زور کے ساتھ ایک غیر منظم حرکت کر رہے تھے جس کی وجہ سے اُن سے روشنی اور حرارت نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی. روشنی اور حرارت کے اخراج نے ان اجزاء میں سکڑاؤ پیدا کیا اور وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہو کر اور زیادہ تیزی

سے گردش کرنے لگے۔ گردش کی تیزی سے ان میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوئی، اور اس ٹوٹ پھوٹ نے ہر نبولا سے ستاروں کے ایک سلسلہ کو جنم دیا ـــ ہمارا یہ سورج اسی طرح ایک نبولا سے نکلا ہوا ستارہ ہے۔
اس سورج کا کنبہ قبیلہ جسے ہم نظام شمسی کہتے ہیں، کس طرح وجود میں آیا؟ اس کے متعلق سائنس کہتی ہے کسی وقت سورج کے پاس سے ایک اور بڑے ستارے کا گزر ہوا جس کی کشش ثقل سے سورج کے مادے کے بڑے بڑے گولے ٹوٹ کر اس سے الگ ہو گئے۔ یہی اس کے سیارے ہیں۔ ان سیاروں میں سے بعض اتنے چھوٹے تھے کہ آسانی سے ٹھنڈے ہو گئے۔ اور پھر اولاً سیال مادہ کی شکل اختیار کر کے بعد میں ٹھوس ہوتے گئے۔ سورج کے اسی قسم کے چھوٹے سیاروں میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ بعض وقت ایسے سیارے بھی جب سیال حالت میں پہنچتے ہیں تو ان کا کوئی ٹکڑا الگ ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس سیارے کے چاند کی شکل میں اس کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ ہماری زمین کا یہ چاند بھی اسی طرح کسی وقت اس سے الگ ہوا تھا [1]
یہ ہے کائنات سے متعلق سائنسدانوں کا نظریہ اور یہ جس طرح از اول تا آخر ظن و تخمین اور مفروضات سے مرکب ہے وہ ذرا بھی مخفی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کو جب ظن و تخمین کے بجائے سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا تو اصل حقیقت اس سے بالکل مختلف نظر آنے لگی جو اب تک سمجھی گئی تھی۔ یہ کائنات کے اس جزو سے متعلق نظریہ کا حال نکلا جو دوسرے اجزاء کے مقابلہ میں ہم سے قریب ترین جزو ہے، تو ان اجزاء سے متعلق نظریے کتنے قابل اعتماد ہوں گے جن کی زمین سے دوری چاند کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اور یہ تو پھر بھی موجودات سے متعلق نظریوں کا معاملہ ہے۔ لیکن ان موجودات کی وہ شکلیں اور وہ حالتیں جو سائنسداں بتاتے ہیں کہ اربوں کھربوں سال پہلے کبھی تھیں۔ ذرا ان کے بارے میں سوچیے کہ کتنا اور کیونکر اعتماد ان کے متعلق سائنسدانوں کے بیانات پر کیا جا سکتا ہے؟ سوال کسی نظریہ کے غلط نکل جانے کے بعد کا نہیں ہے۔ ان نظریوں میں سے کوئی نظریہ غلط ثابت ہو یا نہ ہو سوال اعتماد و یقین کی بنیاد کا ہو کہ ان بیانات میں آخر وہ کون سی چیز ہے جو اعتماد کو دعوت دینے اور یقین پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ مگر آج کا انسان کس قدر اطمینانِ قلب کے ساتھ ان بیانات پر ایمان لاتا اور ان کو حقائق کی کیسی واقعی تفسیر سمجھتا ہے۔ کس قدر بھروسہ کے ساتھ وہ اب تک اس کا قائل رہا کہ ہم جس زمین پر بستے ہیں اسی سے الگ ہو جانے والا ایک ٹکڑا یہ چاند ہے! اور کس بھروسہ کے ساتھ وہ آج بھی اس کا قائل ہے کہ یہ زمین سورج سے ٹوٹا ہوا ایک گولہ ہے۔ حالانکہ سائنسدانوں نے کبھی نہیں کہا وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ حقیقت کے باب میں حرف آخر ہے۔ اس کے برعکس اس کائنات سے متعلق کچھ خبریں اُن شخصیتوں نے دی ہیں جنھیں پیغمبر کہا جاتا ہے

[1] قرآن اور علم جدید۔ از ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم، سے اختصار کے ساتھ

یہ وہ ہیں کہ انھیں کے دم قدم کی تاثیر سے دنیا میں صدق و دیانت کا چلن ہوا۔ جن کی زندگی کا سب سے بڑا وصف ہی صداقت کیشی اور صداقت پرستی تھا۔ جنھوں نے صدق و صفا کو اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کی زندگی بنانے کی خاطر وہ دُکھ اُٹھائے کہ کسی دوسرے کے حصے میں وہ کیوں آئے ہوں گے۔ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِيَاءُ[1]۔ یہ وہ ہیں کہ جن کی سچائی اور پاکیزگی پر حرف لانے کی جرأت کبھی ان کے دشمنوں کو بھی نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی بدنصیب کے حصہ میں یہ جرأت کبھی آہی گئی تو خود اُس کی رسوائی کے سوا اور کسی کام کی نہ ہو پائی۔

اپنے اسی معروف وصفِ صداقت کے ساتھ یہ شخصیتیں اس کائنات کے آغاز و انجام اور درمیانی ادوار سے متعلق کچھ باتیں لوگوں کو انتہائی قطعیت کے ساتھ بتاتی ہیں اور اس ذاتِ کبریا کی طرف سے وحی کہہ کر بتاتی ہیں جس کے نام پر وہ داعی تھے کہ لوگ صداقت و دیانت اختیار کریں۔ اور کیسے سراپا خلوص داعی کہ دنیا کی کوئی دوسری دعوت اپنے لیے اپنے داعی کے ایسے صدق و خلوص کا ثبوت نہیں ہم پہونچا سکتی۔ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس وصف کے لوگ اپنے خدا کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کر دیں گے جس کے متعلق انھیں شرحِ صدر نہ ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور بالکل اسی طرح ہے جس طرح وہ بیان کرنے جا رہے ہیں؟ ان کے تو تربیت کردہ لوگوں کا حال بھی یہ تھا کہ جب خدا کی کتاب کی کسی آیت کا مطلب ان سے پوچھا جاتا جس کے متعلق انھیں حق الیقین نہ ہوتا کہ کیا مطلب ہے تو یہ کہہ کر معذرت کر دیتے تھے کہ "اگر میں اللہ کی کتاب کے بارے میں کوئی ایسی بات کہوں جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں جانتا تو کس آسمان کے نیچے اور کس زمین کے اوپر مجھے ٹھکانا ملے گا"۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی بات سے زیادہ دنیا کے کسی آدمی کی بات اس کی مستحق نہیں کہ اُس پر شرحِ صدر کے ساتھ ایمان لایا جائے اور اُن کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اس پر فخر کیا جائے کہ اتنا کچھ یقینی علم بھی ہمارے پاس ہے۔ مگر کیا قیامت ہے کہ اور تو اور خود ان پیغمبروں کے کتنے ہی ماننے والے آج کی فضا سے ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ انھیں ان پیغمبروں کی کتنی ہی باتوں کو زبان پر لاتے ہوئے شرم آتی ہے اور اس کے برعکس جو سائنسدانوں کی زبان سے نکل جائے وہ کچی بھی ناول اور مذہب کے بغیر ادروں کے ساتھ اُن کی زبانوں پر بھی جاری ہو جاتا ہے۔ سائنسدانوں کی بات کو بغیر کسی معقول وجہ یا دلیل کے غلط سمجھنا ضروری نہیں مگر ان کی جو بات صحیح معلوم ہوتی ہو اس کے لیے پیدا ہونے والے شرحِ صدر سے کہیں زیادہ شرحِ صدر پیغمبر کی بات کے لیے اگر دل میں پیدا نہیں ہوتا تو پھر آدمی کو سوچنا چاہیے کہ اُس کا ایمان کہاں تک قابلِ اطمینان ہے؟

یہ اشاعت شوال اور ذی قعدہ کا یہ مشترکہ شمارہ صرف ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک ماہ کی مدت میں اس سے زیادہ ضخیم شمارہ ممکن نہ تھا۔ خدا نے چاہا تو آئندہ شمارہ میں کچھ صفحات زیادہ کر کے اس کمی کی ممکن تلافی کی جائے گی ___ مرتب

---

[1] دنیا میں سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کے حصہ میں آتی ہے (حدیث)

کِتَابُ الْمُعَاشِرَۃِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مُسَلْسَل)

اولاد کے بارہ میں باپ کی ذمہ داریاں

[اس سلسلہ میں چند عنوانات کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس سے پہلی قسطوں میں پیش کی جاچکی ہیں ـــــ اس کے آگے ناظرین کرام آج کی صحبت میں ملاحظہ کریں۔]

نکاح اور شادی کی ذمہ داری:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کی یہ بھی ذمہ داری بتلائی ہے کہ جب بچہ یا بچی نکاح کے قابل ہو جائے تو اس کے نکاح کا بندوبست کیا جائے اور تاکید فرمائی ہے کہ اس میں غفلت نہ برتی جائے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وُلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنْ اِسْمَہٗ وَاَدَبَہٗ فَاِذَا بَلَغَ وَلَمْ یُزَوِّجْہُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُہٗ عَلٰی اَبِیْہِ ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے، تو چاہیئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھی تربیت دے اور سلیقہ سکھلائے،

پھر جب وہ سن بلوغ کو پہونچے تو اس کے نکاح کا بندوبست کرے اگر (اس نے اس میں کوتاہی کی اور) شادی کی عمر کو پہونچ جانے پر بھی (اپنی غفلت اور بے پرواہی سے) اس کی شادی کا بندوبست نہیں کیا اور وہ اس کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو گیا تو اس کا باپ اس گناہ کا ذمہ دار ہوگا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث میں اولاد کے قابل شادی ہو جانے پر ان کے نکاح اور شادی کے بندوبست کو بھی باپ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اس بارہ میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دوسروں کی تقلید میں نکاح شادی کو بہت بھاری اور بوجھل بنا لیا ہے اور ان کے رسم و رواج کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں۔ اگر ہم اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں اور نکاح شادی اس طرح کرنے لگیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اور اپنی صاحبزادیوں کے نکاح کیے تھے تو یہ کام اتنا ہلکا پھلکا ہو جائے جتنا ایک مسلمان کے لیے جمعہ کی نماز ادا کرنا، اور پھر اس نکاح اور شادی میں وہ برکتیں ہوں جن سے ہم بالکل محروم ہو گئے ہیں ـــــ

ماں باپ کے حقوق اولاد پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ماں باپ پر اولاد کے حقوق اور اس سلسلہ کی اُن کی ذمہ داریاں بیان فرمائیں اسی طرح اولاد پر ماں باپ کے حقوق اور اس سلسلہ کے اُن کے فرائض بھی بتلائے، بلکہ اس کو آپ نے اپنی تعلیم و تلقین میں جزو ایمان کا درجہ دیا۔ قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نازل کیا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے اس میں ماں باپ کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اللہ تعالیٰ کی توحید اور عبادت کے ساتھ ساتھ اس طرح دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال میں خدا کی عبادت کے بعد ماں باپ کی خدمت اور راحت رسانی کا درجہ ہے ـــــ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ	اور تمہارے رب کا قطعی حکم ہے کہ صرف
اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۝	اسی کی عبادت اور پرستش کرو، اور ماں

(بنی اسرائیل۔ ع ۳) باپ کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ اور اُن کی خدمت کرو!

اور دوسری جگہ سورۂ لقمان میں ماں باپ کا حق بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا گیا ہو اگر بالفرض کسی کے ماں باپ کافر و مشرک ہوں اور اولاد کو بھی کفر و شرک کے لیے مجبور کریں تو اولاد کو چاہیے کہ اُن کے کہنے سے کفر و شرک تو نہ کرے لیکن دُنیا میں اُن کے ساتھ اچھا سلوک اور اُن کی خدمت بھی کرتی رہے۔

(وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۞ ـــــ لقمان۔ ع ۲)

آگے درج ہونے والی حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کے حقوق اور اُن سے متعلق اولاد کے فرائض کے بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل قرآن مجید کی ان آیات ہی کی تشریح و تفسیر ہے۔

ماں باپ اولاد کی جنّت اور دوزخ ہیں:۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ الْوَالِدَیْنِ عَلٰی وَلَدِهِمَا قَالَ هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ ـــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضرت! اولاد پر ماں باپ کا کتنا حق ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تمھاری جنت اور دوزخ ہیں۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر تم ماں باپ کی فرمانبرداری و خدمت کروگے اور ان کو راضی رکھوگے تو جنت پالوگے اور اس کے برعکس اگر اُن کی نافرمانی اور ایذا رسانی کرکے انھیں ناراض کروگے اور اُن کا دل دکھاؤگے تو پھر تمھارا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

اللہ کی رضا والدین کی رضامندی سے وابستہ ہے:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

رِضَى الرَّبِّ فِي رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ۔

ــــــــــــــــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔ (جامع ترمذی)

تشریح) حدیث کا مطلب اور مدعا یہ ہے کہ جو اپنے مالک و مولا کو راضی کرنا چاہے وہ اپنے والد کو راضی اور خوش رکھے، اللہ کی رضا حاصل ہونے کے لیے والد کی رضا جوئی شرط ہے، اور والد کی ناراضی کا لازمی نتیجہ اللہ کی ناراضی ہے، لہذا جو کوئی والد کو ناراض کرے گا وہ رضائے الٰہی کی دولت سے محروم رہے گا۔

اس حدیث میں والد کا لفظ آیا ہے جو عربی زبان میں باپ ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (ماں کے لیے والدہ کا لفظ بولا جاتا ہے) — اس بنا پر اس حدیث میں ماں کا ذکر صراحۃً نہیں آیا ہے۔ لیکن چونکہ دوسری احادیث میں جو عنقریب درج ہوں گی ماں کا درجہ باپ سے بھی بلند اور بالاتر بتایا گیا ہے اس لیے ماں کی خوشی اور ناخوشی کی بھی وہی اہمیت ہوگی اور اس کا بھی وہی درجہ ہوگا جو اس حدیث میں باپ کی رضامندی اور ناراضی کا بتایا گیا ہے۔

ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ :-

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللهِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِىْ قَالَ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ فَاَدْنَاكَ۔

ــــــــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجھ پر خدمت اور حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری ماں، میں پھر کہتا ہوں تمہاری ماں، میں پھر کہتا ہوں تمہاری ماں، اسکے بعد تمہارے باپ کا حق ہے، اس کے بعد جو تمہارے قریبی رشتہ دار ہوں، پھر جو ان کے

بعد نزدیکی رشتہ دار ہوں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

تشریح) حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں سوال کرنے والے صحابی کا نام مذکور نہیں ہے۔ لیکن جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں بہز بن حکیم بن معاویہ قشیری سے روایت کیا گیا ہے کہ میرے دادا معاویہ بن حَیدہ قشیری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ "مَنْ أَبَرُّ؟" (مجھے کس کی خدمت اور کس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے؟) یعنی اس بارہ میں سب سے زیادہ اور سب سے مقدم حق کس کا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ "اُمَّكَ" "تمہاری ماں کا" انھوں نے پوچھا "ثُمَّ مَنْ؟" (پھر کس کا حق ہے) آپ نے پھر فرمایا "اُمَّكَ" (تمہاری ماں کا) انھوں نے پھر پوچھا "ثُمَّ مَنْ" (اس کے بعد کس کا حق ہے) آپ نے پھر فرمایا "اُمَّكَ" انھوں نے اس کے بعد پھر پوچھا "ثُمَّ مَنْ" (پھر اس کے بعد کس کا حق ہے) تو چوتھی دفعہ میں آپ نے فرمایا "اَبَاكَ ثُمَّ الْاَقْرَبَ فَالْاَقْرَبَ" یعنی ماں کے بعد تمہارے باپ کا حق ہے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ اہلِ قرابت اور رشتہ داروں کا حق ہے کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

ان دونوں حدیثوں کا مضمون بلکہ سوال جواب کے الفاظ بھی قریب قریب یکساں ہیں اس لیے اس کا بہت امکان ہے کہ صحیحین کی حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں جس شخص کے سوال کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی معاویہ بن حیدہ قشیری ہوں جن کی حدیث ان کے پوتے بہز بن حکیم سے امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کی ہے ــــ

ان دونوں حدیثوں کا صریح مدعا یہ ہے کہ خدمت اور حُسنِ سلوک کے بارہ میں ماں کا حق باپ سے زیادہ اور مقدم ہے ــــ قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کئی جگہ اس میں ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید کے ساتھ خاص طور سے ماں کی اُن تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر فرمایا گیا ہو جو حمل اور ولادت میں اور پھر دودھ پلانے اور پالنے میں خصوصیت کے ساتھ ماں کو اٹھانی پڑتی ہیں۔

بوڑھے ماں باپ کی خدمت میں کوتاہی کرنے والے بدبخت اور محروم :-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ

وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَوْ أَحَدَهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ ــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ آدمی ذلیل ہو، وہ خوار ہو، وہ رسوا ہو! عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون! (یعنی کس کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے؟) آپ نے فرمایا وہ بدنصیب جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بڑھاپے کی حالت میں پائے پھر (ان کی خدمت اور ان کا دل خوش کر کے) جنت حاصل نہ کر لے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث اوپر درج ہو چکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ماں باپ تمہاری جنت اور تمہاری دوزخ ہیں یعنی ماں باپ کی خدمت اور راحت رسانی جنت حاصل کرنے کا خاص وسیلہ ہے اور اس کے برعکس ان کی نافرمانی اور ایذا رسانی آدمی کو دوزخی بنا دیتی ہے، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ماں باپ بڑھاپے کی عمر کو پہونچ کے از کار رفتہ ہو جائیں تو اس وقت وہ خدمت اور راحت رسانی کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور اس حالت میں اُن کی خدمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب اور مقبول عمل اور جنت تک پہونچنے کا سیدھا زینہ ہے۔ ـــــ پس اللہ تعالیٰ جس بندہ کو اس کا موقع میسر فرمائے اور وہ ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کا بڑھاپا پائے اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت تک نہ پہونچ سکے بلاشبہ وہ بڑا بدنصیب اور محروم ہے۔ اور ایسوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا ہے کہ وہ نامراد ہوں، ذلیل و خوار ہوں، رسوا ہوں۔

ماں باپ کی خدمت بعض حالات میں ہجرت اور جہاد سے بھی مقدم:-

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ أُجَاهِدُ، قَالَ أَلَكَ أَبَوَانِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ ــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں جہاد میں

جانا چاہتا ہوں، آپ نے پوچھا کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟ اس نے کہا ہاں ہیں، آپ نے فرمایا تو پھر اُن کی خدمت اور راحت رسانی میں جد و جہد کرو۔ (یہی تمہارا جہاد ہے)

(سنن ابی داؤد)

تشریح) غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات منکشف ہو گئی تھی یا کسی وجہ سے اس کے بارہ میں شبہ ہو گیا تھا کہ اس آدمی کے ماں باپ اس کی خدمت کے محتاج ہیں اور یہ ان کو چھوڑ کے اُن کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے آگیا ہے اس لیے آپ نے اُس کو یہ حکم دیا کہ وہ گھر واپس جا کر ماں باپ کی خدمت کرے کیونکہ ایسی حالت میں اس کے لیے ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ جس کسی کے ماں باپ ہوں وہ جہاد اور دین کی کسی خدمت کے لیے کبھی گھر سے باہر نہ نکلے اور صرف وہی لوگ جہاد میں اور دین کی خدمت میں لگیں جن کے ماں باپ نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابۂ کرام جہاد کرتے تھے اُن میں بڑی تعداد انہی کی ہوتی تھی جن کے ماں باپ زندہ ہوتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَجُلاً هَاجَرَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْیَمَنِ فَقَالَ هَلْ لَكَ اَحَدٌ بِالْیَمَنِ؟ فَقَالَ اَبَوَایَ، فَقَالَ اَذِنَا لَكَ؟ قَالَ لَا، قَالَ ارْجِعْ اِلَیْهِمَا فَاسْتَاْذِنْهُمَا فَاِنْ اَذِنَا لَكَ فَجَاهِدْ وَاِلَّا فَبِرَّهُمَا ——— رواہ ابوداؤد واحمد

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص یمن سے ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچا تو آپ نے اُس سے پوچھا کیا یمن میں تمہارا کوئی ہے؟ اُس نے عرض کیا کہ ہاں میرے والدین ہیں، آپ نے دریافت فرمایا کیا انھوں نے تم کو اجازت دی ہے؟ (اور تم اُن کی اجازت سے یہاں آئے ہو؟) اُس نے عرض کیا ایسا تو نہیں ہے، آپ نے فرمایا تو پھر ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور یہاں آنے کی (اور جہاد اور دین کی محنت میں لگنے کی) اُن سے اجازت مانگو، پھر وہ اگر تمہیں اجازت دے دیں تو آؤ اور جہاد میں لگ جاؤ اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو اُن کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔ (سنن ابی داؤد، مسند احمد)

تشریح) ہجرت کرکے آنے والوں اور جہاد میں شرکت کرنے والوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو عام متعقل رویہ اور اُسوۂ حسنہ تھا اس کی روشنی میں اس قسم کی تمام احادیث کے بارہ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا تعلق اس صورت سے ہے جب ماں باپ خدمت کے سخت محتاج ہوں اور کوئی دوسرا اُن کی خبرگیری کرنے والا نہ ہو، اور اس وجہ سے وہ اجازت بھی نہ دیں تو پھر بلاشبہ ان کی خدمت اور خبرگیری ہجرت اور جہاد سے بھی مقدم ہوگی۔

جنت ماں کے قدموں میں ہے :-

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ اَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَرَدْتُ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ فَقَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا ____ رواہ احمد والنسائی

معاویہ بن جاہمہ سے روایت ہے کہ میرے والد جاہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ارادہ جہاد میں جانے کا ہے اور میں آپ سے اس بارہ میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے اُن سے پوچھا کیا تمھاری ماں ہیں؟ انھوں نے عرض کیا ہاں ہیں، آپ نے فرمایا تو پھر انہی کے پاس اور انہی کی خدمت میں رہو، اُن کے قدموں میں تمھاری جنت ہے۔

(مسند احمد، سنن نسائی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِمْتُ فَرَأَيْتُنِي فِي الْجَنَّةِ فَسَمِعْتُ فِيْهَا قِرَاءَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا؟ قَالُوا حَارِثَةُ بْنُ النُّعْمَانِ كَذٰلِكُمُ الْبِرُّ كَذٰلِكُمُ الْبِرُّ وَكَانَ اَبَرَّ النَّاسِ بِاُمِّهٖ ____ رواہ البغوی فی شرح السنہ والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سویا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں ہوں، وہیں میں نے

کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی تو میں نے دریافت کیا کہ اللہ کا یہ کون بندہ ہے جو یہاں جنّت میں قرآن پڑھ رہا ہے؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ حارثہ بن النعمان ہیں، ماں باپ کی خدمت اور اطاعت شعاری ایسی ہی چیز ہے، ماں باپ کی خدمت اور اطاعت شعاری ایسی ہی چیز ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہ خواب بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ) حارثہ بن النعمان اپنی ماں کے بہت ہی خدمتگزار اور اطاعت شعار تھے (یعنی اسی عمل نے ان کو اس مقام تک پہونچایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنّت میں اُن کی قراءت سنی) (شرح السنہ للبغوی وشعب الایمان للبیہقی)

ماں کی خدمت بڑے سے بڑے گناہ کی معافی کا ذریعہ:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَصَبْتُ ذَنْباً عَظِیْماً فَھَلْ لِیْ مِنْ تَوْبَۃٍ؟ قَالَ ھَلْ لَکَ مِنْ اُمٍّ؟ قَالَ لَا قَالَ وَھَلْ لَکَ مِنْ خَالَۃٍ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبِرَّھَا ———— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، تو کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے (اور مجھے معافی مل سکتی ہے) آپ نے پوچھا تمھاری ماں زندہ ہے؟ اُس نے عرض کیا کہ ماں تو نہیں ہے، آپ نے فرمایا تو کیا تمھاری کوئی خالہ ہے؟ اُس نے عرض کیا کہ ہاں خالہ موجود ہے، آپ نے فرمایا تو اُس کی خدمت اور اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمھاری توبہ قبول فرما لے گا اور تمھیں معاف فرما دے گا) (جامع ترمذی)

تشریح) توبہ کیا ہے؟ گناہ پر دل سے نادم وپشیمان ہوکر اللہ سے معافی مانگنا، تاکہ اللہ کے غضب اور اُس عذاب سے بچ جائے جس کا وہ گناہ کی وجہ سے مستحق ہوچکا ہے، اور توبہ کی قبولیت یہ ہے کہ اللہ پاک اس کو معاف فرمادے اور اُس سے راضی ہوجائے ۔۔۔

یوں تو سارے ہی اعمالِ صالحہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ گناہوں کے گندے اثرات کو مٹاتے اور اللہ کی رضا اور رحمت کو کھینچتے ہیں۔ (اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ) لیکن بعض اعمالِ صالحہ اس بارہ میں غیر معمولی امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی خدمت اور اسی طرح خالہ اور نانی کی خدمت بھی انہی اعمال میں سے ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گنہگاروں اور سیاہ کاروں کی توبہ قبول فرما لیتا ہے اور اُن سے راضی ہو جاتا ہے۔

خدمت اور حسنِ سلوک کافر و مشرک ماں کا بھی حق ہے:۔

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّیْ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِیْ عَھْدِ قُرَیْشٍ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اُمِّیْ قَدِمَتْ عَلَیَّ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ اَفَاَصِلُھَا؟ قَالَ نَعَمْ صِلِیْھَا۔

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے (حدیبیہ والے) معاہدہ کے زمانہ میں، میری ماں جو اپنے مشرکانہ مذہب پر قائم تھی (سفر کر کے مدینہ میں) میرے پاس آئی، تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ خواہشمند ہے۔ تو کیا میں اس کی خدمت کردوں؟ آپ نے فرمایا ہاں اس کی خدمت کرو (اور اس کے ساتھ وہ سلوک کرو جو بیٹی کو ماں کے ساتھ کرنا چاہیے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت اسماء صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور دوسری ماں سے حضرت عائشہ صدیقہ کی بڑی بہن تھیں، ان کی ماں کا نام روایات میں قُتَیلہ بنت عبد العزیٰ ذکر کیا گیا ہے۔ ان کو حضرت ابوبکر نے زمانۂ جاہلیت ہی میں طلاق دے کر الگ کر دیا تھا۔ بہرحال اسلام کے دور میں یہ ان کی بیوی نہیں رہیں اور اپنے پرانے مشرکانہ طریقہ ہی پر قائم رہیں۔ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں جب مشرکین مکہ کو مدینہ آنے کی اور مدینہ کے مسلمانوں کو مکہ جانے کی آزادی حاصل ہو گئی تو

حضرت اسماء کی یہ ماں اپنی بیٹی کے پاس مدینہ آئیں، حضرت اسماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجھے ان کے بارہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے کیا ان کے کافر و مشرک ہونے کی وجہ سے میں ان سے "ترکِ موالات" کروں یا ماں کے رشتہ کا لحاظ کر کے ان کی خدمت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کی خدمت کرو اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ماں کا حق ہے۔

حدیث میں "رَاغِبَۃٌ" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ اس عاجز نے خواہشمند کیا ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ حضرت اسماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری ماں جو مشرک ہیں کچھ خواہش مند ہو کر آئی ہیں، یعنی وہ اس کی طالب و متوقع ہیں کہ میں ان کی مالی خدمت کروں بعض شارحین نے اس کا ترجمہ منحرف اور بیزار بھی کیا ہے اور لغت کے لحاظ سے اس کی بھی گنجائش ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ میری ماں ملنے تو آئی ہیں لیکن ہمارے دین سے منحرف اور بیزار ہیں، ایسی صورت میں اُن کے ساتھ میرا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا ماں ہونے کی وجہ سے اُن کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کروں، یا بے تعلقی اور بے رُخی کا رویہ اختیار کروں ـــــ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کرو جو ماں کا حق ہے۔ (نَعَمْ صِلِیْھَا)

اوپر قرآنِ مجید کی وہ آیت ذکر کی جا چکی ہے جس میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کسی کے ماں باپ کافر و مشرک ہوں اور وہ اولاد کو بھی کفر و شرک کے لیے مجبور کریں اور دباؤ ڈالیں تو اولاد اُن کی یہ بات تو نہ مانے لیکن ان کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک برابر کرتی رہے۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اُن کے خاص حقوق:-

اولاد پر ماں باپ کے حقوق کا سلسلہ اُن کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کے کچھ اور حقوق عائد ہو جاتے ہیں جن کا ادا کرتے رہنا سعادت مند اولاد کی ذمہ داری اور اللہ تعالیٰ کی خاص رضا اور رحمت کا وسیلہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ السَّاعِدِیِّ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَہٗ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلِمَۃَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

هَلْ بَقِيَ مِنْ بِرِّ أَبَوَيَّ شَيْءٌ أَبَرُّهُمَا مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِمَا؟ قَالَ نَعَمْ الصَّلٰوةُ عَلَيْهِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمَا وَاِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِيْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِهِمَا وَاِكْرَامُ صَدِيْقِهِمَا ——— رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ

ابواُسید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک وقت جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے بنی سلمہ میں سے ایک شخص آئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا میرے ماں باپ کے مجھ پر کچھ ایسے بھی حق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد مجھے ادا کرنا چاہئیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، اُن کے لیے خیر و رحمت کی دعا کرتے رہنا، اُن کے واسطے اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگنا، اُن کا اگر کوئی عہد معاہدہ کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا، اُن کے تعلق سے جو رشتے ہوں اُن کا لحاظ رکھنا اور اُن کا حق ادا کرنا اور اُن کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا۔ (سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّصِلَ اَبَاهُ فِيْ قَبْرِهٖ فَلْيَصِلْ اِخْوَانَ اَبِيْهِ بَعْدَهٗ

——— رواہ ابن حبان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی یہ چاہے کہ قبر میں اپنے باپ کو آرام پہونچائے اور خدمت کرے تو باپ کے انتقال کے بعد اُن کے بھائیوں کے ساتھ وہ اچھا برتاؤ رکھے جو رکھنا چاہیے۔

(صحیح ابن حبان)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةُ الرَّجُلِ اَهْلَ وُدِّ اَبِيْهِ بَعْدَ اَنْ يُّوَلِّيَ ——— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا باپ کی خدمت اور حسن سلوک کی ایک اعلیٰ قسم یہ ہے کہ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے دوستوں کے ساتھ اکرام و احترام کا تعلق رکھا جائے اور باپ کی دوستی و محبت کا حق ادا کیا جائے۔ (صحیح مسلم)

تشریح حضرت عبداللہ بن عمر کی ان دونوں حدیثوں میں صرف باپ کے بھائیوں اور اہل محبت کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس باب میں ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں ابھی اوپر حضرت ابو اُسید ساعدی کی روایت سے جو حدیث ذکر کی جا چکی ہے اس میں ماں باپ دونوں کے اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک اور اہل محبت کے اکرام و احترام کو اولاد پر ماں باپ کے مرنے کے بعد اُن کا حق بتایا گیا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَمُوْتُ وَالِدَاهُ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاِنَّهٗ لَهُمَا لَعَاقٌّ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْ لَهُمَا وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمَا حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ بَارًّا

—— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے اور اولاد زندگی میں اُن کی نافرمان اور اُن کی رضامندی سے محروم ہوتی ہے، لیکن یہ اولاد اُن کے انتقال کے بعد سچے دل سے اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و رحمت کی دعا اور مغفرت و بخشش کی استدعا کرتی رہتی ہے (اور اس طرح اپنے قصور کی تلافی کرنا چاہتی ہے) تو اللہ تعالیٰ اُس نافرمان اولاد کو فرمانبردار قرار دے دیتا ہے۔ (پھر وہ ماں باپ کی نافرمانی کے وبال اور عذاب سے بچ جاتی ہے) (شعب الایمان للبیہقی)

تشریح جس طرح زندگی میں ماں باپ کی فرمانبرداری و خدمت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک اعلیٰ درجہ کا عمل صالح ہے جو بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اُن کے مرنے کے بعد اُن کے لیے اخلاص اور الحاح سے رحمت و مغفرت کی دعا ایسا عمل ہے جو ایک طرف تو ماں باپ کے لیے قبر میں راحت و سکون کا وسیلہ بنتا ہے اور دوسری طرف اس سے اولاد کے اُن قصوروں کی تلافی ہو جاتی ہے جو ماں باپ کی فرمانبرداری اور خدمت میں اُن سے ہوئی ہو اور وہ خود اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کی مستحق ہو جاتی ہے —— قرآن پاک میں اولاد کو خاص طور سے ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ماں باپ کے لیے رحمت و مغفرت مانگا کرے۔

وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝ (بنی اسرائیل ع ۲)

اور اللہ سے یوں عرض کیا کرو، کہ اے پروردگار میرے ماں باپ پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے مجھے بچپنے میں شفقت کے ساتھ پالا تھا!

ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کی دنیوی برکات :-

ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کی اصل جزا تو جنت اور رضائے الٰہی ہے جیسا کہ ان احادیث سے معلوم ہو چکا ہے جو "ماں باپ کے حقوق" کے زیر عنوان پہلے درج ہو چکی ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلایا ہے کہ ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کرنے والی اولاد کو اللہ تعالیٰ کچھ خاص برکتوں سے اس دنیا میں بھی نوازتا ہے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ فِىْ عُمْرِ الرَّجُلِ بِبِرِّهٖ وَالِدَيْهِ ـــــ رواہ ابن منیع و ابن عدی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی خدمت و فرمانبرداری اور حسن سلوک کی وجہ سے آدمی کی عمر بڑھا دیتا ہے۔ (مسند ابن منیع، کامل ابن عدی)

تشریح) اس طرح کی احادیث کا تقدیر کے مسئلہ سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا اور معلوم ہے کہ فلاں آدمی ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کرے گا، اسی لحاظ سے اس کی عمر اس سے زیادہ مقرر فرمائی گئی جتنی کہ اس کو ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری نہ کرنے کی صورت میں دی جاتی۔ اسی طرح ان سب حدیثوں کو سمجھنا چاہیے جن میں کسی اچھے عمل پر رزق میں وسعت اور برکت وغیرہ کی خوشخبری سنائی گئی ہے، حالانکہ رزق کی تنگی اور وسعت بھی مقدر ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرُّوْا آبَاءَكُمْ يَبَرُّ اَبْنَاءُكُمْ وَعِفُّوْا تَعِفَّ نِسَاءُكُمْ ـــ رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے آباء (ماں باپ) کی خدمت و فرمانبرداری کرو، تمھاری اولاد تمھاری فرمانبردار اور خدمت گزار

ہوگی، اور تم پاکدامنی کے ساتھ رہو، تمھاری عورتیں پاکدامن رہیں گی۔

(معجم اوسط للطبرانی)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو اولاد ماں باپ کی فرمانبرداری اور خدمت کرے گی، اللہ تعالیٰ اسکی اولاد کو اس کا فرمانبردار اور خدمت گزار بنائے گا۔ اسی طرح جو لوگ پاکدامنی کی زندگی گزاریں گے اللہ تعالیٰ اُن کی بیویوں کو پاکدامنی کی توفیق دے گا۔

والدین کی نافرمانی و ایذارسانی عظیم ترین گناہ :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ماں باپ کی فرمانبرداری اور راحت رسانی کو اعلیٰ درجہ کی نیکی قرار دیا ہے جو جنت اور رضائے الٰہی کا خاص وسیلہ ہے۔ اسی طرح ان کی نافرمانی اور ایذارسانی کو "اکبر الکبائر" یعنی بدترین اور خبیث ترین گناہوں میں سے بتلایا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْکَبَائِرِ فَقَالَ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَہَادَۃُ الزُّوْرِ۔

رواہ البخاری

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبیرہ (یعنی بڑے بڑے) گناہوں کے بارہ میں دریافت کیا گیا (کہ وہ کون کون گناہ ہیں)، تو آپ نے فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، اور ماں باپ کی نافرمانی و ایذارسانی، اور کسی بندہ کو ناحق قتل کردینا، اور جھوٹی گواہی دینا۔

(صحیح بخاری)

تشریح) صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں ان گناہوں کو "اکبر الکبائر" (یعنی کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ) بتایا گیا ہے اور جس ترتیب سے آپ نے ان کا ذکر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے بعد والدین کے عقوق (یعنی ان کی نافرمانی اور ایذارسانی) کا درجہ ہے حتیٰ کہ قتل نفس کا درجہ بھی اس کے بعد ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ

وَالِدَيْهِ؟ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کو گالی دے، پھر وہ جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے۔ (تو گویا اس نے خود ہی اپنے ماں باپ کو گالی دلوائی۔)
(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کا کسی دوسرے کو ایسی بات کہنا یا ایسی حرکت کرنا جس کے نتیجہ میں دوسرا آدمی اس کے ماں باپ کو گالی دینے لگے، اتنی ہی بری بات ہے جتنی کہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینا، اور یہ گناہِ کبیرہ کے درجہ کی چیز ہے ـــــ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں ماں باپ کے احترام کا کیا مقام ہے اور اس بارہ میں آدمی کو کتنا محتاط رہنا چاہیے۔

دوسرے اہلِ قرابت کے حقوق اور صلہ رحمی کی اہمیت :-

اسلامی تعلیم میں والدین کے علاوہ دوسرے اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کے حقوق کی ادائیگی پر بھی بہت زور دیا گیا ہے اور "صلہ رحمی" اس کا خاص عنوان ہے ـــــ قرآن مجید میں جہاں والدین کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے وہیں "وَذِي الْقُرْبَىٰ" فرما کر دوسرے اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کے حقوقِ قرابت کی ادائیگی کی بھی وصیت فرمائی گئی ہے ـــــ ابھی چند صفحے پہلے صحیح بخاری وصحیح مسلم کے حوالہ سے ایک سائل کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ "خدمت اور حسنِ سلوک کا سب سے پہلا حق تم پر تمہاری ماں کا ہے اس کے بعد باپ کا اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا" ـــــ اب یہاں چند وہ حدیثیں اور پڑھ لیجئے جن میں صلہ رحمی کی اہمیت اور اس کے فضائل وبرکات بیان فرمائے گئے ہیں، یا اس کے برعکس قطع رحمی کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهٗ وَ مَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهٗ ـــــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رحم (یعنی حق قرابت) مشتق ہے رحمٰن سے (یعنی خداوند رحمان کی رحمت کی ایک شاخ ہے اور اس نسبت سے) اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس کو توڑوں گا۔ (صحیح بخاری)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی باہم قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمٰن سے اور اس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے، اور وہی اس کا سر چشمہ ہے اور اسی لیے اس کا عنوان رحم مقرر کیا گیا ہے۔ اس خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے عند اللہ اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو صلہ رحمی کرے گا یعنی قرابت اور رشتہ داری کے حقوق ادا کرے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اپنے سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا اور جو کوئی اس کے برعکس قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے کاٹ دے گا اور دور اور بے تعلق کردے گا ـــــ اسی ایک حدیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں صلہ رحمی کی (یعنی رشتہ داروں اور اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کی) کتنی اہمیت ہے اور اس میں کوتاہی کتنا سنگین جرم اور کتنی بڑی محرومی ہے ـــــ آگے درج ہونے والی حدیثوں کا مضمون بھی اس کے قریب ہی قریب ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ ـــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رحم (یعنی رشتہ قرابت) عرش الٰہی کے ساتھ معلق ہے اور کہتا ہے جو مجھے جوڑے (یعنی جو رشتہ قرابت کے حقوق ادا کرے اور صلہ رحمی کرے) اللہ اس کو جوڑے

(جو مجھے توڑے (یعنی رشتہ و قرابت کے حقوق ادا نہ کرے اور قطع رحمی کرے) اُس کو اللہ توڑے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

تشریح) رحم کا عرشِ الٰہی سے معلّق ہونا دراصل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی غیر معمولی اہمیت اور قرب خاص کی ایک تعبیر ہے۔ جس طرح اس سے پہلی حدیث میں اس کو "شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ" فرمایا گیا ہے اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ کی اس حدیث میں "مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ" کہا گیا ہے، ان دونوں تعبیروں کا حاصل یہی ہے کہ "رحم" یعنی رشتہ قرابت کو اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص قرب اور اُس کی خصوصی عنایت حاصل ہے، جو اس کا حق ادا کرے وہ اللہ کے ہاں مقبول اور اُس کی رضا کا مستحق ہے اور جو اس کے حق کو پامال کرے وہ مردود اور اُس کی رحمت و عنایت سے محروم ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنَا اللّٰهُ وَاَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنْ اِسْمِىْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں میں رحمٰن ہوں، میں نے رشتۂ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے، پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اُس کو توڑ دوں گا (سنن ابی داؤد)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مشیت سے پیدائش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے، پھر ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے رحم مقرر کیا ہے۔ جو اس کے نام پاک رحمٰن سے گویا مشتق ہے (یعنی دونوں کا مادہ ایک ہی ہے) پس جو بندہ انسان کی فطرت میں رکھے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ان حقوق اور تقاضوں کو ادا کرے گا یعنی صلۂ رحمی کرے گا اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ اُس کو جوڑے گا (یعنی اس کو اپنا بنالے گا اور فضل و کرم سے نوازے گا)

اور اس کے برعکس جو کوئی قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اور قرابت کے اُن حقوق کو پامال کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور انسان کی فطرت میں رکھے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا یعنی اپنے قرب اور اپنی رحمت و کرم سے محروم کر دے گا۔

آج کی دنیا میں مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت سے محرومی کا منظر جو ہر جگہ نظر آرہا ہے، بلاشبہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہماری بہت سی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان احادیث کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس بربادی اور محرومی میں بڑا دخل ہمارے اس جرم کو بھی ہے کہ صلہ رحمی کی تعلیم و ہدایت کو ہماری غالب اکثریت نے بالکل ہی بھلا دیا ہے اور اس باب میں ہمارا طرزِ عمل غیر مسلموں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔

صِلہ رحمی کے بعض دنیوی برکات:-

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَیُنْسَاَ لَہٗ فِیْ اِثْرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی یہ چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی اور کشادگی ہو اور دنیا میں اس کے آثار قدم تا دیر رہیں (یعنی اس کی عمر دراز ہو) تو وہ (اہلِ قرابت کے ساتھ) صلہ رحمی کرے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اللہ کی کتاب قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں یہ حقیقت جا بجا بیان فرمائی گئی ہے کہ بعض نیک اعمال کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی برکتوں سے نوازتا ہے ——— اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ صلہ رحمی یعنی اہلِ قرابت کے حقوق کی ادائیگی اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک، وہ مبارک عمل ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی اور برکت ہوتی ہے ——— صلہ رحمی کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ آدمی اپنی کمائی سے اہلِ قرابت کی مالی خدمت کرے، دوسرے یہ کہ اپنے وقت اور اپنی زندگی کا کچھ حصہ

اُن کے کاموں میں لگائے، اس کے صلہ میں رزق و مال میں وسعت اور زندگی کی مدت میں اضافہ اور برکت بالکل قرین قیاس اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت کے عین مطابق ہے۔

اسبابی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے، یہ واقعہ اور عام تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور خانگی الجھنیں جو زیادہ تر حقوقِ قرابت ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں آدمی کے لیے دلی پریشانی اور اندرونی کڑھن اور گھٹن کا باعث بنتی ہیں اور کاروبار اور صحت ہر چیز کو متاثر کرتی ہیں، لیکن جو لوگ اہلِ خاندان اور اقارب کے ساتھ نیکی اور صلۂ رحمی کا برتاؤ کرتے اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک رکھتے ہیں اُن کی زندگی انشراح و طمانیت اور خوشدلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے اُن کے حالات بہتر رہتے ہیں اور فضلِ خداوندی اُن کے شاملِ حال رہتا ہے۔

قطع رحمی جنّت کے راستے میں رکاوٹ :-

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ ——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا (یعنی رشتہ داروں اور اہلِ قرابت کے ساتھ برا سلوک کرنے والا) جنّت میں نہ جاسکے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اسی ایک حدیث سے سمجھا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں اور اللہ کے نزدیک صلۂ رحمی کی کتنی اہمیت ہے اور قطع رحمی کس درجہ کا گناہ ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قطع رحمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا سخت گناہ ہے کہ اس گناہ کی گندگی کے ساتھ کوئی جنّت میں نہیں جاسکے گا، ہاں جب اس کو سزا دے کے پاک کر دیا جائے گا یا کسی وجہ سے اس کو معاف کر دیا جائے گا تو جاسکے گا، جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ ہو جنت کا دروازہ اسکے لیے بند رہے گا۔

قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ بھی صلۂ رحمی :-

خاندانی زندگی میں بکثرت ایسا پیش آتا ہے کہ ایک آدمی رشتہ اور قرابت کے حقوق ادا نہیں کرتا،

اہل قرابت کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ ایسے آدمی کے ساتھ بھی صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا ——— رواه البخاری

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آدمی صلہ رحمی کا حق ادا نہیں کرتا جو (صلہ رحمی کرنے والے اپنے اقرباء کے ساتھ) بدلہ کے طور پر صلہ رحمی کرتا ہے، صلہ رحمی کا حق ادا کرنے والا دراصل وہ ہے جو اس حالت میں بھی صلہ رحمی کرے (اور قرابتداروں کا حق ادا کرے) جب وہ اس کے ساتھ قطع رحم (اور حق تلفی) کا معاملہ کریں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) ظاہر ہے کہ قطع رحمی اور حق تلفی کرنے والوں کے ساتھ جب جوابی طور پر قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے گا تو یہ بیماری اور گندگی معاشرہ میں اور زیادہ بڑھے گی اور اس کے برعکس جب اُن کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے گا تو انسانی فطرت سے اُمید ہے کہ دیر سویر اُن کی اصلاح ہوگی اور معاشرہ میں صلہ رحمی کو فروغ ہوگا۔

ارشاداتِ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ

علماء، طلباء، اربابِ اہتمام اور اصحابِ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

تلخیص ـــــــ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

قسط (۵)

فرمایا کہ ـــــــ ایک صاحب کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ ہر وقت آمادہ فساد اور برسرِ پرخاش رہتے ہیں۔ محض اس خیال سے کہ یہ خیالات میں ہم سے مختلف ہے۔ اس پر فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ محض اس بنا پر فساد کرتے ہوں کوئی اور بات ہوگی۔ اپنے طرز کو بدلنا چاہیے۔ طبعی بات ہے کہ حکومت کی تو لوگ ہر طرح کی برداشت کر لیتے ہیں مگر بدون حکومت کوئی کسی کا زیادہ نہیں سہ سکتا نہ برداشت کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے خیالات کی جو تبلیغ کرتے ہوں گے اس میں تشدد کا لہجہ ہوگا۔ تبلیغ بھی ہر شخص کا کام نہیں۔ لیکن اگر پھر بھی قصداً ایسا کرتے ہو تو پھر تیار ہو جاؤ کہ کچھ بھی سر پڑے اس کو برداشت کرو ......

حضرت شاہ عبد القادر (دہلویؒ) نے ایک شخص کو مجلسِ وعظ میں ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہنے دیکھا۔ جب سب لوگ وعظ ختم ہونے کے بعد اٹھ کر چلے گئے تو اس شخص کو روک لیا اور فرمایا کہ میاں میں کھڑا ہوتا ہوں ذرا یہ دیکھنا کہ میں جو پاجامہ پہن رہا ہوں یہ خلافِ شریعت ٹخنوں سے نیچا تو نہیں؟ وہ شخص سمجھ گیا (اور کہا کہ) حضرت میں ہی خلاف پر ہوں، اسی وقت زائد پائنچہ پھاڑ ڈالا اور توبہ کی ـــــــ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ سنیئے۔ ایک خاں صاحب آپ کے معتقد تھے

اور بچپن کے دوست بھی تھے حتیٰ کہ جمعہ کے دن ایک ہی جگہ (یکے بعد دیگرے) غسل کرکے کپڑے بدلتے تھے مگر وضع بظاہر خلافِ شریعت تھی۔ ایک روز حضرت مولانا نے خان صاحب سے کہا کہ خانصاحب آپ کو معلوم ہے کہ ہماری تمہاری پرانی دوستی ہے۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تم اس وضع میں رہو اور میں اس وضع میں ـــ اس لیے جب نہانے آؤ تو اپنے دو جوڑے لے کر آنا ایک اپنے لیے ایک ہمارے لیے میں بھی آج تمہاری جیسی وضع اختیار کروں گا۔ خاں صاحب مارے شرمندگی کے پانی پانی ہوگئے اور اُسی روز سے شرعی لباس پہن لیا ـــ ناصح اگر عالم نہ ہوگا اور نصیحت کرے گا تو اُس میں (بعض اوقات) تکبر ہوگا۔ مناسب طریق سے نصیحت کرنا یہ عالم ہی کا کام ہے ـــ دوسرے فطری طور پر مخاطب کے قلب میں اُس کی عظمت و محبت ہوتی ہے اس لیے اُس کی سختی بھی گوارا کر لی جاتی ہے اور اِس فطری عظمت پر (بھی) مجھ کو ہمیشہ اس کا خیال رہتا ہے کہ اہلِ علم کی بے وقعتی نہ ہو۔

ـــ فرمایا کہ علم کے ساتھ عقل کی بھی سخت ضرورت ہے اور عقل کی افزونی عادۃً موقوف ہے تجربے پر اور تجربہ اکثر بوڑھوں کو زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے میں آج کل کے اہلِ علم نوجوانوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم عالم تو ہو مگر بوڑھے نہیں ہو اس لیے بوڑھوں سے پوچھ پاچھ رکھا کرو۔ بدون بوڑھوں کے کام نہیں چلتا۔ اِس بوڑھوں کے تجربے پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شادی میں لڑکی والے نے ..... یہ شرط کی تھی کہ برات میں کسی بوڑھے کو ساتھ مت لانا۔ ایک بوڑھے کو معلوم ہوا اُس نے کہا مجھ کو ضرور لے جاؤ ـ لوگوں نے کہا جب (لڑکی والے تمہیں) دیکھیں گے تو مواخذہ کریں گے۔ بوڑھے نے کہا (سانس کے آنے جانے کا انتظام کرکے کسی بڑے) صندوق میں بند کرکے لے چلو۔ غرض بڑے میاں کو صندوق میں بند کرکے لے گئے وہاں پہونچ کر لڑکی والے نے کہا کہ برات کا ہر آدمی ایک ایک بکرا کھائے تب لڑکی نکاح میں دیں گے اب یہ (سب براتی) گھبرائے ہوئے گئے صندوق کے پاس ـــ اور بڑے میاں کو صندوق میں سے نکالا اور (اس شرط کو) بیان کیا۔ اُس بوڑھے نے کہا کہ ایک ایک بکرا (بھنوا کر) منگاتے رہو اور سب مل کر کھاتے رہو اس طرح سب (بکروں کا گوشت) کھا جاؤ گے چناں چہ ایسا ہی ہوا اور اُن کا مطالبہ باقی رہا کہ پیٹ نہیں بھرا ـــ ایک بوڑھے میاں کی اور حکایت ہے کہ ایک بارات میں گئے اور وہاں لڑکی والے نے سب براتیوں کے ہاتھوں کو سیدھا کرکے کھپچیاں بندھوادیں اور کہا کہ اس طرح کھانا پڑے گا۔ اب سب گھبرا گئے کہ کیسے کھا سکتے ہیں۔ منھ تک تو

ہاتھ نہیں جاسکتا۔ (ایک) بڑے میاں نے کہا کیا دیکھتے ہو آمنے سامنے بیٹھ جاؤ اور ہر شخص اپنے سامنے والے کے مُنھ میں لقمہ دیتا رہے ـــ یہ تو بڑھاپے کی دنیا کی برکت ہے اور آخرت کے اعتبار سے یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ مسلمان بوڑھوں کا (بعد مرگ) لحاظ کرتے ہیں ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جس کے پاس سرمایہ ہو اُس کو تبلیغ کا انتظام کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ علماء اس کام کے لیے چندہ نہ مانگیں اس سے علماء کی وقعت نہیں رہتی ـــ وعظ کہہ کر جہاں چندہ مانگا سب اثر گرڈ بڑ ہوگیا۔ بڑے زور شور کی تقریر، گھنٹے دو گھنٹے کی محنت، ایک لفظ چندہ کے کہتے ہی سب ختم ـــ اس لیے چندہ بھی وہی کرے جس کے پاس سرمایہ ہو اور علماء صرف تبلیغ کریں۔ اُسوقت تبلیغ موثر ہو سکتی ہے ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ خلوص بڑی چیز ہے اور یہ اکثر غرباء میں ہوتا ہے اور اُمراء میں فُلوس تو ہوتا ہے مگر خلوص نہیں ہوتا ـــ

ایک غریب شخص نے مجھ کو ایک اکنی دے کر کہا کہ میں ایک پیسہ دینا چاہتا ہوں تین پیسے واپس کر دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بھلا اس میں کیا ریاکاری ہو سکتی ہے؟ سو غرباء سے ہمیشہ میرا یہ معاملہ رہا ہے محض اُن کے خلوص کی وجہ سے اور اُمراء کے ساتھ دوسرا معاملہ ہوتا ہے ـــ چنانچہ نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خاں صاحب مرحوم نے مجھ کو مدعو کیا میں نے چند شرائط پیش کیں منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھ کو کچھ دیا نہ جائے۔ سب شرائط طے ہوگئیں ـــ میں ڈھاکہ پہونچا نواب صاحب نے درخواست کی کہ میری چھوٹی چھوٹی دو لڑکیاں ہیں اُن کو بسم اللہ پڑھا دیجئے اور یہ بھی کہا کہ ہمارا خاندانی دستور یہ ہے کہ بسم اللہ شروع کرانے کے وقت کچھ دیا جاتا ہے۔ اگر نہ دیا جائے یا قبول نہ کیا جائے تو ہماری سُبکی ہوتی ہو ـــ یہ (ایک) ترکیب تھی کہ اس بہانے سے مجھ کو نقد دیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی سبکی گوارا نہیں کر سکتا لیکن اپنی وضع کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تو اُس کی صورت یہ ہے کہ میں جلوت میں تو آپ کا عطیہ لے لوں گا اور خلوت میں واپس کر دوں گا اور عمر بھر واپسی کا کسی سے تذکرہ نہ کروں گا مگر اپنے دل میں تو خوش رہوں گا کہ میں نے اپنے مسلک اور مشرب کے خلاف نہیں کیا بس چُپ رہ گئے اور رُقعہ لکھا کہ میری غلطی تھی اب میں آپ کی وضع پر اپنی تجویز کو نثار کرتا ہوں۔۔۔۔ نواب صاحب مجھ سے بعضے پیر دل کی شکایت کرتے تھے کہتے تھے کہ ہمارا روپیہ بھی لیا اور اپنے سامنے (تعظیمی) سجدے تک کرائے ـــ

میرے محض چند روز کے قیام میں پاس بیٹھنے سے اُن کی کایا پلٹ گئی حالانکہ میں نے نہ کچھ کہا نہ کسی بات سے (جا بیجا) روکا ــــ واپسی کے بعد وطن پہنچ کر کچھ روپیہ سفر خرچ میں سے بچ گیا میرا ہمیشہ کا معمول رہا کہ بچی ہوئی رقم واپس کر دیتا تھا مگر یہ واپس کرنا نواب صاحب کی شان کے خلاف تھا اور رکھنا بھی وضع کے خلاف تھا میں نے یہ کیا کہ مسجد میں لگا دیا اور اُن کو اطلاع کر دی ــــ اور بریلی میں یہ مشہور ہوا کہ چھ ہزار روپیہ لایا ہے میں نے سُن کر کہا کہ تم بھی لے آؤ ــــ ایک ذرا سا نسخہ تھا استغنار کا جس سے دین کی عزت ہوئی اور نواب صاحب کو دینی نفع حاصل ہو گیا ــــ

فرمایا کہ ایک واعظ مولوی صاحب کی حکایت قصبہ بڑھانہ میں جا کر سُنی کہ اُن کا وعظ آٹھ آنے سے پانچ روپیہ تک کا ہوتا تھا ــــ ہر قسم کے طبائع کے لوگ موجود ہیں ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا انتظام کے لیے منتظم کا اعتدال کے ساتھ کسی قدر سخت ہونا بھی ضروری ہے۔ بدون اس کے انتظام ہونا دشوار ہے۔ فلاں مدرسہ کے اندر جو فساد ہوا اُس کا اصل سبب کام کرنے والوں کا ڈھیلا پن ہے جو مشورہ میں نے دیا تھا اُس پر منتظمانِ مدرسہ پورا عمل نہ کر سکے ورنہ ایک دم فساد خدا کے فضل سے ہوا ہو جاتا کام قوتِ قلبی سے ہوتا ہے محض ظاہری سامان سے کام نہیں ہو سکتا ــــ

میں نے ایک ایسے ہی موقع پر خود حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا۔ اُس وقت..... مدرسہ میں (سخت) اختلاف ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ ایک آدمی ہمارا بھی ممبر ہو اور حضرتؒ منظور نہ فرماتے تھے۔ میں نے لکھا کہ اس کو منظور فرما لیجئے کثرت تو پھر بھی حضرت ہی کے خدام کی رہے گی ورنہ مدرسہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ حضرتؒ نے جواب تحریر فرمایا تھا کہ نا اہل کو ممبر بنانے میں ہم سے مواخذہ ہوگا اور اب اس فساد کے وہ خود ذمے دار ہیں اگر مدرسہ ٹوٹ جائے ــــ ہم کو خدا تعالیٰ کی رضا منظور ہے مدرسہ مقصود نہیں ہم نا اہل کو ممبر نہیں بنا سکتے ــــ

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ سوادِ اعظم کا مشہور مفہوم یہ ہے کہ ہر زمانے میں جس طرف کثرت ہو۔ میں کہتا ہوں یہ مراد نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ خیر القرون میں جس عقیدے کی طرف کثرت تھی کیونکہ اُس وقت اہل باطل کم تھے اہل خیر زیادہ تھے۔ اُس وقت کسی طرف کثرت ہونا علامت تھی اُس کے حق ہونے کی۔ اس وقت کا سوادِ اعظم مراد نہیں اور وہ بھی عقاید میں کثرت مراد ہے آرار

میں کثرت مراد نہیں۔ جیسا اس وقت جمہوریت کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے اور وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آیۂ قرآنی) سے استدلال کیا جاتا ہے (میں نے جو کہا) اس کے سمجھنے کے لیے بڑی بات یہ ہے کہ صحابہؓ کا یہی عمل تھا ان سے زیادہ قرآن کو کون سمجھ سکتا ہے؟ دیکھیے سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشورہ کیا۔ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے میں تمام صحابہ ایک طرف تھے اور تنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے۔ پھر دیکھو کیا عمل ہوا؟ ——

اور جو لوگ جمہوریت کے مدعی ہیں اخیر میں وہ بھی شخصیت ہی سے کام لیتے ہیں چنانچہ یہ معلوم ہوا ہے کہ اختلافات کے وقت وائسرائے کو اختیار ہوتا ہے کہ جس شق پر چاہے عمل کرے۔ اسی طرح بادشاہ کو اختیار ہے کہ جب چاہے پارلیمنٹ توڑ دے۔ غرض سب کو اسی طرف آنا پڑا۔ آخر میں شخصیت ہی رہ جاتی ہے۔ خود اسی جمہوریت میں کثرت (اور اکثریت) والے چاہتے ہیں کہ ہماری شخصیت رہے ..... پھر اگر کثرت بھی معتبر ہوتی تو مطلق کثرت نہیں۔ اہل کی کثرت معتبر ہوتی اور وہ بھی جب کہ خلوئے ذہن (خالی الذہن ہونے) کی حالت میں ہو۔ یہاں دونوں باتیں نہیں ——

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اگر مسلمان اسی پر (اعمال صالحہ کے لیے) آمادہ ہو جائیں کہ ہم کو آخرت میں سب کچھ مل جائے گا تب بھی ان کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور وہ تمام دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ خیر آخرت تو بڑی چیز ہے۔ دنیا ہی کے بہت سے مفاد ایسے ہیں کہ وہ اتفاق پر موقوف ہیں۔ یہ تو دنیاوی کاموں کے لیے بھی اتفاق نہیں کرتے ——

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا ..... میں نے اصلاحِ انقلاب میں دلائل سے یہ ترتیب ثابت کی ہے کہ اول ماں باپ کا حق ہے۔ دوسرے درجے میں استاد کا۔ تیسرے درجے میں پیر کا۔ ماں باپ کی مثال اینٹ مٹی جمع کرنے والے کی ہے اور استاد کی مثال مکان بنانے والے کی ہے اور پیر کی مثال نقش و نگار کرنے والے کی —— ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اصل چیز طلب ہے اس طلب پر اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جیسے بچے کو ماں کے دودھ کی طلب ہوتی ہے تو دودھ اس کے اثر سے اترتا ہے تو ماں کو ناز نہ چاہیے کہ میں دودھ بچے کو دیتی ہوں۔ دودھ خود بچے کی طلب کا اثر ہے۔ (دودھ) تجھ کو اسی واسطے عطا فرمایا ہے کہ تو بچے کو دے۔ البتہ بچے کو ضروری ہے کہ وہ (سن شعور میں پہونچکر) اس کو اپنا محسن سمجھے۔ اسی بنا پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ شیخ اپنے پاس سے کچھ نہیں دیتا مرید ہی میں سب ذخیرہ ہے۔ شیخ سے اس کا ظہور ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ مرید

کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے ــــ سبحان اللہ تحقیق اور تربیت دونوں کو کس طرح جمع فرمایا۔ واقعی اپنے فن کے امام تھے، مجتہد تھے، مجدد تھے۔ حضرتؒ کے فیضِ باطنی سے ایک عالم منور اور روشن ہوگیا۔ سبحان اللہ کیسی ذات تھی ــــ

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت، فلاں شخص کی حالت دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے شیخ نے قطعاً اُن کی تربیت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ فرمایا نری توجہ سے کیا ہوتا ہے جب تک دوسری طرف سے بھی طلب نہ ہو ــــ حضرات انبیاء علیہم السلام سے تو زیادہ کسی کی توجہ نہیں ہوسکتی مگر جہاں دوسری طرف سے طلب نہیں ہوئی کچھ بھی نہ ہوا۔ عادۃ اللہ یہی ہے اسی عدمِ طلب کے متعلق حق تعالےٰ فرماتے ہیں ــــ اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا کٰرِهُوْنَ۔ اِدھر سے طلب اور ارادہ ہو تو اس طرف سے عطا ہوتی ہے ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اہلِ باطل میں فہم و عقل کا تو نام و نشان نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں اتباعِ دین سے، تقویٰ سے، طہارت سے، اہل اللہ اور خاصانِ حق کی صحبت سے۔ بدون اس کے عقل و فہم نہیں پیدا ہوتے ــــ

فرمایا کہ ــــ تاویل و توجیہہ کا بھی ایک معیار ہے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی غالب حالت صلاحیت کی ہے۔ دین کا مطیع ہے، عقائد صحیح ہیں ایسے شخص سے اگر کوئی غلطی ہوجائے وہاں تاویل واجب ہے اور جہاں فسق و فجور کا غلبہ ہے وہاں تاویل نہ کی جائے گی اور مستحقینِ تاویل کی شان میں اگر تاویل بھی نہ کی جائے تب بھی کفِّ لسان (زبان کا روکنا) واجب ہے گو اُن کا معتقد ہونا بھی واجب نہیں جیسے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ..... ان کا معتقد ہونا واجب نہیں مگر گستاخی بھی محلِ خطر ہے اور خطر بھی ایسا جس کو امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ اہلِ طریق سے بدگمانی کرنے میں اندیشہ سوءِ خاتمہ کا ہے اور اگر کچھ نہ کہو تو کچھ اندیشہ نہیں۔ تو بہتر صورت یہی ہے اور احتیاط اسی میں ہے کہ کچھ نہ کہو گو یہ بھی ضروری نہیں کہ معتقد ہو جاؤ ــــ بس نہ معتقد ہو اور نہ کچھ بے جا کلمہ کہو اسی میں خیر ہے ..... ہمارے بزرگوں کا تو مسلک یہ ہے کہ وہ افراط و تفریط کو پسند نہ فرماتے تھے۔ بجز منصوص علیہ حضرات کے کسی خاص

عــہ کیا ہم اس دعوئی ایمان کو تمہارے گلے میں ڈالدیں درآنحالیکہ تم اس سے نفرت کیے چلے جاؤ۔

(اور مُتعیّن) بزرگ کا نہ معتقد ہونا فرض ہے اور نہ بُرا بھلا کہنا جائز..... شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ پر بعض خشک علماء بڑا ہی سب و شتم کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ بُرا بھلا کہا جائے۔ فصوص عــہ کو نہ مانیے۔ فصوص کا ماننا فرض نہیں مگر نصوص کا ماننا تو فرض ہے اور نصوص کا حکم ہے کہ بدون دلیل شرعی یقینی کے کسی کو بُرا کہنا جائز نہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ کھلے اور یقینی یہ سب چیزیں ہونا چاہئیں، قرآن بھی، حدیث بھی، فقہ بھی، تصوف بھی ____ پھر ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا شخص حدود پر رہ سکتا ہے۔ جامع نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے محقق اور جامع، موقع اور محل کو دیکھتا ہے ____

ایک مدرسہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ____ جتنا بھی کام ہو اُصول صحیحہ کے تابع ہو اور حدود شرعیہ کے ماتحت رہ کر ہو، مقصود، خدا کی رضا ہے۔ مسلمان کے ہر کام کا مقصود خدا کی رضا ہونا چاہیے اور اُن کی خوشنودی پیش نظر رہنا چاہیے۔ مدرسہ رہے یا جائے ____ چاہے مدرسہ ملک میں بدنام ہو یا نیک نام، چندہ بند ہو یا جاری رہے۔ طلباء زیادہ ہوں یا کم، غرض کہ کچھ بھی ہو اُصول صحیحہ کے تابع رہنا چاہیے اور یہ میری رائے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمانے کے مطابق ہے اپنی تنہا رائے نہیں ..... ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں فساد اور بگاڑ کی رفتار تیزی پر ہے اور اصلاح کی رفتار سُست ہے تو پھر بگاڑ ہی غالب رہے گا اور اُسی کو قوت ہوگی۔ ہاں اگر اصلاح کے مقابل فساد اور بگاڑ نہ ہوتا تو پھر بتدریج اصلاح کی رفتار چلتی ..... تو پھر تجربہ عمل کے لحاظ سے اصلاح کو قوت ہو جاتی

ایک موقع پر فرمایا کہ اب فلاں مدرسہ میں اصلاح محض تدبیر سے محال ہے۔ اب تو ضرورت قوت کی ہے۔ اس لیے کہ اصلاح تو اس غلطی کی ہوتی ہے جو بلا قصد کے ہوتی ہے اور جو غلطی قصد سے ہو اور نفس کی شرارت کا اُس میں دخل ہو اور پھر اُس میں اغراض بھی وابستہ ہوں وہاں کیسے اصلاح ہو سکتی ہے۔ قوت سے تو اصلاح ہو سکتی ہے سو اس سے کام لیا جائے ..... کام تو کام کے طریقے سے ہو سکتا ہے اور جس درجے کا کام ہو اُسی درجے کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے .....

ایک صاحب کی غلطی پر مواخذہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کون سی انسانیت ہے کہ ضروری سوال پر بھی آپ جواب نہیں دیتے اس متانت اور بزرگی سے یہاں کام نہ چلے گا یہ سکہ اور بازاروں میں چلتا

عــہ فصوص الحکم، مصنفہ شیخ محی الدین ابن عربی

ہے جہاں بڑی بڑی دُکانیں جمائے بیٹھے ہیں اور بضرورت بولنا ذمصنوعی بزرگی کے بھی مُنافی نہیں البتہ زیادہ بولنا
مُنافی، بزرگی کے ہو سکتا ہے اور اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ اس پر ایک مُفید واقعہ یاد آیا۔ ایک بے تکلف
..... مولوی صاحب نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ ..... زیادہ
بولنا اچھا نہیں اور آپ زیادہ بولتے ہیں (حضرت مولاناؒ کی عادت تھی کہ افاداتِ علمیہ کو شاگردوں
کے سامنے خوب وضاحت اور خاص شغف کے ساتھ پیش فرمایا کرتے تھے) ____ حضرتؒ نے فرمایا
کہ زیادہ بولنے کی فی نفسہٖ ممانعت نہیں اصل میں فضول بولنے کی ممانعت ہے مگر مبتدی اس اعتدال
پر عادۃً قادر نہیں ہوتا اس لیے اُس کو زیادہ تقلیل کی تعلیم کی جاتی ہے تاکہ اعتدال پر آجائے۔ اسکی
ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک کاغذ جو مدت تک ایک رُخ پر مُڑا رہا ہو تو اُس کو سیدھا کرنے کے لیے
اُس کی جانبِ مخالف کی طرف موڑنے میں مُبالغہ کرتے ہیں یعنی اُس کو دوسری جانب خوب زور سے
موڑتے ہیں۔ پھر جب کھولتے ہیں تو وہ سیدھا ہو جاتا ہے اور یہی مقصود تھا ____ عجیب مثال ہے۔
ایسی باریک بات کو اس قدر بدیہی کر دیا۔ حقیقی علم اس کو کہتے ہیں جس میں نہ پیر زاہد کی اصطلاحیں
ہیں نہ تدقیقات ہیں ____

ایک خط کو ملاحظہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ عبارت بھی ہر شخص کو لکھنا نہیں آتی اس کے لیے بھی علم
دین پڑھنے کی ضرورت ہے یعنی منقولات۔ ورنہ محض معقولات پڑھنے کا وہ حشر ہوگا جیسے ایک معقولی
مولوی صاحب سے وعظ کے لیے کہا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ کو وعظ کہنا نہیں
آتا۔ کہنے لگے کون کہتا ہے کہ مجھ کو وعظ کہنا نہیں آتا میں ابھی کہتا ہوں یہ کہہ کر منبر پر جا بیٹھے اور وعظ
شروع کیا کہ خدا تعالیٰ کی وہ شان ہے اور وہ قدرت ہے کہ وہ عالم کو لیس (نیست) سے ایس (ہست)
میں لائے ہیں اور پھر ایس سے لیس میں لے جائیں گے۔ غرض چار پانچ منٹ تک وعظ میں یہی ایس
لیس کرتے رہے اس کے بعد وعظ ختم کر دیا ____

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے حساب باقاعدہ نہیں سیکھا اور فرائض وغیرہ نکال لینا اور
چیز ہے، فن میں مہارت ہونا اور چیز ہے۔ مجھ کو فن میں مہارت نہیں ____

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
نے وساوس کا ایک عجیب علاج فرمایا ہے۔ واقعی حضرت اس فن کے مجتہد تھے۔ دوسرے مشائخ تو لمبے چوڑے

وظائف بتلاتے ہیں ـــ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب وساوس کثرت سے آنے لگیں تو مستقلاً اُن کے نکالنے کے درپے نہ ہو جاؤ بلکہ اُس وقت یہ خیال کرلو کہ خدا تعالیٰ کی بھی کیا عجیب صنعت ہے بتائیے ایک دریا بنایا ہے جس میں کیسی کیسی موجیں اُٹھتی ہیں کہ اُن کے روکنے کی کوشش کرتا ہوں مگر موجیں ہیں کہ نہیں رُکتیں ــ بس اس صُنعِ الٰہی کے مراقبے سے وہ وساوس آئینہ ہو جائیں گے مشاہدہ صُنعِ الٰہی کا ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل کوئی کام ہو کام کرنے والوں میں نہ اُس کے اُصول ہیں نہ حُدود، نہ اہل کو دیکھا جاتا ہے نہ نااہل کو بڑی ہی گڑبڑ ہو رہی ہے حالانکہ کام کرنے سے قبل ہمیشہ اُس کے نتائج پر غور کرنا اور اُصول صحیحہ کے تابع ہو کر کام کرنا ضروری ہے ــ ایک مدرسے کے ایک طالب علم کا خط آیا تھا، لکھا تھا کہ ...... میرے سپرد شعبۂ تبلیغ کی امارت ہے، جمعرات کے روز مبلغین کو جمع کرکے تبلیغ کے لیے بھیجنا میرے ذمّے ہے اور بعض مرتبہ بعض مقام پر میں خود بھی تبلیغ کے لیے جاتا ہوں، اس مرتبہ ایک طالب علم سے کچھ غلطی ہو گئی میں نے اس غلطی پر تنبیہ کی تو اُس نے کہا کہ مجھ کو سزا دیجیے میں نے اُس کے کان پکڑوا دیے، اُس کے بعد مجھ کو بے حد ندامت ہوئی اور اس طالب علم سے معافی چاہی، مجھ کو ایسا کرنا (کان پکڑوانا) چاہیے تھا یا نہیں؟ اور یہ اچھا ہوا یا بُرا؟ میں نے لکھ دیا کہ بُرا ہوا بلا ضرورت اُس کی اہانت کی، تم امارت سے استعفاء دیدو، تم اس قابل نہیں، آج پھر خط آیا ہے کہ میں امارت سے مستعفی ہو گیا ہوں اور اپنی حرکت اور بے وقوفی پر نادم ہوں، میں نے لکھا ہے کہ امارت ہی کو چھوڑا ہے یا تبلیغ کے کام کو بھی چھوڑ دیا، کبھی یہ سمجھتے ہوں کہ "امیر" کے ذمّے تو دین کا کام ہے اور "غریب" کے ذمّے دین کا کام نہیں ـــ جب امارت ہی نہیں تو دین کا کام میرے ذمّے نہیں ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب (بیدل رامپوری) خیالات کے تو خیر غالی..... تھے مگر تھے نیک نیت۔ میں زمانۂ طالب علمی میں دیوبند سے میرٹھ والد صاحب کے پاس آیا ہوا تھا۔ زیادہ قیام کی ضرورت تھی۔ والد صاحب نے میرے اسباق کے ناغہ کے خیال سے مجھ کو درس کے لیے اُن کے سپرد کرنا چاہا مگر انھوں نے فرمایا کہ کثرتِ اساتذہ مُناسب نہیں اور وہ بھی دو چار روز کے لیے کیونکہ کثرت میں سب کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔ کیسے کام کی بات فرمائی ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ متکبرین کی سی وضع اختیار کرنا، اُن کا لباس پہننا اس میں خاصیت ہے کبر کی۔ جس سے ایک ظُلمت پیدا ہوتی ہے اور قلب بگڑتا ہے اسی طرح اپنی حیثیت سے زیادہ قیمتی کپڑا

پہننا، اپنی وسعت سے زیادہ سامان جمع کرنا، یہ سب کبر کی فرع ہیں۔ بالخصوص جبکہ فجار و کفار کے ساتھ تشبہ بھی ہو تب تو ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مصداق ہوگا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ یہ جدید تعلیمیافتہ لوگ تو مولویوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ مولوی بے وقوف ہوتے ہیں مگر اُن کو جو مولوی ملا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کتابیں سمجھ کر نہیں پڑھیں ورنہ اُن کو پتہ چل جائے کہ مولوی بے وقوف ہوتے ہیں یا خود جناب۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر طالب علم دینی کتابیں سمجھ کر پڑھے پھر اُس کی قابلیت کے مقابلے میں کوئی کتنی ڈگریاں حاصل کیے ہوئے ہو ہرگز قابلیت ظاہر نہیں کر سکتا۔

ایک صاحب نے عرض کیا کہ ایک قادیانی چند مرتبہ میرے پاس اپنے مذہب کی کتابیں دکھلانے کو لا چکا ہے اور مجھ سے زبانی مذہبی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں عالم نہیں ہوں اپنے مذہب سے پورا واقف نہیں۔ یہ باتیں تم ہمارے علماء سے پوچھو اور انھیں سے گفتگو کرو۔ فرمایا۔ یہی جواب مناسب ہے۔ جتنے اہل باطل فرقے ہیں شب و روز اسی ذکر میں رہتے ہیں اور اہل حق کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ پھر اُن کے پاس اتفاق سے اپنے مسلک و مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کا سامان موجود ہے۔ کافی سرمایہ ہے۔ دوسرے ممالک تک میں تبلیغ کے لیے پہونچ گئے۔ آج کل حق و باطل کو تو کوئی دیکھتا نہیں صرف ان باتوں کو دیکھتے ہیں کہ تبلیغ کا کام کرتے ہیں، غیر مسلموں سے مناظرہ کرتے ہیں۔ اسلام کے ہمدرد ہیں۔ اگر (ایسی) تبلیغ اور اشاعت حق کا معیار ہے تو اس وقت عیسائیوں سے زیادہ کوئی بھی تبلیغ نہیں کر رہا۔ تمام ممالک میں اُن کے مشن کھلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مناظرہ کرنا بھی حق کا معیار نہیں ہو سکتا۔ عقل و فہم لوگوں سے جاتا رہا۔ یہ بھی ایک بڑا قہر خداوندی ہے۔ اب تو یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ لوگوں کو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ قادیانی تو اپنے کو مسلمان کہتا ہے پھر علماء اُس کو کافر کیوں کہتے ہیں؟ خوب سمجھ لو اُس کا اپنے کو مسلمان کہنا ایسا ہے جیسے مسیلمۂ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ نماز پڑھتا تھا حضورؐ کی رسالت کی تکذیب نہ کرتا تھا بلکہ صرف اپنی رسالت کا دعویٰ کرتا تھا کہ جیسے یہ رسول ہیں ایسا ہی میں بھی رسول ہوں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ طلبِ صادق بھی عجیب چیز ہے۔ یہی ایک ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑے سخت کام کو سہل بنا دیتی ہے۔ دیوبند میں ایک شخص تھے دیوان اسد دیا۔ انھوں نے حضرت

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی درخواست کی. حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں کیا چیز ہوں اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بتلایا کہ وہاں جا کر مرید ہو جاؤ۔ انھوں نے کچھ چون و چرا نہیں کی سیدھے گنگوہ حضرت کی خدمت میں پہونچے اور جا کر مرید ہو گئے. پھر دیوبند واپس آئے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پھر عرض کیا کہ حضرت! بیعت کر لیجئے. فرمایا کہ گنگوہ (جا کر) حضرت سے تو بیعت ہو آئے پھر یہ درخواست کیسی؟ عرض کیا کہ وہاں تو آپ کے فرمانے سے بیعت ہو آیا اور کبھی جس جس سے آپ فرمائیں بیعت ہو جاؤں، باقی اصل، بیعت تو آپ ہی سے ہوں گا ـــ کیا ٹھکانا ہے اس محبت اور اطاعت کا کیسے سمجھ دار آدمی تھے مخالفت کبھی نہیں کی فسخ کی ـــ اور درخواست بھی نہ چھوڑی. آخر مولانا کو بیعت کرنا پڑا ـــ اور واقعی بیعت تو وہی ہے جو ایسی طلب کے بعد ہو اب تو بیعت، اکثر رسم ہی رسم رہ گئی ہے ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ وہ اپنے فضل سے اور بزرگوں کی برکت سے عین وقت پر ضرورت کی چیز قلب میں القا فرما دیتے ہیں ـــ ایک مولوی صاحب جو اپنے ہی عقائد کے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ اگر تم خفا نہ ہو تو ایک بات کہوں، میں نے کہا کہ خفا ہونے کی کیا بات ہے کہو کیا بات ہے. کہا کہ دشمن کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر ہم کو بھی رحم آجاتا ہے تو کیا حق تعالیٰ کو رحم نہ آئے گا جب کفار، دوزخ میں جلیں گے. میں نے کہا کہ یہ آپ کا قیاس مع الفارق ہے. آپ میں تو انفعال ہے اور اللہ تعالیٰ انفعال سے منزہ ہے وہاں تو جو کچھ بھی ہوتا ہے ارادہ سے ہوتا ہے. پھر وہ ارادہ، حکمت سے ہوتا ہے ـــ مولوی صاحب نے (یہ جواب سُن کر) توبہ کی ـــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ شاہانِ سلف میں جس قدر بادشاہ گزرے ہیں اُن کو رعایا کے ساتھ شفقت تھی. اُن کی پرورش کا خیال رکھتے تھے. اب اکثر حکومتوں کو اس کا خیال نہیں اور جب تک شفقت نہ ہو. پرورش کا خیال نہ ہو کوئی طریقہ اور کوئی تدبیر رعایا کو مطیع بنانے کی نہیں

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ذہانت بھی عجیب ـــ چیز ہے بشرطیکہ اُس کا استعمال بھی محل پر ہو. سُلطان عبدالحمید (سلطان ٹرکی) سے کسی یورپین بادشاہ نے کہا تھا کہ آپ یورپ کے درمیان میں ایسے ہیں جیسے بتیس دانتوں کے درمیان زبان ـــ اس میں تعریض تھی عجز و ضعف کی طرف جس کو سلطان سمجھ گئے اور فرمایا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے مگر قدرتی سنّت یہ ہے کہ دانت پہلے

فنا ہو جاتے ہیں اور زبان باقی رہتی ہے۔ عجیب جواب ہے آخر تو شاہ ہی دماغ تھا ــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہمیشہ سے جس قدر مسلمانوں کے مذہب کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی اور مخالفت ہو رہی ہے اگر اس سے ہزارواں حصہ کوشش بھی کسی دوسرے مذہب کے مٹانے کی کی جاتی تو اب تک کبھی کا فنا ہو چکتا ــــ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی حامی ہے اس لیے انشاء اللہ تعالیٰ یہ مٹ نہیں سکتا ــــ اور یہ بھی ایک وجہ ہے مسلمانوں کی بے فکری کی۔ سمجھتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی بھی حامی نہ ہو تب بھی خدا تعالیٰ تو حامی ہے وہ خود دین کے محافظ ہیں اور اسی پر کیا حصر ہے۔ استغناء مطلقاً مسلمانوں کا خاصہ ہے اور یہ شجاعت کے لوازم سے ہے اور دوسری قوموں میں نہیں ــــ

فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ میں مرض غیبت میں مبتلا ہوں اس کا کوئی طریقہ، علاج تبلائیے۔ میں نے لکھ دیا کہ یہ فعل، اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ آج پھر خط آیا ہے لکھتے ہیں کہ ہے تو اختیاری مگر بغیر علاج کے اصلاح کے غیر ممکن ہے۔ میں نے لکھا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ زنا ہے تو اختیاری مگر بدون، علاج کے اصلاح غیر ممکن ہے تو کیا بجز ترک زنا کے اُس کی اصلاح کا اور بھی طریقہ آپ کے نزدیک ہے؟ ــــ

ایک اہل علم کے خلاف شریعت، افعال کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا کہ علم پڑھ کر بھی جس میں خشیت نہ پیدا ہو اس سے وہ جاہل اچھا جس میں خشیت ہو۔ علم کی مثال، نافع اور مضر ہونے میں تلوار کی دھار کی سی ہے اس سے دوست بھی کٹتا ہے اور دشمن بھی کٹتا ہے۔ اگر تلوار چلانے والا ماہر فن نہ ہو تو کبھی اس سے اپنے ہی کو نقصان پہونچ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح کہ مارا ہاتھ دشمن کے اور وہ خالی گیا اور لوٹ کر اپنے ہی پر پڑ گیا۔ اسی طرح علم بڑی ہی نازک چیز ہے اس میں امن بھی ہے اور خوف بھی۔ گو غالب، امن ہی ہے، مگر حسن استعمال کی ضرورت ہے ــــ

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! یہ مشہور ہے کہ چودھویں صدی کے بعد کا کوئی بیان نہیں آیا۔ کیا اس کی کوئی اصل ہے؟ فرمایا کہ یہ تو یوں ہی مشہور ہو گیا۔ روایات میں نہ تیرھویں کی تخصیص ہے نہ چودھویں کی نہ پندرھویں کی ــــ فرمایا کہ ایک مولوی صاحب کسی بزرگ کا قول نقل فرماتے تھے کہ (دینی) تصنیف بھی اُس اُمت کے خصائص میں سے ہے۔ واقعی اور اُمتوں میں اس شان کی تصنیف نہیں ہوئی۔ ایک ایک حدیث کو حضورؐ تک پہونچا سکتے ہیں اور وسائط کے نام بتلا

سکتے ہیں کہ فلاں سے فلاں نے روایت کی اور اُن کے حالات، بیان کر سکتے ہیں۔ یہ اسی مذہب کی خصوصیت میں سے ہے ورنہ کوئی مذہب بھی کسی اپنی مذہبی بات کو اپنے پیشوا تک اس اہتمام کے ساتھ نہیں پہونچا سکتا۔ یہ بات کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی سوائے اسلام کے — اللہ اکبر، علماء نے دین کی اس قدر خدمت کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ساری ساری عمریں خدمت دین میں گزار دیں اور یہ اس لیے زیادہ عجیب ہے کہ سلاطین اکثر اِن حضرات کے مخالف بھی رہے جس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اُن سے امداد تو کیا ملتی اور اُلٹی مخالفت کا معاملہ رہتا تھا۔ باوجود کسی مادّی امداد نہ ہونے کے ایسی عظیم الشان خدمت نہایت عجیب بات ہے اور سلاطین کی مخالفت اِن حضرات کے اثر کی وجہ سے تھی ......

اِن حضرات نے جیلوں میں رہ کر اور ہر قسم کی تکلیفیں اُٹھا کر دین کی خدمتیں کیں — ایک ہم ہیں کہ عالیشان محلوں میں رہ کر اور نرم فرشوں پر بیٹھ کر تنعّم کر رہے ہیں — افسوس آج اُن کی خدمات کو دقیانوسی خیالات بتلایا جاتا ہے مگر وہ دقیانوسی تو ایسے (اعلیٰ) دماغ کے تھے کہ اگر اس زمانے میں ہوتے تو اِن احمقوں کو مُنہ بھی نہ لگاتے ہم تو پھر بھی اِن کی بہت رعایتیں کرتے ہیں..... اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی گنوار جاہل کسی وکیل کے مُعاملے یا مقدمے میں دخل دینے لگے۔ وہ وکیل اُس کو بے ہودہ سمجھ کر مُنہ بھی نہ لگائے گا —

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ تحریف دین میں تو آج کل بعضے لوگوں کو ایک خاص ملکہ ہو گیا ہے۔ جاہل تو بھلا کسی شمار میں نہیں لکھے پڑھے تعلیم یافتہ حتیٰ کہ بعضے جو مولوی کہلاتے ہیں وہ قرآن و حدیث میں ایسی تحریف کرتے ہیں کہ جس کا سر نہ پاؤں —

فرمایا کہ ہم تو پیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے جو ہم سے بے حسی کی توقع رکھی جائے۔ ہم تو طالب علم ہیں طالب علموں کو پسند کرتے ہیں۔ طالب علموں ہی میں رہتے ہیں۔ طالب علموں ہی کی باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں جن کو ایسی بزرگی پسند ہو جس میں بالکل حس ہی نہ رہے وہ ایسوں کے پاس جائے۔ اگر بزرگی یا پیری بے حسی کا نام ہے تو ایسی بزرگی اور پیری کو ہمارا سلام ہے —

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ تصنیف کا کام بہت ہی مشکل ہے۔ جو کام کرتا ہے وہی جانتا ہے کہ کیا کیا مشکلات پڑتی ہیں۔ آج کل تو (بہت سے) مصنفین برساتی مینڈک کی طرح اُمنڈ پڑے ہیں۔ اُن کا اس وقت کوئی ذکر نہیں۔ اُن کا تو یہ قصہ ہے کہ ایک پہلو لے لیا اور رسالہ لکھ

مارا جاے آگے پھر کچھ ہوا کرے۔ ذکر اُن مصنفین کا ہے جو محقق ہیں جن کے سامنے ہر پہلو پے ہر جزئی اور کلی پر نظر ہے اور اس حالت میں پھر وہ تصنیف کرتے ہیں۔ اُن کی حالت تصنیف کے وقت ایسی ہوتی ہے جیسے جاں کنی کے وقت ہوتی ہے ـــــ ایک کتاب میں لکھ رہا تھا اب تو وہ چھپ کر تیار ہو گئی مگر تصنیف کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ اُس کے ایک مقام پر اُلجھن پیدا ہوئی بہت غور اور فکر کی مگر کچھ نہ لکھ سکا بالآخر چھوڑ دیا۔ صبح کو قرآن شریف پڑھتا ہوا جنگل گیا اسٹیشن کے قریب پہونچکر وہ مقام حل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بے ساختہ دل میں ڈال دیا۔ وہاں سے محض اس خیال سے لوٹ کر آیا کہ کہیں ذہن سے نکل نہ جائے اور ذہول نہ ہو جائے۔ یہاں آ کر وہ مضمون لکھ کر پھر جنگل گیا اور وہ مضمون صرف دو سطریں تھیں۔ اب کسی کو کیا خبر کہ کام کرنے والے پر کیا گزرتی ہے اور دیکھنے والوں کو اس کی کیا خبر ہوگی کہ یہ دو سطریں کیا چیز ہیں؟ ـــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ خود بھی بڑی غلطی ہے کہ ایک دم اتنا بڑا کام (مدرسہ وغیرہ کا) شروع کر دیتے ہیں جس کام کو آدمی سنبھال نہ سکے اُس کام کو کرے ہی کیوں؟ اور اگر کرے بھی تو چھوٹے پیمانے پر شروع کرے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کوئی آمدنی کی سبیل فرما دیں تو جس قدر آمدنی بڑھتی رہے کام کو بڑھاتے رہیں جیسے بتدریج بچہ پرورش پاتا ہے۔ ـــــ اور ایسا ہی کام دیرپا اور مستقل بھی ہوتا ہے اور اسی کو قوت ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ مگر اس وقت اکثر مسلمانوں کے ہر کام میں صرف جوش ہوتا ہے۔ ہوش باقی نہیں رہتا ـــــ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس کو شاید منتہا سے بھی آگے پہونچا دیں گے مگر کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد خبرے بنا شد ـــ سوڈے کی بوتل کا سا جوش ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ چھوٹا سا کام بھی نہیں رہتا ـــ وہی مثل صادق آتی ہے "کھاؤں تو گھی سے نہیں تو جاؤں جی سے"۔ اور یہ بات بالکل بے قاعدہ اور بے اُصول ہے ـــــ ایک خط کو ملاحظہ فرما کر فرمایا کہ بعض کو لکھنا تو آتا نہیں خواہ مخواہ گڑبڑ کرتے ہیں۔ ایسا بُرا اور بھدا خط ہے کہ دیکھ کر بھی اُلجھن ہوتی ہے۔ ایسا ہی ایک اور صاحب کا خط آیا تھا۔ نہایت ہی بدخط تھا۔ اُس کو تو شاید ڈاکخانے والے بھی پڑھ کر پریشان ہوئے ہوں اور پتہ سمجھنے میں دقت ہوئی ہو۔ اُس میں لکھا تھا کہ میں اپنے نفس کی اصلاح چاہتا ہوں۔ میں نے جواب میں لکھ دیا تھا کہ نفس کی اصلاح کے پہلے ضرورت ہے اصلاح خط کی کیونکہ اس کا (خط) کا تعلق دوسرے کی راحت اور کلفت سے ہے۔ اگر اس میں شبہ ہو تو لفافے پر جو پتہ لکھا ہے اسی کو دیکھ لو۔ غالب یہی ہے کہ ڈاک خانے والے بھی پریشان ہوئے ہوں گے۔

حضرت عمرؓ کی شخصیت سازی

(از مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہمارے معاشرہ میں شخصیت سازی کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ ہر ایک اپنے حال میں مست اور دوسرے کی فکر سے بے نیاز ہے۔ حد یہ ہے کہ کسی کو یہ معلوم کرنے کی بھی فکر نہیں کہ اسلام میں کس قسم کی شخصیت مطلوب ہے۔

ذیل میں شخصیت سازی کے لیے حضرت عمرؓ کی کوششیں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ اسلام میں مطلوبہ شخصیت کا پتہ چل سکے۔

(۱) حضرت عمرؓ نے تحصیل علم اور سمجھ پر کافی زور دیا حتیٰ کہ جبری تعلیم کا حکم دیا۔

علیکم بالفقه فی الدین و	دین میں تفقہ (بصیرت) حاصل کرو حسن
حسن العبادة و التفهم فی	عبادت کے خوگر بنو اور عربیت میں سمجھ
العربیة ۱؎	پیدا کرو۔

ایک موقع پر فرمایا

کونوا اوعیة الکتاب و	کتاب کے ظرف (برتن) اور علم کے
ینابیع العلم ۲؎	سرچشمے بنو۔

ابوسفیان نامی ایک شخص کو متعین کیا کہ قبائل میں پھر کر لوگوں کو تعلیم پر مجبور کرے۔

۱؎ تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الستون ۲؎ الباب السابع والخمسون۔

بعث عمر بن الخطاب رجلا من	حضرت عمرؓ نے قریش کے ایک آدمی ابوسفیان
قریش یقال له ابو سفیان یستقرئ	نامی کو گاؤں والوں کے پاس بھیجا کہ وہ اُن سے
اهل البادیة[1]	پڑھنے کا مطالبہ کرے

(۲) فہم و دانش کو بڑائی و سرداری کا معیار مقرر کیا اور پست خیالات و کم ظرفی سے منع کیا۔

تفقهوا قبل ان تسودوا[2]	سرداری سے پہلے سمجھ حاصل کرو۔

ایک اور جگہ فرمایا

ان الحکمة لیست عند کبر السن و	حکمت (دانائی) کبر سن پر موقوف نہیں ہے وہ
لکنه عطاء من الله یعطیه من یشاء	اللہ کا عطیہ ہے جس عمر میں چاہتا ہے عطا کرتا
فایاك ودناءة الامور[3]	ہے۔ اپنے کو ادنیٰ اور کمتر باتوں سے بچاؤ۔

(۳) حالات و معاملات کی درستگی کو زیادہ اہمیت دی اور نماز و روزہ وغیرہ عبادات سے دھوکا نہ کھانے کی تاکید کی۔

لا تنظروا الی صلاة امرئ ولا صیامه	کسی کی نماز و روزہ کی طرف نہ دیکھو بلکہ بات
ولکن انظروا الی صدق حدیثه اذا	کرتے وقت اس کی سچائی دیکھو۔ شفا پانے کے
حدث والی ورعه اذا اشفی والی	بعد اس کی پرہیزگاری دیکھو اور امانت کے وقت
امانته اذا ائتمن[4]	اس کی دیانداری دیکھو۔

(۴) ہر وقت چاق چوبند رہنے کا حکم دیا۔ گردن جھکا کر بیٹھنے اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بننے سے منع کیا۔

یا هذا ارفع رأسك فان الخشوع	میاں۔ سر اُٹھاؤ۔ تمہارے دل میں جس قدر خشوع
لا یزید علی ما فی القلب[5]	ہے وہ سر جھکا کر بیٹھنے سے زیادہ نہ ہوگا۔

(۵) صفائی ستھرائی عبادت اور خوشبو کو زیادہ اہمیت دی۔

لیعجبنی الشاب الناسك نظیف	مجھے صاف ستھرا عبادت گزار اور خوشبودار

---

[1] کتاب الاغانی ج۔۶ اخبار زید [2] تاریخ عمرؓ الباب الستون۔ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً

الثوب طیب الریح ۔[1] جوان پسند ہے۔

(۶) کارکردگی و کارگزاری کو سرمایۂ حیات قرار دیا اور بے کاری و کام چوری کو نہایت حقیر رکھایا۔

کان اذا رای فتی فاعجبہ حالہ	جب کسی جوان کو اچھی حالت میں دیکھتے تو پوچھتے
سال عنہ ھل لہ حرفۃ فان قیل لا	کہ کون پیشہ کر رہے ہو۔ اگر جواب ملتا کہ کچھ نہیں کر
قال سقط من عینی۔[2]	رہا ہوں تو فرماتے کہ یہ میری نظر سے گر گیا۔

(۷) فیشن پر پابندی لگائی اور عیش و عشرت کی زندگی سے منع فرمایا، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا۔

اخشوشنوا ولا تبختروا کتبختر	کھردرے بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ
الاعاجم۔[3]	کرو۔

دوسری جگہ ہے۔

ایاکم والتنعم وزی العجم وعلیکم	اپنے کو عیش و عشرت کی زندگی اور عجمیوں کے طرز
بالشمس فانھا حمام العرب[4]	سے بچاؤ۔ سورج سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ عرب
	کا حمام ہے۔

ایک اور جگہ ہے۔

تمعددوا واخشوشنوا واخشوشبوا	سخت بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو
واخلولقوا واعطوا الرکب اسنتھا	پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب
وانزوا نزوا وارموا بالاغراض[5]	چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو اور جم کر
	تیر اندازی کرو۔

ایک موقع پر جوانوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔

نھینا عن التکلف[6]	ہم تکلف سے روکے گئے ہیں۔

(۸) دنیا کو مقصود بنانے سے منع کیا اور دوسرے جہان و آسمان پر نظر رکھنے کا حکم دیا۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] ازالۃ الخفاء مقصد دوم من ابواب شتی ص ۱۳۰ [4] ایضاً [5] ایضاً [6] بخاری ج ۲ باب ما یکرہ من کثرۃ السوال وتکلف ما لا یعنیہ ص ۱۰۸۳

لا يحزنك الا يجعل لك كثير ما تحب من امور دنياك اذا كنت ذا رغبة في امر آخرتك [1]

تمہیں یہ بات غم میں نہ ڈالے کہ دنیوی امور میں پسندیدہ چیزوں کا زیادہ حصہ نہیں ملا ہے۔ جبکہ تم کو آخرت کے امور سے رغبت ہے۔

(۹) لوگوں کے ذکر و تذکرہ میں پڑنے سے منع کیا کہ اس سے بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔

عليكم بذكر الله فانه شفاء واياكم وذكر الناس فانه داء [2]

تم اللہ کے ذکر کو لازم پکڑو کہ اس میں شفاء ہے اور لوگوں کے تذکرہ سے اپنے کو بچاؤ کہ اس میں بیماری ہے۔

(۱۰) خودستائی سے سختی کے ساتھ روکا اور اس کو احساس کمتری و خودکشی پر محمول کیا چنانچہ فرمایا

من قال انا عالم فهو جاهل [3]

جس شخص نے کہا میں عالم ہوں وہ دراصل جاہل ہے۔

ایک اور موقع پر ہے۔

المدح ذبح [4]

اپنی تعریف کرنا خود کو ذبح کرنا ہے۔

(۱۱) اپنی مضبوطی کے ساتھ دوسروں کی نکتہ چینی سے بے پرواہ رہنے کا حکم دیا۔

ما انعم الله على عبد نعمة الا وجد له من الناس ولو ان امرأ اقوم من السهم لوجد له من الناس من يغمز عليه فمن حفظ لسانه ستر الله عورته [5]

اللہ نے بندہ کو جس نعمت سے نوازا ہے اسکے حاسد ضرور ہوں گے۔ اگر کوئی شخص تیر سے زیادہ سیدھا ہو جب بھی اس میں عیب نکالنے والے ہوں گے۔ جس نے اپنی زبان کی حفاظت کی، اللہ اس کی خفیہ باتوں کو چھپائے گا۔

(۱۲) غلامی کے رواج کو ختم کیا کہ اس سے شخصیت مجروح ہوتی تھی چنانچہ فرمایا۔

لا يسترق عربي [6]

کوئی عربی غلام نہ بنایا جائے۔

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب السابع والخمسون [2] ایضاً ص۹۰ ایضاً الباب الستون۔ [3] تاریخ عمر الباب الستون ص۲۰۲ [4] کنز العمال ج۲ کتاب الجہاد من قسم الافعال الاساری ص۳۱۲

ابو موسیٰ اشعریؓ گورنر کو یہ حکم بھیجا۔

خلوا کل اکار و زراع [1] — کسی کاشت کار و ہل چلانے والے کو غلام نہ رکھا جائے۔

ایک موقع پر فرمایا۔

متیٰ استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهم احراراً [2] — تم نے ان لوگوں کو غلام کب سے بنا رکھا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔

(۱۳) حضرت عمرؓ نے تقدیر پر غلط اعتقاد سے روکا کہ اس سے شخصیت کی بالیدگی ختم ہوتی۔ اور پست حوصلگی سرایت کر جاتی ہے. چناں چہ ایک مرتبہ ملک شام جا رہے تھے معلوم ہوا کہ وہاں طاعون کی وبا شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔ واپسی کا ارادہ کیا تو ابو عبیدہؓ نے اعتراض کیا کہ

افراراً من قدر الله۔ — کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں۔

جواب میں فرمایا۔

نعم نفر من قدر الله الیٰ قدر الله [3] — ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

"تقدیر" اللہ کے علم و اندازہ کا نام ہے وہ کوئی آہنی زرہ نہیں ہے جو لوگوں کو پہنا دی گئی ہو کہ لوگ بھنچتے جائیں اور وہ قبضہ کرتی جائے جس طرح وہاں جانا تقدیر سے ہے اسی طرح نہ جانا تقدیر سے ہے۔ چناں چہ آگے فرمایا۔

ارءیت لو کان ابل فھبطت وادیاله عدوتان احداهما خصبة والاخریٰ جدبة الیس ان رعیت الخصبة رعیتها بقدر الله وان رعیت الجدبة رعیتها بقدر الله [4] — اچھا بتاؤ کہ اگر تم اپنے اونٹوں کے ساتھ کسی وادی میں اترو جس کے ایک طرف سرسبزی ہو اور دوسری طرف خشکی تو کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر سرسبز حصہ میں چراؤ تو یہ بھی تقدیر سے ہے اور خشک حصہ سے

---

[1] ایضاً [2] تاریخ عمر الباب الثامن والثلثون صـ۱۰۱ [3] مسلم باب الطاعون [4] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثالث والثلاثون صـ۹۹

چڑھاؤ گویہ کیسی تقریر سے ۔

(۱۴) شعائر کی غلط تعظیم سے روکا اور حجر اسود کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

انی لاعلم انك حجر لاتنفع ولا تضر[1]	میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے۔ نہ نفع پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔

اسی طرح " رمل " کے بارے میں فرمایا۔

مالنا وللرمل انما کنا رائینا به المشرکین وقد اھلکھم اللہ[2]	رمل سے ہمارا کیا تعلق ہے اس کے ذریعہ ہم نے مشرکین کو مرعوب کیا تھا۔ اب اُن کو اللہ نے ہلاک کر دیا۔

لیکن چونکہ اس کا تعلق روایت و یادگار سے تھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل موجود تھا۔ اس بنا پر نہ خود ترک کیا اور نہ ترک کرنے کا حکم دیا۔

(۱۵) اُس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا جس کے نیچے صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی کہ بعد میں لوگ اس کی زیادہ تعظیم نہ کرنے لگیں جس سے شخصیت پر حرف آئے ۔

امر عمر بن الخطاب بقطع الشجرۃ التی بویع تحتھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقطعھا لانھم کانوا یذھبون یصلون تحتھا فخاف علیھم الفتنۃ[3]	حضرت عمرؓ نے اس درخت کے کاٹ دینے کا حکم دیا جس کے نیچے لوگوں نے رسول اللہؐ سے بیعت کی تھی اس لیے کہ لوگ اس کے نیچے نماز پڑھنے لگے تھے جس سے فتنہ کا اندیشہ تھا۔

(۱۶) حضرت دانیالؑ کی قبر پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا کہ اس سے قبر کی غلط تعظیم کا اندیشہ تھا۔

وامر عمر باخفاء قبر دانیالؑ[4]	حضرت عمرؓ نے دانیالؑ کی قبر چھپانے کا حکم دیا۔

(۱۷) اوراد و وظائف کا سلسلہ زیادہ نہ جاری ہونے دیا کہ اس سے زندگی کے کاموں میں

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثالث والثلاثون ص۶۷ [2] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب دخول مکہ والطواف [3] مسلم باب الطاعون [4] الاعتصام للشاطبی ج۲ فصل تحدیکون اصل العمل مشروعا ص۹۲ [5] اغاثۃ اللھفان لابن القیم ص۲۷۸

عدل و اعتدال برقرار رکھنے میں دشواری ہوتی ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ بعد کے فتنوں کے ذکر میں کہتے ہیں۔

اختراع اوراد و احزاب بہ نیت تقرب	اللہ سے نزدیکی حاصل کرنے کی غرض سے اوراد
الی اللہ عزوجل زیادہ بر سنت	وظائف اختراع کر لیے گئے جو سنت سے منقول
ماثورہ والتزام مستحبات مانند	نہیں تھے اور واجبات کی طرح مستحبات کا
التزام واجبات [1]	التزام ہونے لگا۔

(۱۸) حضرت عمرؓ نے مذہبی رہنمائی کے لیے معیار مقرر کیا اور وعظ و افتاء جیسے مقدس فریضہ کی ہر شخص کو اجازت نہ دی کہ اس سے بھی دوسرے کی شخصیت کا گہرا تعلق ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ فتنوں کے ذکر میں کہتے ہیں۔

پہلے وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی اجازت پر موقوف تھا اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر نہ کوئی وعظ کہہ سکتا اور نہ فتویٰ دے سکتا تھا لیکن بعد میں یہ صورت باقی نہ رہی اور وعظ و افتاء میں آزادی ہوگئی [2]

(۱۹) حسب حیثیت و صلاحیت مذہبی امور کی ذمہ داری سپرد کی اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا تاکہ کوئی شخص خام کار و غلط رہنماؤں کا شکار نہ ہونے پائے چنانچہ فرمایا۔

من اراد القرآن فلیات اُبیّا و من	جو شخص قرآن حاصل کرنا چاہے وہ ابی بن کعبؓ
اراد ان یسأل الفرائض فلیات زیداً	سے حاصل کرے جو فرائض کی معلومات حاصل
و من اراد ان یسأل عن الفقہ فلیات	کرنا چاہے وہ زیدؓ کے پاس جائے اور جو فقہ
معاذاً [3]	سیکھنا چاہے وہ معاذؓ سے سیکھے۔

(۲۰) حضرت عمرؓ نے درازی تقریر اور پیشہ ورانہ وعظ کو پسند نہیں کیا بلکہ غلط اثر کے اندیشہ سے اُن کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔

ان کثیرا من الخطب من شقاشق الشیطان [4]	بہت سے خطبے (وعظ) شیطانی ہیجان سے ہیں۔

---

[1] ازالۃ الخفاء مقصد اول در تقریر فتنے ص ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۳۰ [3] ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۱۳۰

[4] ازالۃ الخفاء مقصد دوم من الابواب شتی ص ۱۳۹

شقاشق (جمع شقشقہ) اس جھاگ کو کہتے ہیں جو مستی کے وقت اونٹ کے منھ سے باہر آتا ہے۔
چناں چہ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

شیطان کے ساتھ اس شخص کو تشبیہہ دی جو اپنے کلام کو وسیع کرتا اور صدق و کذب کی پروا
نہیں کرتا ہے۔[1]

(۲۱) حضرت عمرؓ نے ہر شخص کو خود کفیل بننے کا حکم دیا اور خاص طور سے مذہبی رہنماؤں کو دوسرے کے لیے بار بننے سے منع کیا کہ اس سے دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

یا معشر القراء ارفعوا رؤسکم	اے قرار (علماء) کی جماعت اپنے سروں کو
فقد وضح الطریق واستبقوا	اونچا رکھو۔ راستہ کھلا ہوا ہے۔ مال کمانے
الخیرات ولا تکونوا عیالا	میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ اور
علی المسلمین[2]	مسلمانوں پر بوجھ نہ بنو۔

(۲۲) معاشی بدحالی و بدنظمی کی وجہ سے شخصیت کی نشو و نما ختم ہو جاتی یا وہ غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس بناء پر حضرت عمرؓ نے خصوصی توجہ کے ساتھ مختلف قسم کے انتظامات کیے مثلاً گداگری پر پابندی لگائی۔ چنانچہ ایک سائل آپ کے سامنے سے گزرا جس کی جھولی غلہ سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے اس کو اونٹوں کے آگے بکھیر دیا اور فرمایا۔

الآن سل ما بدا لک[3]	اب سوال کر جو تجھے میسر آجائے۔

(۲۳) مستقل ذریعۂ آمدنی بنانے کا حکم دیا تاکہ حالات کی تبدیلی سے اخلاق و کردار کے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ نے قادسیہ کے عطایا و وظائف دیکھ کر کہا کہ بعض لوگوں کے اخراجات زیادہ نہیں ہیں۔ کھانے والے افراد بھی کم ہیں۔ ایسی حالت میں فضول خرچی کے جذبات اُبھرنے کا قوی اندیشہ ہے۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا

"جب ان لوگوں کو سرکاری عطایا ملیں تو کچھ بھیڑیں خرید لیں اور ان کی پرورش کرتے رہیں۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الستون ص ۱۹۱ [3] ایضاً الباب الثامن والثلثون ص ۹۵

پھر مزید عطایا لینے پر اونٹ بھیڑیں خرید لیں۔ اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے میرے بعد کے حکمران اس نظام کو قائم نہ رکھ سکیں۔ اگر یہ ذریعۂ آمدنی باقی رہے گا تو غریبوں کے کام آئے گا اور لوگ اس کے سہارے اپنی زندگی گزار سکیں گے۔

خالدؓ۔ یہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کے مخاطب دور و نزدیک کے سب لوگ ہیں۔ جو شخص بالکل آخری سرے پر بیٹھا ہے وہ بھی میری ذمہ داری میں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو حکمراں اپنی رعایا کی خبرگیری سے غافل رہتا ہے اس کو فردوس کی بو تک نہ آئے گی۔"[1]

(۲۴) خوشحالی و فارغ البالی کے پروگرام کو وسیع کر کے ہر ایک کی معاشی کفالت کا اعلان کیا۔

ولا یدع فقیراً فی ولایته الا	مملکت میں ہر تنگدست کو دیا جائے۔ ہر مدیون
اعطاه ولا مدیونا الا قضی	کا دین ادا کیا جائے۔ ہر کمزور کی مدد کی جائے
عنه دینه ولا ضعیفا الا اعانه	ہر مظلوم کی دستگیری کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم
ولا مظلوماً الا نصره ولا ظالماً	سے روکا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے۔
الا منعه عن الظلم ولا عاریا الا	غرض کوئی ضرورتمند ایسا نہ رہنے پائے جس کی
کساه کسوة[2]	ضرورت پوری نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

لیس لاحد الا له فی هذا المال حق[3]	ہر شخص کا سرکاری خزانہ میں حق ہے۔

(۲۵) دفاتر قائم کر کے لوگوں کے وظیفے مقرر کیے۔ چنانچہ خالد بن ولیدؓ نے یہ تجویز پیش کی۔

میں نے ملک شام میں بادشاہوں کو دیوان مرتب کرتے اور فوج بھرتی کرتے دیکھا ہے[4]

اس پر ابوسفیانؓ نے اعتراض کیا۔

کہ کیا آپ رومیوں جیسے دفاتر قائم کریں گے؟ اس کے بعد لوگ اپنے اپنے وظیفوں پر بھروسہ کر کے تجارت چھوڑ دیں گے۔ عمرؓ نے کہا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کے "فے"

---

[1] ابوبکر صدیق و فاروق اعظم بارھواں باب [2] شرح شرعۃ الاسلام سید علی زادہ۔ [3] کتاب الاموال ص ۲۳۳
[4] الاحکام السلطانیہ للقاضی ابی یعلی فصل فی وضع الدیوان ص ۲۲۱

کا مال بہت ہو گیا ہے۔ [1]

دفاتر قائم کر کے وظیفہ مقرر کرنے میں دو دشواریاں تھیں (۱) رومیوں سے مشابہت (۲) خود کار ذریعۂ معاش سے بے رغبتی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے حالات و ضرورت کی رعایت سے اس انتظام کو ناگزیر سمجھا اور اس نظام کو یہاں تک ترقی دی کہ العوالی (مضافات) کے حکام سے وہاں کے لوگوں کی فہرست طلب کر کے ان کے وظیفے مقرر کیے نیز نومولود شیر خوار بچوں کا وظیفہ دودھ چھڑانے کے بعد سے مقرر کیا۔ لیکن جب دیکھا کہ مائیں وظیفہ کی وجہ سے دودھ چھڑانے میں جلدی کر رہی ہیں تو پیدا ہونے کے بعد ہی سے وظیفہ کا حکم دے دیا۔ [2]

(۲۶) معلموں۔ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ یہ معزز خدمت دریوزہ گری کی نذر نہ ہونے پائے۔

ان عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان کانا	حضرت عمر و عثمان۔ اماموں۔ مؤذنوں معلموں
یرزقان المؤذنین و الائمۃ و المعلمین و القضاۃ [3]	اور قاضیوں کو تنخواہیں دیتے تھے۔

(۲۷) عوام کی معاشی حالت درست کرنے کے لیے معیار زندگی پر پابندی لگائی اور روزانہ گوشت کھانے سے روک دیا۔ چناں چہ ذبح خانہ خود تشریف لے جاتے اور جس کو دو دن گوشت خریدتے دیکھتے دُرّے سے اس کو سزا دیتے تھے۔

فاذا رأی رجلاً اشتری لحماً یومین	جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ دو دن مسلسل گوشت
متتابعین ضربہ الدرۃ [4]	خرید رہا ہے تو اس کو دُرّے مارتے

اور یہ فرماتے تھے۔

الا طویت بطنک لجارک و ابن	تو نے اپنے پڑوسی اور چچیرے بھائی کے
عمک [5]	لیے کیوں کفایت نہیں کی۔

یہ قحط کے زمانہ کی بات نہ تھی بلکہ عام حالات میں معیارِ زندگی پر پابندی لگا کر لوگوں کو معاشی

---

[1] فتوح البلدان ذکر العطاء فی خلافۃ عمرؓ ص ۲۶۳ [2] ایضاً [3] تاریخ عمر الباب السابع و الثلاثون۔
[4] ایضاً

لحاظ سے خود کفیل بنانا چاہتے تھے۔

(۲۸) وارد و صادر کی معاشی ضرورت کے لیے مال گودام بنایا جس میں مختلف چیزوں کا اہتمام تھا۔

فجعل فیھا الدقیق والسویق والتمر	مال گودام میں آٹا، ستو، کھجور، کشمش اور دوسری
والذبیب وما یحتاج الیہ یعین بہ	ضرورت کی چیزیں تھیں جن کے ذریعہ مسافروں
المنقطع بہ والضیف [۱]	اور مہمانوں کی مدد کی جاتی تھی۔

(۲۹) معاشی توازن برقرار رکھنے اور عیش و عشرت سے بچانے کے لیے مسلمانوں کو زمین و جائداد رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا۔

چنانچہ طنطاوی جوہری کہتے ہیں۔

فلما کثرت الاموال فی ایام	حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب مال
عمر و وضع الدیوان فرض الرواتب	زیادہ ہو گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کیے گئے لوگوں
للعمال والقضاۃ ومنع ادخار	کے وظیفے مقرر ہوئے۔ عاملوں اور قاضیوں
المال وحرم علی المسلمین	کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، نیز سرمایہ جمع کرنے
اقتناء الضیاع والذراعۃ	زمین رکھنے، کاشتکاری کرنے اور کرانے
والمزارعۃ لان ارزاقھم وارزاق	سے روک دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ
عیالھم تدفع لھم من بیت	لوگوں کے بال بچوں تک کے وظیفے سرکاری خزانہ
المال [۲]	سے مقرر کر دیے تھے۔

ممانعت کے اس قانون نے یہاں تک ترقی پائی کہ

اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس نو مسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا [۳]

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ممانعت کے اس قانون پر عمل کیا تھا۔

وایدھذہ القاعدۃ عمر بن	حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبدالعزیز

---

[۱] تاریخ عمر الباب الثلاثون صد ۲۰۳ [۲] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۴ [۳] ایضاً

عبد العزیز وکان یتحذی ابن الخطاب بکل خطواتہ[۱] — نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقش قدم پر چلتے تھے

(۳۰) دی ہوئی زمین وجاگیر واپس لے لی۔ چناں چہ قوم بجیلہ کو خالصہ زمین کا کچھ حصہ دے دیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا لیکن بعد میں حضرت عمرؓ نے اس کو واپس لے لیا پھر جب قوم بجیلہ کے بعض افراد نے اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کیا تو سرکاری خزانہ سے ان کی مدد کی جس کی حیثیت لازمی طور سے معاوضہ کی نہ تھی۔[۲]

اسی طرح بلال بن حارث سے پوری وادی عقیق یہ کہہ کر واپس لے لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو اس لیے نہیں دی تھی کہ نہ خود آباد کرو اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دو۔ جتنی زمین آباد کر سکتے ہو اپنے پاس رکھو اور بقیہ خلافت کے حوالہ کر دو۔ یہ سُن کر بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی نہ واپس کروں گا خواہ میں اُسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ چھوڑ کر بقیہ زمین لے لی۔[۳]

(۳۱) حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں (جبکہ لوگوں کے حقوق پامال ہو رہے تھے) اجتماعی طعام کی ایک تجویز کا خیال ظاہر کیا۔ چناں چہ فرمایا۔

فواللہ لو ان اللہ ما یفرجہا ما	اگر اللہ اس صورت حال سے نجات نہ دے گا
ترکت باھل بیت من المسلمین	تو خدا کی قسم میں ہر مسلمان کے گھر میں جس میں
لھم سعۃ الا ادخلت معھم اعدادھم	کچھ وسعت ہے اس کے افراد کے برابر غریب مفلوں
من الفقراء فلم یکن اثنان یھلکان	کو داخل کر دوں گا کیوں کہ نصف پیٹ کھانے
علی ما یقیم واحداً[۴]	سے کوئی ہلاک نہ ہوگا۔

یہ کوئی ترغیب کا معاملہ نہ تھا بلکہ قانون و فرض کی شکل تھی جیسا کہ "فواللہ" اور "ادخلت" سے ظاہر ہے۔

---

[۱] ایضاً [۲] کتاب الاموال وکتاب الخراج و احکام القرآن للجصاص، اسلام کا زرعی نظام [۳] کتاب الاموال کتاب الخراج یحییٰ ص۹۳ [۴] تاریخ عمر الباب الثالث والثلثون ص

(۲۲) حضرت عمرؓ نے حکومت و عوام کے درمیان کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا نہ رکھا بلکہ سب کو ایک خاندان کے افراد قرار دیا تاکہ کوئی احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں

انما مثلنا کمثل قوم سافروا	ہماری مثال اور قوم کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ
فدفعوا نفقاتہم الی رجل	لوگوں نے سفر کیا اور اپنے اخراجات کی رقم
منہم فقالوا لہ انفق علینا	اپنے میں سے کسی آدمی کے یہ کہہ کر حوالہ کردی
فہل لہ ان یستأثر علیہم	کہ ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو۔ کیا ایسی صورت
بشیٔ قال لا ۔ لہ	میں ان کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا
	ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

حکومت کی حیثیت واضح کرتے ہوئے فرمایا

فان اللہ جعلنی خازنا ٥	مجھ کو اللہ نے خازن اور تقسیم کرنے والا بنایا
وقاسما لہ	ہے۔

(۲۳) عام حالات میں حکومتی طبقہ کے لیے متوسط درجہ کی زندگی کا معیار پیش کیا۔

قوتی وقوت اہلی کقوت	میری اور میرے گھر والوں کی روزی اس قدر
رجل من قریش لیس بأغناہم	ہے جتنی کہ قریش کے متوسط درجہ شخص کی جو
ولا بأفقرہم ؎	نہ زیادہ مالدار ہو اور نہ زیادہ مفلس ہو۔

اور خاص حالات میں جب تک دوسروں کے لیے ضروریات زندگی کی فراہمی نہ ہو جائے اس معیار کو بھی گوارا نہ کیا۔ چنانچہ قحط کے زمانہ میں گھی اور دودھ وغیرہ کا استعمال ترک کر دیا اور وہی غذا استعمال کرنے لگے جو عام لوگوں کو ملتی تھی ؎

(۲۴) اہل و عیال کو بھی اس انداز سے رکھا کہ اُن کی وجہ سے کوئی اپنے کو کمتر نہ سمجھے چنانچہ فرمایا۔

لہ ایضاً الباب التاسع والثلثون۔ ؎ ایضاً

؎ تاریخ عمر الباب التاسع والثلثون

انه واللّٰه مالك عندی	خدا کی قسم میرے پاس تمہارا (اہل وعیال) اتنا
غیر سهمك فی المسلمین	حصہ ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا ہے اس میں
وسعك او عجز عنك هذا	تمہیں وسعت ہو یا تنگی میرے اور تمہارے درمیان
کتاب اللّٰه بینی و بینکم	اللہ کا یہی فیصلہ ہے۔

(۳۵) حکم و احکام اور قانون کے نفاذ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ کوئی رعایت گوارا نہ کی۔ بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں سختی کا برتاؤ کیا جیسا کہ حضرت عمر کا دستور یہ منقول ہے۔

اذا نهی الناس عن شیئ جمع	جب لوگوں کو کسی چیز سے روکتے تو اپنے گھر
اهله فقال انی قد نهیت عن	والوں کو جمع کر کے فرماتے کہ میں نے فلاں
کذا و کذا وان الناس ینظرون	چیز سے منع کیا ہے اور لوگ تمہاری طرف
الیکم کما ینظر الطیر الی	ایسے ہی دیکھ رہے ہیں جیسے پرندہ گوشت
اللحم فان وقعتم وقعوا و	کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی
ان هبتم هابوا وانی واللّٰه	بچیں گے اور تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے
لا اوتی برجل وقع فیما نهیت	اگر تم میں سے کسی نے منع کی ہوئی باتوں کا ارتکاب
الناس عنه الا ضعفت له العقوبة	کیا تو اپنے تعلق کی وجہ سے خدا کی قسم میں اس
لمکانه منی فمن شاء منکم فلیتقدم	کو دوگنی سزا دوں گا اب اختیار ہے جو چاہے
ومن شاء فلیتاخر[1]	آگے بڑھے اور جو چاہے پیچھے ہٹے۔

(۳۶) عہدہ و ملازمت میں اپنے خاندان و گھر والوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ احتیاط سے کام لیا۔

کوفہ والوں کی حالت سے حضرت عمرؓ اکثر پریشان رہتے تھے۔ اگر ان پر کوئی نرم حاکم بنایا جاتا تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے اور سخت آدمی کو متعین کیا جاتا تو اس کی شکایت کرتے چنانچہ ایک مرتبہ تنگ آکر کہا۔

---

[1] الباب السادس والسبعون، ص ۲۳۶

ولود وت انی وجدت رجلا　　کاش مجھے کوئی قوی امانتدار اور مسلمان ملتا تو
قویا امینا مسلما استعمله علیهم　　میں اس کو کوفہ والوں پر حاکم بناتا۔

ایک شخص نے عرض کیا۔

انا والله ادلك علی الرجل　　خدا کی قسم میں آپ کو ایک ایسا ہی آدمی بتاتا
القوی الامین المسلم واثنی　　ہوں جو قوی امین مسلمان سب کچھ ہے اور
علیه۔　　بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔

پوچھا وہ کون ہے؟ جواب دیا عبداللہ (آپ کے صاحبزادے ہیں)
یہ سن کر فرمایا۔

قاتلك الله [1]　　اللہ تجھے محروم کرے۔

(۳۷) بیوی میں بھی برتری کے جذبات نہ ابھرنے دیے بلکہ ان سے برابر خدمتِ خلق و رفاہ عام کے کام لیتے رہے۔ چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک رات گشت کر رہے تھے کسی گھر سے دردِ زہ میں مبتلا عورت کے کراہنے کی آواز سنی فوراً واپس آکر اپنی بیوی "ام کلثوم" کو خدمت کے لیے لے گئے جو نسوانی امور کی نگہداشت کرتی رہیں یہاں تک کہ فراغت ہو گئی [2]

یہ گھر معمولی تھا جس میں جانے سے بیگمات کی توہین ہوتی ہے اور عورت بھی اونچے درجہ کی نہ تھی بلکہ کم درجہ کی تھی جس سے بات کرنے میں بیگمات کی توہین ہوتی ہے۔

(۳۸) حضرت عمرؓ نے عملاً معاشرتی امتیازات (اونچ نیچ کی تقسیم۔ ذات پات کی تفریق اور حسب و نسب کا لحاظ وغیرہ) کو ختم کیا کہ اس سے بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور ذاتی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں چنانچہ میل جول و ملاقات میں رؤسا کو ثانوی حیثیت دی اور جن کو کمتر سمجھتے تھے ان کو درجۂ اول پر رکھا۔

حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس سہیل بن عمرو حارث بن ہشام ابوسفیان بن حرب اور قریش کے دوسرے رؤسا حاضر ہوئے۔ خبیبؓ۔ بلالؓ اور دوسرے آزاد شدہ غلام

---

[1] تاریخ عمر الباب الاربعون　[2] ابوبکر صدیق و فاروق اعظم بارھواں باب از ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔

بھی آئے لیکن حضرت عمرؓ نے ثانی الذکر کو اجازت دی اور اول الذکر کو چھوڑ دیا۔ اس پر ابو سفیان نے کہا۔

لم ار کالیوم قط یاذن لھؤلاء ‏ ‏ دنیا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان غلاموں کو

العبید ویترکنا علی بابہ ‏ ‏ اجازت ملتی ہے اور ہم دروازہ پر کھڑے رہتے

لایلتفت الینا۔ ‏ ‏ ہیں۔ ہماری طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔

سہیل زیادہ سمجھدار تھے انھوں نے جواب دیا۔

ایھا القوم انی واللہ قد ‏ ‏ اے لوگو میں تمہارے چہروں کی ناگواری دیکھ

اری الذی فی وجوھکم ‏ ‏ رہا ہوں۔ اگر تم غصہ کرتے ہو تو اپنے اوپر غصہ

ان کنتم غضابا فاغضبوا ‏ ‏ کرو۔ قوم کو دعوت دی گئی اور تمہیں بھی دی گئی

علی انفسکم دعی القوم ‏ ‏ لیکن قوم نے قبول کرنے میں جلدی کی اور تم

ودعیتم فاسرعوا وابطأتم ‏ ‏ لوگوں نے دیر کی۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا

فکیف بکم اذا دعوا یوم ‏ ‏ جبکہ قیامت کے دن قوم بلائی جائے گی اور

القیمۃ وترکتم لہ ‏ ‏ تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔

(۲۹) حسب و نسب اور ذات پات کے بتوں کو اس طرح توڑا کہ ولی کی مرضی کے خلاف غیر کفو میں نکاح کا حکم دیا چنانچہ موالی (آزاد شدہ غلاموں) میں سے ایک مالدار شخص نے ایک قریشی کی بہن سے پیغام بھیجا قریشی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

ان لنا حسبا وانہ لیس ‏ ‏ ہم حسب و نسب والے ہیں۔ وہ (لڑکا) لڑکی

لھا بکفو۔ ‏ ‏ کا کفو نہیں ہے۔

جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہونچی تو آپ نے قریشی کو بلا کر کہا کہ وہ مالدار بھی ہے اور پرہیزگار بھی اگر بہن راضی ہے تو نکاح کر دو۔

زوج الرجل ان کانت المرءۃ راضیۃ ‏ ‏ اگر لڑکی راضی ہے تو اس سے نکاح کر دو۔

چناں چہ بھائی نے جا کر پوچھا تو وہ راضی ہو گئی اور نکاح کر دیا گیا۔

لہ تاریخ عمر الباب الثالث والثلثون ص۲۸۰

فراجعها اخوها فرضيت فزوجها منه[1] بھائی نے جب اس سے مراجعت کی تو وہ راضی ہو گئی اور اس سے نکاح کر دیا۔

یہ کوئی معاشقہ کا معاملہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہو بلکہ حسب و نسب کے "بت" کو توڑنا مقصود تھا جس کے آہنی پنجہ میں اب مسلم معاشرہ گرفتار ہو گیا ہے۔

(۴) خود اپنے صاحبزادہ "عاصم" کا نکاح ایک دودھ فروش کی بیوہ لڑکی سے کیا جس کا واقعہ مشہور ہے[2]۔

امیر المومنین نے لڑکی کا حسب و نسب دیکھا اور نہ معیار زندگی پر نظر کی۔ ادھر صاحبزادہ نے نہ جہیز کی خواہش کی اور نہ بیوگی پر نظر کی۔ دراصل ان دونوں نے زندگی کے اصل معیار کو دیکھا اور وہ "تقویٰ" ہے جس کا ثبوت لڑکی میں بدرجۂ اتم موجود تھا بس اسی کو بنیاد بنا کر صاحبزادہ نے آمادگی ظاہر کی اور امیر المومنین نے شادی کا پیغام بھیجا۔

غرض اس قسم کی بہت سی تعلیمات ہیں جن سے شخصیت سازی کا ثبوت ملتا ہے اور نہایت ہی خوددار عالی حوصلگی علم و ہنر میں ترقی کے ساتھ باوقار زندگی گزارنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔

---

[1] ازالۃ الخفاء مقصد دوم سیاست فاروق اعظم [2] ایضاً گشت عمرؓ

"تسخیرِ فطرت یا علم و عشق"

(از جناب قاضی محمد عدیل عباسی۔ ایڈوکیٹ بستی، یوپی)

زیرِ طبع کتاب "اقبال اور اسلام" کا ایک جزو

آج کی متمدن دنیا کے نقش و نگار کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ابتدائے تاریخ سے قبل کے انسان کا رہن سہن کیا رہا ہوگا۔ لیکن ایک دور وہ بھی تھا جب وہ غاروں اور درختوں کے سائے کے نیچے گزر بسر کرتا تھا اور گھاس پھوس اور کچے گوشت کھاتا تھا۔ اس نے ابھی آگ دریافت نہیں کی تھی کہ کھانا پکاتا، کپڑا بنانا نہیں جانتا تھا اس لیے یا تو ننگے رہتا تھا یا درختوں کی چھال پہنتا تھا لیکن وہ ادراک، احساس، حواسِ خمسہ سے قدرتاً بہرہ ور تھا اور اسی کا دوسرا نام عقل ہے جو اس میں ودیعت کی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو اور دنیا کو سنوارنے میں تدریجی منزلیں طے کرنا شروع کیں۔ آگ دریافت کی اور کچے گوشت کو بھون کر کھایا۔ غذا کے معاملے میں یہ اس کا پہلا قدم تھا اور اس کے بعد وہ روز بروز نئی دریافتیں کرتا رہا۔ انسان کے اندر آرزو اور جستجو اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری تھی کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بنی ہوئی تھی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ہر چیز کی دریافت و جستجو میں لگا رہتا ہے گویا یہ مادہ انسان کے خمیر میں ہے اور اسے طبیعت ثانیہ کہنا بھی صحیح نہیں، یہ اس کی اصل طبیعت اور اس کا اصل مذاق ہے۔ جس عالم آب و گل میں اس کو رہنا تھا اور جس ماحول میں اسے زندگی گزارنی تھی وہ اس کے راستے میں رکاوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیاں، گھنے جنگل، مہیب غار، دریا اور پہاڑ، کہاں جائے اور کیا کرے! نیچر یعنی فطرت اس کی دشمن تھی۔ اس نے اس سے لڑنے اور اس کو قابو میں کرنے کی تمنا پیدا کی اور یہ تمنا اس کی تخلیق میں مضمر تھی۔ اس تمنا کے لیے اسے کسی عالم کے وعظ، کسی فلسفی کی تقریر، کسی جوش اور ولولہ دلانے والے

خطبہ کی ضرورت نہ تھی وہ بہ تقاضائے فطرت اس میں منہمک ہوگیا اور اس کی یلغار کے سامنے یہ کائنات فطرت سرنگوں ہوتی چلی گئی۔ اس کی فتوحات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے لوہے کی دریافت کی۔ کلہاڑے بنائے۔ جنگلوں کو کاٹ کر کشتیاں بنائیں اور دریاؤں کو پار کیا۔ اس کی تسخیر فطرت کے میدان عمل کا وہ بڑا کامیاب دن تھا جب اس نے دانہ زمین میں ڈالا اور غلہ اُگایا۔ زراعت موجودہ دورِ تمدن کی مشعلِ اولیں تھی۔

اب وہ جہالت اور کم علمی کے ظلمات سے باہر نکل رہا تھا اور علم و شعور کی ہلکی ہلکی شعاعیں اُسے نظر آنے لگی تھیں۔ اس نے پھر غلہ کا استعمال سیکھا اور طرح طرح کے کھانے تیار کرنے شروع کیے۔ ان سب باتوں کے سکھانے کے لیے کوئی اُستاد تھا نہ کوئی کتاب تھی نہ معلم تھا نہ مدرسے اور کالج تھے۔ خود اس کے اندر موجود عقل کی رہنمائی اور خود اپنے تجربات اس کے لیے مشعلِ راہ تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی ارتقائی منزلیں طے کیں اور آج خوش نما باغ و بہار پارک اور ہوٹل، طرح طرح کے لذیذ کھانے۔ انواع و اقسام کے ظروف، رہنے کے لیے عمدہ سے عمدہ مکانات، استراحت کے لیے نرم ملائم گدے اور مسہریاں، چلنے کے لیے تیز رفتار سواریاں، مرض پر قابو پانے کے لیے دوائیں، پُر سکون زندگی گزارنے کے لیے قوانین، دستور حیات کے لیے آئین موجود ہیں۔ الغرض اس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کہاں وہ دریا سے ڈرتا تھا اور اس پار سے اُس پار جانا محال تھا اور کہاں اس نے دریا کے پانی کو نہ صرف کھیتوں میں پہونچایا بلکہ اس سے بجلی نکالی اور راستوں اور گھروں کو روشن و پُر نور کر دیا۔ اس نے بجلی سے مزدور کا کام لیا۔ اس سے اپنے بدن گرم کیے کھانا پکایا، لکڑی چیری، گیہوں پیسا اور طرح طرح کی خدمات لیں۔ کہاں وہ پہاڑ کو ناقابل عبور سمجھتا تھا اور کہاں اس نے ڈائنامیٹ سے پہاڑوں کو روئی کے گالے کی طرح اڑا دیا۔ کبھی ہمالیہ "فصیل کشور ہندوستاں" تھا اب ہمالیہ انسان کی حفاظت کا محتاج ہے۔ اس نے سمندروں کو مسخر کرکے دخانی جہازوں سے اس کی موجوں کو روند ڈالا۔ اس نے ہوا کو مسخر کیا اور ہزاروں میل فی گھنٹہ ہوائی جہازوں پر پرواز کرنے لگا۔ زراعت کے بعد صنعت کی نوبت آئی اور اس نے سارے عالم کو نگارخانہ بنا دیا اور معاش اور راحت کے نئے نئے راستے پیدا کیے۔ انسان کی طبع ناصبور آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک وسیع میدان ہے۔ ایک لمحہ اُس کو چین نہیں۔ نت نئے فتوحات وہ کرتا رہتا ہے۔ اور آسمانوں پر کمند ڈالتا ہے۔ آج اس کی پرواز کرہ باد سے پرے خلا میں ہے اور چاند مریخ زہرہ تک پہونچنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ آج وہ ہزاروں میل دور سے لوگوں سے بات بھی کرتا ہے اور ان کی شکل بھی دیکھتا ہے۔ طلسم ہوش ربا کے افسانے آج حقیقت بن کر سامنے ہیں

یہ سب علم انسانی کے کرشمے اور عقل کے معجزے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جس کو پانچ چھ سو سال سے زائد نہیں ہوئے جب علم انسانی اتنا محدود تھا کہ حکیم یا ڈاکٹر کا درجہ اسی کو ملتا تھا جو تمامی علوم پر حاوی ہو چنانچہ بوعلی سینا حکیم نہیں کہا گیا بلکہ شیخ کہلایا اور روایت ہے کہ صرف اس لیے کہ وہ موسیقی نہیں جانتا تھا۔ آج علم و فن نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی ایک ایک شاخ ہی میں کمال حاصل نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل شاخوں پر نظر ڈالے اور کل موجودہ علم کا احاطہ تو تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ علم کو آرٹ اور سائنس میں تقسیم کر کے ہر ایک کی بے شمار شاخیں اور شاخوں کی شاخیں ہیں۔ مثال کے طور پر صرف علم الابدان کو لے لیجیے تو اس میں طب اور جراحت کے دو بڑے شعبے ملیں گے۔ اور ہر ایک میں الگ الگ مضامین ہیں۔ اگر آج آپ کسی کو ڈاکٹر کہہ دیں تو سننے والا اگر ہوشیار ہے تو کچھ سمجھ نہ سکے گا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ابھی صرف دس سال قبل ڈاکٹر سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ وہ ہر مرض بلکہ طب و جراحت کے ہر شعبے کا ماہر ہے۔ آج آنکھ کے ڈاکٹر، کان کے ڈاکٹر، حلق کے ڈاکٹر، پھیپھڑے کے ڈاکٹر، ہڈی کے ڈاکٹر الغرض ہر ہر عضو کے الگ الگ ڈاکٹر ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ بیمار ہو کر کسی ماہر طبیب (ڈاکٹر) کے پاس لکھنؤ چلے جائیں تو وہ آپ کو مختلف ماہرین فن کے پاس بھیج کر ان کی رپورٹیں لے گا اور تب کوئی رائے قائم کر سکے گا۔ اگر آپ تبقں جیسے معمولی اور عالمگیر مرض میں مبتلا ہیں تو وہ دانت کے ڈاکٹر کی رائے لے گا کہ دانتوں میں پائیریا یا اس قسم کی کوئی بیماری تو نہیں ہے جس سے معدہ پر اثر پڑ رہا ہے۔ اگر بخار ہے تو خون کا معائنہ کرائے گا۔ الغرض علم کی وسعت اور پہنائیوں کی وجہ سے ہر ماہر فن ایک جزو میں مقید ہو کر رہ گیا ہے اور دوسرے ماہرین فن کا محتاج ہے اور یہ مشورہ دے کر کہ آپ فلاں سے اس معاملہ میں مشورہ کر کے رپورٹ لائیے، اپنے عجز اور اس شاخ علم سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔

مادّہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسان اصل نقطہ اس کائنات کا ہے اور وہ زیور علم سے آراستہ ہے۔ اس علم کی بدولت وہ فطرت کی تسخیر کر رہا ہے، فطرت اس کی دشمن ہے اور یہی تنہا اس کی دشمن ہے۔ اور جب وہ کل فطرت کو مسخر کرے گا تو وہ کامل ہو جائے گا۔ تکمیل انسانیت کے لیے علم اور عقل کے راستے سے نیچر کو قابو کر لینا ہی کافی ہے اور ایک ماوراء المحسوسات قادر مطلق ہستی کا تصور محض اس کے علم کی خامی اور اس لیے اپنی بعض ضروریات زندگی میں مجبوری و مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً جب تک انسان نے دریاؤں سے پانی کو نکال کر نہروں اور دیگر ذرائع سے کھیتوں کی آبپاشی

کا طریقہ دریافت نہیں کیا تھا اور اس کی کھیتی کی نمو و پرداخت کا انحصار صرف ابر باراں پر تھا تو پانی نہ برسنے کی شکل میں وہ عظیم الشان قادر مطلق ہستی کا تصور کر کے اس سے دعائیں مانگتا تھا کہ وہ پانی برسا دے لیکن جب اس نے نہر، ٹیوب ول اور دیگر ذرائع سے زمین اور دریا کو مسخر کر کے اور فن طبیعات اور انجینیرنگ سیکھ کر کھیتوں کو پانی سے بھر دیا تو وہ پانی برسنے کی دعا نہیں کرے گا اس لیے کہ علم کی کمی اور مجبوری کا نام خدا ہے ورنہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔

دوسری طرف مذاہب کا ایک گروہ جو وحدت الوجود جیسے عقیدہ کا قائل ہے وہ مادہ اور روح دونوں کے وجود سے انکار کرتا ہے اور جب مادّہ کا وجود نہیں ہے تو تسخیر کس کی ہوگی جب انسان کی انا یا ایغو کا وجود نہیں ہے تو تسخیر کون کرے گا اور کس کے لیے کرے گا۔ دوسرا گروہ مادہ کے وجود کا تو اقرار کرتا ہے لیکن اس سے گریز یا فرار کرتا ہے اور کنج عافیت میں بیٹھ کر سکون پرستی اور اللہ کی یاد میں گزارنا چاہتا ہے۔ وہ فطرت سے آویزش کا قائل نہیں اگرچہ تسخیر فطرت سے جو منافع حاصل ہوں ان سے مستفیض ہونے سے احتراز نہیں رکھتا وہ اپنا گھر بجلی کے چراغوں سے روشن کرتا ہے لیکن بادلوں سے بجلی لانے کی مشقت سے منحرف ہے۔

اقبال کا نظریہ جو عین اسلام کی تعلیم ہے اس کو ظاہر کرنے سے پہلے ایک اور امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ انسان جب جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا تو اسے کسی قانون یا دستور کی ضرورت نہ تھی یا یہ بات ابھی اس کے شعور میں نہیں آئی تھی۔ جس طرح وہ متمدن ہوتا گیا اور اس نے بڑے بڑے شہر بسائے اور مل جل کر رہنا سیکھا تو اس کو ضابطۂ حیات کی حاجت ہوئی انفرادی اور اجتماعی ــــــ اور دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک آ گئی کہ فوجداری اور مال دیوانی اور قومی سے نکل کر بین الاقوامی قوانین بھی تیار کرنے پڑے۔ ان معاملات کو حل کرنے کے راستے کیا ہیں۔ حقوق اور فرائض کی تربیت کیسے دی جائے جرائم کے انسداد اور ان کی سزائیں کیا ہوں۔ مختلف عقاید میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ صلح و امن کے کیا راستے ہیں۔ ان ہی قوانین کے انضباط اور تدوین اور ان پر عمل در آمد کے ضوابط کا نام تہذیب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسائل کس طرح حل ہوں گے دنیا کے ایک بڑے گروہ کا جن میں مادہ پرستوں کے علاوہ بہت سے مذاہب کے ماننے والے بھی شامل ہیں یہ خیال ہے کہ یہ مرحلے بھی عقل ہی طے کرے گی انسانی عقل کل پر محیط ہے اور وہ انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

ایک تیسرا مرحلہ جدھر مادّہ پرستوں کی توجہ اس لیے منعطف نہیں ہوئی کہ وہ مادّہ کے سوا خدا اور

روح کے قائل ہی نہیں ہیں اور وہ مرحلہ بے خود انسان کے ذاتی اور شخصی اعمال کا ہو قوانین کی زد میں نہیں آتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کسی قسم کا قانون مرتب کیا جا سکتا ہے مثلاً ماں باپ کی اطاعت۔ اپنے چھوٹوں سے محبت، مبتلائے آلام و مصائب سے ہمدردی، احسان، عفو و درگذر، کینہ بغض، حسد، غیبت، چغلی سے گریز وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے مارکس ازم میں انفرادی اعمال صالحہ کا اسی طرح کوئی وجود نہیں ہے جس طرح انفرادی آزادی کوئی چیز نہیں سب کچھ مجموعی انسان کے فلاح و بہبود میں مضمر ہے اور تسخیر کائنات کی غرض بھی یہی ہے کہ انسان آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ انسان انسان میں فرق باقی نہ رہے۔ اور افلاس، بیماری ایک انسان پر دوسرے انسان کی برتری دور ہو۔ الغرض اصل چیز انسان نہیں بلکہ انسانوں کی سوسائیٹی ہے۔

قرآن حکیم نے ان تمام خیالات و افکار کا جائزہ لیا ہے اور ایک سیدھی اور مستقیم راہ جو ہر عام و خاص کی سمجھ میں آسکتی ہے، معین کی ہے۔ اقبال نے اپنے فن کارانہ شعری مہارت سے اسی کو بار بار زور کلام اور حسن بیان کی خوبیوں سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔ علماء اسلام نے سیدھے سادھے الفاظ میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ تمام عالم انسان کے لیے اور انسان اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے اسی کو وہ فلسفیانہ زبان میں عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اشعار کے خوبصورت سانچے میں ڈھالتا ہے۔

جہاں تک تسخیر فطرت کا سوال ہے وہ پوری حد تک مادہ پرستوں کے ساتھ جاتا ہے، وہ انسان کے اندر علم و عقل کی بے پناہ طاقتوں کے پنہاں ہونے کا قائل ہے۔ اسی لیے وہ حرکت کا مدح خواں اور سکون کا مخالف ہے۔ جد و جہد زندگی میں وہ انسان کو ہر وقت آگے بڑھنے کے لیے کوڑے مارتا ہے اور حیات کو بے ثبات تصور کر کے مغموم و دلگیر ہو کر کنج عافیت تلاش کرنے کو انتہائی معیوب تصور کرتا ہے۔ وہ انسان کو آرزوؤں کا مسکن مانتا ہے اور نت نئے انداز اور نئے شان سے اس کو جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے   ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

چنانچہ اس نے شاعرانہ شوخی کے ساتھ محاورہ مابین خدا و انسان بھی تصنیف کیا ہے۔ اس سے مراد انسان کی قوت تسخیر فطرت کی پر زور نمائش ہے۔ خدا انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں نے ایک آب و گل سے اس دنیا کو پیدا کیا لیکن تو نے ایران و تاتار و زنگ میں اسے تقسیم کر دیا۔ میں نے

سے لوہا بنایا تو نے اس سے شمشیر و تیر و تفنگ بنائے تو چمن کے درختوں کو کاٹنے کے لیے تیر بناتا ہے اور طائر نغمہ زن کے لیے قفس تیار کرتا ہے۔

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاکِ پولاد ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان کی یہ شرارتیں جب بیان کی گئیں تو گو ان میں بھی اس کے علم و تسخیر کے کرشمے شامل تھے لیکن بمنزلہ شر کہے گئے تھے۔ اس لیے انسان نے جواب دیا کہ میری قوتِ تسخیر خیر کی جانب بھی مائل ہے اور میں نے وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جس نے تیری صفتِ عالم سازی کو جلا دیدی ہے۔ تو نے رات بنائی تھی اندھیری تھی، میں نے چراغ بنا کر اسے روشن کیا، تو نے مٹی بنائی تھی میں نے جام بنایا، تو نے بیابان و کہسار اور نشیب و فراز زمین بنادی تھی میں نے اس کو خیابان و گلزار و باغ بنا کر آراستہ کیا میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ تیار کرتا ہوں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی یہ تعلی جو دراصل حقیقت کی آئینہ دار ہے اس میں اقبال نے صرف شوخی بھر دی ہے اور گستاخی کے ساتھ انسان کے کمالات فنِ تسخیر کو ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح کی شوخی اور مستی وہ "پیام مشرق" میں اپنی نظم بہشت میں ظاہر کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ دنیا حرکت و جد و جہد اور آرزوں کی تکمیل کی ہے۔ آدم جب بہشت میں تھے تو ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ تھا وہ آرزو کی خلش سے آزاد تھے چنانچہ میلادِ آدم، انکارِ ابلیس، اغوائے آدم کے تحت عنوانات سے جو بشکل ڈرامہ اقبال نے بعنوان تسخیر فطرت لکھا ہے اس کے آخر میں آدم کی زبان سے اسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ اس دنیا کو بہشت سے بھی زیادہ دلکش پاتا ہے کیونکہ یہاں سوز و گداز ہے۔ آسمانوں کا راستہ ڈھونڈنا اور ستاروں

کو رازدار بناتا ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں تغیر ہے اور آرزو کی خلش ہے۔

آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن　　دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے　　رہِ آسماں نوازن بہ ستارہ راز کردن

بہ گداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا　　نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

گہے بہ حزنِ یکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے　　گہ خار نیش زن را بہ گل امتیاز کردن

ہمہ سوز نا تمامم ہمہ درد آرزویم
بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

بہشت کے سکون کو یوں بیان کرتا ہے کہ اس کے یوسف نے زنداں کا درد نہیں دیکھا اور اس کی زلیخا کے پاس دل نالاں نہیں ہے۔ اس کا خلیل حریف آتش نہیں ہے اور اس کے کلیم کی جان میں ایک بھی شرر نہیں ہے۔ شبہات اس کے یقین پر چھاپا نہیں مارتے ہیں اور وصال کو اندیشۂ ہجراں نہیں ہے۔ اور تب کہتا ہے کہ بہشت کور ذوقوں کی دنیا ہے اس میں رہ کر کیا کروگے اس میں یزداں ہے اور شیطان نہیں ہے۔

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ پھر کلام کی شوخی اور شاعرانہ گستاخی ہے جو اقبال کے یہاں قدم قدم پر ملے گی۔ تسخیر فطرت میں حرارت آرزو ہے۔ آج بادلوں پر قابو پایا تو کل چاند پر تیر مارا۔ ایک کو فتح کیا تو دوسرے کی تلاش ہے۔ یہاں کشمکش ہے، جد وجہد ہے۔ بہشت میں سکون اور راحت ہے اس لیے وہ کشمکشِ حیات کو اس عنوان سے پیش کرتا ہے کہ گویا جنت بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ جہاد زندگانی کی جانب توجہ پوری قوت سے مبذول ہو۔

تسخیر فطرت میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر خطرہ ہے اسی لیے وہ خطرے کو دعوت دیتا ہے وہ پکارتا ہے۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

یعنی اگر زندگی چاہتا ہے تو خطرے کے اندر رہنا سیکھ۔

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

خطر تمہارے تاب و تواں کا امتحان اور جسم و جان میں کیا ممکنات پوشیدہ ہیں ان کا میزان ہے۔
اسی شوخی کے ساتھ وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ زندہ دلوں کے لیے زندگی صرف جفا طلبی ہے اس لیے اگر کعبہ کے راستہ میں خطرہ نہ ہو تو وہاں کا بھی سفر میں نہ کروں گا۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

اور کہتا ہے کہ

چوں موج ساز وجودم ز سیل بے پرداست
گماں مبر کہ دریں راہ ساحلے دارم

یعنی جس طرح موج دریا اور سمندر کے سیلاب میں جلتی ہے وہی حال میرا ہے یہ مت سمجھنا کہ میں اس سمندر میں ساحل یا کنارہ تلاش کرتا ہوں۔
تسخیر فطرت کا سبق اقبال معراج پیغمبر علیہ السلام سے بھی لیتا ہے چنانچہ صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ؎

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

پھر تسخیر فطرت براہ عقل کو کس لطیف لیکن واضح انداز سے بیان کیا ہے ؎

فطرت کو خرد کے رو برو کر تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں چاک گل و لالہ کو رفو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

جب آدم دنیا میں آتے ہیں تو روحِ ارضی ان کا اس طرح استقبال کرتی ہے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری نظر دیکھ

الغرض وہ اس تمام عالم رنگ و بو زمین سے آسمان اور ستاروں تک مسخر کرکے انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ سخر لکم ما فی السموات و الارض کا کیا منشا ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کو مسخر کر لینا ہی ایک مومن کی شان ہے۔ چنانچہ حزب الاحزاب مصنفہ ملا علی قاری رح میں جو دعائیں درج ہیں ان میں ایک جگہ یہ بھی درج ہے کہ کل عالم کو میرے لیے مسخر کر دے۔ یہ دعائیں قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہیں گویا یہ ایک مومن کا منصب العین حیات ہے کہ وہ سارے عالم کو مسخر کرے اور زمینوں اور آسمانوں پر تصرف کرے۔ دنیائے اسلام کے نامور مفکر و خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ''ساعتے با اہل دل'' کے عنوان سے مولانا محمد یعقوب صاحب بھوپالی مدظلہ کے اقوال

الفرقان میں تحریر فرماتے رہے ہیں اس میں ایک جگہ حضرت نے اس دعا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر سارا عالم ہمارے تصرف میں آجائے تو ہم اس کو کھلائیں گے کہاں سے؟ یہ ایک صوفیانہ نکتہ تھا، ایک مخصوص حلقہ کو تعلیم تھی۔ غالباً مقصود یہ تھا کہ وہ دعا مانگو جو دل سے نکلے اور جس کے لیے حمیّ پیدا ہو لیکن حقیقت ظاہر ہے کہ یہ دعا مومن کو سکھائی گئی ہے۔[1]

'عالمِ اسلام اور سائنس سے بے خبری'

علم ایک وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں دیگر علوم کے ساتھ علم سائنس بھی شامل ہے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا اطلبوا العلم ولو کان بالصین (یعنی علم طلب کرو خواہ وہ چین میں ملے) اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علم کو گہوارے سے موت تک طلب کرو۔ علم کے حصول پر اس قدر زورِ شانِ نبوت کو ظاہر کرتا ہے جس کے لیے مستقبل کی تمام تاریکیوں میں روشنی نمودار تھی لیکن علمائے اسلام نے حدیثِ بالا میں ایک لفظ کا اضافہ فرمایا کہ علم سے مراد علمِ دین ہے۔ حالانکہ قانون کی شرح کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ اس میں کسی لفظ کا اضافہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے مناسب یہ تھا کہ علم سے مراد علمِ مطلق لیا جاتا۔ علمِ دین کی اولیت و اہمیت و فرضیت مسلم اور اس کا تناسب مقام بھی کون تسلیم کرے گا لیکن سوال علمِ دنیا سے گریز کا ہے چنانچہ اس تشریح نے بڑے دوررس نتائج پیدا کیے۔
اور میرا جو ناچیز مطالعہ ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں اسلام کے زوال کی وجہوں میں ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ اور یہ بات اقبال کی نظر سے پنہاں نہ تھی اسی لیے وہ علم کی کہیں مذمت نہیں کرتا بلکہ ہر جگہ وہ مقام دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہے البتہ اسے شوخی اور گستاخی سے روکتا ہے اور اپنے حد کے اندر رہنا سکھاتا ہے۔ زوال کی دوسری بڑی وجہ سلطانی ہے تیسری ملاؤں کی تنگ نظری اور خرقہ پوش اربابِ خانقاہ کی بے بصری ہے ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ ملائی و سلطانی و پیری

ترکی کی تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اس لیے حکمراں رہے کہ ان کے پاس آلاتِ حرب دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر تھے لیکن جب یورپ میں علم اور سائنس

---

[1] الفرقان :- فاضل مقالہ نگار نے اس پیراگراف میں اور اس سے اگلے پیراگراف میں چند باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں۔ آئندہ شمارہ میں ان شاء اللہ اس بارے میں کچھ لکھا جائے گا۔

کی روشنی آئی تو اس سے ترکوں نے اجتناب کیا اور اسی قدیم روش پر قائم رہ گئے۔ ترکوں نے سب سے پہلے رائفل کا استعمال کیا اور جب سلطان سلیم نے مصر پر حملہ کیا اور اسے چشم زدن میں تاخت و تاراج کر کے حکمراں طبقہ مملوکوں کے امیر کو گرفتار کیا تو اس نے سلطان سلیم کے سامنے ایک بے باک تقریر کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے: "آج جو ہم کو شکست ہوئی اور تم کو فتح تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم ہم سے زیادہ بہادر ہو۔ ہم یقیناً تم سے زیادہ بہادر ہیں لیکن تمہارے پاس رائفل اور توپیں ہیں اور ہمارے پاس یہ سامان نہیں ہیں۔ یہ رائفل اور توپیں ہمارے پاس بھی لائی گئی تھیں اور ہمارے سرداروں نے ہم کو مشورہ دیا تھا کہ ہم انھیں اپنا لیں لیکن ہم لوگوں نے انکار کیا اور کہا ان سے لڑنا مردانگی کے خلاف ہے۔ تب ہمارے امیر نے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا جب اسی سے تم نیست و نابود کیے جاؤ گے۔" پھر اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا کہ "افسوس آج وہی دن ہے۔"

علم کے خزانے یونان سے اٹلی اور اٹلی سے بغداد اور وہاں سے یورپ پہونچے۔ یورپ ان کی روشنی سے جگمگا اٹھا لیکن سلطانی کی وجہ سے حکومت ترکیہ میں جو اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اس نے اس کو جدت پسندی اختیار کرنے سے باز رکھا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر جدید طرز پر فوج کو ترتیب دینے کا کوئی سلطان خیال بھی کرتا تھا تو فوج بغاوت کر دیتی تھی اور علماء ان کی تائید کرتے تھے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ترکی کا سمندروں پر قبضہ تھا اور آخر کار وہ دن بھی آیا جب طرابلس المغرب پر اطالیہ نے حملہ کیا تو ترکی بے چارگی سے دیکھتا رہ گیا وہاں وہ فوج کس طرح بھیج سکتا تھا جب کہ اس کے پاس جنگی جہاز ہی نہ تھے۔ مختصراً انجام یہ ہوا کہ وہ دن بھی تھا جب سلیمان شکوہ نے وائنا کا محاصرہ اس دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ آج میں وائنا کے محل میں ناشتہ کروں گا اور میرے گھوڑے وائنا کے اصطبل میں دانہ کھائیں گے اور یا وہ دن بھی آیا کہ بیرونی طاقتوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ قوم پرور ترکوں میں سے جو ملا اسے تہ تیغ کر دیا بقیہ دیگر ممالک میں جا کر روپوش ہو گئے۔ وہ تو ایک رندِ بے باک جرأت قلندرانہ کے ساتھ اٹھا اور کچھ بچا لے گیا، ورنہ ترکوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑتی قبائے خلافت پرزے پرزے ہو گئی اور عالم اسلامی منتشر ہو کر مرکز سے محروم ہو گیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ اس لیے کہ علم سے پہلو تہی کی گئی اور روزہ حج اور زکوٰۃ کے مسائل سیکھنے کے سوا اور ہر چیز کو علم کے وسیع اور بسیط خانہ سے خارج کر دیا گیا۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اور آج بھی وہی عالم ہے۔ تمام دنیائے اسلام کے مدارس میں مذہبیات کے علاوہ جن سے مراد قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے، صرف آرٹس کے بعض اجزا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً قدیم فلسفہ اور قدیم منطق وغیرہ۔ سائنس کی تعلیم شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور علوم جدیدہ سے اجتناب و اعراض عین اسلام تصور کیا جاتا ہے۔ اس ہمارے ملک میں درس نظامیہ سے باہر نکلنا کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا ہے۔ ندوۃ العلماء نے ضرور علم تجارت بلند کیا تھا لیکن وقت نے اسے بھی مرعوب کر دیا۔ سرسید علیہ الرحمۃ نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی اور سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم پر کمربستہ ہوئے تو ان پر وھڑا دھڑ کفر کے فتوے صادر ہوئے[1]۔ خود سرسید فرماتے ہیں ؎

خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم　　ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

اسرائیلی فوجوں کے مقابلے میں عربوں کی حالیہ شرمناک شکست اور بیت المقدس کے نکل جانے کا حادثہ بالکل تازہ ہے۔ اس کے روحانی اسباب و علل جو بھی ہوں اور میں ان کا منکر نہیں لیکن جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ عرب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ سلطانی کا زور ہے اور سائنس کا فقدان پورے عرب میں ایک سوئی بھی نہیں بنتی ہے اور نہ اس جانب دھیان ہے حالانکہ اگر کل عرب متحد ہو جائے تو وہ ایٹمی پاور بن سکتا ہے وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے یا تو امریکہ یا روس کی امداد کا محتاج ہے وہ خود آلات حرب تیار نہیں کر سکتا۔ غیر سے دریوزہ گری اور امداد غیر پر انحصار کے سلسلے میں مدح و شکایت کا ایک دفتر بے پایاں ہماری کل تگ و دو کا شاہکار ہے۔ اسرائیل عرب ممالک کے اندر ایک ناسور بن گیا ہے اور صیہونی تحریک بڑے بڑے منصوبوں کے خواب دیکھ رہی ہے اور عرب میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کسی کوشش کا ابھی آغاز تک نہیں ہوا۔

الغرض جس زمانہ میں اقبالؔ نے اپنا پیام سنانا شروع کیا اس وقت سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم اگر کفر و شرک نہیں تو بدعت سیہ ضرور قرار پا چکی تھی اس لیے اقبالؔ کو اس معاملہ میں اصل اسلام کو دلوں میں پیوست کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔

(باقی)

---

[1] الفرقان: یہاں فاضل مقالہ نگار نے اُن لوگوں کے ساتھ کچھ انصاف کی ضرورت نہیں سمجھی ہے جو سرسید مرحوم کو [illegible]

حضرت مولٰنا عبدالمومن دیوبندیؒ

(جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (استاذ حدیث و تفسیر جامعہ ملیہ دہلی)

(حضرت مولٰنا کے یہ حالات میں نے محب محترم حضرت مولٰنا ابوالحسن علی ندوی کی فرمائش پر "نزھۃ الخواطر" کے آخری حصہ کے لیے مرتب کیے تھے۔ اب قدرے تفصیل کے ساتھ نذر ناظرین "الفرقان" ہیں۔)

حضرت مولانا عبدالمومن دیوبندی رحمۃ اللہ تعالیٰ دیوبند کے ممتاز علمی خاندان شیوخ عثمانی کے ایک رکن تھے، ان کے والد بزرگوار کا اسم گرامی منشی فہیم الدین تھا، یہ محکمۂ نہر میں ایک افسر کی حیثیت سے سرکاری ملازم تھے، ان کے تین فرزند تھے۔ ایک وکیل تھے، دوسرے اودا سیر تیسرے سب سے چھوٹے حضرت مولانا تھے، مولانا نے اپنے شوق سے علوم دینی کی طرف توجہ فرمائی، اور ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ مولٰنا کی حقیقی بہن کی شادی حضرت مولٰنا محمود حسن مدرس دارالعلوم سے ہوئی تھی جو بعد میں اسی دارالعلوم کے شہرۂ آفاق صدر المدرسین ہوئے اور "شیخ الہندؒ" کے لقب سے عالم اسلام میں شہرت پائی۔ غالباً حضرت شیخ الہندؒ کا یہ تعلق ہی مولٰنا کو انگریزی اسکول کے بجائے دارالعلوم کی چہار دیواری میں کھینچ لانے کا سبب بنا ہو، حضرت شیخ الہند اسی سال ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم کے حلقۂ مدرسین میں شامل ہوئے تھے۔[۵]

دارالعلوم میں مولٰنا عبدالمومنؒ نے اس دورِ اوّل کے اساتذہ کرام سے علوم آلیہ و عالیہ کی تکمیل کی اور محدث عصر حضرت مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ تعالیٰ صدر المدرسین اوّل دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث پڑھا اور ۱۲۹۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

۵۔ تذکرۃ الخلیل ص ۱۱

مولانا کے دار العلوم میں رفقائے درس بھی وہ اصحاب فضل و کمال رہے جو بعد میں آسمانِ علم و دین پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ چنانچہ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ کو دار العلوم کا چوتھا جلسہ دستار بندی ہوا تو اس میں گیارہ طلبہ نے سند فراغ حاصل کی۔ ان خوش نصیب طلبہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، شمس العلماء مولانا ناظر حسن دیوبندی اور مولانا عبد المومن دیوبندی کے نام بھی شامل ہیں[عـــہ]

قطبِ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کے سروں پر دستارِ فضیلت باندھی اور ہندوستان میں علمی و دینی رہنمائی کا تاج ان کے سروں پر رکھا۔ حضرت مولانا کو ۱۳۰۴ھ میں دار العلوم کی طرف سے جو سند عطا ہوئی اُس کے بعض جملے یہ ہیں:۔

"مولوی عبد المومن ۱۲۹۲ھ میں میزان پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے۔ اکثر امتحانوں میں انعام پایا۔ جلسۂ دستار بندی ۱۳۰۱ھ میں دستارِ علم حاصل کی۔ استعداد تام، مناسبت عمدہ، ذہن مناسب، طبع سلیم، فکر مستقیم رکھتے ہیں ـــــ بطور نیابت طلبہ کو درس دیتے ہوئے اکثر کتبِ درسیہ پڑھانے میں آئیں۔ ان کی خوبیٔ اخلاق اور عمدگی عادات سے مدرسین و مہتممین و جمیع طلبہ ہم درس راضی و خوش رہے ـــــ اب حسب الطلب بمشورۂ اراکین مدرسہ سند عطا ہوئی ـــــ ۵ ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ۔"[عـــہ]

اس مضمون سند سے واضح ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد حضرت مولانا کچھ عرصہ اپنے اساتذہ کرام کی زیرِ رہنمائی نائب مدرس کی حیثیت سے دار العلوم کی مسندِ درس پر بھی فائز رہے۔

میرٹھ، حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ اور اُن کے رفقاء کرام کے تبلیغی دورہ کے بعد سے علماءِ حق کی دینی و اصلاحی سرگرمیوں کا ایک خاص مرکز تھا۔ دہلی چھوڑنے کے بعد، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسمؒ میرٹھ ہی میں مقیم ہوگئے۔ اسبابِ ظاہری کے درجہ میں حضرت نانوتویؒ نے پہلے منشی ممتاز علی مہاجر مکی کے مطبع مجتبائی میں کتبِ دینیہ کی تصحیح کا کام اپنے ذمہ لیا اور اُن کے ہجرت کر جانے کے بعد، مولوی محمد ہاشم کے مطبع ہاشمی میں یہی خدمت اختیار فرمائی مگر یہ شغل

عـــہ تذکرۃ الرشید ص ـــ عـــہ ریکارڈ محافظ خانہ دار العلوم دیوبند۔

محض بہانہ کے طور پر تھا۔ اصل مقصد اشاعتِ علم، تبلیغ دین، اور تردید کفر و باطل کی وہ عظیم الشان خدمات تھیں جو حضرت مولانا نے میرٹھ کو مرکز بنا کر انجام دیں۔ اور شمع اسلام کو مسیحیت اور آریہ دھرم کے پرچارکوں کے حملوں کے جھکڑوں سے محفوظ رکھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد، جو غیر متوقع طور پر جلد ہی (۱۲۹۷ھ) میں ہو گیا تھا دار العلوم دیوبند میں حضرت کے رفقاء کرام نے میرٹھ کی علمی و دینی رونق کو باقی رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ میرے جد بزرگوار مولوی حافظ عبد الہادی اور اُن کے ماموں مولوی محمد ہاشم مالک مطبع ہاشمی میرٹھ کی درخواست پر جو ۱۲۹۰ھ کے جلسۂ دستار بندی دار العلوم کے خصوصی شرکاء میں تھے۔ (روئداد دار العلوم دیوبند ۱۲۹۰ھ) پہلے حضرت مولانا ناظر حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مدرسۂ اسلامیہ میرٹھ کے صدر مدرس کے منصب پر، اور پھر کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا عبد المومن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مدرسۂ قومیہ میرٹھ کے منصب صدارت پر مقرر ہو کر میرٹھ تشریف لائے۔ اس زمانہ میں اول الذکر مدرسہ کے کارپرداز مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم ہی تھے۔ اور ثانی الذکر مدرسہ کے، دیندار کمبوہ خاندان کے رئیس حافظ رُوح اللہ خاں تھے جن کو حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔

مدرسۂ اسلامیہ میرٹھ کی بنیاد اکابر میرٹھ کی درخواست پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے رکھی گئی تھی۔ یہ مدرسہ پہلے جامع مسجد میرٹھ کی قدیم شاہی عمارت میں قائم ہوا اس کے بعد محلہ مفتی واڑہ میں مولوی محمد ہاشم صاحب مہتمم مدرسہ کے ذاتی مکان میں منتقل ہوا پھر جب میرٹھ کے مخیر رئیس حاجی الٰہی بخش مرحوم نے ایک عمارت اس کے لیے مسجد بالائے کوٹ سے متصل تعمیر کرادی تو اس جدید عمارت میں چلا گیا (یہ حالات مجھے حضرت مولانا محمد اسحاق کٹھوری مرحوم رکن مجلس شوریٰ دار العلوم اور والد محترم حضرت مولانا قاضی بشیر الدین قاضی شہر میرٹھ سے جو دونوں ہم سبق اور مدرسہ کے قدیم ترین طلبہ میں سے تھے، معلوم ہوئے) اسی سے متصل زمانہ میں، حضرت مولانا عزیز الرحمان صاحب دیوبندی (جو بعد میں دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم مامور ہوئے) بھی اسی مدرسہ میں تشریف لائے اور کئی برس مقیم رہے، والد مرحوم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

مدرسۂ قومیہ میرٹھ میں مولانا عبد المومن رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قیام کتنے دن رہا اس کا تعین نہ ہو سکا

تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت کافی طویل تھی۔ میری تعلیمی زندگی کے آغاز (۱۳۲۹ھ) تک وہاں قیام رہا۔ مجھے ان کا وہاں کا زمانہ یاد ہے۔ اسی مدرسہ میں حضرت کے ممتاز شاگرد اور ملک کے فاضل مصنف حضرت مولنا عاشق الٰہیؒ نے اول سے آخر تک آپ سے علوم ادبیہ وعقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی۔ پھر حضرت کے ساتھ اسی مدرسہ میں بطور مدرس کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرس ہو کر تشریف لے گئے۔

مولنا عاشق الٰہیؒ کے بعد کے مولنا کے دوسرے ممتاز شاگرد حضرت مولنا اعزاز علی شیخ الادب دارالعلوم دیوبند بھی ہیں۔ حضرت شیخ الادبؒ نے حضرت مولنا عبدالمومن کے علاوہ حضرت مولنا عاشق الٰہی مرحوم سے بھی علوم دینیہ اور ادبیہ کی تحصیل کی۔ یہ دونوں فضلاء کمبوہ خاندان کے فرد تھے اور یہ مدرسہ (مدرسہ قومیہ) کمبوہ صاحبان کا خاندانی قومی مدرسہ سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔

اس کے بعد کے زمانہ کے حضرت مولنا کے ایک اور ممتاز شاگرد مولنا محمد علی نامی ایم۔ اے مرحوم سابق صدر شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی تھے۔

مدرسہ قومیہ کی مدرسی کے زمانہ میں حضرت مولنا کا قیام مسجد بالائے کوٹ گزری بازار کے حجرہ میں رہتا تھا۔ یہ وہ مسجد ہے جو پہلے مسجد قاضیان کے نام سے موسوم تھی۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ حضرت مولنا محمد اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولنا عبدالحیؒ کے ساتھ اپنے تاریخی تبلیغی دورہ کے سلسلہ میں میرٹھ وارد ہوئے اور مولوی حیات بخش قاضی ومنصف میرٹھ اور اُن کے برادرِ خورد مولوی قاضی قادر بخش نے ان کی میزبانی کے فرائض ادا کیے (سیرۃ سید احمد شہید مرتبہٗ مولنا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ) تو حضرت سید صاحب نے اسی حجرہ میں قیام فرمایا تھا اور اسی مسجد میں نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ غالباً انہی بزرگوں کے قدموں کی برکات ہیں کہ آج تک اس مسجد میں کوئی نہ کوئی خدا رسیدہ ہستی مقیم رہی ہے۔

بہرحال حضرت مولنا عبدالمومنؒ جب تک مدرسہ قومیہ میرٹھ کے مدرس رہے ان کا قیام اسی مسجد کے مشرقی حجرہ میں رہا۔

حافظ روح اللہ خاں مرحوم کے بعد مدرسہ قومیہ کا انتظام بعض بریلوی عقائد کے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا اور حضرت مولنا کو وہاں سکونِ قلب حاصل نہ رہا۔ میرٹھ کے ممتاز رئیس حافظ

فصیح الدین صاحب سوداگر اسلحہ میرٹھ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت مولانا سے مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ میں تشریف لانے کی درخواست کی جسے مولانا نے قبول فرمالیا اور تادمِ آخر وہیں مقیم رہے۔

۱۹۲۶ء میں میں دار العلوم دیوبند ایک سال سے زیادہ قیام کرکے میرٹھ آگیا اور مدرسہ امداد الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں متوسطات پڑھتا تھا۔ اس مدرسہ میں اس وقت حضرت مولانا صدر المدرسین تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت مولانا عبد الرحمان مدرس معقولات اور حضرت مولانا اختر شاہ امروہی مدرس ادبیات عربی و فارسی تھے۔ تینوں اساتذہ اپنے اپنے فنون کے باکمال اُستاد تھے۔ اور ایک خصوصیت جو آج کل عنقا کے درجہ میں ہے یہ تھی کہ تعلیمی خدمات دینی فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے اور مشاہرہ جس کی حدود میں چالیس روپے سے متجاوز نہ ہوتی تھی محض قوت لایموت کے طور پر قبول کر لیتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز غالباً ہدایہ کے درس میں دینی تعلیم پر اُجرت کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ فرمانے لگے اگرچہ متاخرین نے علوم دینیہ کے مٹ جانے کے خطرہ سے دینی تعلیم پر اُجرت کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے مگر مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ پھر آبدیدہ ہوکر فرمایا "اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھے برابر سرابر چھوڑ دیں اور تعلیم دین کو وسیلۂ معاش بنانے پر دار و گیر نہ فرمائیں تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔

حضرت مولانا اختر شاہ خاں مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ ساری عمر غالباً تیس روپے ماہوار مشاہرہ پر بسر کردی اور درس و تدریس میں انہماک کی یہ کیفیت تھی کہ ضروریاتِ دینی و دنیوی کے اوقات کو چھوڑ کر صبح و شام اور رات کو ہر وقت طلبہ کا ہجوم آپ کو گھیرے رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لیے مکان سے جامع مسجد تک راستہ طے فرماتے تھے تو اس ڈیڑھ میل کی مسافت میں طلبہ کتابیں ہاتھ میں لیے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور سبق جاری رہتا تھا۔ یہ منظر دیکھنے والے میرٹھ میں آج بھی موجود ہیں۔

میں نے غالباً تین سال کے مدرسۂ امداد الاسلام کے زمانہ میں ہدایہ، مشکوٰۃ، بیضاوی اور دیوان حماسہ مولاناؒ سے پڑھیں۔ پھر دورۂ حدیث میں شرکت کے لیے میں دار العلوم دیوبند چلا گیا۔

جہاں محدثِ عصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری اپنی تجلیاتِ علمیہ کی آخری کرنیں بکھیر رہے تھے۔

حضرت مولانا عبد المومن کا اندازِ درس یہ تھا کہ کسی طالب علم کو قرأۃ شروع کرنے کا حکم دیتے تھے طالب علم عبارت پڑھتا تھا، مولانا اس وقت اپنی پان کی ڈبیا کھول کر اس میں سے پان نکالتے تھے۔ اور بٹوے میں سے چھالیا اور تمباکو نکال کر اس میں ڈالتے تھے۔ اتنی دیر میں طالب علم قرأت سے فارغ ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات مولانا صرف آخری جملے ہی سنتے تھے۔ پھر مسئلہ زیر بحث سے متعلق مختصر اور جامع تقریر ایسے دلنشیں انداز میں فرماتے تھے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ پانی ہو جاتا تھا اور طالب علم کے دماغ کے تمام کانٹے نکل جاتے تھے۔ تقریر طویل نہیں ہوتی تھی مگر اس کے باوجود کوئی ضروری بات چھوٹتی بھی نہ تھی۔ سنا ہے کہ یہ انداز انھوں نے اپنے بلند پایہ استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے لیا تھا۔

حضرت مولاناؒ اپنے طلبہ سے، خصوصاً ان طلبہ سے جو محنت سے پڑھتے تھے بڑی محبت کرتے تھے۔ بالکل اپنی اولاد کی طرح ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے دل میں بھی تحصیلِ علم، خدمتِ دین اور اخلاص و للّٰہیت کے جذبات اتار دیں۔ مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ حالاتِ زمانہ بدل رہے تھے۔ اور مولانا اس پر محزون تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں اور میرے رفقاء مولوی سید شوکت علی (ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے کراچی یونیورسٹی)، مولوی حفیظ علی مرحوم وغیرہ یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک روز ہم میں سے ایک طالب علم اپنی عربی انشاء کی کاپی پر حضرت مولانا سے اصلاح لے رہا تھا، مقصد "فاضل" کے امتحان کی تیاری تھی، اتفاقاً اُسی وقت ایک بیرونی مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ حیرت سے طالب علم کا منھ دیکھ کر کہنے لگے۔ کیا یہ مضمون اس لڑکے نے لکھا ہے؟ حضرت مولانا نے فرمایا جی ہاں۔ پھر کیا ایک چہرہ کا رنگ بدل گیا اور حسرت کے ساتھ فرمانے لگے "افسوس اب تو ایسے طلبہ سے واسطہ پڑتا ہے جن سے کوئی توقع ہی نہیں کی جا سکتی، اور جن سے کوئی توقع ہو سکتی ہے اُن کے ذہنوں کا رُخ بدلا ہوا ہے۔

۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا کو کینسر کا مرض ہوا۔ میرٹھ کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو حضرت شیخ الہند کے خاندان سے خصوصی تعلقات کی بنا پر علاج کے لیے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہاں دہلی لایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ سے علاج کیا۔ مگر وقت سفر آ چکا تھا۔ چند ماہ کی علالت کے بعد راہیِ

ملک بقا ہوئے۔ وصیت کے مطابق درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔ تاریخ پیدائش کا صحیح علم نہ ہو سکنے کی وجہ سے عمر کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ساٹھ سے زیادہ اور ستر سے کم تھی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولاناؒ کی کسی تصنیف کا علم نہ ہو سکا۔ ان کے رفیق درس حضرت مولانا ناظر حسن دیوبندی صدر المدرسین مدرسہ عالیہ ڈھاکہ نے زمانۂ قیام بنگال میں بنک کے سود کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ مولاناؒ نے ہزلۃ العالم کے نام سے اس کا رد لکھا تھا۔ اسی طرح بعض مختصر رسائل فرق مبتدعہ کے رد میں لکھے تھے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی کے مقبول ترجمہ قرآن اور حواشی قرآن پر بھی حضرت مولاناؒ نے اصلاحی نظر ڈالی۔ اور ان ہی کی سفارش پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسے نظر ثانی سے آراستہ کیا۔ حضرت مولاناؒ کے کئی تحریر زندہ ہوئے مگر ان کی علمی وراثت مولانا محبوب الٰہی صاحب صدر مدرس مدرسہ عبد الرب دہلی کو حاصل ہوئی۔ مولانا مدظلہ اب ضعیفی کے دور میں ہیں اور اپنے والد ماجد سے اتقدر مشابہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر ان کی تصویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔

دو باتوں کی وضاحت

از محمد منظور نعمانی

(۱)

الفرقان کے گزشتہ شمارہ میں "حرمین پاک کی حاضری" کے زیر عنوان راقم سطور نے ذکر کیا تھا کہ حجاز مقدس میں اور بعض دوسرے بلاد عربیہ میں بھی بعض مساجد میں تراویح کی نماز اس طرح ہوتی ہے کہ امام صاحب قرآن مجید کو ہاتھ میں لے کر اُس کو دیکھ کر پڑھتے ہیں۔

ناظرین الفرقان میں سے ایک صاحب نے اس کے بارہ میں دریافت کیا ہے کہ کیا یہ طریقہ درست ہے اور اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہو جاتی ہے؟ ــــ اُن صاحب کو خط سے جواب دے دیا گیا تھا لیکن مناسب معلوم ہوا کہ الفرقان کے صفحات میں بھی اس کی وضاحت کر دی جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں ہے، اُن کے نزدیک یہ "عمل کثیر" ہے اور اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے ــــ لیکن اُن کے صاحبین امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اور دوسرے بعض ائمہ مجتہدین امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک یہ جائز ہے اور اس سے نماز میں خلل نہیں آتا۔ حجاز مقدس وغیرہ میں نماز تراویح میں جو ائمہ قرآن مجید میں دیکھ کر قراءت کرتے ہیں وہ اسی دوسرے مسلک کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲)

گزشتہ شمارہ کے اسی مضمون میں سفر کی سرگزشت کے ضمن میں برصغیر ہند و پاکستان اور حجاز مقدس کے اختلاف مطالع کی بنیاد پر رویت ہلال اور قمری تاریخوں کے فرق کا بھی ذکر کیا گیا تھا ــــ جو کچھ عرض کیا گیا تھا اُس کا حاصل یہ تھا کہ ۹ نومبر کو جبکہ اتوار کا دن تھا اور ہندوستان

میں شعبان کی ستائیسویں^{۲۷} تاریخ تھی، حجاز مقدس میں شعبان کی انتیسویں^{۲۹} تھی، اسی دن بعد نماز عشا محکمۂ شرعیہ کی طرف سے رمضان مبارک کا چاند ہو جانے کا اعلان ہو گیا، اس لیے وہاں پہلا روزہ ۱۰ نومبر دوشنبہ کے دن رکھا گیا۔ اس بنا پر ۲۴ نومبر دوشنبہ کو (جس دن کہ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صبح کو جدہ سے روانہ ہو کر عصر کے وقت بمبئی پہونچے) ہمارا پندرھواں روزہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں رمضان کی تیرھویں تاریخ تھی اور تیرھواں روزہ تھا۔ اس حساب سے ۹ دسمبر سہ شنبہ کو یہاں رمضان مبارک کی اٹھائیسویں^{۲۸} تاریخ تھی اور ہمارا تیسواں^{۳۰} روزہ تھا، اس کے اگلے دن یعنی چہار شنبہ ۱۰ دسمبر کو یہاں ہندوستان میں (اور اسی طرح پاکستان میں بھی) بلا اختلاف انتیسویں^{۲۹} رمضان تھی (یعنی وہ دن یہاں یقینی طور پر رمضان کا تھا) اور ہم یہاں موجود تھے، اس لیے ہم نے رمضان کا وہ دن پایا، اور قرآن پاک نے رمضان کے پانے والوں پر اس کے ہر دن کا روزہ فرض کیا ہے ــــ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۵ میں رمضان مبارک کی یہ فضیلت اور عظمت بیان کرنے کے بعد کہ اس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ"۔ (تم میں سے جو کوئی اس مہینہ (رمضان) میں حاضر موجود ہو تو وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے) الغرض قرآن پاک کے اس صریح حکم کی بنا پر ہم نے یہاں کی انتیسویں^{۲۹} رمضان کو بھی روزہ رکھا اور یہ ہمارا اکتیسواں^{۳۱} روزہ ہو گیا۔

اس آیت کے علاوہ احادیث نبوی کی ہدایت بھی یہی تھی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مشہور حدیث ہے۔ "صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ جب رمضان کا چاند دیکھ لیا جائے تو روزے رکھے جائیں اور جب شوال کا چاند نظر آ جائے تب روزے چھوڑ دیے جائیں اور فطر منائی جائے) ہم نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ ۹ نومبر کو ہم مکہ معظمہ میں تھے، وہاں اس رات کو چاند نظر آ گیا ہم نے وہاں روزے رکھنے شروع کر دیے، وسط رمضان میں ہم ہندوستان آ چکے تھے، یہاں شوال کا چاند ۱۰ دسمبر کی شب میں دیکھا گیا، اس لیے ہم نے اس دن تک روزہ رکھا اور اگلے دن اس ارشاد نبوی کی ہدایت کے مطابق عید کی۔

جنوبی ہند کے ایک صاحب نے ایک خط کے ذریعہ اس پر تنقید کی ہے، جس کا انداز اور لب ولہجہ افسوس ہے کہ صرف عامیانہ اور ناسنجیدہ ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ حد تک تمسخر آمیز بھی ہے ـــ اس تنقید کا حاصل یہ ہے کہ جب ۹ دسمبر سہ شنبہ کو (جبکہ یہاں ہندوستان میں ۲۸واں روزہ تھا) ہمارے روزے پورے ۳۰ ہو چکے تھے تو اس کے بعد ۱۰ دسمبر کو ہمیں روزہ نہیں رکھنا چاہیے تھا کیونکہ حدیث نبوی کی رو سے رمضان یا ۲۹ کا ہوتا ہے

یا ۳۰ کا، اس لیے ہم نے اکتیسواں روزہ غلط رکھا، اُس دن روزہ رکھنا ہمارے لیے حرام تھا۔

ان صاحب کے خط سے یہ نہیں سمجھا جاسکا کہ وہ اختلاف مطالع کی بنیاد پر بعید المسافت علاقوں اور ملکوں کے درمیان رویت ہلال کی تقدیم و تاخیر اور اس کی بنا پر تاریخ کے فرق کو (جو اب ایک مشاہداتی حقیقت بن چکی ہے) تسلیم کرتے ہیں یا اُن کو اس سے انکار ہے، حالانکہ اس بحث میں وہی بنیادی مسئلہ ہے تاہم اُن کے تسنخ کو نظر انداز کر کے اُن کے شبہ یا استدلال کو پیش نظر رکھ کر نفس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے سطور ذیل حوالۂ قلم کی جارہی ہیں تاکہ اگر کسی اور صاحب کو بھی اس طرح کا خلجان ہو تو اُن کی نظر سے بھی گزر جائے۔ واللہ الموفق۔

یہ بات کہ رمضان بلکہ ہر قمری مہینہ یا ۲۹ دن کا ہوتا ہے یا ۳۰ دن کا ایک مسلّم حسابی اور مشاہداتی حقیقت بھی ہے اور اختلاف مطالع سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ برصغیر ہند و پاکستان اور حجاز مقدس کے درمیان رویت ہلال میں ایک یا دو دن کا فرق ہونے کے باوجود ہر جگہ رمضان یا ۲۹ کا ہوتا ہو یا ۳۰ دن کا، یہی حدیث نبوی کا مدعا ہے، اور اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔۔۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہوسکتا ہے اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کے عام رواج نے اس کو اب ایک عام واقعہ بنا دیا ہے کہ ایک شخص آخر شعبان اور شروع رمضان میں حجاز مقدس یا کسی اور ملک میں ہو جو ہندوستان سے ۳۔۴ ہزار میل مغرب میں واقع ہو، مطلع کے اختلاف کی وجہ سے وہاں رمضان کا چاند ہند و پاکستان سے دو دن پہلے دیکھ لیا جائے اور اس بنا پر وہاں رمضان ہمارے ہاں سے دو دن پہلے شروع ہو جائے (جیسا کہ اس سال بھی حجاز مقدس میں ہوا) پھر وہ شخص رمضان ہی میں ہندوستان آجائے۔ اس صورت میں یہاں اٹھائیسویں ۲۸ رمضان کو اُس کے ۳۰ روزے پورے ہو جائیں گے، اُس کے اگلے دن یہاں انتیسویں رمضان ہوگی یعنی قطعی اور یقینی طور پر وہ دن یہاں رمضان کا ہوگا اور مندرجہ بالا قرآنی آیت (فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ) کی رو سے اُس دن روزہ رکھنا اُس پر فرض ہوگا، اگرچہ یہ اس کا اکتیسواں ۳۱ روزہ ہو جائے گا۔ (جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جاچکا ہے۔ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس سال یہی صورت پیش آئی۔)

اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص آخر شعبان اور شروع رمضان میں ہند یا پاکستان میں ہو (ظاہر ہے کہ وہ مندرجہ بالا قرآنی آیت اور ارشاد نبوی صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ کے حکم کے مطابق رمضان کے

روزے اُسی وقت شروع کریگا جب یہاں رمضان کا چاند ہو جائے گا، پھر وہ اثنائے رمضان ہی میں مثلاً حجاز مقدس پہنچ جائے اور وہاں رمضان مبارک دو دن پہلے شروع ہو چکا ہو (جیسا کہ اس سال ہوا) تو وہاں کی ۲۹ ویں رمضان کو اس کا ۲۷واں روزہ ہوگا، اگر بالفرض ۲۹ ویں ہی کو وہاں شوال کا چاند ہو گیا تو اگلے دن عید الفطر ہوگی اور میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی مفتی بھی اُس کو یہ فتویٰ دے گا کہ چونکہ اُس کے روزے صرف ۲۷ یا ۲۸ ہوئے ہیں اس لیے وہ شوال کا چاند ہو جانے کے باوجود وہاں عید کے دن روزہ رکھے اور ۲۹ یا ۳۰ کی گنتی پوری کرے اگر بالفرض وہ ایسا کرے گا تو ارشادِ نبوی "اَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ" کی صریح خلاف ورزی اور حکم شریعت کی نافرمانی ہوگی ـــــ یہ صورت مسئلہ بھی صرف فرضی نہیں ہے، بلکہ جس طرح ہم لوگوں کو اس سال پہلی والی صورت پیش آئی اور ہم نے ۳۱ روزے رکھے، اس طرح بعض اُن حضرات کو جو ہندوستان یا پاکستان میں رمضان مبارک شروع ہونے کے بعد حجاز مقدس پہنچے تھے اور عید تک وہیں مقیم رہے. یہ دوسری صورت پیش آئی، وہاں شوال کا چاند بھی ۲۹ کا مانا گیا یعنی ۹ر دسمبر سہ شنبہ کو عید الفطر ہوئی جبکہ ان حضرات کے روزے صرف ۲۷ ہوئے تھے۔

جو کچھ عرض کیا گیا اُس پہ غور کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ رمضان کا مہینہ تو کہیں بھی ۲۹ دن سے کم اور ۳۰ دن سے زیادہ کا نہیں ہوا، بلکہ اس سال تو ہند و پاکستان اور حجاز مقدس دونوں ہی جگہ ۲۹ دن کا ہوا، لیکن بعد مسافت کی بنا پر مطلع کے اختلاف اور سفری نقل و حرکت کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہو گئی کہ ہم لوگوں نے رمضان کے ۳۱ دن پائے (۱۵ دن حجاز مقدس میں اور ۱۶ دن ہندوستان میں) اس لیے ہم نے ۳۱ روزے رکھے جن میں سے ہر روزہ رمضان ہی میں رکھا گیا اور اس کے برعکس کچھ دوسرے حضرات نے رمضان مبارک کے صرف ۲۷ دن پائے اس لیے انھوں نے صرف ۲۷ ہی روزے رکھے، اور کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے رمضان مبارک کے کسی ایک دن کا بھی روزہ چھوڑا. بلاشبہ انھوں نے اور ہم نے بھی ارشادِ ربانی " فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" اور ہدایت نبوی "صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ" کی پوری تعمیل کی۔

اس عاجز نے یہی سمجھا ہے اور اب تک جن اہل علم اور اصحاب فتویٰ سے اس بارہ میں گفتگو کا اتفاق ہوا، اُن کی رائے بھی یہی معلوم ہوئی، لیکن ہم میں سے کوئی بھی معصوم نہیں اور بلاشبہ دلیل کے ساتھ ہر ایک کو اختلاف رائے کا حق ہے ـــ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے جزئی سوالات بھی پیدا ہوں گے، علماء شریعت اور اصحاب فتویٰ کو اُن پر بھی غور فرمانا ہوگا۔ واللہ الملہم للحق والصواب ـــــ

Regd . No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 37 NO. 10-11 JAN, FEB 1970

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ غیر ممالک سے ۱۵ شلنگ ہوائی ڈاک کے لیے مزید محصولڈاک کا اضافہ	لکھنؤ ماہنامہ الفرقان اس شمارہ کی قیمت ...... ۹۰ پیسے	سالانہ چندہ ہندوستان سے .... ۸/- پاکستان سے ...... ۸/۵۰ ضخامت ۶۵ صفحات قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے

شمارہ ۱۲	بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۷۰ء	جلد ۳۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ مارچ تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اوّلیں

از ـــــــ عتیق الرحمن سنبھلی

گزشتہ شمارہ کے ایک مضمون "تسخیر فطرت یا علم و عشق" میں بعض ایسے خیالات کا اظہار ہوا تھا جن پر الفرقان کو اختلافی نوٹ دینا پڑا۔ اس نوٹ میں اختلاف اور وجوہ اختلاف کی کوئی تفصیل نہیں تھی، اُسے آئندہ پر محمول کر دیا گیا تھا۔ اس صحبت میں اسی امر کی تھوڑی سی وضاحت منظور ہے۔

فاضل مضمون نگار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ:

۱۔ تسخیر ارض و سما اسلام کی تعلیم ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کو مسخر کر لینا ہی ایک مومن کی شان اور اسکی زندگی کا نصب العین ہے۔ قرآن نے سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرما کر یہی تعلیم دی تھی۔

اسی ذیل میں یہ بھی تھا کہ:

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "اطلبوا العلم ولو بالصین" (علم طلب کرو خواہ چین میں ملے) جیسے ارشادات میں مطلق علم کے حصول پر زور دیا تھا، جس میں سائنس وغیرہ بھی شامل ہیں مگر علماء نے اس کی تشریح محض "علم دین" سے کی، جس کا کوئی جواز نہیں تھا، اور اس سے عالم اسلام کو یہ غیر معمولی نقصان پہنچا کہ علم دنیا سے گریز کا رجحان پیدا ہو گیا، جو اسلامی طاقت کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ علم دنیا سے گریز ایک نقصان کا سودا ہے، تو اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا دنیا میں رہنا اور علم دنیا سے بے اعتنائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پیراکی سیکھے بغیر سمندر کی زندگی اختیار کرنا چاہے اسی علم دنیا کا نام سائنس ہے، خواہ وہ آج کی سی عظیم ترقی یافتہ شکل میں ہو یا سینکڑوں اور ہزاروں برس پہلے کی معمولی اور حقیر شکلوں میں، جس کے ذریعہ انسان اپنے لباس، پوشاک، غذا، علاج و معالجہ، حفاظت و دفاع اور حرب و ضرب کی ضروریات اپنے مقابلہ میں معمولی درجہ پر پوری کرتا تھا۔

انسان کی ایسی فطری اور لابدی ضرورت میں اسلام جیسا دین فطرت مانع اور مزاحم ہو، اس کا کوئی سوال ہی نہیں، اُس کے صحیفۂ مقدس کا یہ ارشاد کہ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا

نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے اُس وقت تک بامعنیٰ ہی نہیں ہو سکتا جب تک انسان کو اس خزانۂ ارضی کا جائزہ لینے، اس سے استفادہ کے لیے دماغ لڑانے اور کچھ نتائج اخذ کر کے اُنھیں آزمانے کی اجازت نہ ہو ـــ اور یہی علمِ دُنیا یا سائنس ہے!

علاوہ ازیں خدا نے جو طرح طرح کی ذمہ داریاں انسان پر ڈالی ہیں، اپنی جان کی حفاظت کرے، نسل و خاندان کا بار اُٹھائے، اقربا کی خبرگیری کرے، عام حاجتمندوں کے کام آئے، اور سب سے بڑھ کر دینِ حق کو غالب کرنے میں کوشاں ہو، یہ جملہ فرائض آدمی کی جس استطاعت پر موقوف ہیں، وہ علمِ دُنیا کے بغیر کہاں سے مل سکتی ہے؟ اس لیے اجازت ہی نہیں، موقع و محل سے اس کی اہمیت کے اشارے بھی قرآن و حدیث میں مل سکتے ہیں۔

لیکن سائنس کے میدان میں مغربی اقوام کی ترقیوں اور تسخیرِ کائنات کے سلسلہ کی اُنکی بلند پروازیوں کو دیکھ کر اس کو "اسلام کا نصب العین" قرار دے دینا بنیادی طور پر اسی قبیل کی غلطی ہے جس نے عنایت اللہ خاں مشرقی جیسے لوگوں کو اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ اسلام و کفر اور عملِ صالح اور فسق و فجور کی بالکل دوسری تشریح کرنے لگے! انھوں نے مجاز و استعارہ کی زبان یا شاعرانہ انداز میں نہیں بلکہ پورے زور و قوت اور اصرار کیساتھ، اپنے نزدیک استدلال کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا کہ مغرب کی موجودہ مادی سائنسی ترقیات ہی عینِ اسلام و ایمان ہیں اور اس راہ کی اُنکی محنت و کاوش وہ اصل جہاد اور عملِ صالح ہے جس کی قرآن میں دعوت دی گئی ہے اور اس بنا پر موجودہ یوروپین اقوام ہی "مومنین صالحین" ہیں اور مسلمان جو اپنی کوتاہی کی وجہ سے ان ترقیات سے محروم ہیں وہ دراصل کفار و فجار ہیں، وہ جس اسلام کو لیے بیٹھے ہیں وہ اصلی اسلام نہیں ہے بلکہ "مولوی کا غلط مذہب" ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کا ایک مقام اور درجہ ہے کسی چیز کو اسلام کا یا مسلمانوں کا نصب العین قرار دینے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کیا قرآن مجید یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس کو یہ رتبہ دیا گیا ہے، اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے فیض یافتہ صحابہ کرام کا رویہ اس کے بارہ میں وہ رہا ہے جو کسی شخص اور جماعت کا اپنے نصب العین کے بارہ میں ہونا چاہیے ـــ ظاہر ہے کہ سائنس یا جس چیز کو اس بحث میں "تسخیرِ ارض و سماء" کہا گیا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں ہے ـــ قرآن مجید میں بیشک "سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" فرمایا گیا ہے اور جگہ جگہ فرمایا گیا ہے لیکن اس کا زیرِ بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں ان آیات کا مقصد تو بندوں کو صرف یہ بتانا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احسانات فرمائے ہیں کہ تمہیں وجود بخشا، تمہارے لیے غذائیں پیدا کیں، زندگی کی دوسری ضروریات مہیا فرمائیں، اسی طرح اس کا یہ بھی عظیم احسان ہے کہ اس نے زمین و آسمان کی کائنات کو تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ تم ان سے اور ان کی مضمر طاقتوں سے فائدہ اٹھا سکو، اس خدا کی قدرت اور اس کی شانِ

---

[1] بہت سے قارئین جو اس سے ناواقف ہیں انھیں یہ سطریں پڑھ کر غالباً حیرت ہوگی اور ان کے دل میں ضرور یہ خیال آئیگا کہ کوئی آدمی بسلامتِ ہوش و حواس ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ مشرقی کی ضخیم کتاب "تذکرہ" کا خاص موضوع یہی ہے۔ پوری کتاب اسی دعوے کی تکرار و تکرار سے بھری ہوئی ہے۔

رب العالمین کو جان سکو، اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن مجید کی ان آیات میں تسخیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، اور بیشک وہ اسی کی شان ہے تسخیر کا مطلب ہے کسی چیز کو تابع فرمان کر لینا، ایسی گرفت اس پر حاصل کرنا کہ سر مو انحراف نہ کر سکے ظاہر ہے کہ یہ شان اللہ ہی کی ہے۔ آج جس بے تکلفی کے ساتھ تسخیر کی نسبت انسان کی طرف کی جانے لگی ہے وہ صرف جاہلیت جدیدہ کی پیداوار ہے، خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے مومن کا کام کائنات کی تسخیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مسخر کی ہوئی مخلوقات کو اس کی مرضی اور احکام کے مطابق استعمال کرنا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں بہت سی جگہ مومن بندوں کی شان اور ان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، مگر اس میں کہیں یہ نہیں کہ وہ برق و باد کی تسخیر کرتے اور مہر و پروین پر کمند ڈالتے ہیں محترم مضمون نگار اگر چاہیں تو کم از کم سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۲ "اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ" الخ اور سورۂ احزاب کی آیت ۳۵ "اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ" الخ قرآن مجید میں دیکھ لیں یہ مومن کے اوصاف کے سلسلہ کی جامع ترین آیتیں ہیں۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ کسی حدیث سے بھی یہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ مومن اپنا نصب العین تسخیر کائنات سمجھے اور اس کے لیے ضروری علم ہر جگہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ رہ گئی یہ بات کہ حدیث "اطلبوا العلم ولو بالصین" جیسی احادیث میں صرف علم دین مراد ہے یا اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک خاص اس حدیث کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ ان روایات میں سے ہے جو اگرچہ عوام میں کسی وجہ سے شہرت پا گئی ہیں لیکن انکی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور اس وجہ سے محدثین کے نزدیک ان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ ہاں اور بہت سی صحیح حدیثوں میں بلکہ قرآن مجید کی آیات میں بھی تحصیل علم کی تاکید اور اس کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے لیکن جو شخص قرآن و حدیث کی زبان اور اس کے محاورات کو جانتا ہے اس کو اس میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان سب آیات و احادیث میں وہ علم ہدایت مراد ہے جو نبیوں کے ذریعہ آتا ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا اہل کتاب کے بارہ میں فرمایا گیا ہے "وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ" ظاہر ہے کہ اس سے یہی علم ہدایت مراد ہے جو انکے نبیوں کے ذریعہ انکے پاس آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور اور صحیح حدیث ہے "ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما وانما ورثوا العلم" یعنی انبیاء علیہم السلام نے روپے پیسے کی میراث نہیں چھوڑی بلکہ اپنی میراث میں علم چھوڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہ علم ہدایت ہی مراد ہے جو انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ سے ملا تھا اور جو انھوں نے بطور میراث اپنی امتوں کیلئے چھوڑا یعنی خدا کی ذات و صفات، اسکی مرضیات اور اسکے احکام کا علم۔ الغرض قرآن و حدیث کے طالبعلم کیلئے یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ جن آیات یا احادیث میں تحصیل علم کی تاکید فرمائی گئی ہے وہاں اس سے یہ علم ہدایت ہی مراد ہے۔ علاوہ ازیں اتنی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر بالفرض دوسرے علوم و فنون بھی مراد ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام انکے سیکھنے سکھانے اور انکی دعوت و اشاعت کا بھی ویسا ہی اہتمام کرتے جیسا کہ دین و شریعت کے علم کا کیا گیا۔ رہا علم دنیا تو اسکی ضرورت و اہمیت ثابت کرنے کیلئے بالکل ضروری نہیں ہے کہ احادیث علم کے مفہوم کی وسعت کا دعویٰ کیا جائے، اسکے لیے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ان احادیث میں تو کسی بھی آیت یا حدیث میں علم دنیا سے بے اعتنائی کی تعلیم نہیں ہے۔ باقی رہی اس علم کی ضرورت تو جبتک اسلام کو ترک دنیا اور ترک اسباب کا داعی نہ بتایا جائے، مسلم افراد کے لئے

صفحہ ۶۸ پر ایک ضروری اعلان ملاحظہ فرمائیں

كِتَابُ الْمُعَاشَرَةِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِيث

(مُسَلسَل)

میاں بیوی کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں

انسانوں کے باہمی تعلقات میں ازدواجی تعلق کی جو خاص نوعیت اور اہمیت ہے اور اُس سے جو عظیم مصالح اور منافع وابستہ ہیں وہ کسی وضاحت کے محتاج نہیں، نیز زندگی کا سکون اور قلب کا اطمینان بڑی حد تک اسی کی خوشگواری اور باہمی اُلفت و اعتماد پر موقوف ہے ـــ پھر جیسا کہ ظاہر ہے اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ فریقین کو پاکیزگی کے ساتھ زندگی کی وہ مسرتیں اور راحتیں نصیب ہوں جو اس تعلق ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں اور آدمی آوارگی اور پراگندگی سے محفوظ رہ کر زندگی کے فرائض و وظائف ادا کر سکے اور نسلِ انسانی کا وہ تسلسل بھی انسانی عظمت اور شرف کے ساتھ جاری رہے جو اس دُنیا کے خالق کی مشیت ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد بھی اسی صورت میں بہتر طریقہ پر پورے ہو سکتے ہیں جبکہ فریقین میں زیادہ سے زیادہ محبت و یگانگت اور تعلق میں زیادہ سے زیادہ خوشگواری ہو۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میاں بیوی کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کے بارہ میں جو ہدایات دی ہیں اُن کا خاص مقصد یہی ہے کہ یہ تعلق فریقین کے لیے زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور مسرت و راحت کا باعث ہو، دل جُڑے رہیں اور وہ مقاصد جن کے لیے یہ تعلق قائم کیا جاتا ہے بہتر طریقہ سے پورے ہوں ـــ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کا خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے لیے سب سے بالاتر سمجھے، اس کی وفادار اور فرمانبردار رہے، اس کی خیر خواہی اور رضا جوئی میں کمی نہ کرے، اپنی دُنیا اور آخرت کی بھلائی اس کی خوشی سے وابستہ سمجھے ——— اور شوہر کو چاہیے کہ وہ بیوی کو اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سمجھے، اس کی قدر اور اس سے محبت کرے، اگر اس سے غلطی ہو جائے تو چشم پوشی کرے، صبر و تحمل اور دانشمندی سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اپنی استطاعت کی حد تک اس کی ضروریات اچھی طرح پوری کرے، اس کی راحت رسانی اور دلجوئی کی کوشش کرے۔

ان تعلیمات کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے کے لیے اب سے قریباً ۱۴۰۰ سال پہلے پوری انسانی دنیا اور خاصکر عربوں کے اس ماحول کو سامنے رکھنا چاہیے جس میں بیچاری بیوی کی حیثیت ایک خریدکردہ جانور سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور اُس غریب کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا ——— اس مختصر تمہید کے بعد اس سلسلہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پڑھیے!

بیوی پر سب سے بڑا حق اُس کے شوہر کا ہے:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الْمَرْأَةِ زَوْجُهَا وَاَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الرَّجُلِ اُمُّهٗ ——— رواہ الحاکم فی المستدرک

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورت پر سب سے بڑا حق اُس کے شوہر کا ہے اور مرد پر سب سے بڑا حق اُس کی ماں کا ہے۔ (مستدرک حاکم)

اگر غیر اللہ کیلئے سجدہ کی گنجائش ہوتی تو عورتوں کو شوہروں کیلئے سجدہ کا حکم ہوتا:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ

لِزَوْجِهَا ـــــــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میں کسی کو کسی مخلوق کے لیے سجدہ کا حکم کرتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (جامع ترمذی)

تشریح) کسی مخلوق پر کسی دوسری مخلوق کا زیادہ سے زیادہ حق بیان کرنے کے لیے اس سے زیادہ بلیغ اور مؤثر کوئی دوسرا عنوان نہیں ہو سکتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیوی پر شوہر کا حق بیان کرنے کے لیے اختیار فرمایا۔ حدیث کا مطلب اور مدعا یہی ہے کہ کسی کے نکاح میں آجانے اور اس کی بیوی بن جانے کے بعد عورت پر خدا کے بعد سب سے بڑا حق اس کے شوہر کا ہو جاتا ہے، اسے چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری اور رضاجوئی میں کوئی کمی نہ کرے۔

جامع ترمذی میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہ کی روایت سے انہی الفاظ میں روایت کی گئی ہے ــــ اور امام احمد نے مسند میں اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کی ہے۔

لَا يَصْلُحُ لِبَشَرٍ اَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ	کسی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ
وَلَوْ صَلَحَ لِبَشَرٍ اَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ	کسی دوسرے آدمی کو سجدہ کرے، اور اگر
لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ اَنْ تَسْجُدَ	یہ جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ
لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهٖ عَلَيْهَا۔	اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، کیونکہ اس پر اس
(الحدیث)	کے شوہر کا بہت بڑا حق ہے۔

اور سنن ابن ماجہ میں یہی مضمون حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت سے حضرت معاذ بن جبل کے ایک واقعہ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ اس روایت میں واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

"مشہور انصاری صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ملک شام گئے ہوئے تھے، جب وہاں سے واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سجدہ کیا، آپ نے تعجب سے پوچھا "مَا هٰذَا يَا مُعَاذ؟" (معاذ یہ کیا کر رہے ہو) انہوں نے

عرض کیا کہ میں شام گیا تھا وہاں کے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے دینی پیشواؤں، پادریوں کو اور قومی سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرے دل میں آیا کہ ایسے ہی ہم بھی آپ کو سجدہ کیا کریں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا نہ کرو ـــــ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

فَاِنِّیْ لَوْ کُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ	اگر میں کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے
یَّسْجُدَ لِغَیْرِ اللّٰہِ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَۃَ	سجدہ کرنے کے لیے کہتا تو عورت کو کہتا کہ
اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا..... الحدیث	وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

اور سنن ابی داؤد میں اس سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی قیس بن سعد سے روایت کیا گیا ہے ـــــ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

"میں حیرہ گیا تھا (یہ کوفہ کے پاس ایک قدیمی شہر تھا) وہاں کے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ ادب و تعظیم کے طور پر اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں، پھر جب میں (سفر سے لوٹ کے) آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ سے یہی بات عرض کی، آپ نے مجھ سے فرمایا!

اَرَاَیْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِیْ اَکُنْتَ	بتاؤ اگر (میرے مرنے کے بعد) تم میری قبر
تَسْجُدُ لَهٗ؟ فَقُلْتُ لَا فَقَالَ لَا	کے پاس سے گزروگے تو کیا میری قبر کو بھی
تَفْعَلُوْا، لَوْ کُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ	سجدہ[1] کروگے؟ (قیس کہتے ہیں) میں نے
یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَاءَ	عرض کیا کہ نہیں (میں آپ کی قبر کو تو سجدہ
اَنْ یَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا	نہیں کروں گا) تو آپ نے فرمایا ایسے ہی اب

---

[1] اس سوال سے آپ کا مقصد قیس بن سعد کو یہ بتانا اور سمجھانا تھا کہ میں تو ایک فانی ہستی ہوں، ایک دن وفات پاکر قبر میں دفن ہو جاؤں گا اور اس کے بعد تم بھی مجھے سجدہ کے لائق نہ سمجھوگے، پھر مجھے سجدہ کیونکر روا ہو سکتا ہے، سجدہ تو اس ذات کے لیے روا ہو جو "حَیٌّ لَا یَمُوْتُ" ہے اور جس کے لیے کبھی فنا نہیں۔ ۱۲

جَعَلَ اللّٰہُ لَہُمْ عَلَیْہِنَّ مِنْ حَقٍّ۔ عبادت کرو۔ ۔ ۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اگر میں کسی کو کسی دوسری مخلوق کے لیے سجدہ کرنے کے لیے کہتا تو عورتوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں، اس عظیم حق کی بنا پر جو اللہ نے ان کے شوہروں کا ان پر مقرر کیا ہے۔

اور مسند احمد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور واقعہ روایت کیا گیا ہے کہ ایک اونٹ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سجدہ کیا (یعنی وہ اس طرح آپ کے حضور میں جھک گیا جس کو دیکھنے والوں نے سجدہ سے تعبیر کیا) اس اونٹ کا یہ طرز عمل دیکھ کر بعض صحابہ نے حضور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اونٹ جیسے چوپائے اور درخت آپ کے لیے سجدہ کرتے ہیں (یعنی جھک جاتے ہیں) تو ان کی بہ نسبت ہمارے لیے زیادہ سزاوار ہے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں ۔ ۔ ۔ آپ نے اُن سے فرمایا!

اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَاَکْرِمُوْا اَخَاکُمْ	عبادت اور پرستش بس اپنے رب کی کرو اور
وَلَوْ کُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ	اپنے بھائی کا (یعنی میرا) بس اکرام و احترام
لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَۃَ اَنْ	کرو اور اگر میں کسی کو کسی دوسری مخلوق
تَسْجُدَ لِزَوْجِہَا۔	کے لیے سجدہ کرنے کو کہتا تو عورت کو کہتا کہ
..... الحدیث	وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے ..... الخ

ان مختلف احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی پر شوہر کے حق کے بارہ میں یہ سجدہ والی بات مختلف موقعوں پر اور بار بار فرمائی۔

ہر قسم کا سجدہ صرف اللہ کے لیے :-

ان سب حدیثوں سے یہ بات بھی پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ شریعت محمدی میں سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے، اس کے سوا کسی دوسرے کے لیے حتیٰ کہ افضل مخلوقات سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کسی طرح کے سجدہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت معاذ یا قیس بن سعد یا جن دوسرے صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سجدہ کے بارہ میں عرض کیا تھا وہ سجدۂ تحیہ ہی کے بارے میں عرض کیا تھا جس کو

لوگ سجدۂ تعظیمی بھی کہہ دیتے ہیں) اس کا تو شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان صحابہ نے معاذ اللہ سجدۂ عبادت و عبودیت کے بارہ میں عرض کیا ہو۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکا اور آپ کی دعوت توحید کو قبول کر چکا اس کو تو اس کا وسوسہ بھی نہیں آ سکتا کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو سجدۂ عبادت کرے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان حدیثوں کا تعلق خاص کر سجدۂ تحیہ ہی سے ہے۔ اسی لیے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کسی مخلوق کے لیے سجدۂ تحیہ بھی حرام ہے۔ پس جو لوگ اپنے بزرگوں مرشدوں کو یا مرنے کے بعد ان کے مزاروں کو سجدے کرتے ہیں وہ بہر حال شریعت محمدی کے مجرم اور باغی ہیں اور ان کا یہ عمل صورۃً بلاشبہ شرک ہے۔

غیر اللہ کے لیے سجدہ کے بارہ میں یہاں جو چند سطریں لکھی گئیں، یہ مندرجہ بالا احادیث کی تشریح کا ضروری حق اور تقاضا تھا، اب اصل موضوع یعنی بیوی پر شوہر کے حقوق سے متعلق بقیہ احادیث پڑھیے۔

شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری:۔

میاں بیوی کے تعلق میں یہ ضروری تھا کہ کسی ایک کو سربراہی کا درجہ دیا جائے اور اسی حساب سے اس پر ذمہ داریاں بھی ڈالی جائیں، اور ظاہر ہے کہ اپنی فطری برتری کے لحاظ سے اس کے لیے شوہر ہی زیادہ موزوں ہو سکتا تھا، چنانچہ شریعت محمدی میں گھر کا سربراہ مرد ہی کو قرار دیا گیا ہے اور بڑی ذمہ داریاں اسی پر ڈالی گئی ہیں ـــــ فرمایا گیا ہے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" (مرد عورتوں کے سربراہ اور ذمہ دار ہیں) اور عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ گھر کے سربراہ و ذمہ دار اور اپنے سرتاج کی حیثیت سے شوہر کی بات مانیں اور بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کی جو مخصوص خانگی ذمہ داریاں ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ چنانچہ ان کے لیے فرمایا گیا ہے "فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ" (نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیچھے بھی ان کی آبرو اور ہر امانت کی) حفاظت کرتی ہیں) ـــــ اگر عورت شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کے بجائے نافرمانی و سرکشی کا رویہ اختیار کرے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں پہلے کشمکش اور پھر خانہ جنگی ہوگی جو دونوں کی دینی و دنیوی بربادی کا باعث ہوگی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے عورتوں کو شوہروں کی اطاعت و فرمانبرداری اور رضا جوئی کی تاکید بھی فرمائی ہے اور اس کا عظیم اجر و ثواب بیان فرما کے ترغیب بھی دی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْأَةُ اِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَاَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ ــــ رواه ابونعيم فی الحلية

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے اور ماہ رمضان کے روزے رکھے اور اپنی شرم و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کی فرمانبردار رہے تو پھر اسے حق ہے کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو۔ (حلیہ ابونعیم)

تشریح) اس حدیث میں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ اس میں بیوی کے لیے شوہر کی اطاعت کو نماز، روزہ اور زنا سے اپنی حفاظت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں اس کی بھی ایسی ہی اہمیت ہے جیسی کہ ان ارکان و فرائض کی۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ قَالَ الَّتِيْ تَسُرُّهُ اِذَا نَظَرَ وَتُطِيْعُهُ اِذَا اَمَرَ وَلَا تُخَالِفُهُ فِيْ نَفْسِهَا وَلَا مَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ

ــــــــــ رواه النسائی والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کون عورت زیادہ اچھی ہوتی ہے (یعنی اچھی عورت کے کیا اوصاف ہیں) آپ نے فرمایا وہ (عورت زیادہ اچھی ہے جس میں یہ اوصاف ہوں) اسے دیکھ کر شوہر کا جی خوش ہو، اور جب وہ کسی کام کے کرنے کو کہے تو وہ اس کی تعمیل کرے، اور خود اپنی ذات اور اپنے مال و جائداد کے بارہ میں شوہر کی منشا اور مرضی کے خلاف کوئی ایسی بات اور ایسا اقدام نہ کرے جو اس کی ناگواری کا باعث ہو۔ (سنن نسائی شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) حدیث کے پہلے جملہ "تَسُرُّہٗ اِذَا نَظَرَ" میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جن کا بیوی میں ہونا شوہر کی مسرت اور خوشدلی کا باعث ہوتا ہے، مثلاً اس کا سلیقہ مند اور صفائی پسند ہونا، خوش مزاج اور با اخلاق ہونا، نیک صورت، نیک اطوار اور اطاعت شعار ہونا وغیرہ وغیرہ۔

عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا اِمْرَأَۃٍ مَاتَتْ وَزَوْجُہَا عَنْہَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّۃَ۔

رواہ الترمذی

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت اس حالت میں دنیا سے جائے کہ اس کا شوہر اس سے راضی اور خوش ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس سلسلۂ معارف الحدیث میں یہ بات بار بار واضح کی جا چکی ہے کہ جن احادیث میں کسی خاص عمل پر جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے اور اس کا صلہ جنت ہے اور اس کا کرنے والا جنتی ہے، لیکن اگر بالفرض وہ عقیدہ یا عمل کی کسی ایسی گندگی میں لوث ہو جس کی لازمی سزا دوزخ کا عذاب ہو تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اس کا اثر بھی ظاہر ہو کے رہے گا۔ اسی روشنی میں حضرت ام سلمہ کی اس حدیث کا مطلب سمجھنا چاہیئے۔

دوسری بات یہاں یہ قابل لحاظ ہے کہ اگر کوئی شوہر ناواجب طور پر اپنی بیوی سے ناراض ہو، تو اللہ کے نزدیک بیوی بے قصور ہوگی اور ناراضی کی ذمہ داری خود شوہر پر ہوگی۔

[یہاں تک وہ حدیثیں مذکور ہوئیں جن میں بیویوں پر شوہروں کا حق بیان کیا گیا ہے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری اور رضاجوئی کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اب وہ حدیثیں پڑھیے جن میں شوہروں کو بیویوں کی رعایت اور دلجوئی و دلداری اور بہتر رویہ کی تاکید فرمائی گئی ہے]

(جاری)

ارشاداتِ حکیم الامّت حضرت مولانا تھانویؒ

علماء و طلباء، اربابِ اہتمام اور اصحابِ مدارس کے لیے لمحۂ فکریہ

تلخیص ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(۶)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ——— اب سُنا جاتا ہے کہ بعض مدارس کے طلباء کا تو بالکل ہی طرز بدل گیا ہے (اِلَّا مَاشَاءَ اللہ) دیکھنے سے یہی پتہ نہیں چلتا کہ یہ ..... کالج ہے یا دینی مدرسہ، جب اپنے بزرگوں کے طرز کو چھوڑ دیا تو پھر نور کہاں؟ برکت کہاں؟ .... طلباء کے لباس میں، طرزِ معاشرت میں تبدیلی پیدا ہوگئی، منتظمین، اساتذہ سب کے سب طلباء سے مغلوب ہیں. محض اس وجہ سے کہ اگر یہ نہ رہے تو ہماری مدرسی کیسی جاتی رہے گی ——— تو کیا ان صاحبوں کی نظر میں خود مدرسہ مقصود بالذات ہے؟

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ مدرسہ مقصود بالذات نہیں. مقصود خدا کی رضا ہے خواہ مدرسہ رہے یا نہ رہے ——— یہاں بفضلہ تعالیٰ قواعد اور اُصول کی رعایت کی جاتی ہے مگر اُن (قواعد و اُصول) پر لوگ معترض ہیں. اگر یہاں یہ اُصول نہ ہوتے تو کیا دِق کرنے کے لیے بدفہم لوگ یہاں بھی کچھ کم آتے ہیں. مگر بحمد اللہ اپنے بزرگوں کی دُعا کی برکت سے اور اصول صحیحہ کی وجہ سے یہاں کسی کی نہیں چلتی اور الحمد للہ کہ بجز رضاءِ حق کے یہاں کوئی چیز مقصود ہے ——— لوگوں نے اُصول صحیحہ کو چھوڑ دیا ہے جس سے ایک عالم کا عالم پریشانی میں مبتلا ہے. حتیٰ کہ حکومت اپنی رعایا سے، باپ اپنے بیٹے سے، اُستاد اپنے شاگرد سے، پیر اپنے مرید سے، خاوند اپنی بیوی سے، آقا اپنے نوکر سے ———

اور اگر اصول صحیحہ کا اتباع کیا جائے اور ہر چیز کو اپنی حد پر رکھا جائے تو کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں ہو سکتی۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ آدمی عربی کی درسی کتابیں سمجھ کر پڑھ لے (یہ کافی ہے) اس کے بعد (دینی معاملات و مسائل میں شبہات کا جواب دینے کے لیے) کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

مگر آج کل عربی طلبا بھی کتابیں سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ طوطے کی طرح رٹتے ہیں۔ اس وجہ سے اُن میں سمجھ پیدا نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے جو درسی کتابیں انتخاب کی ہیں اُن میں سب کچھ ہے مگر سمجھ کر پڑھ لینا شرط ہے۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اکثر مشکل باتیں پیش آئیں مگر حق تعالیٰ نے ہمیشہ مدد فرمائی۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ نیکوں کو تو حکم ہے کہ بدوں کی صحبت سے بچو اور بدوں کو حکم ہے کہ نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ تو اس صورت میں نیک اپنی صحبت میں بدوں کو آنے کیوں دیں گے؟ جبکہ اُن کو حکم ہے کہ بدوں کی صحبت سے بچو۔ پھر بدوں کو نیکوں کی صحبت کیونکر میسر ہوگی۔

فرمایا کہ جواب سننے کے بعد تو کچھ بھی اشکال نہیں رہتا، مگر اوّل وہلے میں تو بڑا ہی سخت اشکال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسی وقت مدد فرمائی اور قلب میں جواب القاء فرمایا یہ سب اُن کی ہی رحمت ہے۔ میں نے کہا کہ عادت اللہیہ یہ ہے کہ تابع کا اثر متبوع پر نہیں ہوتا۔ متبوع کا اثر تابع پر ہوتا ہے۔ اس لیے نیکوں کو جو حکم ہے کہ بدوں کی صحبت سے بچو۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے تابع بن کر اُن کی صحبت مت اختیار کرو۔ لیکن اگر وہ تمہارے پاس آئیں گے تو تابع ہو کر آئیں گے اُن کو اپنے پاس آنے دو، اسی طرح بدوں کو جو حکم ہے کہ نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ مطلب یہ ہے کہ تم اُن کے تابع بن کر جاؤ۔ یہ جواب سُن کر وہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ اگر حق تعالیٰ عقل سلیم اور فہم کامل کسی کو عطا فرمائیں۔ بڑی ہی اُن کی رحمت اور نعمت ہے اور بڑا ہی فضل اُس بندے پر ہے جس کو ان نعمتوں سے نوازا جائے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت بیان فرمائی کہ ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں ایک مرتبہ قصبہ رام پور (منہیاران) سے دیوبند پہونچا میرا ایک مقدمہ تھا میرے ساتھ ایک ہندو بھی تھا اُس کا مقدمے سے تعلق تھا اُس ہندو نے دیوبند پہونچکر مجھ سے پوچھا کہ کہاں ٹھہروگے؟ میں نے کہا کہ میں حضرت مولانا کے یہاں ٹھہروں گا، اُس نے

لگا کہ میرا ٹھکانا تو بازار میں کہیں ہو گا، باقی قیام کے لیے ایک تھوڑی سی جگہ اور ایک چھوٹی سی چارپائی مولانا کے یہاں سے مجھ کو بھی مل جائے تو بڑی آسانی ہو اور عدالت میں [illegible] ہو کر چلنے میں کوئی تکلیف نہ ہو ـــــ مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت مولانا ہی کی بیٹھک میں انتظام کر دیا، ایک روز میں اور وہ ہندو اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، حضرت مولانا زنانہ مکان سے دبے دبے پیروں بیٹھک میں تشریف لائے اور اُس ہندو کی چارپائی پر بیٹھ کر اُس کے پیر دبانا شروع کیے وہ اس قدر بے ہوش سو رہا تھا کہ خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ میں چونکہ جاگ رہا تھا اس لیے برداشت نہ کر سکا، فوراً اٹھ کر پہونچا اور عرض کیا کہ میں دباؤں گا۔ فرمایا کہ میرا مہمان ہے، مجھ پر حق ہے میں نے پھر اصرار کیا (تو) فرمایا کہ جاؤ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ ـــ آرام کرو ـــ زیادہ بات کرنے سے بیچارے کی آنکھ کھل جائے گی اور تکلیف ہو گی ـــــ کیا ٹھکانا ہے اس بے نفسی کا ـــــــ......

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے حضرات کا ہمیشہ یہ مسلک اور مشرب رہا ہے کہ غربا اور دینداروں سے محبت رکھتے تھے اور اہلِ دنیا بالخصوص اہلِ مال سے جو اُمراء کہلاتے ہیں۔ خصوصیت کا تعلق نہ رکھتے تھے۔ اور اُمرا سے مُراد وہ لوگ ہیں جو متموّل ہونے کے ساتھ دنیادار بھی ہیں لیکن اگر اُن میں سے بھی کوئی دیندار ہو تو اُس سے بھی خصوصیت کا تعلق رکھتے تھے ورنہ نہیں ـــ یہ بات ہماری جماعت ہی کے ساتھ خاص تھی ورنہ دوسرے اکثر علماء کو دیکھا کہ وہ اُمرا کو پٹتے ہیں، اُن کی چاپلوسیاں کرتے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے کا سبب محض اپنی دنیاوی اغراض ہیں ـــ ہمارے حضرات میں ایک استغناء کی شان تھی۔ توکل اعلیٰ درجے کا تھا۔ کبھی دنیاوی اغراض کی بنا پر کسی سے تعلق نہ پیدا فرماتے تھے ـــــ

ایک مولوی صاحب سے فرمایا کہ یہ زمانہ نہایت ہی پُر فتن ہے۔ دین میں تحریف کرنے والے اس زمانے میں بکثرت پیدا ہو گئے ہیں، ملحد اور دہری بھرے پڑے ہیں اور کوئی کام تو رہا نہیں شب و روز بیٹھے ہوئے احکامِ اسلام میں کتر بیونت کرتے رہتے ہیں ـــــ احکامِ طب میں یا احکامِ تعزیرات میں انھوں نے کبھی کتر بیونت نہیں کی ـــــ اور اس دین کے تو حق تعالیٰ محافظ ہیں ورنہ یہ تو ہر وقت اس کی بیخ و بنیاد ہی اکھیڑنے کی فکر میں لگے ہیں۔ خیر یہ بھی زور لگا لیں۔ اِن سے پہلوں نے بھی

بہت زور لگا لیے ہیں مگر اسلام اور احکامِ اسلام کی بقار کی تو یہی شان رہی ہے کہ ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشاں است[عہ]
خم و خمخانہ با مہر و نشاں است

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اس زمانے میں اپنے حضرات کے علوم اور شانِ تحقیق کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بڑے درجے کے لوگ پیدا کیے ہیں۔ ان حضرات کی واقعی یہ حالت تھی کہ جامع تھے ظاہر اور باطن کے کسی نے خوب ہی کہا ہے ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق[عہ]
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

بالخصوص تصوف میں تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شانِ تحقیق عجیب ہی تھی اپنے زمانے کے (تصوف کے) امام، مجتہد، مجدد اور محقق تھے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اب اس زمانے میں (امام) رازیؒ اور (امام) غزالیؒ نہیں پیدا ہوتے۔ میں نے کہا کہ ہمارے اکابر کے ملفوظات اور تحقیقات کو دیکھ لو معلوم ہو جائے گا کہ اس زمانے میں بھی (امام) رازیؒ اور (امام) غزالیؒ موجود ہیں ۔۔۔ صاحب! نبوت ہی تو ختم ہوئی ہے۔ باقی اور کمالات کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن (بزرگوں) کا زمانہ اِس قدر فتن اور شر کا نہ تھا جیسا کہ اب ہے ۔۔۔ یہ سب ان حضرات (ہمارے اکابر) کی تصنیفات اور تحقیقات سے معلوم ہو سکتا ہے مگر اُن کو دیکھتا کون ہے ۔ کیونکہ مذاق ہی بگڑ گیا ہے ۔۔۔۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مولانا محمد صدیق صاحب انبیٹھوی نے ایک عجیب اور کام کی بات فرمائی۔ وہ یہ کہ ہماری جماعت میں جو باوجود زیادہ مجاہدہ نہ ہونے کے اللہ کا فضل ہو جاتا ہے اس کا سبب، اتباعِ سنت کا اہتمام ہے ۔ اس کی برکت سے اُس طرف سے جذب کیا جاتا ہے

عہ وہ ابرِ رحمت ابھی تک دُر فشانی کر رہا ہے اور خم و خمخانۂ شریعت و طریقت اُسی شان و شوکت کے ساتھ ہے۔

عہ ایک ہاتھ میں جامِ شریعت ہے اور ایک ہاتھ میں عشق کا اہرن ہے۔ ہر بوالہوس جام و سنداں کو اس طرح جمع کرنا نہیں جانتا۔

—— کیسی عجیب اور کام کی بات فرمائی۔ سبحان اللہ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ خلوت یہی ہے کہ قلب کا تعلق سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ہونا چاہیے بس یہ ہے سکون کی چیز۔ مگر آج کل لوگوں نے قلب کو اسٹیشن مراد آباد کا اسلامی مسافر خانہ بنا رکھا ہے کہ سب وہیں آکر ٹھہرتے ہیں۔ پھر ایوں والے بھی بریلی والے بھی سہار نپور والے بھی۔ میاں قلب تو ایک ہی کے رہنے اور سمانے کی جگہ ہے اور وہ خداوند جل جلالہ کی ذات پاک ہے اور جن کے قلب میں وہ سما گئے ہیں اُن کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اُن کو مرنا گوارا گوارا ہو جاتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اگر میں عنداللہ مومن ہوں اور ساری دنیا مجھ کو مردود سمجھے میرا کچھ ضرر نہیں اور اگر عنداللہ مردود ہوں اور ساری دنیا قطب، غوث، ابدال سمجھے تو کچھ نفع نہیں —— فلاں خاں صاحب نے ساری عمر اسی میں صرف کی کہ مجھ کو برا بھلا کہا مگر الحمد للہ میں نے ایک سطر بھی جواب میں نہیں لکھی تو میرا کیا بگڑ گیا ——

قرآن شریف کا بھی یہی طرز ہے کہ احکام بیان کر دیے۔ مخالف پر زیادہ رد و قدح نہیں کیا ——

ایک مولوی صاحب نے عجیب بات کہی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو نفع مناظرے سے کبھی نہیں ہوا ہے —— جب ہوا تبلیغ سے ہوا اور وہ بھی اُس تبلیغ سے جو جَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ[1] کے ماتحت ہوئی۔ حضرت! لوگوں کو خبر نہیں مجھ کو خبر ہے کہ اُن خاں صاحب کے بعض مرید خود اُن کی تصنیفات کو دیکھ کر ان سے بد اعتقاد ہوئے۔ میری تصنیفات تو دیکھ کر اُن سے بد اعتقاد نہیں ہوئے —— میری تصنیفات کو اُٹھا کر دیکھ لیا جائے۔ کہیں بھی اُن میں اس قسم کے مضامین نہ ملیں گے جن سے بد اعتقاد ہونے کی ترغیب دی گئی ہو، میں نے تو سب کو آزاد کر دیا ہے۔ جس طرف جس کا جی چاہے جائے ہر شخص اپنے دین کا ذمہ دار ہے البتہ خود اُن کی ہی تصنیفات کو دیکھ کر بعضے اُن سے بد اعتقاد ہوئے ..... ابھی کا واقعہ ہے کہ بریلی میں ایک حکیم صاحب ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی ہیں۔ پچیس ۲۵ سال سے اُن (خاں صاحب) کے مرید تھے۔ اِن ہی چیزوں کو دیکھ کر اب انھوں نے عقائد باطلہ سے توبہ کر لی ہے اور اس طرف رجوع کیا ہے۔ مجھ کو لکھا ہے کہ میں آپ سے مرید ہونا چاہتا

---

[1] اُن سے اچھے انداز اور اچھے طریقے سے بحث و گفتگو کرو۔

ہوں۔ میں نے لکھ دیا کہ اس کام میں تعجیل مناسب نہیں۔ اس کے بعد پھر خط آیا کہ تعجیل نہ کرنے کی حد قرار دی جائے۔ میں نے لکھ دیا کہ جب تک میرے چالیس وعظ اور رسائل نہ دیکھ لو اور بیس مرتبہ خط و کتابت اور دس مرتبہ ملاقات نہ کر لو، اس وقت تک یہ حد پوری نہ ہوگی۔ اس پر انھوں نے لکھا کہ میں نے ان حافظ صاحب کے صاحبزادے سے بذریعہ استفسار چند سوالات بھی کیے ہیں، ان کا انھوں نے جواب بھی دیا ہے، میں پھر کچھ سوالات کرتا ہوں وہ بھی آپ کے پاس بھیجوں گا ۔۔۔ میں نے لکھا کہ مجھ کو ان چیزوں سے دل چسپی نہیں، مجھ سے جس مقصد کے لیے رجوع کیا ہے وہ اس طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سوال و جواب ضروری ہیں تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے مجھ سے رجوع کیا ہے اس کو مؤخر کر دیا جائے اور جس میں اس وقت آپ کو اشتغال ہے اس کو مقدم رکھا جائے، جب اس سے فارغ ہو لیں اس وقت مجھ سے خط و کتابت کی جائے، آپ سال بھر میں فارغ ہوں یا دو سال میں ۔۔۔ اس پر لکھا ہوا آیا کہ آپ نے ایسے عنوان سے لکھا ہے کہ مجھ کو اس موجودہ مشغلے سے نفرت ہو گئی اور اب میں اس سلسلے میں کچھ نہ بولوں گا۔ مجھ کو آنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے ۔۔۔ آدمی سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا کہ ابھی جلدی کیا ہے، کچھ خط و کتابت ہونے دیجیے اور اگر آپ آنا ہی چاہتے ہیں تو اس کے متعلق یہ ہے کہ یہاں پر رہتے ہوئے مجلس میں چپ بیٹھا رہنا ہوگا، مکاتبت اور مخاطبت کی اجازت نہ ہوگی۔ اس پر لکھا کہ میں کچھ نہ بولوں گا۔ مجلس میں خاموش بیٹھا رہوں گا ۔۔۔ پھر فرمایا کہ اس مضمون سے اُن کو اس قدر نفع ہوا کہ تمام عمر کے مجاہدات اور ریاضات سے بھی وہ نفع نہ ہوتا۔ اگر میرا مذاق بھی وہی مروج رسم و رواج کے مطابق ہوتا تو اُن کی اس تحریر سے میں خوش ہوتا کہ میرے ساری عمر کے دشمن کے مقابلہ میں میری نصرت کر رہے ہیں بلکہ اور ترغیب دیتا، مضمون منگا منگا کر دیکھتا، اس میں مشورے دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اُن کا فضل ہے کہ مجھ کو ہمیشہ ان چیزوں سے محفوظ رکھا اور ان خرافات سے میری حفاظت فرمائی ۔۔۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ آیا یہ شق زیادہ مفید ہے کہ ایک شخص کو فضول، لایعنی بات سے ہٹا کر کام میں لگا دیا یا وہ مفید تھا جو انھوں نے تجویز کیا تھا، نیز اگر درخواست بیعت کی کرتے ہی اُن کو مرید کر لیتا تو کیا اس قدر نفع ہو سکتا تھا جس قدر اب ہوا؟ (نہیں) بلکہ اُلٹا ضرر ہو جاتا، یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ منتظر بیٹھے تھے کہ اُدھر سے کوئی ٹوٹ کر آئے تو ہم

اس کو دیکھیں۔ اس صورت سے تو ایک نفع نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس صورت کا حاصل تو یہ ہے کہ طالب مطلوب ہو جاتا ہے اور مطلوب طالب۔ پھر نفع کہاں؟ نفع جب ہی ہو سکتا ہے جب ہر چیز حد پر رہے۔ پیر حق میں حق تعالیٰ نے قوت دی ہے اور تالیف قلوب کسی عارض کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اگر کبھی کسی عارض سے ایسا ہوا ہے تو اس کو باقی اور مستمر تو نہیں رکھا گیا۔ حق کی قوت کو ارشاد فرمایا گیا۔ قُلْ[عہ] جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔
تعجب ہے کہ لوگ سب چیزوں میں خاصیت کے قائل ہیں مگر حق کی خاصیت کے قائل نہیں۔ عجیب عقلیں ہیں۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل کے مشائخ تو کیمیاگر سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیمیاگر ایک نہایت پست کمال کی وجہ سے کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ بڑے بڑے دنیادار اور مالدار اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، کیسا استغناء ہوتا ہے اور یہ مشائخ دعویٰ کرتے ہیں شیخ ہونے کا۔ حق تعالیٰ سے تعلق کا، محبت کا اور پھر مخلوق کی طرف نظر اور ان کی چاپلوسی کرتے ہیں۔ مجھ کو تو ایسی باتوں سے طبعاً غیرت آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دین کا نفع پہنچانے کے لیے اخلاق کا برتاؤ کیا جاتا ہے اور مخلوق سے تعلق رکھا جاتا ہے مگر یہ سب محض زبانی جمع خرچ ہے دل میں کچھ اور ہے۔ تعلق کو تو میں منع نہیں کرتا تملق کو منع کرتا ہوں۔ اب تو تملق ہی دیکھا جاتا ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ عنوان کا بھی اثر بڑا ہوتا ہے۔ بات ایک ہی ہوتی ہے مگر تعبیر کا طریق جدا ہوتا ہے ..... ایک شاہ صاحب اہل سماع سے تھے۔ اتفاق سے الہ آباد میں ملے، کہنے لگے کہ آپ تو چشتی ہیں پھر آپ سماع کے کیوں مخالف ہیں؟ میں نے کہا کہ اس کا جواب تو بعد میں دوں گا پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔ آپ یہ بتلائیں کہ طریق کی روح کیا ہے؟ کہا کہ مجاہدہ۔ میں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے آپ یہ بتلائیے کہ مجاہدے کی حقیقت کیا ہے؟ کہا کہ نفس کے خلاف کرنا۔ میں نے دریافت کیا کہ اب سچ بتلائیں کہ سماع سننے کو آپ کا جی چاہتا ہے یا نہیں؟ کہا کہ چاہتا ہے، میں نے کہا کہ ہمارا بھی چاہتا ہے مگر آپ جی چاہا کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے تو صاحب

عہ کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا اور باطل تو چلے جانے اور ختم ہو جانے ہی کے لیے ہے۔

مجاہدہ تم ہوئے کہ ہم ؟ بصورتی تم ہوئے یا ہم ؟ درویش تم ہوئے یا ہم ؟ سمجھ گئے اور کہا کہ ایک عرصے سے اس میں ابتلا تھا آج حقیقت معلوم ہوئی ــــ یہ عنوان ہی کی برکت ہے اگر مناظرانہ گفتگو ہوتی تو سوائے قیل و قال کے کوئی بھی نتیجہ نہ نکلتا۔ اس لیے کہ جواب تو ہر بات کا ہو خواہ صحیح ہو غلط۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مشکل سوالوں کا جواب بھی دل میں ڈال دیتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ اپنی جماعت کے ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مکتوب میں بقسم فرمایا ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ بعض مخالفین اس پر کہتے ہیں کہ ہم تو مولانا کے قول کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے ہمارا بھی یہی اعتقاد ہے کہ وہ کچھ نہ تھے۔ یہ نقل کر کے (ان مولوی صاحب نے) کہا کہ شبہ کی تو بات ہے۔ مولانا کو سچا سمجھ کر پھر اُن کے معتقد ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ آپ جیسا عالم اور ایسی بات میں شبہ ــــ اب اس کا جواب سنیے۔ کمالات کی دو قسمیں ہیں ایک کمالات واقعہ اور ایک کمالاتِ متوقعہ تو حضرت مولانا کا یہ فرمانا کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ یہ کمالات متوقعہ کے اعتبار سے ہے اور ہم جو مولانا کے معتقد ہیں وہ کمالاتِ واقعہ کے اعتبار سے ــــ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔ غرض اللہ کا شکر ہے کہ ہر ضروری چیز کا حل قلب میں ڈال دیا ہے کہیں گاڑی نہیں اٹکتی اور یہ سب اپنے بزرگوں کی دعا کی برکت ہے۔ باقی مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں ــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اہل تحقیق[عہ] کا قول ہے کہ سلطنت کا زوال ظلم سے ہوتا ہے کفر سے نہیں ہوتا ــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ سلف، علوم میں محض قیل و قال پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ علوم سے ضروری نفع حاصل کرتے تھے اور خلف، اکثر زوائد میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ اخیر شب میں نزول رب الی السماء کی جو حدیث ہے اس سے سلف نے تو یہ کام لیا کہ اس سے اُن کو رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے کی اور ابتہال الی اللہ کی رغبت ہو گئی اور انھوں نے اس حدیث کے متعلق کبھی یہ تفتیش نہیں کی جب حق تعالیٰ جسم سے منزہ ہیں تو نزول الی السماء کے کیا

عہ ملفوظات شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ میں بھی ایک ملفوظ اسی مضمون کا ہے۔

معنی؟ اور واقعی کام کرنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ قیل و قال کو کہاں پسند کرتے ہیں اور نہ وہ دلائل فلسفیہ پر مدار رکھتے ہیں۔ جیسا آج کل دلائل فلسفیہ پر مدار سمجھتے ہیں جو بالکل غلط طریق ہے آخر کہاں تک یہ چل سکتے ہیں کہیں تو جا کر انجن فیل ہوگا۔ اس راہ میں یہ سب چیزیں راہ زن ہیں۔ ہاں اگر یہ صورت اس میں کلام و بحث ہو اور تجاوز نہ ہو تو ایک درجے میں کارآمد بھی ہے ـــــ غرض ان چیزوں پر مدار نہیں۔ مدار وہی ہے جس کو صحابہؓ نے کر کے دکھلا دیا یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ـــــ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا اس پر عمل شروع کر دیا نہ دلائل فلسفیہ کی تلاش نہ حِکَم اور اسرار کی جستجو نہ کسی قیل و قال سے مطلب۔ سو اس راہ میں اس طرح کام بن سکتا ہے کہ سب (موشگافیوں) کو خیرباد کہہ کر کام میں لگ جائے..... اور یہ دولت پیدا ہوتی ہے اہلِ محبت کی صحبت میں رہنے سے، اس کی خدمت میں اپنی ہر حالت بیان کرنے سے اور جو وہ تعلیم کرے اس پر عمل کرنے سے.....

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام سے حقیقی غلطی نہیں ہوتی اُن کی شان ہی یہ ہے کہ غلطی سے معصوم ہوں اور اگر بظاہر کوئی غلطی معلوم بھی ہو تو اس غلطی کو حق تعالیٰ ہی غلطی فرما سکتے ہیں ہم کو حق نہیں کہ ہم اس کو غلطی کہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ حقیقت میں وہ غلطی ہوتی ہی نہیں بلکہ وہ طاعت ہوتی ہے مگر وہاں کوئی طاعت اُس سے بڑھ کر ہوتی ہے جو فوت ہو گئی جس کے مقابلے میں اُس کو غلطی فرمایا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بڑی طاعت کے مقابلے میں چھوٹی طاعت کو غلطی کہا گیا۔ خلاصۂ کلام کا یہ ہے کہ اس سے افضل کے ترک کو غلطی فرمایا۔ مثلاً آدم علیہ السلام نے گندم کھایا اس طمع میں کہ فرشتہ ہو جاؤں تو کیا یہ خیال آدم علیہ السلام کا کہ فرشتہ ہونا چاہا۔ غیر طاعت تھا؟ ظاہر ہے کہ طاعت ہی تھا مگر اس سے بڑھ کر طاعت یہ تھی کہ بشر رہ کر ترقی فرماتے یس اس کا ترک، افضل کا ترک تھا اور وہ بھی اجتہاد سے جس کی وجہ سے اس میں اور خِفّت آ گئی۔ اسی سلسلۂ کلام میں حضرت حاجی صاحبؒ کی تحقیق بیان فرمائی کہ معرفتِ الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک معرفت ہوتی ہے علمی اور ایک ہوتی ہے حالی، حضرت آدم علیہم السلام کو معرفتِ علمی تو حاصل تھی لیکن معرفت حالیہ اس واقع پر موقوف تھی چنانچہ اگر اُن سے مواخذہ نہ ہوتا تو منتقم کی معرفتِ حالیہ نہ ہوتی۔ اسی

طرح توبہ کے بعد مُعافی سے تو آپ کی معرفت عالیہ حاصل ہوئی۔۔۔ تو اس واقعے سے حضرت آدم علیہ السلام کے معارف میں ترقی ہوئی گو صورۃً تنزل ہوا ـــــ

ایک ضعیف العمر حضرتؒ کے یہاں مہمان ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ بڑے میاں ہمارے پیر بھائی ہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے پیر بھائی تو کم لوگ ہیں اور عمر بھی زیادہ ہیں اس لیے پیر بھائیوں سے مل کر بڑا ہی جی خوش ہوتا ہے اور ان سے مل کر طبیعت میں ایک خاص تازگی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ میں جب گنگوہ جاتا تھا تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تم آجاتے ہو تو دل زندہ ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے حضرتؒ میرے سامنے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ میں نے حضرت حاجی صاحبؒ کو دیکھا ہے اس لیے اُن کو اس تذکرے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ نفس سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جب موقع پائے گا اور اسباب دیکھے گا ضرور اپنا کام کیے بغیر نہ رہے گا۔ جو لوگ اپنی اصلاح کامل طریقے سے کر چکے ہیں بے فکری تو اُن کے لیے بھی خطرے سے خالی نہیں مگر پھر ایک وجہ سے اُن کے لیے سہولت ہے کہ وہ عین وقت پر بھی علم اور تجربے کی وجہ سے اُس کو قابو میں کر سکتے ہیں ورنہ ہمارے نفس کی حالت منہ زور گھوڑے کی سی ہے جب قابو سے نکل جاتا ہے آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتا جو کچھ ضرر اس سے صادر ہو وہ کم ہے اس لیے ہر وقت ہوشیار رہنے اور انتظام رکھنے کی ضرورت ہے۔ جنھوں نے اس کی حقیقت پہچان لی ہے۔ وہ ہر وقت اس کی فکر میں رہتے ہیں اس سے بے فکری کسی وقت بھی اور کسی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کبھی بے فکری ہوگی دھوکہ کھائے گا۔ سانپ سے کیا بے فکری وہ تو موقع پاتے ہی اپنا کام کرے گا۔ بس یہی حالت اس نفس کی ہے یہ تو اسی وقت تک قابو میں ہے جب تک اس کی فکر کے ساتھ نگرانی ہو اور جس طرح یہ تاک میں ہے اس کی بھی کوئی تاک میں ہو ورنہ یہ تو دشمن ہے شیطان بھی اس قدر خطرناک نہیں جتنا یہ ہے ۔۔۔۔۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میرے اظہارِ حق کا معیار یہ ہے کہ اُس کا منشا نہ کسی کی عداوت ہو نہ کسی کی رعایت، محض تو حق ہو۔ گو اس میں غلطی بھی ہو جائے کیونکہ غلطی سے کون خالی ہے؟ بشریت میں غلطی ہوتی ہے ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایسے کام جس کی دوسروں کو فرمائش کرنا گوارا نہ ہو یا مرضی کے موافق کام ہونے کی اُمید نہ ہو اُن کو تو خیر کر لیتا ہوں ورنہ اب کام ہوتا نہیں قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ تصنیفات کا کام بھی اب قریب قریب بند ہونے کے ہے۔ اللہ کا شکر ہے اور احسان ہے کہ بہت کچھ کام ہو گیا صدیوں ضرورت نہیں اور جب ضرورت ہوگی حق تعالیٰ اپنے کسی اور بندے کو پیدا فرما دیں گے۔ کام کرنا کون سے فخر کی بات ہے یہ تو اُن کا فضل اور احسان ہے کہ کسی سے اپنا کام لے لیں (ہاں مسرت ضرور ہوتی ہے۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ تقویٰ اور طہارت کی تو ہر طبقے میں کمی ہو گئی ہے خواہ علما رہوں یا درویش خواہ زاہد ہوں یا عابد، یہ چیز قریب قریب بہت ہی کم کسی میں پائی جاتی ہے احتیاط رہی ہی نہیں...... یہی وجہ ہے کہ نہ دین کے کاموں میں برکت نہ دنیا کے ــــ اس کے نہ ہونے سے نحوست تو بڑھ گئی اور خیر و برکت جاتی رہی۔ سب گاڑیاں تقوے اور طہارت کی اسٹیم سے چلتی ہیں اور یوں دھکیلنے سے کیا ہوتا ہے ــــــــ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ مسلمان اگر تباہ اور برباد نہ ہوں تو اور کیا ہوں اور اس تباہی اور بربادی کی وجہ زیادہ تر بدانتظامی ہے جو دلیل ہے بے فکری کی ..... اس بے فکری کی بدولت دنیا تو دنیا دین تک تباہ و برباد ہو جاتا ہے میں کیا عرض کروں میری جو آنے والوں کے ساتھ لڑائی ہوتی ہے اُس کا اصل سبب یہی ہے کہ لوگوں میں فکر نہیں جو جی میں آیا کر لیا جو جی میں آیا کہہ ڈالا نہ کوئی قاعدہ نہ اُصول نہ یہ خبر کہ ہماری اس حرکت سے لوگوں کو اذیت ہوگی یا نہیں ؟ محض مست ہیں اور میں فکر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ روک ٹوک، مواخذہ، محاسبہ، دار و گیر کرتا ہوں.... بس یہی لڑائی ہے اس پر خفا ہوتے ہیں یہاں سے جا کر بدنام کرتے پھرتے ہیں کہ سخت گیر ہے۔ بد خُلق ہے۔ مزاج میں تشدّد ہے۔ حالانکہ میں سخت نہیں البتہ مضبوط ہوں۔ ان معترضوں کو ابھی تک سختی اور مضبوطی میں فرق ہی معلوم نہیں .....

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جو چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں تک میں پائی جاتی ہیں وہ اس وقت کے بہت سے علماء و مشائخ میں نہیں۔ حضرت اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا کا بچہ بیمار ہوا اور مر گیا شب کا وقت تھا۔ انھوں نے بیٹے کے انتقال کی خبر اپنے خاوند یعنی

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہ نہیں کی تاکہ صبح تک پریشان نہ رہیں۔ ادھر حضرت ابوطلحہؓ نے بیٹے کو پوچھا کہ اب کیا حالت ہے؟ جواب میں کہا کہ سکون ہے۔ واقعی موت سے بڑھ کر سکون کی اور کیا چیز ہوگی۔ معمول کے مطابق خاوند کی خدمت کی۔ چہرے سے بھی کوئی ملال یا رنج کا اظہار ہونے نہ دیا۔ کھانا کھلایا۔ بستر لگایا..... جب تمام شب گزر چکی اور صبح ہوئی تو پہلے سے مسئلہ پوچھا کہ کسی نے ایک شخص کے پاس کوئی امانت رکھی اب وہ اس کو مانگتا ہے اس کو خوشی اس کے سپرد کر دینا چاہیے یا رنج کرنا چاہیے صحابیؓ نے کہا کہ خوشی سپرد کر دینا چاہیے رنج کی کیا بات ہے۔ تب کہتی ہیں کہ لڑکے کا انتقال ہو چکا ہے اس کو دفن کر آؤ۔ صحابیؓ نے فرمایا کہ بھلی مانس رات بھر تم نے اس کا ذکر نہیں کیا وہ جواب دیتی ہیں کہ کیا نتیجہ ہوتا میں تو پریشان تھی ہی تم بھی پریشان ہوتے۔ اللہ اللہ۔ یہ عورتیں تھیں ذکر کر دینا تو آسان ہے مگر جب اپنے پر گزرے تب پتہ چلے۔ اللہ اکبر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی کیا شان تھی عرب کی پہلے کیا حالت تھی، آپؐ کی برکت سے کیا سے کیا ہو گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نظر سے (عرب والے) کیسا تو کیا (دین کے) کیسا سانچہ بن گئے۔ سبحان اللہ۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ میں معترض کا کبھی جواب نہیں دیتا۔ کہہ دیتا ہوں کہ جو کام ہم سے ہو سکا ہم نے کر دیا اب جو تم سے ہو سکے تم کر دو۔ یہ کیا ضروری ہے کہ سارا کام ایک ہی کے ذمہ رکھا جائے۔ بعض لوگ تصانیف کے متعلق مشورہ دیا کرتے ہیں کہ اس میں فلاں کمی رہ گئی میں کہہ دیتا ہوں تم کمی کو پورا کر دو۔ اس سے زیادہ قیل و قال کرنے میں، مثلاً یہ دعویٰ کروں کہ نہیں یہ کام پورا ہے اس میں کمی نہیں۔ فضول وقت صرف ہوتا ہے اور آدمی ضروری کاموں سے رہ جاتا ہے۔ اپنے بزرگوں کا یہی مسلک اور مشرب تھا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ کبھی قیل و قال میں نہ پڑنا۔ اگر کوئی معترض ہو تو سب رطب و یابس اس کے حوالے کر کے الگ ہو جانا اور کسی ضروری کام میں لگ جانا۔ یہ طریق کو مجھ کو نہایت ہی پسند ہے اور اس سے بے حد نفع ہوا ورنہ بہت سے ضروری کام رہ جاتے۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے ہمیشہ فضول اور عبث سے محفوظ رکھا۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ دعا، التجا اور توبہ تو بالکل متروک ہی (سی) ہو گئیں۔ دنیا دار تو کیا (بہت سے) دیندار وں میں بھی یہ چیزیں نہیں رہیں۔ کچھ لوگوں میں خشکی اور افسردگی

سی آگئی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کام میں برکت وحلاوت نہیں معلوم ہوتی ـــــ ہر چیز میں روکھا پن سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دو چیزیں دعا اور توبہ حقیقت میں مصائب وشرور کے مقابلے میں ڈھال اور ہتھیار ہیں مگر ان ہی سے لوگوں کو غفلت ہے۔ البتہ جب کوئی مصیبت سر ہی پر آ پڑتی ہے اس وقت ہوش آتا ہے پھر تو وہی حالت ہوتی ہے جیسے ایک شخص گھوڑا خریدنے جا رہا تھا۔ ایک ملنے والے راستے میں مل گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا گھوڑا خریدوں گا۔ انھوں نے کہا کہ میاں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تو کہہ لیا ہوتا۔ کہنے لگے کہ اس میں اللہ کے چاہنے کی کون سی بات ہو روپیہ میرے پاس موجود ہے۔ گھوڑے بازار میں ـــــ میں جاؤں گا خرید لاؤں گا۔ یہ بیچارے خاموش ہو گئے۔ بازار پہونچے گھوڑا پسند کر کے سودا کیا۔ طے ہو جانے کے بعد روپیہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا وہاں پہلے ہی گرہ کٹ نے جیب اڑا لی تھی۔ خالی ہاتھ ہلاتے آ رہے تھے، وہی شخص پھر ملے پوچھا کہ بھائی گھوڑا خرید لائے؟ تو کہتے ہیں کیا بتلاؤں ان شاء اللہ میں بازار پہونچا ان شاء اللہ ـــــ گھوڑا پسند کیا ان شاء اللہ سودا طے ہوا ان شاء اللہ۔ روپیہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا ان شاء اللہ کسی گرہ کٹ نے جیب کاٹ کر روپیہ اڑا لیا ان شاء اللہ۔ گھوڑا نہ خرید سکا ان شاء اللہ ـــــ اب موقع بے موقع ان شاء اللہ ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ مستقبل پر ہوتا ہے۔ ماضی پر تھوڑا ہی ہوتا ہے مگر وہ ماضی پر بھی ان شاء اللہ بول رہے ہیں ـــــ بس اسی طرح جب مصیبت سر پر آ پڑتی ہے اس وقت توبہ بھی ہے، دعا بھی ہے۔ الحاح وزاری بھی ہے۔ الا ماشاء اللہ کبھی ہو مگر حالتِ فراغ اور حالتِ صحت میں ان چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ـــــ

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ طاعت بڑی چیز ہے اس کے آثار چہرے تک پر ظاہر ہونے لگتے ہیں اور یہ حالت ہوتی ہے:

نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی نورِ حق ظاہر بود اندر ولی

اس کا خوب ترجمہ کیا ہے (مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی نے)

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ[ع] ـــــ کا ظہور ہونے لگتا ہے ـــــ

[ع] ان کی نیکی وتقویٰ کا نشان ان کے چہروں میں ہے ـــــ اثر سجود سے

بخلاف نافرمانی (اور معصیت) کے کہ اُس سے چہرے پر ظلمت اور وحشت برسنے لگتی ہے۔ ظاہری حُسن اور جمال کو بھی خاک میں ملا دیتی ہے اور باطن کو اس قدر خراب اور برباد کرتی ہے کہ قریب قریب باطن تو مُردہ ہی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ معصیت سے دل پر ایک سیاہ دھبہ پیدا ہوتا ہے اگر توبہ نہ کی تو وہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سارے قلب کو گھیر لیتا ہے۔ اسی کو مولانا (رومیؒ) فرماتے ہیں۔

ہر گنہ زنگے است بر مرآۃ دل دل شود زیں زنگ با خوار و خجل

چوں زیادت گشتِ دل را تیرگی نفسِ دوں را بیش گردد خیرگی

(ترجمہ۔ دل کے آئینے پر ہر گناہ ایک زنگ ہے جس سے دل خراب اور ذلیل ہو جاتا ہے جب دل پر تیرگی اور تاریکی زیادہ ہو جاتی ہے تو پھر نفسِ امارہ کی خیرگی اور آشفتگی بھی بڑھ جاتی ہے۔

آخر میں ضروری گزارشات ــــ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ کا یہ سلسلہ جو چند ماہ سے چل رہا ہے "الافاضات الیومیہ" کی چار جلدوں سے ماخوذ ہے جیسا کہ شروع میں عرض کر دیا تھا "مگر یہ لکھنا رہ گیا تھا کہ یہ ملفوظات ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ سے رجب ۱۳۵۱ھ تک کے ہیں ــ افاضات یومیہ کی تلخیص کے دوران میں حضرت مولانا محمد نبیہ صاحب دا صَل ٹانڈوی مدظلہٗ (خلیفہ مُجاز حضرت حکیم الامتؒ) نے جدید ملفوظات کا نسخہ احقر کو ارسال فرمایا جو خود اُن ہی کا ضبط کیا ہوا ہے۔ اگلی قسط اس مجموعے سے مرتب ہوگی ــ قسط (۵) کی کتابت کی ایک غلطی کی اصلاح بھی کرنا ضروری ہے صد۳۵ سطر ۷، پر مولوی عبد السمیع بیدلؔ کے ذکر میں ہے کہ خیالات کے تو خیر غالی ... تھے۔ خیر کی جگہ غیر بنا لیا جائے یعنی غیر غالی .... تھے۔

تصحیح ــ بابت مضمون حضرت مولانا عبد المومن صاحب دیوبندیؒ" شمارہ جنوری و فروری صفحہ ۷۰ کی آخری سطر ..." ۱۲۹۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے" میں ۱۲۹۹ھ بنا لیا جائے۔ ــــ

"مُرتب"

اسلام کی چار اساسی عبادتوں میں

حج کا مقام

(حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند مدظلہ)

(یہ مضمون ایام حج سے چند ہی روز پہلے لکھا گیا ہے' اس کا بہت مختصر خلاصہ ریڈیو سے نشر بھی ہو چکا ہے' پورا مضمون اب الفرقان کے ذریعہ ہدیۂ قارئین کرام کیا جا رہا ہے — ادارہ)

حج کی ضرورت، حج کی فضیلت اور حج کی حکمت:-

عقیدہ' توحید و رسالت کے بعد اسلام کی عمارت چار بنیادی عبادتوں پر قائم کی گئی ہے' نماز' حج زکوٰۃ اور روزہ۔ اِن چار میں دو اصل ہیں نماز اور حج اور باقی دونوں اُن کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس وقت جبکہ حج بالکل قریب ہے' مجھے اس کے بارہ میں کلام کرنا ہے اور وہی اس وقت میرا اصل موضوع ہے لیکن نماز اور حج میں اپنے اپنے تقاضوں اور احکام کے لحاظ سے کچھ ایسا علاقہ ہے کہ ان میں سے ایک کے ذکر کو چھوڑ کر دوسرے کی وضاحت کا پورا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے حج کی حقیقت واضح کرنے کے لیے حج کے ساتھ ساتھ نماز کا تذکرہ بھی ناگزیر طریقہ پر ہوگا' اور ساتھ ہی ضمنی طور پر زکوٰۃ اور روزہ کا ذکر بھی لازمی طور پر آئے گا۔

نماز پروردگار کے سامنے بندہ کے ادب و تعظیم' عجز و نیاز' فروتنی و خاکساری اور محکومی و غلامی کے جذبات کو ابھارنے اور مستحکم کرنے کے لیے رکھی گئی ہے جس میں اللہ کی شان حکومت و کبریائی اور حاکمیت مطلقہ کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں کیونکہ حکومت و حاکمیت ہی کے جس قدر بھی وجوہ و اسبا

ہو سکتے ہیں۔ وہ لامحدودیت کے ساتھ صرف اسی کی ذات بابرکات میں ہیں خواہ وہ قوۃ و شوکت ہو یا جبر
و قہر، قبضہ و اقتدار ہو یا عظمت و ہیبت، ذرہ ذرہ کا علم ہو یا اُس پر قدرت، بے نیازی و غنا ہو یا مواخذہ
و انتقام، تدبیر و تصرف ہو یا جبر داری و حکمت، سب اُسی کی ذات اقدس کی صفات ہیں، اس لیے
وہی اور صرف وہی حقیقی مالک الملک اور ملک الملوک ہے، اور کون نہیں جانتا کہ حکمران کے سامنے
جذباتِ انقیاد و اطاعت کے ساتھ اظہار عجز و نیاز اور تعظیم و ادب ہی محکوموں کا وظیفہ ہوتا ہے تو
اُس بادشاہوں کے بادشاہ اور ساری کائناتِ ارض و سماء کے حقیقی اور واحد فرماں روا رب العزۃ
جل جلالہ کے سامنے جس کی بادشاہت خود اپنی ہے کسی کی بخشی ہوئی نہیں ہے، انتہائی طور پر عجز و
نیاز بلکہ ذلت و خواری کی بھی انتہائی صورت سے حاضر ہونا نہ صرف قانونی اور عقلی ہی فریضہ ہو سکتا ہے بلکہ
فطرۃ انسانی کا تقاضا بھی ہے، اسی عجز و نیاز اور اظہار ذلت و خواری کی مکمل ترین ہیئت کا نام نماز
ہے۔ چنانچہ نماز کے ہر ہر جزو میں اسی نیاز مندی اور بندگی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ قیام میں چاکروں
کی طرح ہاتھ باندھ کر سر و قد کھڑا ہونا، ادب سے نگاہیں نیچی رکھنا، رکوع میں گردن اور کمر کو جھکا کر سر
تسلیم خم کر دینا، سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا اور آخر میں دو زانو بیٹھ کر عاجزانہ انداز
سے بھیک مانگنا اور اپنی محتاجگی و درماندگی کے دلی اعتراف کے ساتھ اپنی حاجتیں پیش کرنا ہی
نماز کی ہیئت و حقیقت ہے جو اُس کے شاہی اقتدار اور جلال و جبروت کا تقاضا ہے۔

برخلاف اسکے حج کی عبادت عشق الٰہی اور محبت خداوندی کے تقاضے پورا کرنے کیلیے رکھی گئی ہو جسمیں اللہ
کی شانِ جمال و محبوبیت کے سامنے اپنی عاشقانہ وارفتگی، محبت میں گمشدگی اور سرمستی عشق کی دیوانگی کے افعال
پیش کیے جاتے ہیں کیونکہ جس طرح حق تعالیٰ شانہ تمام جہانوں اور ساری کائنات کا بادشاہ مطلق اور حقیقی حکمراں
ہو اسی طرح وہ تمام جہانوں اور جہانوں کے ایک ایک ذرہ کا محبوب حقیقی اور مطلوب اصلی بھی ہو جس کی محبت
بالخصوص انسان کی فطرت میں زیادہ سے زیادہ پیوست کی گئی ہے کیونکہ عشق و محبت کے جسقدر
بھی وجوہ و اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب لامحدودیت کے ساتھ صرف اس کی ذات
کے پرتوے اور صفات ہیں۔ حسن و جمال ہو یا ہنر اور کمال، احسان و عطا ہو یا جود و نوال، بُعد
و قُرب ہو یا معیت و اتصال سب اسی کی جمالی شانیں ہیں، اب اگر کسی جمیل اور صاحب جمال و
کمال سے محبت کرنا اور اُس کے سامنے عاشق بن کر بیٹھنا ہی فطرت ہے تو اللہ رب العزۃ

کے لیے جو سارے جمالات ہستی کا یکہ و تنہا مخزن و مصدر ہے بلکہ مخلوق کا ہر ہر حسن و جمال اس کے جمال کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے تو بندہ کا اپنی انتہائی گرویدگی اور وارفتگی و فنائیت کے ساتھ اُس کے حقیقی جمال پر پروانہ وار نثار ہونا اور محو جمال ہو کر اپنی ہر خودی و خودداری کو کھو دینا بھی نہ صرف کوئی قانونی وظیفہ بلکہ فطرت بشری کا قدرتی تقاضا ہے۔ ان ہی عاشقانہ جذبات و افعال کے مکمل عملی نقشہ کا نام حج ہے۔ جس کے ایک ایک جزو میں وارفتگی، عاشقانہ دیوانگی اور مستی و بے خودی کا رنگ بھرا ہوا ہے، کون نہیں جانتا کہ عاشق میں جب عشق سرایت کر جاتا ہے اور اُس کے دل کی گہرائیوں میں محبوب ہی محبوب بس جاتا ہے تو اُسے محبوب کے ماسوا کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا، نہ لباس زینت کی خبر رہتی ہے نہ وضع قطع اور زیبائش کی فکر، نہ مکان اور گھر کی راحت و آسائش کا دھیان رہتا ہے نہ کسی کی مذمت کی طرف التفات رہتا ہے نہ ستائش کی طرف توجہ، نہ مال و دولت کی طمع رہتی ہے نہ جاہ و حشمت کی طلب، نہ کھانے کی خبر، نہ پینے کی فکر، نہ راحت کی طلب نہ آرام کا خیال، غرض ہر ماسوی دل سے سوخت ہو کر ایک محبوب ہی محبوب باقی رہ جاتا ہے۔ دل میں ہر وقت اسی کا تصور، زبان پر ہر وقت اسی کا تذکرہ، منھ کا ہر وقت اسی کی سمت رُخ، اُسی کی طرف دوڑنا، اُس کے گھر کے ارد گرد چکر لگانا، اُس کے درودیوار کو محبت کی آنکھوں سے دیکھنا، اُس کی ایک ایک اینٹ کو چومنا حتیٰ کہ اُس کے نام لگا ہوا شہر بھی عزیز ہو جاتا ہے اور اُس کے نام لگے ہوئے اُس کے پڑوسی بھی دنیا جہان سے زیادہ پیارے نظر آنے لگتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ایک فانی محبوب کے عشق کی یہ کیفیات ہوں کہ نہ عاشق کو اپنی خبر رہے نہ غیر کی درانحالیکہ ان محبوبان مجازی کا جمال بھی فانی اور عاشق کا عشق بھی آنی اور زمانی تو اللہ رب العزت جس کا جمال بھی جاودانی اور اس کا عشق بھی لافانی، جو سارے ہی جمالات کا سرچشمہ، ہر ہر خوبی و کمال کا مخزن، بلکہ ہر پاکیزہ اور محبوبی کی بے مثال صفت جیسے وجود بخشی و رزاقی، بقا دہی و قیومی، رحیمی و کریمی، شفقت و رافت، جود و عطا، ربوبیت و تربیت، صبر و حلم، عفو و درگزر، احسان و انعام، ہدایت و رہنمائی، سامان حیات کی تخلیق، مہر اور قہر سے مخلوق کو سنبھالنا اور راستے سے آشنا کرکے اُسے حدِ کمال تک پہونچانا اُسی ایک ذات بے ہمتا کی خصوصیات اور اوصاف ہیں تو اُس سے زیادہ جمیل کون ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ کون اس کا مستحق ہے کہ سارا عالم اس کا عاشق اور والہ و شیدا بن کر اور اُس کے

عشق میں سرشار ہو کر اپنی ہر لذت و راحت کو تج دے اور اسی ایک کا ہو رہے بس اسی جذبہ عشق و مستی اور جاذبہ مدہوشی و بے خودی کے مکمل مظاہرہ کا نام حج ہے جس کے سارے اعمال و افعال و ارکان میں عاشقانہ رنگ بھرا ہوا ہے۔

حرم الٰہی کے شوقِ دید میں وطن اور گھر بار چھوڑ کر دیارِ محبوب کی راہ لینا، نہ خشکی کی پروا نہ تری کا ڈر، نہ سمندروں کے عبور سے گریز نہ فضاؤں میں اڑ کر پہونچنے سے باک، غریب الدیاری اور [illegible] بے سروسامانی اور بے کسی کے ساتھ حرمِ خداوندی کی طرف دوڑ، جس کا نام سفرِ حج ہے، حرمِ الٰہی کے قریب مقررہ حد پر جس کا نام میقات ہے، پہونچ کر سلے ہوئے کپڑے اور زیب و زینت کو چھوڑ کر ایک چادر اور ایک لنگی کی کفنی باندھ لینا جس کا نام احرام ہے، ننگے سر ننگے پاؤں، نہ زینت نہ آرائش نہ زیبائش نہ نمائش نہ راحت نہ آسائش نہ حجامت نہ خط کی اصلاح، بال بڑھے ہوئے، سارا جسم گرد آلود، عطر و خوشبو اور تیل پھلیل سے بے گانگی، سر میں جوئیں بھی پڑ جائیں تو مارنے سے گریز، شکار سامنے بھی آ جائے تو اس کو شکار کرنے سے پرہیز، راستے میں گھاس اور کانٹا بھی آ جائے تو اس کے کاٹنے اور اکھاڑنے سے اجتناب اور قرآن کی زبان میں نہ رفث نہ فسوق، نہ جھگڑا نہ ٹنٹا، سخت کلامی بھی سننے میں آئے تو صبر و تحمل، نہ خود اپنی طرف سے کسی سے چھیڑ چھاڑ کہ ایسی ہی باتوں کا نام جنایاتِ احرام ہے جو عاشق کے لیے سزاوار نہیں۔ زبان پر ہمہ وقت لبیک لبیک کی عاشقانہ صدا، راستہ کی اونچائی نیچائی آ جائے تو لبیک، قافلے آتے جاتے مل جائیں تو لبیک، راہ پیمائی کا کوئی موڑ آ جائے تو لبیک، یعنی اے محبوبِ حقیقی میں تیرے ہی پاس حاضر ہو رہا ہوں تیری ہی طرف دوڑ رہا ہوں اور تیرے سوا میرا کوئی مطلوب اور محبوب نہیں اسی کا نام تلبیہ ہے جو واجباتِ احرام میں سے ہے۔

محبوب کا گھر یعنی بیت اللہ سامنے آیا تو شوقِ دید سے اس پر نگاہ جمتے ہوئے اٹھنا اور اس تک گریاں و بریاں پہونچ کر اس کے ارد گرد چکر لگانا جس کا نام طواف ہے۔ محبوب کے گھر کے خاص علامتی نشان (یعنی حجرِ اسود) تک پہونچ جائے تو بڑھ کر اسے شوق و اضطراب سے چومنا گویا محبوب کی دست بوسی کرنا جسے تقبیلِ حجر کہتے ہیں۔ بیتِ محبوب کے کونہ اور ستون سے گزر ہوا تو اسے شوق سے چھونے کو آگے بڑھنا جسے استلامِ رکن کہتے ہیں۔ محبوب کی دہلیز پر پہونچے تو شوقِ بے پایاں سے رو رو کر اس کے دامن سے لگ کر دعائیں مانگنا جسے دعاءِ ملتزم کہتے ہیں، طوافِ عشق کی ان ہفتگانہ گردشوں کی تکمیل پر

دوگانۂ شکر ادا کرنا جسے واجبُ الطواف کہتے ہیں۔ طواف کے بعد محبوب کے گھر کا ایک قطرہ پانی بھی مل جائے تو اُسے سو جان سے جرعۂ محبت سمجھ کر نوشِ جان کرنا جسے شربِ زمزم کہتے ہیں، پھر حرمِ محترم سے باہر محبوب کے نام لگے ہوئے مقدسین کی جگہیں آگئیں جن میں انھوں نے سرمستیٔ عشق اور تسلیم و رضا کی وارفتگیاں دکھلائی تھیں تو اُن ہی کے انداز سے ان جگہوں سے گزرنا کہیں چلنا کہیں دوڑنا کہیں نرم رفتاری کہیں تیز گامی، پھر ایک بار نہیں بلکہ سات سات مرتبہ لمبے لمبے پھیرے، پھرنا جسے سعیِ صفا و مروہ کہتے ہیں۔

پھر دیارِ محبوب میں صرف مکہ کے قیام ہی پر قناعت نہ کرنا کہ باوجود سفرِ غربت کے پھر بھی یہاں شہری آسائشیں تو مہیا تھیں جن سے عشق کی وارفتگیوں پر تہمت آسکتی تھی اور عشق ناتمام رہ جاتا تو اس شہری زندگی سے دور عرفات کے سنسان جنگل میں نویں ذی الحجہ کا دن گزارنا اور فرطِ گریہ و بکا اور الحاح و زاری سے بے خود ہو ہو کر کھڑے اور بیٹھے خیالِ محبوب میں گم رہنا اور اُس سے عنایت و کرم کی بھیک مانگنا جس کا نام وقوفِ عرفہ ہے۔ پھر دن ختم ہوجانے پر وہاں سے دیوانوں کی طرح مزدلفہ کے سنسان جنگل کی طرف بھاگنا اور وہاں بھی اسی طرح رات کاٹ دینا جسے وقوفِ مزدلفہ کہتے ہیں۔

پھر جبکہ محبت کے لوازم میں سے عداوت بھی ہے جو محبوب کے دشمنوں کے ساتھ طبعاً ہوتی ہے جن میں سے سب سے بڑا دشمن شیطان لعین ہے تو منیٰ پہونچ کر شیطان کے آثار و نشانات سے اظہارِ نفرت و بیزاری کرتے ہوئے اُن پر سنگ باری کرنا اور رِضَاءً لِلرَّحْمٰنِ کے ساتھ رَغْمًا لِلشَّیْطَانِ کی صدائے غیرتمندانہ بلند کرنا، پھر ایک دن نہیں بلکہ تین دن تک روزانہ کنکریاں مار مار اس کی عداوت اور اپنی غیرتِ عشق کو اُبھارنا بلکہ جزءِ نفس بنالینا جو پختگیٔ محبت کی نشانی ہے۔ کہ اس کا نام رمیِ جمار ہے۔

اب جبکہ عشق کی بے خودی میں عاشق نے اپنی ساری راحت و آسائش لذت و زینت اور عرفی وقار و امتیاز مٹا کر سب کی قربانی دیدی تو اس کے پاس اپنے نفس کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا لیکن تکمیلِ عشق کا تقاضا تھا کہ وہ اُسے بھی محبوبِ حقیقی پر قربان کردیتا اور خواہشاتِ نفس کی ان قربانیوں کے بعد آخر میں خود بھی محبوب پر قربان ہوجاتا جس کے لیے وہ تیار تھا، لیکن اُس رحمت و رأفت والے محبوب نے اس خودکشی کو گوارہ نہیں فرمایا کہ یہ عاشق مٹ جائے اور عشق و محبت کا یہ کارخانہ ہی سرے سے درہم برہم ہوجائے اس لیے اُس نے جیسے اپنے کامل ترین عاشقِ صادق حضرت ابراہیم خلیل اللہ

اور اپنے سچے عاشق جانباز حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہم السلام کی طرف سے اُن کی جان کے بدلہ میں جانور کی قربانی بطور فدیہ قبول فرماکر اُس کو قربانی نفس قرار دے دیا تھا۔ اس طرح اُس سُنت ابراہیمی کے مُطابق یہاں بھی اُن عُشاق الٰہی کی جان کے بدلہ میں جانور کی قربانی بطور فدیۂ نفس قبول کرلی جاتی ہے اور اُس کو قربانی نفس قرار دے دیا جاتا ہے اسی عمل کا نام نحر، اور اس قربانی کے دن کا نام یَوْمُ النَّحْر ہے، اور اس مرحلہ پر آخر کار یہ عشقی عبادت ختم ہو جاتی ہے۔

بہرحال حج کے تمام افعال خالص عاشقانہ اور محویانہ رنگ کے ہیں جیساکہ نماز کے تمام افعال عاقلانہ اور غُلامانہ رنگ کے تھے اس لیے نماز کی عبادت انسان کی عاقلانہ وفاداری محکومانہ بندگی اور مودبانہ غلامی کے لیے وضع ہوئی ہے جو اللہ کی صفت جلال اور شان قہر وحکومت کا تقاضا ہے اور حج کی عبادت عاشقانہ محویت وبے سامانی فانیانہ جاں سپاری اور بے خودانہ ربودگی کے لیے رکھی گئی ہے جو اللہ کی صفت جمال اور شان محبوبیت کا تقاضا ہے، نماز میں بندہ کی عقل و دانش کا امتحان ہوتا ہے اور حج میں بندہ کے عشق و محبت کا، اسی لیے نماز اور حج کے تقاضوں اور احکام میں بھی وہی تفاوت ہے جو خود عقل اور عشق میں فرق ہے۔ نماز ایک ہیبت وجلال والی ذات کے دربار کی حاضری ہے تو قدم قدم پر بندہ کا ادب و احترام اور عظمت و ہیبت پذیری دیکھی جاتی ہے اور حج کوچۂ محبوب کی حاضری ہے تو قدم قدم پر اس کی فنائیت و ربودگی شوق و اشتیاق نفس سے بے نیازی اور سرمستی وجان سپاری دیکھی جاتی ہے اسی فرق کے تحت نماز میں صاف ستھرا لباس ضروری ہے جو تقاضائے عقل و ادب ہے اور حج میں سرے سے سِلا ہوا لباس ہی ممنوع ہے جو تقاضائے عشق و ادب ہے۔ نماز میں عطر اور خوشبو مستحب ہے جو دربار شاہی کے شایان شان ہے اور حج میں بحالت احرام خوشبو اور تیل پھلیل کا پاس آنا بھی ممنوع ہے کہ عشق کی بے حرمتی ہے۔ وہاں ٹوپی و عمامہ مطلوب ہے جو وقار دربار کے مناسب شان ہے اور یہاں کھُلے سر پر اگر احرام کا کپڑا بھی لگ جائے تو جنایت اور خطار ہے اور اُس پر کفارہ دینا ضروری، وہاں سر ڈھانکنا سنت صلوٰۃ ہے۔ یہاں سر کھُلا رہنا ہی سنت حج اور کمال محویت ہے، وہاں موزے اور جُراب کا پیر میں ہونا نماز میں مخل نہیں اور یہاں وہ جوتہ بھی مخل حج اور ممنوع ہے جو پیر کے اوپر کی ہڈی کو ڈھانپ لے، نماز کے لیے دوڑ بھاگ کر آنا بھی مکروہ ہے کہ خلاف ادب

ومتانت ہے لیکن یہاں قدم قدم پر پُرشوق بھاگ دوڑ ہی عین حج اور خود عبادت ہے نماز میں چلنا پھرنا اور قدموں کی حرکت ممنوع ہے کہ خشوع وسکون کے منافی ہے حج میں شوق واضطراب کے ساتھ قدموں کا حرکت میں رکھنا ہی عین طاعت ہے کہ عشق واضطراب کا یہی تقاضا ہے، نماز میں آنکھیں نیچی رکھنا اور پتلیوں کو غیر معمولی حرکت میں نہ لانا ضروری ہے اور یہاں آنکھ اٹھا اٹھا کر بیت اللہ اور شعائر اللہ کو دیکھنا ہی بنیاد عبادت ہے، نماز کی صفوف میں چپ چاپ کھڑے رہنا ہی روح صلوٰۃ ہے لیکن حج کے جمگھٹوں میں پُرشوق صدائیں اور شورِ لبیک بلند کرنا ہی روح حج ہے، وہاں ادب کے ساتھ نظر بر قدم کلام خداوندی کی سماعت اصل ہے اور یہاں کلام والے کے آثار و مشاہد پر آنکھیں گاڑے رکھنا اصل ہے۔ نماز میں شیطان اور نفس سے پناہ مانگ کر بیکسو رہنا ضروری ہے اور حج میں خود سے آگے بڑھ کر ان دونوں دشمنانِ محبوب پر حملہ آور ہونا، نفس کے مرغوبات کو کچلنا اور شیطان پر سنگ باری کرنا ضروری ہے، نماز میں ذرا سا خون بہہ جائے تو وضو اور نماز دونوں فاسد ہیں اور کسی کو ذبح کرنے کا فعل کیا جائے خواہ وہ قربانی کا جانور ہی ہو تو نماز باطل ہے اور یہاں منحر میں خون بہانا اور اہراقِ دم ہی خواہ اپنے اوپر چھینٹیں بھی آجائیں صحتِ حج کی علامت ہے، بہرحال نماز اور حج میں وہی فرق ہے جو عقل اور عشق میں ہے۔ ایک کا تقاضا شعور اور فکر و ادب ہے اور ایک کا مقتضاء فکر و شعور کے کوچہ سے دور رہ کر ربودگی ومحویت سوختہ جانی و بے خودی اور از خود رفتگی وخود گزاری ہے اس لیے نماز عقل کی تسکین کے لیے ہو اور حج عشق کی تسکین کے لیے اگر نماز نہ ہو تو عقل تشنہ رہ جاتی ہے اور حج نہ ہو تو عشق پیاسا اور بے آب ودانہ رہ جاتا ہے۔ پس جیسے ان دونوں قوتوں کا انسان میں ہونا فطرتِ انسانی کی تکمیل ہے ایسے ہی ان دونوں عبادتوں کا ہونا فطرتِ اسلام کی تکمیل ہے، ظاہر ہے کہ اگر انسان کی حقیقت شعور و محبت یا عقل و عشق کا مجموعہ اور کامل امتزاج ہے اور بلاشبہ ہے کہ بے عقل بھی انسان نہیں کہلاتا اور بے انس و محبت بھی انسان نہیں ہوتا تو بلا تامل اس دعوے کی تصدیق ناگزیر ہو جاتی ہے کہ نماز انسان کی فطرتِ عقلی کا تقاضاء اور حج انسان کی فطرتِ عشقی کا مقتضاء ہے، اور اس لیے اس دعوے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ اگر اسلام میں حج کی عبادت نہ ہوتی تو ایک طرف تو اسلام بلحاظِ دین ناقص اور ناتمام رہ جاتا اور دوسری طرف انسان کی فطرت کا آدھا حصہ مضمحل ہو کر خود انسان بھی بلحاظ دین آدھا اور ناقص رہ جاتا، اس لیے اسلام نے جہاں نماز رکھی کہ انسان کی عقلی اور شعوری فطرت نکھر کر حدِ کمال کو پہنچے۔

وہیں اس نے حج بھی ادا کیا کہ اس کی عشقی فطرت اور بے خودی و محویت کی صفت بھی اُبھر کر ذروۂ کمال تک پہونچ جائے۔

اندریں صورت جبکہ حج فطرت بشری اور فطرت الٰہیہ دونوں کا تقاضا ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے تو اس سے بڑھ کر حج کی ضرورت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ عین فطرت ہے اور فطرت کے لیے کسی بیرونی دلیل کی ضرورت نہیں کہ فطرت خود ہی ایک ناقابل انکار دلیل ہے۔ (باقی)

تسخیر فطرت با علم و عشق

(از قاضی محمد عدیل صاحب عباسی ایڈوکیٹ)

زیر طبع کتاب "اقبال اور اسلام" کا ایک باب

(۲)

علم کی ستائش اور اس کی پہنائیوں اور قوتوں کا اظہار اقبالؔ نے طرح طرح سے کیا ہے اور تسخیر کائنات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ اس معاملے میں وہ مادہ پرستوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہے۔ وہ پوری کائنات کو انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے اور آسمان اور زمین سب کو مسخر کر لینا چاہتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسان میں پوری کائنات پر حکمرانی کرنے کی طاقت و قدرت ہے۔

"علم کے حدود اور تسخیر نفس"

لیکن یہاں تک آنے کے بعد وہ مادہ پرستوں سے ٹکر لینے پر تُل جاتا ہے اور ان کی کم بصری کو واضح کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ انسان کا دشمن صرف فطرت نہیں بلکہ اس کا ایک اور سخت دشمن اس کا نفس ہے اور اس لیے انسان کے کامل ہونے کے لیے صرف یہ شرط کافی نہیں ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کرے بلکہ اسے اپنے نفس پر بھی قابو حاصل کرنا ہوگا اور اس کی تسخیر کا بھی عمل سیکھنا ہوگا۔ بلا اس کے وہ کامل نہیں ہو سکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے باہر جتنی بڑی دنیا آباد ہے اس سے کم وسیع وہ عالم نہیں ہے جو خود اس کے اندر ہے۔ واقعات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو انسان سے باہر کی دنیا میں پیش آتے ہیں دوسرے وہ جو خود اس کے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں جو واقعات اس کے اندر وارد ہوتے ہیں، وہ بڑا

پھر اقتدار کہتے ہیں۔ انسان میں غصہ و رحم، رنج و خوشی، احسان و ظلم، شرافت و تسفل، عفو و انتقام، کرم و بخشش و حسد و بغض و کینہ وغیرہ وغیرہ کے متضاد جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علم سے حاصل کی ہوئی طاقت کا استعمال وہ ان ہی جذبات کے تحت کرتا ہے اس لیے مانا کہ وہ علم کے ذریعہ عالم کو مسخر کرنے کا فن سیکھ لے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اُن کا استعمال بھی صحیح کرے۔ مثلاً آج امریکہ اور روس دونوں ایٹمی پاور بن چکے ہیں اور ہر وقت مشغول سے چلنے والے ہوائی تیار کھڑے ہیں۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کی جانب نفس نتائج سے بے پروا ہو جائے تو صرف ایک بٹن دبانا ہے فوراً طیارے اُڑ جائیں گے اور پورا عالم تین دن سے سات دن کے اندر فنا ہو جائے گا۔ اس کا علاج بیچارے علم کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ معاملہ اس کے دسترس سے باہر ہے اس نے تو ایک طاقت مہیا کر دی اور پھر یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گیا کہ ؎

خواہ آسماں و خواہ زمیں شو خیدئ

اس لیے ضروری ہے کہ نفس کی بھی تسخیر کی جائے اور اسے بھی قابو میں لایا جائے اور بے راہ روی سے بچایا جائے۔ بغیر اس کے یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی اور انسان کی تکمیل نامکمل رہ جائے گی۔ نفس کی تسخیر کے لیے آئین مرتب کرنے ہوں گے وہ آئین کیا ہوں اور کیسے ہوں اور کیسے مرتب ہوں یہ سوالات ہیں جو تمام عالم میں دانش وروں کے دماغ میں زمانہ دراز سے ہیجان پیدا کیے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات منطقی حیثیت سے طے ہو جاتی ہے کہ انسان کو ضبط نفس اور اس کے لیے آئین کی ضرورت ہے ؎

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند   خویش را زنجیری آئین کند

یعنی جو مہ و پرویں کی تسخیر کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو آئین کا پابند کرتا ہے۔ اقبال ان ماہرین علم النفس کا ہم خیال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آزاد وہی شخص ہے جو سب سے زیادہ مقید ہے۔ ایک آدمی لاابالی پن کا شکار ہے جب جی چاہتا ہے سو کر اٹھتا ہے۔ کبھی ۸ بجے اور کبھی ۳ بجے کھانا کھاتا ہے۔ سونے کا بھی کوئی وقت نہیں الغرض اس کی زندگی میں کوئی ضابطہ نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جس کا ہر کام وقت سے ہوتا ہے وہ گھڑی کی سوئی کا پابند ہے۔ بظاہر وہ شخص آزاد ہے جو کسی اصول کا پابند نہیں ہے لیکن درحقیقت آزاد وہ ہے جس نے اپنے آپ کو جکڑ بند کر رکھا ہے چنانچہ اس کی وہ مثالیں دیتا ہے ؎

باد را از زندانِ گل خوشبو کند   قید بو را نافۂ آہو کند

یعنی جب بُو ہرن کی ناف میں بند ہو جاتی ہے تو مشک بنتی ہے۔

می زند اختر سوئے منزل قدم　　پیش آئینے سر تسلیم خم

چاند ایک آئین کے تحت اپنا قدم اٹھاتا ہے تو وہ منزل تک پہونچ جاتا ہے۔

قطرہا دریاست از آئین وصل　　ذرہ ہا صحراست از آئین وصل

باطنِ ہر شئے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل ازیں ساماں روی

قطرے وصل کے آئین پر عمل کر کے دریا اور ذرے اسی آئین وصل پر عمل پیرا ہو کر صحرا بنتے ہیں فطرت ایک آئین کے تحت کام کر رہی ہے اور ہر چیز کا باطن آئین ہی سے قوی ہوتا ہے تو تو اس سازو سامان سے کیسے غافل گزر سکتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت ضبط نفس ہے۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است　　خود پرست و خود سوار و خود سر است

مرد شو آور زمام او بکف　　تا شوی گوہر اگر باشی خزف

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

یعنی تیرا نفس اونٹ کی طرح خود پرور، خود پرست اور خود سر ہے اگر تو مرد ہے تو اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے تاکہ اگر تو ٹھیکری ہے تو گوہر بن جائے جو شخص کہ اپنے اوپر حکمرانی نہیں کرتا وہ دوسروں کا فرمان پذیر یا غلام بن جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ضبط نفس یا تسخیر نفس کا نسخہ کیا ہے کس طرح اسے حاصل کیا جائے۔ اقبالؔ کا نظریہ یہ ہے کہ تسخیر نفس میں سب سے بڑی رکاوٹ "خوف" ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہر وقت موہوم آنے والی بلاؤں سے ڈرتا رہتا ہے۔ اگر موٹر پر سوار ہے تو سوچتا ہے کہ کہیں ٹکرا نہ جائیں کتنے آدمی گاڑی پر انجن کے قریب نہیں بیٹھتے کہ شاید کہیں گاڑی پٹری سے اتر گئی یا لڑ گئی تو سب سے پہلے ہم کو ہی جان کا خطرہ ہوگا۔ ایک ذرا سا گلے میں خراش ہوا اور دو چار دن رہ گیا تو کینسر کا ڈر آگیا۔ گھر میں سوتا ہے تو چونک چونک اٹھتا ہے کہ کہیں چور نہ آگئے ہوں۔ انسان کی زندگی میں ہر چہار طرف خوف ہی خوف ہے۔ اولاد اور اعزہ کی صحت اور عافیت اور زندگی کی جانب سے ہر لمحہ خطرہ لگا رہتا ہے یہ سب خوف کس لیے ہیں۔ اقبالؔ کے نظریے میں اس خوف کی وجہ ان چیزوں سے محبت ہے جن کے ضائع ہونے کا اس کو اندیشہ رہتا ہے۔ خوف اور محبت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ دونوں تسخیر نفس اور انسان کے کامل ہونے میں حائل ہیں۔

طرح تعمیر تو از گل ریختند یا محبت خوف را آمیختند
یعنی تیری تعمیر ایسی مٹی سے ہوئی ہے جس میں محبت کے ساتھ خوف ملا دیا گیا ہے۔

خوف دنیا خوف عقبیٰ خوف جاں خوف آلامِ زمین و آسماں
حب مال و دولت و حبِ وطن حب خویش و اقربا و حب زن

یعنی دنیا کا خوف، عقبیٰ کا خوف، آلام زمین و آسمان کا خوف یعنی وہ مبہم خوف کہ کہیں ایسا ایسا نہ ہو جائے کہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ اس تمام خوف کی بنیاد کیا ہے۔ مال کی دولت کی وطن کی محبت خویش و اقربا اور بی بی کی محبت ان سب کی محبت میں گرفتار ہو کر انسان ہر لمحہ خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ صوفیان باصفا اور خدا جویان معنی آشنا کا قول ہے کہ مذہب انسان کو ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات دینے کے لیے آیا ہے۔

ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات کا کیا ذریعہ ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے حیات کائنات کے بسیط مطالعہ اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا جواب یہ ہے کہ پہلی سچائی اس کائنات کی ایک قادر مطلق ذات یگانہ بے ہمتا و بے مثال ظرف زمان و مکاں کے قیود سے بالاتر ازلی و ابدی ناممکن الادراک واجب الوجود کی ہستی ہے جسے اسلام توحید کہتا ہے اور اقبال نے بھی توحید کا نام دیا ہے۔ وہ حقیقۃ الحقائق ہے۔ وہی انسان کا خالق ہے اور اسی نے وہ نوامیس و آئین مرتب کیے ہیں جن پر عمل کر کے انسان نفس کی تسخیر کر سکتا ہے۔ اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ وہ نوامیس الٰہیہ انسان کو ملیں کیسے۔ اللہ تعالیٰ لامحدود اور انسان محدود، لامحدود کے لیے اپنے کو محدود بنانا اس کی شان اعلیٰ و ارفع کے خلاف اور محدود کا لامحدود تک پہونچنا ناممکن ؏

واں لڑی آنکھ یہاں اپنا گذارہ ہی نہیں

اس لیے ضرورت ہوئی کہ کوئی درمیانی رشتہ قائم کیا جائے تاکہ وہاں کا پیغام ہم تک پہونچ سکے اور اس کے لیے رسالت لابدی قرار پائی اور انبیاء، رسول یا پیغمبر خدا کا پیغام انسانوں تک لائے اور نوامیس الٰہیہ سے باخبر کیا انسانی فہم و ادراک اور علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی صرف وحی یا الہام ربانی سے یہ کام ہو سکتا ہے اور اس کا نام اقبال کی زبان میں "عشق" ہے اور "علم" جو تسخیر کائنات کرتا ہے اسے "تابع عشق" ہونا چاہیے تب انسان کی تکمیل کی منزل طے ہوگی۔

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوہ بیباکش　　از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی

یعنی عقل جہاں سوز ہے لیکن وہ عشق کا صرف ایک جلوۂ بے باک ہے اور عقل عشق سے آئینِ جہاں تابی سیکھتی ہے۔ انسان ان نوامیس الٰہیہ کی اطاعت پر مجبور ہے اور جب وہ ضبط نفس اور اطاعت سے پوری طرح بہرہ ور ہوگا تو نیابت الٰہی کے مرتبہ پر قائم ہوگا اور یہی اس کی تکمیل کا خلاصہ ہے اور بلا اس کے وہ ناقص رہے گا رسالت کے لیے وہ پیغمبر عربی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین اور آپ کے پیغام کو آخری وحی مانتا ہے اور آپ کی اُمت کو خاتم اقوام اور خیر الامم تسلیم کرتا ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اب اقبال کی زبان سے سُنیے ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بہ دست　　ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چوں جاں اندر تنش　　خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست　　خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ما سوا قطع نظر　　می نہد ساطور بر حلق پسر

یعنی جس شخص نے توحید کی عصا ہاتھ میں لے لی۔ وہ خوف کے ہر طلسم کو توڑ ڈالے گا جس کے جسم و جان میں توحید سرایت کر گئی۔ اُس کی گردن کسی باطل کے آگے نہیں جھکتی ہے۔ اس کے سینہ میں خوف کو راستہ مل ہی نہیں سکتا۔ اس کا دل کسی غیر اللہ کو پسند ہی نہ کرے گا۔ اور نہ اس کی جانب مائل ہوگا جو توحید کے احاطہ میں آگیا وہ زن و فرزند کے قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور ہر ماسوا اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ حتی کہ بیٹے کے گلے پر بھی چھری چلا دیتا ہے (اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جنھوں نے حلقِ اسمٰعیلؑ پر چھری رکھ دی تھی)

ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبال نے خوف عقبیٰ سے کبھی چھٹکارہ حاصل کرنے کو کہا ہو لیکن وہ قرآن کی آیۃ الا اِنّ اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن) کی تشریح کر رہا ہے اور ہر بندۂ مومن کو اسی مقام تک لے جانا چاہتا ہے ؎

عطا اسلاف کا جذب دروں کر　　شریک زمرۂ لا یحزنون کر

اقبالؔ ان لوگوں میں نہیں ہے جو اولیا اللہ سے عقیدت کو اصنام پرستی سے ملا دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اولیاء کرام کا بڑا معتقد ہے۔ اس کے خمخانے کی شراب عام ہے۔ جہاں تک رسالت کا تعلق ہے۔ اقبالؔ اس کا ایک عظیم شیدائی ہے۔

طینت پاک مسلماں گوہر است　　　آب و تابش از یم پیغمبر است

یعنی مسلمان کی طبیعت پاک مثل ایک موتی کے ہے جس کی آب و تاب پیغمبر علیہ السلام کے سمندر سے ہوئی ہے۔

لیکن توحید اور رسالت کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا یہاں صرف موضوع سخن کے لحاظ سے اشارہ کرنا مقصود ہے۔

"اعمالِ صالحہ"

عقیدہ توحید و رسالت کو لازمی قرار دینے کے بعد اقبالؔ کہتا ہے کہ اگرچہ عقیدہ ضروری ہے لیکن بلا عمل صالحہ کے وہ تکمیل انسانیت نہ کر سکے گا۔

لذت ایماں فزاید از عمل　　　مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان جو عمل میں نہ آسکے مردہ ہو جاتا ہے اور عمل کے لیے اس نے اسلام کے ارکانِ خمسہ کی تعلیم دی ہے چنانچہ کہتا ہے۔

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز　　　قلب مسلم را حجِ اصغر نماز

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است　　　قاتلِ فحشاء و بغی و منکر است

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند　　　خیبرِ تن پروری را بشکند

مومناں را فطرت افروز است حج　　　ہجرت آموز و وطن سوز است حج

طاعتے سرمایہ جمعیتے　　　ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ　　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز "حتیٰ تنفقوا" محکم کند　　　زر فزاید الفتِ زر کم کند

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست　　　پختۂ محکم اگر اسلامِ تست

اہل قوت شو ز ورد یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی

یعنی کلمۂ توحید سیپ اور نماز اس کے اندر موتی ہے اور مومن کے لیے نماز حج اصغر کا درجہ رکھتی ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک خنجر ہے جس سے خواہش نافرمانی اور منکرات تہ تیغ ہو جاتے ہیں۔ (یہ قرآن پاک کی اس آیت کا ترجمہ ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) روزہ بھوک اور پیاس پر شبخون مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑ ڈالتا ہے۔ حج مومن کے لیے فطرت افروز ہے۔ وہ ہجرت کے تو آئین سکھاتا اور وطن کے غلط نظریے کو جس سے انسان صرف وطنی بن کر رہ جاتا ہے، پھونک ڈالتا ہے (کیونکہ حج سے انسان دنیا کا شہری بنتا ہے) زکوٰۃ حب دولت کو فنا کرتی ہے اور مساوات کا سبق دیتی ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (یعنی تم ہرگز خیر کامل کو پہونچ نہ سکو گے جب تک اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو) اقبال کہتا ہے کہ اس آیت کے معنی سے دل کو محکم کرنا زکوٰۃ کا کام ہے' اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور پیسہ کی محبت گھٹتی ہے اگر تیرا اسلام محکم ہے تو ان سب باتوں پر عمل کرنے سے تجھے استحکام حاصل ہوگا۔ اس خاک پر حکمرانی کرنے کے لیے تم جب ہی اہل ہو سکتے ہو جب "یا قوی" کا ورد کر کے اہل قوت بنو یعنی تسخیر کائنات کے ساتھ تسخیر نفس بھی کرو۔ اور علم کو تابع عشق رکھو۔

عقیدہ اور عمل سے انسان کی تکمیل کا راستہ بتلانے کے بعد وہ اصرار کرتا ہے کہ نوامیس الٰہیہ کی کامل اطاعت و اتباع ہونا چاہیے۔ اقبال نے جا بجا "غلام پختہ کار" بننے کا مشورہ دیا ہے اور کہیں کہیں مجتہدیت کی مخالفت کی ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اقبال فاشزم کا یا ڈکٹیٹرشپ کا قائل ہے اسے کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اقبال دستور حیات مرتب کر رہا ہے' اس کا مطمح نظر نصب العینی (Idealism) ہے۔ عملی سیاست (PRACTICAL POLITICS) سے اُسے کوئی غرض نہیں اور نہ وہ رخصت و اجازت کی گفتگوؤں اور بحثوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ وہ اسلام کو پیش کر رہا ہے اور ان عقاید و اعمال کی تشریح کر رہا ہے جو فرد و ملت کے لیے ہونے چاہئیں اور اصولاً ہونے چاہئیں۔ وہ کوئی نئی دنیا اور اس میں رہنے کے لیے نئے آدم کی تعمیر کے لیے نہیں اٹھا ہے وہ حیات و کائنات کے بارے میں اپنا مطالعہ پیش کر رہا ہے اور انسان کی تکمیل کے لیے ضروریات بتلا رہا ہے۔ اس کی نگاہ وسیع ہے اور وہ ہر گوشہ

پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ ایک ایسے فرد کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی انا یا ایغو میں بہت سی صفات ہوں جن کو وہ تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے پھر وہ ایک "ملت" کا نقشہ پیش کرتا ہے جو وطن کی قید سے آزاد اور عالمی ہو اور اس کے لیے نوامیس الٰہیہ کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے کہیں کہیں رخصت و اجازت کے طور پر کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑے تو وہ اس کے موضوع سخن سے خارج ہے کسی قوم کا کسی دوسری قوم کا غلام ہونا یہ بالکل جداگانہ بات ہے اور اس سے نفرت کا اظہار جس طرح اقبال نے کیا ہے کہیں اور ملنا مشکل ہے یہاں صرف ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد گوہرے داشت و لے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کی غلامی بے بصری ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ کتے سے بھی بدتر ہے کیونکہ ایک کتا دوسرے کتے کے آگے سر خم نہیں کرتا۔ اب اس نے جمہوریت کے عنوان سے جو لکھا ہے اس کا جائزہ لیجیے۔

متاع معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی ز موراں شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

کیا دوں فطرتوں سے متاعِ معنیٔ بیگانہ تلاش کرتے ہو کسی سلیمان کی شوخیٔ طبع چیونٹیوں میں نہیں آسکتی طرز جمہوری سے بھاگو اور غلام پختہ کار بنو کیونکہ اگر دو سو گدھوں کے مغز اکٹھے کر دیے جائیں تو کسی انسان کی فکر اس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت میں عوام الناس آئین و دستور و قوانین ترتیب دیتے ہیں نوامیس الٰہیہ کی پابندی نہیں ہوتی اور نوامیس الٰہیہ پر عمل کے بغیر انسان کبھی اپنی منزل کمال کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس لیے اس طریقۂ جمہوری کو ترک کرو اور نوامیس الٰہیہ کے غلام پختہ کار بنو۔ جمہوریت کا اصول بھی یہی ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو جو کسی جغرافیائی حدود میں آباد ہوں اور ایک حکومت کے ماتحت رہنا چاہیں۔ اپنے لیے آئین و ضوابط مرتب کرنے کا اختیار ہے۔ اور اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ عوام کو غلط قانون بنانے کا بھی حق ہے اور صحیح قانون بنانے کا بھی حق ہے یعنی خود اس کے مدعیان ان آئین اور ضابطوں کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ جمہوریت کے بہت سے فوائد ہیں اور ملکی نظام پر بناء جمہوریت دنیا کے موجودہ نظاموں میں سب سے بہتر

ہے۔ اس کا اقبال منکر نہیں لیکن انسانیت کے جو قوانین وہ مرتب کر رہا ہے۔ اس سے یہ موضوع سخن خارج ہے۔ اقبال کی نگاہ میں عقل انسانی کی حدود ہیں اور وہ تسخیر نفس یا ضبط نفس یا تہذیب نفس کا مرحلہ حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے کائنات نے جو سبق توحید و رسالت کا دیا ہے اور اس کی راہ سے جو نوامیس الٰہیہ ملے ہیں وہی کافی ہو سکتے ہیں اور اسی کا نام وہ عشق رکھتا ہے اور اپنے مرشد رومی کے حسب ذیل شعر سے اکتساب کرتا ہے۔

بہ خرد راہ عشق می پوئی   بہ چراغ آفتاب می جوئی

اسی طرح وہ مولانا رومؒ کا یہ شعر بھی پیش کرتا ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است   زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

چنانچہ ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کو لکھا ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے   دستور حیات کی طلب ہے

اور اس کے لیے کیا ہونا چاہیے۔ یہ لکھ کر کہ میں برہمن زادہ ہوں اور مرے آب و گل میں فلسفہ ہے اور میں اس کی رگ رگ سے باخبر ہوں عقل انسانی کے مقام کی حدوں کو یوں ظاہر کیا ہے۔

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز   سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری   ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت   ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی کی تقویم   دیں سر محمدؐ و ابراہیمؑ
دل در سخن محمدیؐ بند   اے پور علیؓ ز بو علیؒ چند

اسی طرح کہتا ہے ۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے   خرد کیا ہے چراغ رہگزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا   چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے

لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے وہ علم کے مدارج اور مقامات کا بھی بڑا معترف ہے البتہ اس کو تابع عشق رکھنا چاہتا ہے ۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ایک نظم "علم و عشق" میں اُسے اُجاگر کیا ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندہ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن

عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

شرع محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ ساحل حرام

علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اسی طرح کہتا ہے کہ علم تو زمان و مکان کی پیمائش ہے یعنی اسی آب و گل یعنی مادہ سے اس کا تعلق ہے اور ذکر (یعنی عشق) انسان کو واجب الوجود تک لے جاتا ہے۔

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار	مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں	مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اسی طرح دوسرا قطعہ بہ عنوان "وحی" ملاحظہ ہو۔

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں	راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا جذبِ عمل بے بنیاد	سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر	گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ عقل انسانی سے اگر تہذیب نفس کے مراحل طے کیے جائیں تو عقل تو قیاس آرائیوں سے کام لے گی جس طرح عقل نے مادہ کی تسخیر میں سبب اور نتیجہ سے کام لیا تھا اور اسی کا نام سائنس ہے وہ چیز یہاں ممکن نہیں ہے اس لیے اس بات کا پتہ کیسے چلے کہ کیا چیز خوب اور کیا ناخوب ہے جبکہ خود حیات شارح حیات نہ ہو گی یعنی خالقِ انسان جو اس کی فطرت سے واقف ہے خود اس کے لیے قوانین مرتب کر کے نہ دے وہ چیز البتہ یقینی ہے اور اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔
اقبال تقدیر کا قائل نہیں ہے اس کا خیال ہے کہ احکامِ الٰہی کے کامل اتباع سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام ۔۔۔ یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ۔۔۔ ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات ۔۔۔ مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں ۔۔۔ تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے
قدرت کے مقاصد کے عیار اسکے ارادے ۔۔۔ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مصرع: نگاہ مرد مومن سے پلٹ جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کہتا ہے کہ عصر حاضر کے انسان نے عقل کی اتباع اور عشق سے گریز کرکے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ راز حیات سے ناآشنا ہو گیا اور اس کی دنیا تاریک ہو گئی۔

عشق ناپید و خرد صورت مار ۔۔۔ عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا ۔۔۔ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا ۔۔۔ آج تک فیصلہ سود و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ۔۔۔ زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

تہذیب مغربی میں یہی خامی ہے کہ اس کی روح مدنیت نوامیس الٰہیہ کی پابند نہ ہونے سے پاک نہیں رہ گئی ہے اور روح کی پاکیزگی کے بغیر نہ ضمیر پاک رہ سکتا ہے اور نہ خیالات بلند اور ذوق لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ۔۔۔ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اسی لیے وہ سیاست جو دین سے الگ اور صرف عقل انسانی کی تابع ہوتی ہے وہ شیطان کی کنیز اور پست فطرت اور ضمیر مردہ بن جاتی ہے یعنی سیاست اور مدنیت کو نوامیس الٰہیہ کا پابند ہونا چاہیے:-

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں ۔۔۔ کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد ۔۔۔ فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاع غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی ۔۔۔ تو ہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر

دوسری جگہ کہا ہے کہ عیسائیت چونکہ رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے اس لیے اس کو جہانگیری سے کوئی تعلق نہیں اس لیے دین جان بے تن اور جہانگیری تن بے جان بن گئی ہے۔

کلیسا سبحۂ پطرس شمارد | کہ او با جہانگیری کارے ندارد
به کار جہانگیری محکمے نیست | تن بے جان و جان بے تنے ہست

اقبال یقین کے ساتھ مغربی تہذیب کی موت اور اسلام کے جلوہ گر ہونے کی پیشین گوئی کرتا ہے:-

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا | وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے | فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
جہانِ کن فکاں کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے | یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی | ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا | خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر | نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

درس قرآن — مرکزوالی مسجد

۸ر فروری ۷۰ء — ریگ شتبا

• تحریم و تحلیل صرف اللہ کا حق ہے
• مشرکین کی بعض مشرکانہ بدعات و خرافات کا رد
• دین حق کی بنیادی ہدایات

حمد و صلوٰۃ اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ
تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ
الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاۗءَكُمُ
الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا
تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ○

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ
اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ
وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ وَ
اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ
بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ثُمَّ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ
وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ○

الانعام ع ۱۷-۱۸

اے پیغمبر ان سے کہو کہ جو شریعت خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ میرے پاس آئی ہے
میں اس میں کھائی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز کسی کھانے والے کے لیے
جو اس کو کھانا چاہے حرام نہیں پاتا الا یہ کہ وہ مردار جانور ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا
خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ہی ناپاک ہے یا وہ حرام اور سراپا فسق و فجور

یا تو یہ جو بطور فسق غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو ـــــ پھر جو شخص کسی وقت حلال غذا بالکل نہ مل سکنے کی وجہ سے ان محرمات میں سے کوئی چیز کھانے کے لیے مضطر ہو جائے اور اس حالت میں بس جان بچانے کے لیے کچھ کھالے بشرطیکہ حکم خداوندی سے تمرد، بغاوت اور نافرمانی کرنے والا نہ ہو، اور بقدر ضرورت سے زیادہ بھی نہ کھائے تو تمہارا پروردگار غفور و رحیم ہے (دونوں صورت میں معاف فرمادے گا)۔

اور یہودیوں پر ہم نے ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں پر ہو یا ہڈی سے لگی ہوا ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی شرارت اور سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم اس بیان میں سچے ہیں، پھر اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہدو کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے (اس لیے تمہیں یہ مہلت ملی ہوئی ہے) تاہم اس کا عذاب مجرموں سے ٹلنے والا نہیں ہے۔

یہ مشرک ضرور یہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ان چیزوں میں سے جن کے بارہ میں بحث ہے کسی چیز کو ہم حرام قرار دیتے۔ اسی طرح (یعنی یوں ہی باتیں بنا کے) ان سے پہلے کے مکذبین نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ اے پیغمبر ان سے کہدو کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علمی برہان ہے جس کو ہمارے سامنے پیش کر سکو، تم تو محض خیالی باتوں پر چل رہے ہو اور بالکل بے بنیاد قیاس آرائیاں کر رہے ہو ـــــ اے پیغمبر ان سے کہدو کہ (تمہارے دعوے کا بے دلیل ہونا تو ظاہر ہو چکا) پس حجۃ البالغہ (کامل اور روشن دلیل) اللہ ہی کی ہے (جو اس کے پیغمبروں کے ذریعہ آئی اور تم اس کی رو سے یقیناً مجرم ہو) بیشک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا (یقیناً اس کو اس کی قدرت تھی، لیکن ایسا کرنا حکمت کے مطابق نہ تھا)۔

اے پیغمبر ان سے کہدو کہ تم اپنے ان گواہوں کو لاؤ جو اس کی شہادت

دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ گواہی دیں تو تم ان کی ہمنوائی نہ کرنا اور ان لوگوں کی بدعات اور مزخرفات پر نہ چلنا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور دوسری ہستیوں کو اپنے پروردگار کے برابر ٹھہراتے ہیں۔

اے پیغمبر ان سے کہو آؤ میں تمہیں سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے (اور جو پابندیاں تمہارے اوپر عائد کی ہیں، اس کی سب سے پہلی اور اہم ہدایت یہ ہے) کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اور مفلسی تنگ دستی کے خیال سے اپنی اولاد کو مار نہ ڈالو، ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی، اور بے حیائی و بے شرمی کی گندی باتوں کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور جس کا خون بہانا اللہ نے حرام کیا ہو اس کو قتل نہ کرو، الا یہ کہ کسی حق کی بنیاد پر اس کی جان لی جائے ـــــ اللہ نے ان باتوں کی تم کو سخت تاکید کی ہے، امید کی جانی چاہیے کہ تم (ان ہدایتوں کو اور ان کی اہمیت اور روح کو) سمجھو (اور عمل کرو) اور یہ (بھی اس کی ہدایت ہے) کہ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنے پورے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور ناپ تول پوری کرو انصاف اور دیانت داری کے ساتھ، ہم مکلف نہیں کرتے کسی کو مگر اتنے ہی کا جتنا اس کے امکان میں ہو، اور جب بات کہو تو حق و انصاف کی کہو اگرچہ وہ (جس کا معاملہ ہے) تمہارا عزیز قریب ہی ہو، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو ـــــ اللہ نے تم کو اس سب کی تاکیدی ہدایت کی ہے، امید کی جانی چاہیے کہ تم نصیحت پکڑو گے (اور عمل کرو گے) اور (یہ بھی اللہ کا ارشاد ہے کہ) یہ (جس کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے) میرا مقرر کیا ہوا راستہ ہے پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر ادھر ادھر کر دیں ـــــ

تمہیں تمہارے رب نے یہ سب وصیت کی ہے، امید کی جانی چاہیے کہ تم (اس کی پیروی اور پابندی کرتے ہوئے نافرمانی اور اس کے برے انجام سے)

بچ گئے۔

الانعام آیت ۱۴۵ تا ۱۵۰

تعبیر و تشریح یہ آیتیں سورۃ الانعام کے سترھویں اور اٹھارویں رکوع کی ہیں پچھلے ہفتہ ان سے پہلی جو آیتیں زیر درس تھیں وہ وَقَالُوا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ ..... سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۠ تک، ان میں مشرکین عرب کی اُس گمراہی کا ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی غذا کے لیے جو حلال چوپائے گائے بھینس بکری وغیرہ پیدا کیے ہیں اور اسی طرح زمین سے جو غذائی پیداوار ہوتی ہے، ان مشرکین نے ان کے بارہ میں اپنی ایک شریعت گھڑ رکھی تھی اور اپنی مشرکانہ اور توہم پرستانہ ذہنیت کے مطابق بہت سی حلال طیب چیزوں کو کسی خاص طبقہ کے لیے یا سب کے لیے حرام قرار دے رکھا تھا اور اسی طرح بعض حرام اور گندی چیزوں کو حلال بنا لیا تھا اور اس تحریم و تحلیل کو بالکل بے سند خدا کی طرف منسوب کرتے تھے اور اپنی اس خود ساختہ شریعت کو خدا کی شریعت بتاتے تھے حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل اور سند نہیں تھی۔ بلکہ یہ ان کا خالص افترا تھا ــــ آخر میں فرمایا گیا تھا "فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۠" (اس سے بڑا مجرم کون ہوگا جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ پر بالکل جھوٹ بہتان باندھیں جس کی کوئی دلیل اور سند نہ ہو۔ اللہ ایسے مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا)

اس کے بعد متصلاً یہ آیتیں ہیں جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں ــــ ان میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ ان نا آشنایان حقیقت کو بتائیے اور اعلان کر دیجئے کہ خدا نے جو شریعت میری طرف وحی کی ہے اس میں ان چیزوں میں سے جو کھائی جاتی ہیں اور جن کے کھانے کا تم لوگوں میں دستور اور چلن ہے صرف یہ چار چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ ایک مَیْتَةً (مرا ہوا جانور) یعنی جو مر گیا ہو اور شرعی طریقہ پر حلال نہ کیا گیا ہو ــــ دوسرے بہا ہوا خون (جو ذبح کے وقت یا زخمی ہو جانے کی صورت میں جانور کے جسم سے بہتا ہے) تیسرے خنزیر کا گوشت جو سراسر ناپاک ہے، چوتھے وہ جانور جو بطور نذر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو اور بول دیا گیا ہو، ــــ ارشاد ہے

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

یہ مضمون الفاظ کے بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں بھی فرمایا گیا تھا کہ بس یہی چار چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حرام قرار دی ہیں ـــــ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

پھر سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں بھی ان چار چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے، بلکہ ان چار کے علاوہ کچھ اور محرمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان چار چیزوں میں سے "مَیْتَة" (مرا ہوا جانور) اور "دم مسفوح" (بہا ہوا خون) اور "لحم خنزیر" (سور کا گوشت) یہ تینوں بالکل واضح ہیں، ان کے بارہ میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ چوتھی چیز "مَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے، اگرچہ پہلے جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں وضاحت کی جا چکی ہے، لیکن آپ حضرات میں بعض وہ بھی ہوں گے جو اس موقع پر شریک درس نہیں رہے ہوں گے، اس لیے میں آج پھر ضروری وضاحت کرتا ہوں۔

پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ خدا کے پرستار بندے خدا کو راضی کرنے اور اس کی رحمت و عنایت حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کرتے ہیں مشرکین بھی اپنے دیوتاؤں اور فرضی اور وہمی خداؤں کی رضامندی اور نظرِ عنایت حاصل کرنے کے لیے وہ سب ہی کرتے ہیں، مثلاً خدا کے پرستار اس کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں تو مشرکین بھی اپنے معبودوں کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں، خدا پرست اپنے پروردگار کے لیے نذر مانتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں تو مشرکین بھی اپنے مانے ہوئے دیوتاؤں اور شریکوں کے لیے نذریں مانتے اور قربانیاں کرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جو ہر اُس شخص کو معلوم ہے جو مشرکین کے حالات اور اُن کے مشرکانہ طور طریقوں سے واقف اور باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر اللہ کی عبادت اور پرستش کو شرک قرار دیا ہے اسی طرح اللہ کے سوا کسی کے لیے نذر ماننے، نذر چڑھانے اور اُس کے واسطے قربانی کرنے کو بھی شرک بتایا ہے۔

مشرکین عرب میں شرک کی یہ سب صورتیں رائج تھیں، وہ غیر اللہ کی عبادت اور پرستش بھی کرتے تھے اُن کے لیے جانوروں کی نذر بھی مانتے تھے، قربانیاں بھی کرتے تھے ـــــ قرآن پاک نے غیر اللہ کے لیے اس نذر اور قربانی کو ایسا خبیث مشرکانہ عمل قرار دیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جانور بھی حرام اور مردار ہو جاتا ہے جس کو اللہ کے سوا کسی کی نذر کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو یا غیر اللہ کے لیے اس کی قربانی کی گئی ہو "مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" سے یہی دونوں صورتیں مراد ہیں ـــــ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں اس کا مصداق وہ جانور تھے جن کو مشرکین اپنے بتوں کے لیے نذر کے طور پر نامزد کر دیا کرتے تھے یا اپنے بتوں کو راضی کرنے کے لیے جن کی قربانی کرتے تھے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اُن کا گوشت حرام اور مردار قرار دیا گیا ہے اگرچہ وہ مرغا اور بکرا جیسے حلال جانور ہوں۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ "مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" سے مراد صرف وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو ـــ لیکن لغت کے لحاظ سے بھی یہ بات صحیح نہیں ہے، عربی لغت اور محاورہ کی رو سے اس سے وہ جانور مراد ہے جس کو غیر اللہ کے لیے پکار دیا گیا، ہاں وہ جانور بھی اس میں داخل ہوگا اور بدرجہ اولیٰ داخل ہوگا جس پر ذبح کے وقت خدا کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو ـــــ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس پر بڑی تفصیل سے نہایت فاضلانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو بطور نذر غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو، وہ اس مشرکانہ نذر سے حرام ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگر بالفرض اس غیر اللہ کے لیے ان کی قربانی کرتے وقت اُن پر اللہ کا نام لیا جائے اور بسم اللہ پڑھ کر ہی ذبح کیا جائے جب بھی وہ جانور حلال نہ ہوگا جس طرح سور یا کتا اگر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو حلال نہ ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے آپ نے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا "لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ" جس کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت میں بھی وہ سب گمراہیاں آئیں گی جو اگلوں میں آئی تھیں ـــــ حضور کی اس پیشین گوئی کے مطابق بہت سے جاہل مسلمان بھی اس طرح کے مشرکانہ اعمال کرتے ہیں، وہ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں، اُن کے لیے نذریں مانتے ہیں اُن کے

نام کے مرغے اور بکرے ان کے مزاروں پر چڑھاتے ہیں اور انھیں راضی کرنے کے لیے ان کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یہ قطعاً مشرکانہ اعمال ہیں اور ان کے وہ مرغے اور بکرے بلاشبہ "مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ" میں داخل ہیں۔ جس طرح عبادت صرف اللہ کا حق ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک ہے، اسی طرح نذر اور قربانی بھی صرف اللہ کا حق ہے اور غیر اللہ کے لیے قطعاً شرک ہے[1]۔ یہ سب وہی شرک ہیں جن کو مٹانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔

الغرض اس آیت میں اس جانور کو جس کی غیر اللہ کے لیے نذر بول دی گئی ہو، حرام قرار دیا گیا لیکن یہ حرمت چونکہ مشرکانہ نذر کی وجہ سے آتی ہے اس لیے اگر وہ آدمی جس نے اس جانور کی نذر بولی ہو اس جانور کے ذبح ہونے سے پہلے ہی اپنے اس مشرکانہ عمل سے توبہ کرے تو جانور کی حرمت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس مشرکانہ عمل کی وجہ سے حرمت پیدا ہوئی تھی جب اس شخص نے اللہ کی توفیق سے اس سے توبہ کرلی تو حرمت کا وہ سبب ہی ختم ہو گیا۔

بعض لوگ ان جاہل عوام کی طرف سے جو اپنی حاجتیں اور مرادیں پوری کرانے کے لیے بزرگوں کے لیے نذریں مانتے اور ان کے مزارات پر مرغے اور بکرے چڑھاتے ہیں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ان کا مقصد در اصل ان بزرگوں کی روحوں کے لیے ایصال ثواب کرنا ہوتا ہے، حالانکہ جو لوگ اس طبقہ کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ تو ایصال ثواب کے تصور سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں۔ وہ تو انھیں ہی حاجت روا اور کارساز سمجھ کر انھیں راضی کرنے کے لیے نذر مانتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ہم سے راضی ہو جائیں اور ہمارا فلاں کام بنا دیں اور فلاں بلا کو ٹال دیں، یہ بالکل وہی ذہن ہے جو عرب کے مشرکوں کا تھا اور ہمارے ملک کے بت پرست اور توہم پرست مشرکوں کا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے دل کا حال جانتا ہے، اس طرح کی تاویلوں سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں ایک بات اور وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انعام کی اس آیت "قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ

---

[1] نذر در اصل ایک طرح کی عبادت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" ۱۲

اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ۔ الآیۃ میں اور اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ" میں حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ شریعتِ اسلام میں ان چار کے علاوہ کوئی پانچویں چیز حرام نہیں، ان کے سوا سب حلال ہی حلال ہیں —— حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی گندی اور خراب چیزیں حرام ہیں۔ مثلاً کتا، بھیڑیا، چیتا وغیرہ سارے درندے حرام ہیں۔ اسی طرح چیل اور شکرہ جیسے شکاری پرندے حرام ہیں۔ زمین کے کیڑے مکوڑے سانپ بچھو وغیرہ حرام ہیں، خود قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان بیان کی گئی ہو کہ "یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ" (یعنی وہ پاکیزہ اچھی چیزوں کی حلت کا حکم دیتے ہیں اور گندی خبیث چیزوں کی حرمت کا حکم دیتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ شریعتِ اسلام میں ہر خبیث اور گندی چیز حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حدیثوں میں درندوں اور شکاری پرندوں کی حرمت کا اعلان کیا ہے وہ گویا اسی "یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ" کی تشریح اور تفصیل ہے۔

بہرحال اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلامی شریعت میں ان چار چیزوں، (مردار، خون، خنزیر اور مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ) کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے کہ ان دو آیتوں میں جو حصر کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔ اصطلاحی لفظوں میں تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ حصر منطقیوں کا حصرِ حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ حصر اضافی ہے یعنی ان آیتوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سارے محرمات کی تفصیل بتا دی جائے اور ان کی مکمل فہرست پیش کر دی جائے، بلکہ سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکینِ مکہ نے کھانے پینے کی جن حلال چیزوں کو بغیر کسی دلیل اور علم کے حرام قرار دے رکھا تھا اور اس تحریم کو بغیر کسی سند کے خدا کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ان آیتوں کا اصل مقصد بس اسی کی نفی اور تردید ہے۔ اور مطلب ان دونوں آیتوں کا بس یہ ہے کہ تم نے اور تمہارے باپ [illegible] نے کھانے پینے کی

چیزوں میں سے جو بہت سی چیزوں کو سب کے لیے یا کسی خاص طبقہ کے لیے حرام قرار دے رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ایک شریعت گھڑ لی ہے اور اس کو خدا کی طرف نسبت کرتے ہو۔ یہ سب غلط اور خدا پر تمہارا افترا ہے، کھانے پینے کی جن چیزوں کا تم لوگوں میں چلن ہے دستور ہے ان میں خدا نے بس یہ چار چیزیں حرام کی ہیں، ان کے سوا جن چیزوں کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ حرام نہیں کی گئی ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ یہ حصر دنیا بھر کی تمام چیزوں کے لحاظ سے نہیں ہے، بلکہ صرف اُن چیزوں کے لحاظ سے ہے جن کو مشرکین عرب نے بلا کسی دلیل اور سند کے حرام قرار دے لیا تھا اسی کو حصر اضافی کہتے ہیں۔

آگے فرمایا گیا ہے کہ اگر بالفرض کسی وقت کسی آدمی کے لیے ایسی صورت پیش آجائے کہ وہ جان بچانے کے لیے ان چار حرام چیزوں میں سے کچھ کھانے کے لیے مضطر اور مجبور ہو جائے تو دو شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ صرف جان بچانے کے لیے کھائے لذت حاصل کرنے کے لیے نافرمانی کرنے والا نہ ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ بس بقدر ضرورت کھائے ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔ "غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کا یہی مطلب ہے ــــ آگے فرمایا گیا ہے "فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت اور صفتِ مغفرت کا کرشمہ ہے کہ مضطر کے لیے یہ گنجائش دے دی گئی اور آخرت میں اس سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

آگے "وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا" سے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اسکی حیثیت اسی تحلیل و تحریم کے سلسلہ میں مزید وضاحت کی ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام صرف یہ چار چیزیں ہیں، اس پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تورات کے ذریعہ جو شریعت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ملی تھی اس میں تو ان چار کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں حرام کی گئی تھیں چنانچہ ناخن اور سُم والے سارے جانور حرام کیے گئے تھے اور گائے، بکری وغیرہ کی چربی بھی بجز خاص اعضا کی چربی کو مستثنیٰ کر کے حرام کر دی گئی تھی ــــ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی خبیث اور گندی ہیں، پھر ان کو قرآن میں کیوں حرام نہیں قرار دیا گیا ــــ گویا اسی کے جواب میں فرمایا گیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر جو یہ چیزیں حرام کی گئی تھیں، یعنی ناخن اور سُم والے جانور، جیسے اونٹ، شترمرغ، بط، قاز وغیرہ۔ اور گائے بھینس اور بھیڑ بکری کی چربی (سوائے اُس چربی کے جو ان جانوروں کی پشت پر ہو یا انتڑیوں پر ہو یا ہڈی سے لگی ہو) — تو یہ چیزیں اس وجہ سے حرام نہیں کی گئی تھیں کہ ان میں کوئی خباثت اور گندگی ہے، بلکہ یہودیوں کے لیے ان چیزوں کی تحریم اُن کی سرکشی اور بغاوت کی سزا کے طور پر تھی، گویا اس تحریم کے ذریعہ ان کو بطور سزا کے ان نعمتوں سے محروم کر دیا گیا تھا، اس لیے یہ تحریم وقتی اور عارضی تھی، جو اب منسوخ کر دی گئی۔

—— آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ایک سچی تاریخی حقیقت ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے (وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝) آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝" مطلب یہ ہے کہ اگر اس وضاحت کے بعد بھی یہ آپ کی تکذیب کریں اور کٹ حجتی سے باز نہ آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں اور ان کو سنا دیں کہ یہ مت سمجھو کہ خدا تمھارے جرم اور تمھاری ہٹ دھرمی کو دیکھ نہیں رہا یا وہ تمھاری ان حرکتوں سے راضی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی رحمت کا دامن بڑا وسیع ہے وہ مجرموں کو فوراً ہی عذاب کی گرفت میں نہیں لے لیتا بلکہ ان کو پوری مہلت دیتا ہے تاکہ اگر وہ رجوع اور تلافی کرنا چاہیں تو کر سکیں، اس نے تم کو بھی اپنے اسی دستور کے مطابق مہلت دے رکھی ہے۔ لیکن جب اس کی طرف سے عذاب اور سزا کا فیصلہ ہو جائے گا تو پھر کسی طاقت اور کسی تدبیر سے اس عذاب کو مجرموں سے روکا نہ جا سکے گا۔ (وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝)

آگے "سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا" سے مشرکین کی ایک جاہلانہ منطق کا ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے وہ اپنے کافرانہ اور مشرکانہ طور طریقوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ایک بات یہ بھی کہتے تھے کہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں اگر یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہوتا تو وہ ہمیں اس پر چلنے ہی نہ دیتا حالانکہ ایسا نہیں ہو رہا ہے ہم برابر اس راستے پر چل رہے ہیں اور ہم سے

پہلے ہمارے باپ دادے بھی چلتے رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ راستہ اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں محض جاہلانہ ڈھکوسلہ ہے، یہ بات تو چور اور ڈاکو اور بُرے سے بُرا پیشہ کرنے والے بھی کہہ سکتے ہیں ــــ اس دُنیا میں سب کچھ کرنے کی جو آزادی ملی ہوئی ہو یہ ہرگز اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ ہر کوئی جو کچھ کر رہا ہے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ ارشاد ہے۔

سَیَقُولُ الَّذِینَ اَشْرَکُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَکْنَا وَلَا اٰبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِینَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُونَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِینَ ۝

مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین یہ بھی کہیں گے کہ اگر اللہ یہ چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام قرار دیا ہے اُن کو حرام قرار نہ دیں، تو پھر ہم اور ہمارے باپ دادے اللہ کی قدرت اور اس کے ارادہ کے سامنے مجبور ہو جاتے اور ان میں سے کوئی بات بھی نہ کر سکتے، نہ ہم شرک کرتے نہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو حرام کر سکتے اور جب ہم یہ سب کر رہے ہیں اور اس کے باوجود اس دُنیا میں ٹھاٹھ سے جی رہے ہیں تو ثابت ہوا کہ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں سب ٹھیک ہے اور اللہ بھی چاہتا ہے ــــ اس کے جواب میں پہلے تو اُن کو انجام سے خبردار کرنے کے لیے یہ فرمایا گیا کہ ان سے پہلے منکرینِ حق نے بھی اسی طرح کی کٹ حجتی کرکے اور منطق بگھار کے داعیانِ حق کو جھٹلایا تھا جس کے نتیجہ میں اُن پر ہمارا عذاب آگیا تھا ــــ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ تو تمہارے خیالی تیر تکے اور بے اصل اوہام ہیں، اگر کوئی علم و یقین والی بات ہو تو پیش کرو ــــ اس کے بعد فرمایا گیا "قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ" مطلب یہ ہے کہ جب ان کی بات کا غلط اور بے بنیاد اور بے سند ہونا ظاہر ہوگیا تو اے رسول ان سے کہیے کہ پھر اللہ کی قطعی حجت جو اس کے پیغمبروں کے ذریعہ آئی ہے جس میں تمہارے شرک اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کی تحریم کو بدترین جرم قرار دیا گیا ہے وہ قائم اور ثابت ہو چکی اب تم اس کے بارہ میں کوئی معذرت بھی نہیں کر سکتے ــــ اور

یہ بیشک صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ اگر وہ تم سب کو ہدایت سے نوازنا چاہتا تو نوازدیا کرسکتا تھا (فَلَوْشَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝) لیکن اس کی حکمت کا تقاضا اور فیصلہ یہی ہے کہ وہ بندوں کو راہِ حق پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرے گا، اس نے بندوں کو پیدا فرماکر ایک درجہ کی فکر وعمل کی آزادی دے دی ہے اور جو جس راستہ پر چلنا چاہتا ہے اللہ اس کو اس کا موقع دے دیتا ہے، یہی اس کی مشیت ہے لیکن اسی کے ساتھ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ان کو حق کی دعوت اور تعلیم دلوائی ہے اور بتلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے کیا چاہتا ہے اور اس کی رضا اور غضب کا قانون کیا ہے ـــــ اور چونکہ تم خدا کی دی ہوئی آزادی اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کی ہدایت کی مخالفت میں استعمال کررہے ہو اور تمھاری شرارت حد سے بڑھ گئی ہے، اس لیے خدا نے تمھیں ہدایت سے نوازنا نہیں چاہا، اگر وہ چاہتا تو تم کو بھی ہدایت کی نعمت دے سکتا تھا ـــــ فَلَوْشَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

مشرکین جن خرافات میں مبتلا تھے جیسا کہ اوپر کی آیات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ گمراہی بھی تھی کہ بہت سی حلال طیب غذاؤں کو انھوں نے حرام کر رکھا تھا، اسکے لیے ان کی سب سے بڑی سند یہ تھی کہ ہمارے بڑوں نے اور قومی رہنماؤں نے جن کی ہم پیروی کرتے ہیں ہم کو یہی بتایا ہے کہ خدا نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے ـــــ اگلی آیت میں اس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے ان رہنماؤں کو لاؤ وہ اس کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی میں ذرہ برابر بھی احساسِ ذمہ داری ہوگا تو وہ ایسی غلط بات خدا کے بارہ میں نہ کہہ سکے گا اور اگر کوئی شخص بے حیائی پر کمر باندھ کے ایسی بات کہے گا تو کوئی دلیل اور سند نہ پیش کرسکے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ تم اپنے ان رہنماؤں کو لاؤ جو اس کی شہادت

دیں کہ ان چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، امید یہی ہے کہ خدا پر ایسے صریح افتراء کی جرأت کوئی نہ کرے گا ـــ لیکن اگر بالفرض وہ اس کی شہادت دیں تو اے پیغمبر تم اس میں ان کی ہمنوائی نہ کرنا. بلکہ پوری قوت سے اس کی تردید کرنا اور ایسے لوگوں کی بدعات پر مت چلنا جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور آخرت کو نہیں مانتے ہیں۔ اور دوسری ہستیوں کو خدا کی برابر کرتے ہیں۔

یہاں تک مشرکین کی تحریم طیبات والی مشرکانہ بدعت پر کلام کیا گیا اور مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید کی گئی جس سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہو گئی کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا صرف اللہ کا حق ہے اور کسی اور کے لئے بھی یہ حق تسلیم کرنا ایک طرح کا شرک ہے اور اسی طرح بغیر معتبر سند اور دلیل کے یہ کہنا کہ فلاں چیز کو خدا نے حرام یا حلال کیا ہے اُس پر افترا اور سنگین جرم ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان مشرکوں سے کہئے کہ تم نے جن چیزوں کو خواہ مخواہ اور بغیر کسی سند کے حرام قرار دے رکھا ہے، اس کی حقیقت تو تم کو بتا دی گئی کہ خدا نے ہرگز ان کی حرمت کا حکم نہیں دیا ہے ـــ اب آؤ میں تم کو بتاؤں کہ فی الحقیقت کن کن چیزوں اور کن کن باتوں کو خدا نے حرام کیا ہے اور اُس کے بنیادی احکام کیا ہیں! قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ .... الخ۔

ـــــــــ (باقی)

فارم نمبر ۴

(دیکھئے قاعدہ نمبر ۸)

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات

مقام اشاعت .... لکھنؤ ..... وقفۂ اشاعت ... ماہانہ

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک کا نام ... محمد منظور نعمانی ـ شہریت ... ہندستانی

پتہ .... کچہری روڈ، لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

محمد منظور نعمانی

یکم مارچ ۱۹۷۰ء

نئی مطبوعات

فتاویٰ رحیمیہ (جلد اوّل و دوم) از افادات مولانا سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری
جلد اول۔ صفحات ۴۰۰ سائز ۲۰×۲۶/۸ مجلد قیمت دس روپے
جلد دوم۔ ۴۳۲ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ مجلد۔ قیمت۔ بارہ روپے
پتہ:۔ عطرستان۔ چوک بازار۔ سورت (گجرات)

صاحب فتاویٰ مولانا سید عبد الرحیم صاحب بڑی مسجد رانذیر ضلع سورت کے خطیب ہیں۔ گجراتی زبان میں آپ کے یہ فتاویٰ گجرات کے ایک ماہنامے (پیغام) میں شائع ہوتے رہے تھے۔ اصل زبان میں اُن کا مجموعہ شائع ہونے کے بعد اسے اردو میں بھی منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے سامنے یہی اُردو اڈیشن ہے۔

یہ دونوں جلدیں سینکڑوں سوالات کے جوابات پر مشتمل ہیں۔ سوالات کا تعلق صرف فقہی مسائل ہی سے نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کے دینی سوالات ہیں جو مفتی صاحب موصوف سے بحیثیت ایک دینی رہنما کے کیے گئے اور آپ نے اُن کا جواب ارقام فرمایا۔ مثلاً "بارش نہ برسنے اور قحط سالی کے اسباب کیا ہیں؟" "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہ تھے؟" "عمل صالح کی توفیق کیوں ہوتی ہے اور کیوں نہیں ہوتی؟" اس طرح کے بہت سے سوالات پر بھی، جن کا مخصوص علم الفقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس مجموعہ فتاویٰ میں کلام مل جاتا ہے۔

فقہی سوالوں کے جوابات میں بھی مفتی صاحب نے صرف مفتی کے فرائض پر اکتفا نہیں کیا ہو کہ محض حکم شرعی اور اس کی سند بتادی جائے۔ بلکہ بہت سے مقامات پر قرآن و حدیث اور آثار

صحابہ و تحقیقاتِ اکابر نیز دلائلِ عقلیہ کی مدد سے اس قدر شرح و بسط کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کہ ایک مکمل مضمون بن گیا ہے جس میں سائل کی ذہنی تشفی ہی کا نہیں، پابندیٔ شریعت کی ترغیب کا بھی پورا سامان موجود ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا علم بہت حاضر اور دینی لٹریچر پر اُن کی نظر وسیع ہے۔

گجراتی سے اُردو ترجمہ خود مفتی صاحب کا نہیں ہے۔ بعض دوسرے حضرات نے کیا ہے۔ اور وہ خود بھی بجا قابلِ تحسین ہے۔ کہیں سے ترجمہ پن ظاہر نہیں ہوتا۔ کتاب کا ظاہری حُسن بھی معنوی قدر و قیمت سے کم نہیں ہے۔ کتابت و طباعت بہت ہی نفیس اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا استعمال کیا گیا ہے جو اُردو کی خصوصاً دینی کتابوں کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ جلد بھی بہت ستھری اور دیدہ زیب ہے۔

خدا معلوم کیوں جہاں مفتی صاحب نے سوالات کا جواب مختصر دیا ہے وہاں بہت سی جگہ کوئی حوالہ نہیں ہے۔ ایک موقع ایسا بھی تبصرہ نگار کی نظر میں آیا جہاں حدیث کے ایک لفظ کے ترجمہ میں کھلا تسامح محسوس ہوتا ہے۔ جلد دوم صفحہ ۲۴ پر مذکورہ حدیث میں جہاں جہاں "علی حرف" کا لفظ آیا ہے اُس کا ترجمہ چت لیٹنا کیا گیا ہے۔ حالانکہ کروٹ سے لیٹنا اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

کتاب کی ترتیب خاص طور سے بہت نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ جگہ جگہ ایک باب میں دوسرے باب کے مسائل درج ہوئے ہیں۔

ایک ضروری بات رہی جاتی ہے، مفتی صاحب حنفی المسلک ہیں اور جماعت دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں، قدرتی طور پر اُن کے فتاویٰ اسی مذہب و مسلک کے مطابق ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس موقع پر یہ نہ کہنا پڑتا کہ جن جماعتوں سے جماعت دیوبند کی فقہی یا اعتقادی چشمک ہے۔ جہاں اُن کے اعتراضات جہاں زیرِ بحث آ گئے ہیں، وہاں مفتی صاحب کا قلم ایسی شدت پر بھی عمل پیرا ہو گیا ہے جسے اب ترک کر دینا ہی اچھا ہے۔ اگرچہ مفتی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسکی حیثیت جوابی ہے سیئۃ سیئۃ مثلہا میں اسکی اجازت ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت (جلد اوّل) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

طبع دوم صفحات ۴۰۰ سائز ۲۰×۲۶/۸ مجلد۔ قیمت دس روپے

ناشر۔ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۵ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ اب (۱۹۶۹ء میں) اس کا یہ دوسرا ایڈیشن مصنف کی قائم کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

کتاب کے نام سے اُس کا موضوع و مقصد پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ کتاب کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اسلام کو اپنی زندگی کے طویل سفر میں اپنی بقاء اور دفاع کے لیے جس طرح کے افراد و اشخاص کی ضرورت ہوئی وہ عین ضرورت کے مطابق اُسے ملتے چلے گئے۔ اور عموماً اس طرح ملے اور ایسے نامساعد حالات میں انھوں نے عظیم کامیابیاں حاصل کیں، کہ اسے اسلام کی حفاظت کے ایک غیبی انتظام کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر اسلام کی حفاظت کا جو ذمہ اُس کے نازل کرنے والے نے لیا تھا اور پیغمبر اسلام کی زبان سے یہ مژدہ سنایا گیا تھا کہ اس دین کو برابر ایسے مردان کار فراہم ہوتے رہیں گے جو ہر اندرونی بگاڑ اور بیرونی یلغار کے مقابلہ میں اس کی ہستی کا تحفظ کریں، تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

یہ موضوع جتنا مبارک ہے، اتنا ہی بے پایاں بھی ہے۔ کوئی تنہا شخص اپنی پوری زندگی بھی اس پر لگائے تب بھی مشکل ہی سے حق ادا ہو سکے گا۔ اسلام پوری زندگی کا دین ہے۔ ایسے دین کو اپنی زندگی برقرار رکھنے اور ہر دور کے پیمانوں سے اپنی حقانیت کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے تیرہ چودہ سو برس کی طویل مدت میں جتنی متنوع ضرورتوں سے سابقہ ہوا ہوگا اُن کا احاطہ کرنا اور پھر یہ ضرورتیں جس جس طور پر پوری کی گئیں اُسے بیان میں لانا، جیسی وسعت نظر اور جیسی علمی جامعیت کو چاہتا ہے کہاں ممکن ہے کہ وہ سب ایک آدمی میں جمع ہو جائے۔ مگر جتنا کچھ بھی اس موضوع پر کوئی مصنف پیش کر دے وہ چونکہ بہرحال ازدیاد ایمان کا ذریعہ اور اسلام پر پختگیٔ اعتماد کا وسیلہ ہے، اس لیے مبارک ہے، قابل تحسین ہے بلکہ لائق امتنان ہے۔

مولانا علی میاں کا قلم خالی ایک مصنف کا قلم نہیں، ایک ایسے داعیٔ اسلام کا قلم ہے جس کا اسلام کی صداقت، اُس کی ابدیت اور ہر دور میں بالاتری کی صلاحیت پر ایمان و اعتماد اس کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے۔ پھر مولانا کے قلم کا ادبی پایہ اور اُس کی جذبات انگیزی بھی مسلّم ہے۔ ایسے قلم سے جو کچھ بھی اس موضوع پر نکلے اُس کی ایمان افروزی اور اعتماد آفرینی میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کی پیش نظر جلد میں دوسری صدی ہجری سے ساتویں صدی تک اسلامی تاریخ کا

جائزہ لیا گیا ہے اور اس عرصہ میں اسلام کو پیش آنے والے حالات اور اُن کی ضرورتوں پر مدد شخصیتوں نے کئے اُن شخصیتوں کی نشاندہی دُن کے کافی تفصیلی حالات کے ساتھ کی گئی ہے جو ان ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔

اس دوسرے ایڈیشن کا قلم کچھ ضرورت سے زیادہ جلی محسوس ہوتا ہے۔ کتابت اور طباعت اور گٹ اپ بھی قابل تعریف نہیں ہے۔ تصحیح کا بھی شاید پورا اہتمام نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر صفحہ ۴۲ پر "تاریخ کے گمشدہ مآخذ" کے عنوان سے جو عبارت شروع ہوتی ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی جملہ چھوٹ گیا ہے۔

ارکانِ اربعہ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صفحات ۳۶۳۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ مجلد۔ قیمت۔ آٹھ روپے

ناشر:۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ کتاب اصلاً عربی میں لکھی گئی تھی اور بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ اب مجلس تحقیقات سے اس کا یہ اردو ترجمہ شائع ہوا ہے جو محترم مصنف کی نگرانی میں اُن کے برادر زادہ عزیز مولوی محمد الحسنی صاحب نے کیا ہے۔

مولانا کی یہ کتاب ہماری نظر میں اُن کی تمام دوسری کتابوں پر فائق ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مولانا اپنے اصل میدان میں آگئے ہوں۔ اسلام نے جو چار قسم کی عبادتیں مقرر کی ہیں۔ جنھیں "ارکان اربعہ" کہا جاتا ہے، یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج، یہ کتاب ان میں سے ہر ایک کے پورے نظام کو، جو بہت سے فرائض وواجبات، شرائط وآداب اور سنن ومستحبات پر مشتمل ہے، ایسی حکیمانہ تشریح کے ساتھ پیش کرتی ہے جس کی روشنی میں انسان کی کوئی سعادت اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ وہ ان اعمال کا خوگر ہو اور ہر بُن مو سے اُس خدا کی حمد کرے جس نے یہ ابواب سعادت اپنے بندوں پر کھولے۔

کتاب کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ بھی ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ اِن عبادتوں کے حقیقی مقاصد سامنے آئیں اور مادہ پرستانہ افکار کے غلبہ سے جو بہت سے ذہنوں میں ان عبادات

سے متعلق ایسے تخیلات جاگزیں ہوتے جا رہے ہیں جو اُن کے اصل منافع سے محروم کر دینے والے اور بالآخر دین کی معنوی تحریف تک پہونچا دینے والے ہیں اُن کا پردہ چاک ہو۔

پوری کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہو کتاب و سنت کی بنیاد پر کہا گیا ہو بلکہ نصوصِ کتاب و سنت کی بس تشریح ہو جو اس میں پیش کی گئی ہو۔ مصنف نے اپنے فہم و فکر کے علاوہ اُن ائمہ دین کے افکار سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہو جو اس راہ میں کوئی رہنما نقش پہلے چھوڑ گئے ہیں مثلاً امام غزالیؒ، امام ابن القیم اور شاہ ولی اللہ۔ جو اس راہ کے سب سے بڑے امام ہیں۔

ان سب پہلوؤں کے ساتھ ایک خاص خدمت جو اور مولانا نے اس کتاب میں کی ہو وہ یہ ہو کہ اسلامی عبادات کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور ہندو مت کا بھی جائزہ لیا گیا ہو کہ وہاں ان عبادتوں کا کیا تخیل رہا ہو۔ اس تقابلی مطالعہ سے کم از کم اجمالی طور پر یہ بات محقق ہو جاتی ہو کہ اسلام کا نظام عبادات بیحد فائق اور بیحد جامع ہو۔

کتاب کا ظاہر بھی باطن ہی کی طرح شاندار ہو۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہو۔ کاغذ بھی نفیس اور سرورق بھی خوش منظر۔ ان ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ آٹھ روپے میں یہ سودا زیادہ گراں نہیں ہوگا کاش کوئی پڑھا لکھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے ــــ بلکہ جو لوگ عربی خواں ہیں اُنھیں تو ہم مشورہ دیں گے کہ عربی ایڈیشن ہی کا مطالعہ کریں۔ عربی زبان کو ان مضامین سے جو مناسبت ہو اُس کی بنا پر عربی ایڈیشن کا ذائقہ اور اُس کی تاثیر کچھ اور ہی ہو۔

مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام　　از مولانا شمس تبریز خاں

صفحات ۲۶۳　سائز ۲۲×۱۸/۱۶　مجلد قیمت پانچ روپے

ناشر:- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

ہندوستان کا دستور انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اُن کے تصورات پر مبنی ہو جو یہاں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مغرب سے اخذ کیے ہیں۔ ان تصورات کی رو سے کسی حکومت کے زیر سایہ افراد کے لیے کسی معاملہ کے جواز و عدم جواز اور اُس سے پیدا ہونے والے استحقاق اور مواخذہ کا معیار ایک ہی ہونا چاہیے۔ اس بنیاد پر ہندوستان کے دستور میں حکومت کے لیے یہ صریح ہدایت بھی درج

ہو کہ وہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون دیوانی (سول لا) نافذ کرے — جیسا کہ قانون فوجداری پہلے ہی سے ایک چلا آرہا ہے۔

ہندوستان کے خاص حالات میں یہ اتنا بڑا قدم ہے کہ ایکدم سے نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اس لیے اس مقصد کی طرف بالاقساط پیش قدمی کی جارہی ہے۔ پہلے اکثریت سے متعلق مخصوص قوانین کو جو اُن کے شخصی اور خانگی معاملات سے متعلق تھے، مذکورہ تصورات کے مطابق ایک نئے سانچہ میں ڈھالا گیا اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد ملک کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمانوں) کے متعلق ارادہ کیا گیا کہ اسی معیار کے مطابق اُن کے شخصی اور خاندانی معاملات سے متعلق قوانین (مسلم پرسنل لا) میں بھی تبدیلیاں کی جائیں۔

مسلمانوں سے متعلق یہ قوانین بنیادی طور سے اسلامی شریعت پر مبنی ہیں لیکن سو فیصدی شریعت کے مطابق آج بھی نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں کسی ایسی تبدیلی کی تحریک تو شکریہ کی مستحق ہوتی جو اُنھیں مزید شریعت کے مطابق بنا دیتی۔ لیکن ایسے کسی معیار سے تبدیلی جو ان کی رہی سہی شریعت سے مطابقت بھی ختم کر دے، مسلمانوں کو کسی طرح پسند نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ مسلمانوں کے پریشان کن مسائل کی فہرست میں چند سال سے یہ ایک مسئلہ بھی بڑھ گیا ہے کہ حکومت کو اس ارادہ سے کیسے باز رکھا جائے۔ اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے سخت ردّعمل نے اتنا اثر بھی کر دیا ہے کہ کم از کم فی الحال یہ ارادہ معرض التوا میں چلا گیا ہے۔

لیکن دوسری طرف دو نئے محاذ کھل گئے ہیں۔ ایک حکومت سے باہر کے کچھ "ترقی پسند" مسلمانوں اور ہندوؤں کا محاذ ہے جو دانشورانہ انداز میں مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے درپے ہے کہ اس معاملہ میں اُن کا موقف رجعت پسندانہ اور اُن کے معاشرہ کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسرا محاذ اُن خالص ہندو لیڈروں کا ہے جو مسلمانوں کے اس موقف کو "دو قومی نظریے" اور علیحدگی پسندی کے مترادف قرار دے کر یہ جتانا چاہتا ہے کہ اپنے اس رویہ کی موجودگی میں مسلمان کبھی بھی ہندوؤں کے ساتھ اعتماد و یگانگت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے — اور مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح اپنے اس ملّی حصار سے باہر نکل آئیں جس سے نکالے بغیر اُنھیں اکثریت کے تمدنی دھارے میں بہالے جانے کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا وہ مسئلہ جس میں مسلم نقطۂ نظر کو وضاحت اور دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ مصنف نے بڑی محنت اس کے لیے کی ہے اور بہت کچھ پڑھ کر قلم اٹھایا ہے مگر مسئلہ اور اُس کا یہ پس منظر و ماحول جس ڈھنگ سے مسلمانوں کی پیروی چاہتا ہے۔ وہ ڈھنگ ہمیں اس کتاب میں بالکل نظر نہیں آتا۔ اس میں بنیادی بحثیں صرف دو ہیں۔ ۱؎ یہ کہ نکاح و طلاق وصیت و وراثت وغیرہ سے متعلق قوانین اسلام میں وہی مذہبی حیثیت رکھتے ہیں جو عبادات وغیرہ کی ہے۔ اور اُس میں کوئی بھی انسان ترمیم و تنسیخ کا مجاز نہیں ۲؎ یہ کہ اِن ابواب میں اسلامی احکام کس قدر فطری، حقیقت پسندانہ، افراط و تفریط سے پاک اور موجب خیر و فلاح ہیں بالخصوص عورتوں کے بارے میں اسلام کا رویہ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کی بہ نسبت کس درجہ عادلانہ اور لائق قدر و منزلت ہے۔ اور یہ دونوں بحثیں (خواہ ان کا کتنا ہی حق کر دیا جائے) ایسی نہیں ہیں جو مخالف نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتی ہوں۔ جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے وہ تبدیلی کا سوال اُٹھانے والوں کے لیے کوئی انجانی حقیقت نہیں ہے۔ مگر اُن کے نزدیک مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر قابل اصلاح ہے۔ کیونکہ یہ دین و دنیا کی تفریق کے اُس ترقی پسندانہ اصول کے خلاف ہے جس پر آج زندگی کی تنظیم ہونی چاہیے — یہی وجہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا شدید احتجاج بھی اس میں کامیاب نہیں ہوا کہ حکومت اس ارادے ہی کو چھوڑ دیتی، بلکہ صرف یہ اعلان ہوا کہ ایسا کوئی اقدام مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کیا جائیگا۔

اسی طرح کتاب کی دوسری بحث بھی مخالف محاذ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ کیونکہ اولاً تو یہ خیر و فلاح اور عدل و فطرت کے اُس تصور پر مبنی ہے جو مصنف کا (اور ہم لوگوں کا) اپنا تصور ہے۔ جبکہ مخالفین کا تصور مختلف ہے۔ جب تک اِن کے تصور کا طلسم نہ توڑا جائے اِن کے محاذ پر کوئی اثر نہیں ڈالا جا سکتا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی نکلیں گے جو اِن قدروں میں تو ہم سے اختلاف نہیں رکھتے۔ یا کم از کم وہ مانیں گے کہ اسلام نے جس زمانہ میں یہ احکام دیے تھے اُس وقت اور اُس کے بعد بھی ایک مدت تک واقعی اِن میں معاشرے کی بڑی بھلائی اور خصوصاً عورتوں پر بڑا احسان تھا، مگر اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آج جبکہ معیشت بالکل نئے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ اُس سانچہ کے اندر بھی انھیں ضابطوں کو برقرار رکھنا کیسے قرین عدل و فطرت ہو سکتا ہے؟ — اختلاف کی اس بنیاد کو بھی بحث میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ان دو بنیادی بحثوں کے علاوہ ضمنی طور سے حکومت کے موقف پر بھی عقل و انصاف اور دستور و بین الاقوامی روایات کی روشنی میں تنقید کی گئی ہے۔ اور حسب عادت اس بحث کے لیے بھی مصنف نے کافی تیاری کی ہے۔ مگر اس کو پڑھ کر بھی احساس ہوتا ہے کہ خود حکومت کا موقف ہی مصنف پر واضح نہیں ہے ورنہ وہ اس طرح کا استدلال یقیناً نہ کرتے کہ

"اگر یکسانیت ہی مطلوب ہے تو پھر اکثریت ہی کا قانون کیوں نافذ ہو۔ اقلیتیں بھی اس مطالبہ کا حق رکھتی ہیں کہ انھیں کا قانون جسے وہ عزیز رکھتی ہیں پورے ملک میں یکساں طور پر نافذ ہو۔" (ص ۹۴)

علی ہذا برطانوی حکومت کے رویہ کو بھی دلیل نہ بنا دیتے کہ مسلم پرسنل لا میں تو اس غیر ملکی حکومت نے بھی مداخلت نہ کی تھی۔ اور نہ اسلامی تاریخ کا حوالہ دینے کو برمحل سمجھتے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کے پرسنل لا میں دخل نہیں دیا۔ کیونکہ نہ حکومت اکثریت کا قانون نافذ کر رہی ہے۔ اور نہ اس کی مثال کسی مسلم حکومت یا برطانوی حکومت کی ہے جو حکومتِ غیر کی حیثیت رکھتی تھیں۔

کتاب کی افادیت کو ایک اور چیز نے بھی بہت نقصان پہنچا دیا ہے۔ اور وہ ہے حشو و زوائد کی کثرت۔ مصنف نے اس تصنیف کے لیے جو کچھ پڑھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کا سب اس کتاب میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب مواد بجائے خود تو بہت کام کا ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کا بڑا حصہ بے محل اور دور از کار ہے۔ جس کی وجہ سے مباحث منضبط نہیں رہ سکے اور نکھری نکھرائی کوئی بات مشکل ہی سے عام ناظرین کے ہاتھ آسکے گی۔ موجودہ شکل میں صرف اہل علم اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتب خانۂ الفرقان کی دینی اصلاحی مطبوعات

معارف الحدیث

اردو ترجمہ اور موثر و دلنشین تشریح کے ساتھ احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب، جس کے ذریعہ اردو داں طبقہ کے لیے بارگاہ نبوی سے براہ راست علمی اور دینی استفادہ کا دروازہ کھل گیا ہے۔

پانچ ضخیم جلدیں مکمل ہو چکی ہیں

جلد اوّل۔ کتاب الایمان، بڑا سائز ۲۸۰ صفحات قیمت ۔/۵
جلد دوم۔ کتاب الرقاق والاخلاق ۳۴۰ " " ۵/۷۵
جلد سوم۔ کتاب الطہارۃ والصلوٰۃ ۴۹۲ " " ۔/۷
جلد چہارم۔ کتاب الزکوٰۃ والصوم والحج ۲۹۷ " " ۵/۲۵
جلد پنجم۔ کتاب الاذکار والدعوات ۴۰۸ " " ۶/۵۰

نوٹ:۔ مجلد کے لیے فی جلد ۱/۲۵ کا اضافہ، جلد انگریزی کی ہوگی۔

اسلام کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو خاص تاثیر اور مقبولیت عطا فرمائی ہے؟ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی، ہندی، گجراتی اور کنیڑی وغیرہ۔ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت اعلیٰ

مجلد قیمت ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

یہ کتاب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے لیے لکھی گئی ہے ۲۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں قرآن پاک کی ہدایات و تعلیمات کو کوئی سو عنوانات کے تحت اس طرح مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے اسلام کے برحق اور قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا یقین بھی پیدا ہوتا ہے اور دل میں نور، اور قرآنی ہدایت پر چلنے کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ انگریزی اور ہندی اڈیشن بھی زیر طبع ہے۔

قیمت ۵/۰۰

دین و شریعت

اس کو اچھے اچھے اصحاب نظر نے اس دور کی عظیم ترین کتاب کہا ہے۔ اسلام کے پورے نظام، عقائد و اعمال اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی تعلیمات پر ایسی جامع اور اس درجہ یقین آفریں شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ قیمت ۲/۷۵

نماز کی حقیقت — نماز کی روح اور اس کی حقیقت سے واقفیت کے لیے اور اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے قیمت ۱/۲۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت — کلمہ شریف کی ایمان افروز تشریح۔ قیمت ... ۔/۵۰

برکات رمضان — رمضان اور روزہ کے بارہ میں اسلامی تعلیمات کی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر تشریح۔ قیمت ۔/۱

آپ حج کیسے کریں؟ — حاجیوں کے لیے بہترین رہنما اور معلم جس کے مطالعہ سے حج کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ عاشقانہ جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو حج کی روح ہے۔ قیمت ... ... ۔/۲

آسان حج — کم پڑھے لکھے حضرات کے لیے "آپ حج کیسے کریں" کا آسان زبان میں خلاصہ جیبی سائز۔ قیمت ... ... ۔/۷۵

سب سے پہلا سفرنامہ حج — دو سو سال پہلے ہندوستان کے ایک صاحب دل عالم اور بزرگ نے پیدل دو سال میں حج کا سفر کیا تھا۔ یہ سفرنامہ اُن کے اس سفر عشق کی بڑی دل آویز اور نورانی روداد ہے۔ قیمت ... ... ۔/۲

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ — الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کا کتابی اڈیشن

مکتوبات خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ — لفظ بلفظ ترجمہ ... ۔/۴

حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت — مجلد ۳/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ — مجلد ۔/۲

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمان مرحوم)

امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر ایک پورا کتب خانہ ہے۔ قیمت مکمل چار جلد غیر مجلد -/۲۸

لغات القرآن

تمام قرآنی الفاظ کی نہایت جامع اور مفصل ڈکشنری۔ الفاظ کے معانی متعین کرنے میں جہاں علمی بحث اور تاریخی تشریح کی ضرورت پڑی ہے اس کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اہل علم کے لیے بڑے کام کی ہے۔ بڑے سائز کی چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل سیٹ غیر مجلد -/۳۳

فہم قرآن

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم' اے)

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم و شرائط پر موقوف؟ اس سلسلہ میں احادیث نبویہ کا کیا مقام ہے؟ یہ اس کتاب کے خاص مباحث ہیں۔ -/۴

قرآن اور تعمیر سیرت

فلسفہ نفسیات کے ماہر جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی ایک نہایت قابل قدر کتاب ہے جس میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ متعدد مقالوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

ارض القرآن

قرآن پاک میں جن مقامات اور شہروں کے نام آئے ہیں اُن پر فاضلانہ جغرافیائی مباحث۔ از مولانا سید سلیمان ندوی۔ دو حصوں میں مکمل۔ قیمت مکمل صرف -/۱۰/۵۰

رہنمائے قرآن

قرآن کریم کے مطالعہ میں اس مختصر سے مقالے سے بڑی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ خاص کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ قیمت صرف -/۱

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے

چند تفسیری رسالے

جو اپنے اپنے موضوع پر اُن کے گہرے اور وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہیں

قرآنی شخصیتیں

قرآن میں اول سے آخر تک جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے اُن کے بارے میں مختصر تحقیقی معلومات۔ قیمت صرف ۲/۲۵ پیسے

حیوانات قرآنی

قرآن مجید میں جن حیوانات کا تذکرہ آیا ہے۔ اُن کے بارے میں تحقیقی معلومات۔ قیمت صرف -/۲

قصص و مسائل

بعض قرآنی مسائل اور قصص پر چند تحقیقی نوعیت کے مقالات کا مجموعہ۔ قیمت صرف -/۲

بشریت انبیاء

قرآن مجید کی بہت سی آیات سے انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا اثبات۔ قیمت صرف ۲/۲۵

تفسیر ماجدی جلد اول

اس تفسیر کی افادیت اور خصوصیات کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ مکمل نظر ثانی اور بکثرت اضافات کے ساتھ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ جلد سورۂ فاتحہ، بقرہ، آل عمران کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بڑے سائز .. صفحات، قیمت مجلد -/۱۸ (باقی جلدیں زیر طبع)

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

کاروانِ مدینہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ان روح پرور مضامین کا مجموعہ جن کا تعلق رسول اللہ صلعم کی ذات اقدس سے ہے۔ آخر میں ایک تمثیلی نعتیہ مشاعرہ بھی ہے جسمیں فارسی اور اردو شعرا کا منتخب کلام جمع ہو گیا ہے۔ اہل محبت کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ قیمت مجلد ۳/-

تاریخ دعوت و عزیمت

امت کے مشہور مجددین و مصلحین، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، خواجہ حسن بصری، امام ابوالحسن اشعری، ابن الجوزی، امام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، عارف رومی، محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین منیری کی دینی و تجدیدی خدمات کا مفصل تذکرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ۲ جلدوں میں قیمت مجلد اول -/۶، جلد دوم مجلد ۶/-، جلد سوم زیر طبع ہے

تذکرۃ الرشید

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مکمل سوانح حیات حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے قلم سے۔ قیمت ۸/-

سوانح مولانا محمد یوسفؒ

داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح حیات جس کو مولانا سید محمد ثانی حسنی نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں تیار کیا ہے۔ قیمت مجلد ۱۰/-

سوانح حضرت رائے پوری

عارف باللہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے حالات زندگی، ان کی شخصیت کے نمایاں صفات اور معرفت و سلوک کا ایمان افروز تذکرہ۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے۔ قیمت مجلد ۶/-

ارکانِ اربعہ (اردو) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تازہ ترین معرکۃ الآرا تصنیف جو بلاشبہ موصوف کا شاہکار ہے .... قیمت مجلد ۸/-

محدثین عظام اور اُن کے علمی کارنامے

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)

ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ کا تذکرہ، اور تدوین حدیث کی تاریخ۔ شروع میں مولانا علی میاں کا مقدمہ۔ قیمت ۴/۵۰

فنِ اسماء الرجال ائمہ حدیث کا عظیم کارنامہ

مولانا تقی الدین ندوی کی دوسری تصنیف۔ اس میں فن اسماء الرجال کی تاریخ اور اس کے بارے میں ضروری تفصیلات جمع کر دی گئی ہیں۔ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے۔ قیمت صرف ۱/۷۵

علم الفقہ

مرتبہ۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی سلیس اردو زبان میں فقہ حنفی کی مستند کتاب ہے۔ کامل چھ حصے قیمت کامل مجلد ۱۶/-

تزکیۂ نفس

مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک عظیم تصنیف جس کا پہلا حصہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا ابھی حال ہی میں اس کا دوسرا حصہ بھی شائع ہوا ہے۔ یہ تصنیف مولانا کی تربیتی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو اب تصنیفی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۶/-

تبلیغ دین

(از حضرت امام غزالی)

حضرت امام غزالی کی مشہور و معروف تصنیف "اربعین" (جو دراصل انکی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء العلوم" کا خلاصہ ہے) کا اردو ترجمہ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے قلم سے۔ قیمت مجلد ۴/۵۰ رعایتی ۲/۵۰

مسلم پرسنل لا تصنیف مولانا شمس تبریز خاں، شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات لکھنؤ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد قیمت ۵/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

Regd No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 37 NO. 12 MARCH 1970